تعمیرِ حیات

شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

خصوصی اشاعت

بیاد گار

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، مولانا سید محمد الحسنی، مولانا اسحٰق جلیس ندوی
کی خصوصیات، کمالات اور خدمات کا مختصر جائزہ، ہند و پاک کے
ممتاز علماء اور اہلِ فکر و نظر کے قلم سے

مُرتّبہ

نور عظیم ندوی
شمس الحق ندوی
محمود الازہار ندوی

ملنے کا پتہ: مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

کتابت: ابونسیم ندوی، دلشاد احمد

قیمت: =/۲۵ روپے

سنہ طباعت: صفر ۱۴۰۰ھ (جنوری ۱۹۸۰ء)

طابع و ناشر

پرنٹر، پبلشر، ناظر شعبۂ تعمیر و ترقی ندوۃ العلماء نے جے۔کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر "تعمیر حیات"، ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس پیشکش کا مقصد

ملی، دینی اور علمی حلقہ میں عمومی طور پر اور ندوۃ العلماء کے حلقہ میں خصوصی طور پر، پے در پے جو تین حادثے پیش آئے، ان سے انفرادی طور پر بھی اور مجموعی طور پر بھی ملت اسلامیہ کا، اس قحط الرجال کے دور میں، ایک بڑا نقصان ہوا، اس کی تلافی اور کسی طرح سے ممکن نہیں، لیکن جانے والوں کے کارنامے اور خدمات کا تذکرہ اگر محفوظ کر دیا جائے اور اس کو نئی نسل تک پہنچانے کا انتظام کیا جا سکے، تو اس کی کسی حد تک تلافی ہو سکتی ہے۔ خود ہمارے عربی مدارس میں۔ جن کے یہ تینوں مرحوم افراد ساختہ پرداختہ تھے۔ اور پھر دار العلوم ندوۃ العلماء میں، نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد تعلیم پا رہی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ کارکنان دار العلوم اور ادارہ تعمیر حیات کی اس پیشکش کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ان نوجوانوں کے سامنے، جانے والوں کی خدمات اور ان کے کارنامے سامنے آئیں اور ان کے اندر خود اعتمادی، کوششوں کے نتائج کے برآمد ہونے پر یقین اور سابقین کے نقش قدم پر چلنے کا حوصلہ اور شوق پیدا ہو ——— خدا ادارہ کی اس کوشش کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے اور نوجوانوں کو جانے والوں کا نعم البدل بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

ابوالحسن علی ندوی

(مولانا سید) ابوالحسن علی ندوی

فہرست مضامین

مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مُرتّب

غالباً اوائل جون کی بات ہے میں نے ایک خواب دیکھا، خواب اگرچہ مختصر تھا لیکن اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے ایسا کہ عرصہ تک ذہن ودماغ پر مسلط رہا اور کوشش کے باوجود بھلایا نہیں جاسکا۔ دیکھا کہ میں قاہرہ سے لکھنؤ واپس لوٹا ہوں اور سیدھے ندوہ آیا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ یہاں کی فضا پر رنج والم کے بادل چھائے ہوئے ہیں، بہت لوگ جمع ہیں، چہرے افسردہ اور سوگوار ہیں اور تعزیتی جلسہ ہو رہا ہے، جس کی مجھے پہلے سے کوئی اطلاع نہیں تھی اور حیرت واستعجاب کے ساتھ میں بھی سوگواروں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔

صبح کو آنکھ کھلی تو طبیعت افسردہ تھی اور دن بھر بے کیفی ہی نہیں بلکہ اضمحلال کی کیفیت طاری رہی، کئی روز تک اس خواب کا اثر رہا، غالباً تیسرے روز اپنے رفیق اور مونس وغمخوار برادرم نذر الحفیظ ندوی سے تذکرہ کیا، انہوں نے بھی فکرمندی کا اظہار کیا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی اور ذہن میں خلش باقی رہی۔ اس طرح کی ذہنی الجھنیں اور پریشانیاں اکثر مخدوم معظم حضرت مولانا علی میاں مدظلہ، کو لکھ دیا کرتا تھا اور ان کی دعائیں اور والانامے غموں کا مداوا، پریشانیوں کا علاج اور دل ودماغ کے لئے تقویت اور اطمینان کا سامان ہوا کرتے تھے۔ اس خواب کے بعد بھی ان کی خدمت میں کئی خطوط بھیجے لیکن اس کے تذکرہ کی ہمت نہیں ہوئی، رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آگئی اور اپنے کاموں میں مشغول ہو گیا لیکن یہ خواب ذہن سے محو نہ ہو سکا۔ آخر چند روز بعد، غالباً ۲۴ یا ۲۵ جون کو ریاض سے ایک عزیز کے خط کے ذریعہ مولانا محمد الحسنی کے اچانک انتقال کی اندوہناک خبر ملی، جس سے دل پر چوٹ لگی۔ انسانی طبیعت کی کمزوری ہے کہ ناپسندیدہ اور المناک حوادث سے فرار کے بہانے تلاش کرتا ہے خواہ یہ بہانے کتنے ہی غیر معقول کیوں نہ ہوں، ایک خیال یہ آیا کہ شاید کوئی اور ہو ؎

گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مگر دوسرے ہی روز مولانا محمد واضح صاحب کے خط سے اس خبر کی تصدیق ہوگئی اور مجبوراً اس پر یقین کرنا ہی پڑا۔ زندگی میں پیش آنے والے کتنے واقعات و حوادث ایسے ہوتے ہیں کہ انسان ان پر مجبوراً ہی یقین کرتا ہے کہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ امر خداوندی کے سامنے بس بھی کس کا چل سکتا ہے؟ تاہم تیور کے استعجابیہ نقوش یہی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

یہ داستان درد کی ابھی نہ چھیڑ ہمنشیں
کہ موت آگئی انھیں! نہیں نہیں یقیں نہیں

پے درپے حادثات

یہ حادثہ خود ایسا تھا کہ اس کو جھیل جانا ہم لوگوں کے لئے آسان نہیں تھا لیکن اس کے بعد تو جیسے تسبیح کا دھاگا ٹوٹ گیا اور دانے ایک ایک کر کے گرنے لگے۔ تقریباً ایک ماہ بعد محبی قمر علی ندوی کے خط سے مولانا اسحٰق جلیس ندوی کے انتقال کی خبر ملی۔ یہ خبر بھی اتنی غیر متوقع تھی کہ یقین کرنا مشکل۔ مولانا محمد الحسنی کے انتقال پر انہوں نے تعمیر حیات میں درد و غم میں ڈوبا ہوا اداریہ سپرد قلم کیا تھا اور "محمد الحسنی نمبر"، کا اعلان کیا تھا لیکن کیا خبر تھی کہ ؎

آج وہ کل ہماری باری ہے

ابھی خاص نمبر کی تیاری بھی نہیں کر سکے تھے کہ خود ان سے جاملے، اور کتب خانہ ندوۃ العلماء، تعمیر حیات، تحریک پیام انسانیت اور دوسرے بہت سے میدان جہاں ان کے دم سے رونق اور ان کی ہر دم جواں پیہم رواں شخصیت سے زندگی تھی جیسے سنسان ویران ہو گئے، حوادث کا سلسلہ اسی پر ختم نہیں ہوا ابھی قدرت کو صبر و ضبط کا اور امتحان لینا تھا چنانچہ قاہرہ سے ہندوستان آتے ہوئے ۳۰ر اگست کو ایک دن کے لئے کراچی ٹھہرا تو برادرم فضل ربی ندوی کی زبانی مولانا عبد السلام قدوائی ندوی کے وفات کی اطلاع ملی۔ مولانا اگرچہ عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے، لیکن ابھی تک ان میں جوانوں کی ہمت تھی، عزم تھا، ندوہ اور عام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی مستقبل کے لئے نہ جانے کتنے منصوبے ان کے ذہن میں تھے۔ دعوت و تبلیغ اور تصنیف کے لئے نوجوانوں کی تربیت کے نہ جانے کتنے خواب اپنی تعبیر کے ہنوز منتظر تھے، وہ ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم تھے، دار المصنفین کے ناظم تھے اور اسلام اور عصر جدید سوسائٹی

کے ممبر، اوران سارے کاموں میں پوری سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ وہ اپنی سادگی و بے تکلفی اور بیکراں خلوص کی وجہ سے ہر حلقہ میں محترم اور محبوب تھے، ان کا انتقال ایک ناقابل تلافی نقصان ہے اور خاص طور سے ندوہ اور ندویوں کے لئے۔

پے در پے یہ تین حادثے ندوہ میں ایسے پیش آئے کہ ان میں سے ایک بھی۔ ایک عربی شاعر کی تعبیر کے مطابق۔ اگر "روز روشن" کو پیش آجائے تو وہ شب تیرہ و تار میں بدل جائے، اور ندوہ میں ان حادثات کا جتنا سخت اثر ہوا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ آسمان ندوہ کے ایک نہیں پے در پے تین درخشندہ و تابندہ ستارے ٹوٹ گئے تھے اور اگر حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی شخصیت نہ ہوتی جس سے ہم سب ہی حسب مقدور روشنی حاصل کرتے ہیں تو شاید واقعی یہاں سورج کی روشنی ماند پڑجاتی اور روز روشن تیرہ و تار رات میں بدل جاتا۔

۴ ستمبر کو میں حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی خدمت میں حاضری کے لئے ندوہ پہنچا تو مجھے اپنا خواب یاد آرہا تھا، یہاں تعزیتی جلسے تو بے شمار ہو چکے تھے لیکن صف ماتم اب بھی بچھی ہوئی تھی اور پوری فضا پر غم و اندوہ کے کثیف بادل چھائے ہوئے تھے۔ یہ تینوں حادثے ندوہ اور ندویوں کے لئے ایسے ہیں کہ ایک نہیں متعدد تعزیتی جلسے نہ ان گہرہائے گراں مایہ کا حق ادا کر سکتے ہیں اور نہ ان حوادث سے زخمی دلوں کا مرہم بن سکتے ہیں۔

تو آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید
چہ گنجہائے فراواں زیانِ جاں آمد

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

یہ حادثات ندوہ کے لئے انتہائی المناک اور قوم و ملت کے لئے ناقابل تلافی نقصان کا باعث تو تھے ہی، ان تینوں مرحومین کے ساتھ راقم الحروف کی ذاتی قربت و تعلقات نے غم کی کاٹ اور خسارہ کے احساس میں مزید اضافہ کر دیا۔

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی سے باقاعدہ شرف تلمذ حاصل نہیں لیکن اس کے باوجود ان سے بہت قریب رہا اور خوب خوب فائدہ اٹھایا، میں مولانا کو ہمیشہ اپنا محسن اور قابل احترام استاذ سمجھتا رہا اور مولانا مجھے قریبی عزیز۔ وہ ہمیشہ اپنی شفقت و محبت سے نوازتے رہے، اپنے علم اور اس سے زیادہ اپنے

تجربات سے مستفید فرماتے رہے، میں ندوہ سنہ ۶۰ء میں بغرض تعلیم داخل ہوا تو وہ جامعہ ملیہ میں ناظم دینیات اور تاریخ اسلامی کے استاذ تھے اور اکثر ندوہ تشریف لایا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں ان سے ملاقات ہوئی اور ان کی بے تکلفی، سادگی اور خلوص نے بہت جلد گرویدہ بنالیا، ہم لوگ ان سے اتنے قریب اور ان کی خدمت میں کچھ ایسے شوخ ہوگئے کہ بسا اوقات ایسی باتیں بھی بے تکلف کہہ جاتے تھے جو اپنے اساتذہ اور دارالعلوم کے ذمہ داروں کے ساتھ نہیں کرسکتے تھے اور مولانا بزرگانہ شفقت اور فراخدالی کے ساتھ ہر بات سنتے اور اس کا جواب دیتے، پھر جب سنہ ۶۸ء میں ندوہ کے ابتدائی درجات میں تدریس کی خدمت سپرد ہوئی اور ساتھ ہی ندائے ملت میں کام کا موقعہ ملا تو مولانا سے قرب وتعلق اور بڑھ گیا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ خود انہوں نے قریب کرلیا۔ وہ برابر تدریس وتربیت سے متعلق اپنے مشوروں سے نوازتے، اپنے تجربات سناتے۔ طلبہ کے ذہن اور ان کی نفسیات کے بارہ میں اہم اور ضروری باتیں بتلاتے، جن سے طلبہ کو پڑھانے اور اس سے زیادہ ان کے ذہن کو پڑھنے میں مدد ملتی، مولانا اکثر فرمایا کرتے کہ جو کتاب یا موضوع پڑھانے جاؤ اس کا مطالعہ اور تیاری ضروری ہے لیکن طلبہ کے ذہن اور ان کی نفسیات کا بھی مطالعہ کیا کرو۔ اور ایک کامیاب مدرس کی شاید سب سے اہم خصوصیت یہی ہے کہ اسکے بغیر مدرس اپنی بات طلبہ کے ذہن میں اتار نہیں سکتا۔

مولانا کے اوصاف وخصائص میں ایک اہم خصوصیت جو ہم لوگوں کے لئے خاص طور پر کشش کا باعث اور اخذ واستفادہ کا منبع تھی وہ تھی ان کے مطالعہ کی کثرت اور ذہن کی وسعت، وہ قدیم وجدید علوم وافکار کے جامع تھے۔ اسلام کے بنیادی عقائد، اس کے احکام اور اصولوں پر اچھی نظر تھی ساتھ ہی جدید دنیا کے مزاج شناس اور اس کے تقاضوں سے واقف تھے۔ ان کی اس خصوصیت سے ہم لوگ بہت فائدہ اٹھاتے اور اکثر جدید مسائل پر ان سے گفتگو کیا کرتے۔ ایک دفعہ دہلی میں مولانا سے ملاقات ہوئی، محبی قمر علی ندوی بھی ساتھ تھے۔ مولانا ایک طویل بیماری سے شفایاب ہوئے تھے نقاہت ابھی باقی تھی اور ہم لوگ مزاج پرسی ہی کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ مولانا نے حسب معمول خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کیا، بڑی شفقت کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا اور گفتگو شروع ہوئی تو بات جدید مسائل اور فقہی جمود تک پہنچ گئی پھر تقریباً دو گھنٹے تک مولانا اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے جس سے ایک طرف ان کے عمیق مطالعہ اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا تھا دوسرے اس پر حیرت تھی کہ اس بیماری پر بھی مولانا کا دماغ کس طرح کام کرتا رہا۔

مولانا فقہی جمود پر سخت برہم تھے ان کا خیال تھا کہ اس سے اسلام کو نقصان پہنچا اور پہنچ رہا ہے، بعض ایسے مسائل جن کو "جدید مسائل" میں شمار کیا جاتا ہے اور ان کے بارہ میں ہمارے علماء کا کوئی واضح اور متفقہ فتوی نہیں آرہا ہے اس کی وجہ بھی مولانا کی نظر میں یہی جمود تھا۔ مولانا نے اس گفتگو میں دو باتوں کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی، ایک یہ کہ ہمارے علماء فتوی دیتے وقت اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے کے بجائے فقہائے متاخرین کے یہاں کوئی جزئیہ تلاش کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا مولانا! آپ کی اس رائے سے کچھ لوگ اصولاً اختلاف رکھتے ہیں۔ مولانا میرا مطلب سمجھ گئے اور فرمایا، "ارے بھئی! میرا مطلب یہ نہیں کہ لوگ اپنے مسلک کی اتباع چھوڑ دیں اور بالکل آزاد ہو جائیں۔ مذاہب اربعہ میں اخذ و استنباط کے اصول مقرر ہیں ان اصولوں کے دائرہ میں رہتے ہوئے اصل ماخذ و منبع کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ دوسری بات جس کی طرف مولانا نے توجہ دلائی کہ جدید مسائل پر غور کرتے وقت ہمارے علماء فقہائے متاخرین کی متعین کردہ اصطلاحات اور ان کی تعریفوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں، حالانکہ یہ تعریفیں منزل من اللہ تو ہیں نہیں۔ مولانا نے مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ لوگ سجدہ کی تعریف کرتے ہیں "وضع الجبهة على الارض" اور جب جہاز پر نماز کی بات آتی ہے تو طرح طرح کی تاویلیں کرنا پڑتی ہیں۔

مولانا مرحوم کی یہ باتیں اس وقت بہت شدت سے یاد آئیں جب ایک بار پرانے مذہبی رسائل کی ورق گردانی کے دوران "منی آرڈر" کی بحث پر نظر پڑی۔ علماء کے ایک طبقہ نے جسمیں بڑے معزز اور وسیع النظر حضرات شامل تھے، اسے ناجائز کہا تھا اور "ربا" کی ایک شکل قرار دیا تھا اور دوسرا طبقہ اس کے جواز کے حق میں تھا، اور فریقین کے درمیان یہ بحث اصطلاحات اور ان کی تعریفوں ہی میں غلطاں و پیچاں تھی۔ دلچسپ بات یہ کہ ہنڈیوں کے ذریعہ روپے بھیجنا سب کے نزدیک جائز تھا اور اب تو شاید کسی کے ذہن میں یہ خیال بھی نہ آتا ہو کہ "منی آرڈر" کے جواز اور عدم جواز پر بحث بھی ہو سکتی ہے۔

مولانا کی ایک اور صفت جو ہم لوگوں کے لئے بہت بڑی نعمت تھی وہ تھی خوردوں کی ہمت افزائی، اور یہ صفت ان کو ان کے اساتذہ سے ورثہ میں ملی تھی، وہ ہم لوگوں کی برابر ہمت افزائی کرتے رہتے، ہمیشہ آگے بڑھانے کے لئے کوشاں رہتے اور اس کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے، وہ دارالعلوم میں تعلیم اور طلبہ کی تربیت سے متعلق بعض اہم ذمہ داریاں بھی ہم لوگوں کے سپرد کرنے کے حق میں تھے۔ پھر تعلیم کی تکمیل اور جدید عربی ادب و تنقید کے مطالعہ کے لئے میرے اور برادرم نذر الحفیظ کے قاہرہ جانے کا موقعہ آیا تو مولانا نے ہمت افزائی

فرمائی بلکہ خود رائے بریلی جاکر حضرت مولانا علی میاں مدظلہ سے گفتگو کی اور طے کر دیا، وہیں سے ہم دونوں کے نام خط میں اس کی اطلاع بھی دے دی، پھر جب سارے مراحل طے ہو گئے تو اساتذۂ دارالعلوم کی طرف سے کی گئی الوداعی دعوت میں تقریر کی، نصیحتوں سے نوازا، اپنی امیدوں اور آرزوؤں کا تذکرہ کیا اور دعائیں دیں۔ قلق اس کا ہے کہ واپسی پر ان سے ملاقات نہیں ہو سکی اور میرے یہاں پہنچنے سے چند روز قبل وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ تغمدہ اللّٰہ بنعماتہ واسکنہ فسیح جناتہ۔

مولانا سیّد محمد الحسنی

مولانا سید محمد الحسنی مرحوم (جنھیں ان سے قریب رہنے والے محمد میاں کہا کرتے تھے) کے ساتھ ہمارے تعلقات کچھ ایسے تھے کہ اس کی نوعیت متعین کرنا آسان نہیں۔ وہ باقاعدہ استاذ نہیں تھے مگر ان کے لئے اساتذہ کا سا احترام ہمارے دل میں جاگزیں تھا، بیعت وارادت کا تعلق نہیں تھا مگر ان کے پاس بیٹھنے سے ایک طرح کی لطیف خنکی اور طمانیت قلب کا احساس ہوتا تھا، ان سے قرابت نہیں تھی مگر کسی قریب ترین عزیز کی طرح الفت و یگانگت تھی، ان کی عظمت اور اپنی خوردی وکم مایگی کے سبب دوستی ہو نہیں سکتی تھی مگر دوستوں کی سی بے تکلفی تھی، اتنی ساری اور کسی حد تک متضاد نوعیتیں جمع تھیں، ہمارے ان کے تعلقات میں۔ اور۔ ان کی ذات بھی بہت متضاد اوصاف وخصائص کی جامع تھی، متانت اور وقار کا مجسمہ مگر چہرہ پر اور باتوں میں بھولاپن، طبیعت کے نرم مگر اصولوں کے پکے، لوگوں سے بے نیاز مگر ہر ایک کے ہی خواہ، ہمدرد اور رنج وراحت کے شریک، دنیا سے بے تعلق، مگر پوری دنیا کے مسلمانوں کے غم میں گھلنے والے، کسی تنظیم اور جماعت سے تعلق نہیں مگر متعدد تنظیموں اور تحریکوں کے خصوصی مشیر اور ان میں زندگی کی روح پھونکنے والے، عقائد اور تہذیب میں قدامت کا نمائندہ، مگر افکار و آراء میں جدید، خاموش طبع اور سنجیدہ مگر انتہائی ظریف اور خوش طبع، عام اخلاق اور گفتگو میں مخمل کی طرح نرم مگر جذبات کے آتش فشاں، سیاست سے دور مگر ہر سیاسی مسئلہ اور سیاسی گروہ کے بارہ میں ایک متعین رائے، سادگی پسند مگر جمال فطرت کے قدر شناس، شاعری کبھی نہیں کی (کم از کم ہمارے علم کی حد تک) مگر ذوق شاعرانہ کہ شعراء اپنے اشعار پر ان کی رائے لیتے اور سند سمجھتے۔

اسی طرح ان کے ملنے جلنے والے بھی مختلف ذوق وطبیعت اور مختلف طبقات کے تھے اور وہ ہر ایک

کو اس کا پورا حق دیتے کہ سمجھنے لگتا کہ وہ اسی کے ہیں اور اسی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جو اُن سے پہلی دفعہ ملتا وہ ان کی متانت سنجیدگی اور وقار کی وجہ سے بات کرتے گھبراتا، لیکن جو قریب ہو جاتا وہ انھیں چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور ان سے جتنا قریب ہوتا گرویدگی اتنی ہی بڑھتی جاتی۔

نفاست اور سلیقہ، سادگی و پرکاری ان کی طبیعت کے نمایاں اوصاف تھے۔ لباس سے لے کر رہن سہن، گفتگو، تحریر و انشاء پردازی تک ان کے ہر کام میں ان اوصاف کی جھلک نمایاں تھی، ایک ایسے شخص کے لئے حسن فطرت سے دلچسپی اور اس کی قدرشناسی غالباً لازمی ہے اور محمد میاں میں یہ جوہر موجود تھا، وہ مناظر فطرت سے لطف اندوز ہوتے اور کسی حد تک اس کا شوق بھی رکھتے تھے، خوبصورت و خوشگوار موسم سے متاثر ہوتے، دلکش مناظر کو دیر تک دیکھتے رہتے، بارش کے دوران آسمان سے صاف شفاف موتیوں کی طرح گرتے ہوئے پانی کے قطروں کو دیر دیر تک دیکھتے اور لطف اندوز ہوتے، میں نے بارہا دیکھا ہے، ایک دفعہ غالباً دس یا گیارہ بجے ندوہ سے امین آباد جانا تھا وہ باہر نکلے کہ تھوڑی دور جا کر رکشا لیں گے، برسات کا موسم تھا آسمان پر بادل گھرا تھا اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو کسی بھی باذوق کو سرمست کر دینے کے لئے کافی تھی۔ محمد میاں تھوڑی دور چلے پھر لوٹ آئے، کہنے لگے آج کے موسم کی قدر نہ کرنا کفر ہے، آج تو کشتی سے جانا چاہیئے، پھر انہوں نے کشتی لی اسی سے گومتی پار کی، شہید منار کے پاس اترے اور رنگ برنگے پھولوں اور پودوں کے درمیان گذرتے اور ریزیڈنسی (بیلی گارد) ہوتے ہوئے اپنے گھر گئے۔ ندوہ کا تاریخی اجلاس ہوا تو ہر شخص انتظامات میں لگا ہوا تھا، لوگوں کے ذمہ کئی کئی کام تھے، محمد میاں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے لیکن "روداد چمن" کے مؤلف نے سب سے زیادہ دلچسپی چمن بندی میں لی، ہرے بھرے لان، پھولوں کی کیاریاں اور تختے انہیں سب سے زیادہ اپنی طرف کھینچتے رہے۔

حسن کی یہ جستجو صرف گل بوٹوں تک ہی محدود نہیں تھی، ادب و انشاء میں بھی یہی کیفیت تھی اور یہ ایک فطری بات ہے جو دل کش مناظر سے متاثر ہوگا وہ اچھی اور دل کش تعبیر سے ضرور لطف لے گا، جو باد صبا کی لطیف لہروں کا قدرشناس ہوگا وہ اچھے اور خوبصورت اشعار پر جھوم اٹھے گا، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ادبی حسن کا صحیح ادراک وہی کر سکتا ہے جس کو خزانۂ قدرت سے ذوق جمال عطا ہوا ہو، سخن فہمی اور چیز ہے اور سخن شناسی کچھ اور ہی چیز ہے۔ اشعار کا مطلب بہت سے لوگ سمجھتے ہیں، کسی ادبی شہ پارہ کا خلاصہ کوئی بھی کر سکتا ہے، لیکن ان سے

لطف اندوز ہونے کے لئے ذوق جمال شرط ہے اس کے بغیر اگر ادبی شہ پارہ کی تحلیل کی گئی ہو تو بڑے سے بڑا شاعر بھی چیخ پڑے گا " شعر مرا بمدرسہ کہ برد "۔ محمد میاں کو اعلیٰ اور پاکیزہ ذوق جمال فطرت سے ودیعت ہوا تھا، وہ اچھے جملہ یا دلکش تعبیر پر بے اختیار داد دیتے، اچھے شعر پر جھوم اٹھتے اور مزہ لے لے کر پڑھتے، خود ان کی اپنی تحریر میں جو رعنائی و برنائی ہے وہ اسی اعلیٰ ذوق کی دین ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ انتہائی خشک موضوعات پر قلم اٹھاتے تو اس میں بھی تازگی اور چاشنی پیدا کر دیتے، اسی طرح کوئی ہلکی پھلکی چیز لکھتے تو اس میں وقار و وزن کا پرتو جھلکنے لگتا، مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے " روداد چمن " پر تبصرہ کرتے ہوئے شاید ان کے اسی کمال کی طرف اشارہ کیا تھا کہ انہوں نے پروپگنڈا کو لٹریچر بنا دیا۔

یہاں ان کے اوصاف و کمالات گنانا نہ مقصود ہے نہ ممکن۔ ان پر دوسروں نے مجھ سے بہت اچھا لکھا ہے اور لکھیں گے ؎

نہ حسنت غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی، و دریا ہمچناں باقی

یہاں مقصود اپنے اور ان کے تعلقات پر روشنی ڈالنا ہے اور اس سے خود اپنے اندر انبساط اور اعتماد کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس کوئی نیا نہیں بہت پرانا ہے۔ ہم لوگ ہمیشہ اپنے آپ کو ان سے قریب کر کے خوش ہوتے تھے گویا محمد میاں سے قربت اور ان سے کسی حد تک بے تکلفی ایک کوالیفکیشن تھی، کیا کیا جائے وہ تھے ہی اسی طرح کے کہ آدمی ان سے مل کر خوش ہوتا اور ان سے تعلق قائم ہونے پر فخر کرتا ؎

من اگر والہ و مدہوش شوم، معذورم
کہ در آئینہ عجب حسن و جمالے دیدم

عمر، علم اور ہر اعتبار سے ہم لوگ ان سے چھوٹے تھے، عمر کے اس فرق، پھر ان کے رکھ رکھاؤ، وقار اور ان سب سے زیادہ ان کی موثر اور طاقتور تحریروں کی وجہ سے ایک طرح کی عظمت اور احترام دل میں بسا ہوا تھا لیکن ان کے حسن اخلاق، محبت آمیز برتاؤ اور لبوں پر کھیلنے والی دلنواز مسکراہٹ نے ایک طرح کی قربت اور بے تکلفی بھی پیدا کر دی تھی، مرحوم کے عالی مرتبت خاندان کے ایک بہت بڑے بزرگ کے بارہ میں عربی کے مشہور شاعر فرزدق کا شعر ہے ؎

یغضی حیاءً و یغضی من مهابته
فلا یکلم الا حین یبتسم

(وہ شرم وحیا سے اپنی نگاہیں نیچی رکھتے ہیں اور لوگ احتراماً سرافگندہ رہتے ہیں
گفتگو کا یارا اسی وقت ہوتا ہے جب ان کے لبوں پر تبسم رقص کرتا ہے)۔

محمد میاں کے ساتھ ہمارا تعلق بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ میں سنہ ۱۹۶۰ء میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ندوہ میں داخل ہوا اسی وقت مرحوم سے جان پہچان ہوئی اور ان کی اردو اور عربی تحریروں سے فائدہ اٹھانے لگا، تعمیر حیات کے اجراء کا موقع آیا تو اس نئے رسالہ کے لئے ان کے اخلاص اور ہم اور ہمارے دوسرے ساتھیوں کے جوش وخروش نے قربت پیدا کردی۔ پھر سنہ ۶۶ء میں دوبارہ ندوہ آیا اور ساتھ ہی ندائے ملت میں کام شروع کیا تو تعلقات بڑھتے ہی گئے، مختلف مسائل میں صلاح ومشورہ کے لئے اکثر اور کبھی کبھی ہفتہ میں ایک سے زائد بار جمع ہوتے اور ان سے مشورہ کرتے" نوآموز صحافیوں " اور ندائے ملت کے لئے ان کے خلوص، ان کی ہمت افزائی اور بہت سے مسائل میں نقطہ نظر کے اتفاق نے قربت اور بڑھادی، پھر جب میں قاہرہ چلا گیا تو اس مکانی بعد نے دلی اور ذہنی قربت میں مزید اضافہ کردیا، وہ بے تکلفی کی چاشنی لئے ہوئے محبت آمیز خطوط سے برابر نوازتے رہے، ہر خط بہت تفصیلی ہوتا، ایسا لگتا کہ اپنے سارے احساسات ومشاعر کاغذ پر منتقل کردینا چاہتے ہیں لیکن کاغذ کی تنگ دامانی مانع ہے۔ گذشتہ مئی کے اواخر میں ایک خط موصول ہوا اس میں اس تنگ دامانی کی شکایت کی تھی اور لکھا تھا کہ آئندہ ایروگرام کے بجائے لفافہ لکھا کریں گے، لیکن افسوس میرے نام ان کا یہ آخری خط ثابت ہوا، وہ اپنے ہر خط میں مصر اور عالم عربی کے حالات دریافت کرتے، میں حسب توفیق ان کے مطالبات پورے کرتا اور ان کی جھلک البعث کے اداریوں، ان کے مستقل کالم " صور واوضاع "، اور الرائد میں ان کے مضامین میں نظر آتی، ان کا یہ اعتماد میرے لئے ہمیشہ باعث اعتزاز رہا، مولانا محمد ثانی حسنی سے یہ معلوم ہونے پر مرحوم کے خلوص ومحبت کی یاد تازہ ہوگئی اور آنکھیں بھیگ گئیں کہ انہوں نے اہم خطوط محفوظ رکھنے کے لئے جو فائل خود بنائی تھی اسمیں میرے بھی متعدد خطوط موجود ہیں ؎



حاصل رہا ہے مجھ کو ملاقات کا شرف
مٹی کا اک چراغ تھا سورج سے فیضیاب

ان کے آخری خط میں بھی تفصیلی حالات کا مطالبہ تھا اور میں نے اس کا جواب بھی بہت تفصیل سے لکھا تھا لیکن اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ ایسی جگہ جا چکے تھے جہاں خطوط نہیں پہنچ سکتے، صرف اعمال جاتے ہیں یا دعائیں، اور جس طرح زندگی میں ان سے ضرورت اور بلاضرورت ملا کرتے تھے اور مل کر خوش ہوتے تھے اب ان کی وفات کے بعد زبان پر بے اختیار ان کے لئے دعائیں آجاتی ہیں ؎

اللہ ان پہ بارش رحمت ہو دم بہ دم
ان کے لیے کھلیں ترے رحم و کرم کے باب

مولانا اسحاق جلیس ندوی

مولانا اسحق جلیس ہمارے بزرگ بھی تھے دوست بھی۔ بزرگ لفظی معنوں میں زیادہ اصطلاحی معنوں میں کم۔ ان کا اتنا ساتھ رہا، اتنی قربت اور بے تکلفی تھی کہ ان کے نام کے ساتھ "مولانا" لکھنے پر تکلف سا محسوس ہوتا ہے۔ زبان پر "اسحاق صاحب" ہی چڑھا ہوا ہے۔ اور جب تک "زبان سنبھال کر" نہ بولیں "مولانا" آتا ہی نہیں۔ اس نام کے ساتھ ایک ہر وقت مشغول، ہر لحظہ متحرک، ہر دم رواں، پیہم دواں اور سیماب صفت شخصیت کی تصویر ذہن کے پردے پر اُبھرتی ہے۔ وہ شروع ہی سے بڑے متحرک اور فعال تھے۔ دھن کے پکے اور کام کے سچے۔ بیکار بیٹھنا جیسے جانتے ہی نہ تھے۔ سستی و کاہلی ان کے قریب نہ پھٹکتی۔ ان کی یہ صفت انہی تک محدود نہ تھی بلکہ متعدی تھی، وہ اپنے قریب رہنے والوں میں بھی حرکت پیدا کر دیتے اور کاہلوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیتے، حرکت، مشغولیت اور تیزی ان کی سب سے واضح خصوصیت اور ان کی کتاب زندگی کا سب سے نمایاں عنوان تھی۔ ہر کام میں تیز رفتاری ان کی عادت، کام میں تیزی، گفتگو میں تیزی، تقریر میں تیزی، اور اسی تیزی کے ساتھ زندگی گذار کر اپنے رب سے جا ملے۔

ہماری ان کی پہلی ملاقات سنہ ۶ء میں ہوئی۔ میں نیا نیا ندوہ آیا تھا اور اس وقت کے درجہ ششم (عالمیت سال دوم) میں داخلہ ہوا تھا۔ وہ درجہ نہم (فضیلت کے آخری سال) میں تھے۔ حسن اتفاق کہ ہم لوگوں کو رہنے کے لئے ایک ہی کمرہ ملا۔ رواق رحمانی کا مشرقی حصہ اسی سال مکمل ہوا تھا اور اس کے آخری کمرہ ۱۵ میں ہم لوگوں کو جگہ ملی تھی۔ اسحاق صاحب چھٹیوں کے بعد کچھ تاخیر سے آئے۔ اس وقت تک کمرہ

بھر چکا تھا اور دو رویہ چار پائیوں کے بیچ میں ان کی چار پائی تھی۔ اس طرح ان کو یک گونہ مرکزیت ،، حاصل ہوگئی تھی۔ گورے چٹے، قد آور، صحت مند، چہرے پر بھر پور داڑھی، پرسنالٹی ایسی کہ دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے آتے ہی ہم لوگوں کی پرسکون زندگی میں جیسے طوفان آگیا۔ طلبہ میں انکی شخصیت بڑی مقبول تھی اور لوگ کثرت سے ان کے پاس آتے، مختلف مسائل پر بحث ہوتی، کچھ لوگ مشورے طلب کرتے، کچھ لطیفے اور چٹکلے ہوتے۔ مسکراہٹوں کی لہر اٹھتی اور کبھی کبھی قہقہوں کے فوارے بھی۔

اس ہماہمی میں بڑی زندگی تھی، بہت لطف آتا اور ہم سب اس میں دلچسپی لیتے لیکن یہ کبھی کبھی گراں بھی گزرتی، خاص طور سے مطالعہ کے اوقات میں لیکن کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ میں ایک تو ندوہ میں نیا تھا پھر جونیئر وہ مجھ سے بہت سینئر تھے اور جونیئر سینئر کا رشتہ ہماری ان روایات میں سے ہے جو اب بھولتی جارہی ہیں۔ اس وقت یہ روایت زندہ تھی اور سینئر طالب علم ایک طرح کا مربی اور سرپرست ہوتا اور جونیئر اس کا خورد اور عزیز۔ کسی بڑے طالب علم کا کوئی کام کردینا یا اس کے احکام بجالانا معمول میں داخل تھا۔ اس وقت یہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہم کسی کی خدمت کررہے ہیں بلکہ ایک معمول کی بات تھی۔ اسی طرح سینئر طالب علم جونیئر طلبہ کی دیکھ ریکھ کرتے، رنج وغم میں ان کی دلجوئی کرتے۔ بیمار ہوں تو رات رات بھر تیمار داری کرتے۔ اخبارات اور کتابوں کے مطالعہ میں رہنمائی کرتے۔ جونیئر طالب علم سے کوئی بھول چوک ہوجاتی اور معاملہ خدانخواستہ نگراں یا ذمہ داران دارالعلوم تک پہنچ جاتا تو سینئر خود سامنے آجاتے اور ممکن حد تک مدافعت کرتے، تھوڑی دور کے لئے کہیں جانا ہو یا ہوٹل میں چائے وغیرہ پی جائے تو جونیئر کا پیسہ نکالنا گستاخی تھی۔ اسحاق صاحب وسیع القلب اور کشادہ دست بھی تھے اور ہم لوگ ان کی سینئرٹی سے خوب فائدہ اٹھاتے۔ زمانہ طالب علمی میں بھی اور اسکے بعد بھی۔

میں شروع شروع میں نئے اور جونیئر ہونے کی وجہ سے نیز اسحاق صاحب کی وجاہت اور طلبہ میں انکی مقبولیت کی وجہ سے ان کے سامنے دبتا تھا، لیکن ایک ہی کمرہ میں رہنے اور ذوق مطالعہ میں اشتراک کی وجہ سے بہت قریب اور بے تکلف ہوگیا۔ مطالعہ کے میدان میں انہوں نے میری رہنمائی کی "حیات شبلی،، میں نے انہی کے مشورے سے ندوی زندگی کے پہلے ہی سال پڑھ لی، ورنہ شاید بہت دیر میں نوبت آتی۔ وہ اس زمانے میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے معاون سکریٹری تھے اور مجلس میں آنے والے بعض علمی رسائل اور نئی کتابیں کبھی کبھی اپنے مطالعہ کے لئے ساتھ لاتے اور ہم لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے، تعلیم مکمل کرنے

کے بعد وہ پورے طور پر مجلس میں لگ گئے۔ جب بھی ہمارے ان کے تعلقات بدستور رہے اور اس کی برکت سے ایسے رسائل وکتابیں پڑھنے کو ملتی رہتیں جن تک عام طلبہ کی رسائی نہیں تھی۔ عربی کی بہت سی کتابیں مصر، بیروت وغیرہ سے حضرت مولانا کے نام آتیں۔ مولانا ان پر ایک نظر ڈال کر مجلس میں محفوظ کرا دیتے اور اسحاق صاحب کے ذریعے ہم بھی ان کتابوں تک پہنچ جاتے۔

۱۹۶۲ء میں ندوہ سے فراغت کے بعد میں تکمیل کے لئے ایک سال اور رک گیا، اس وقت اسحاق صاحب مجلس کی ترقی و توسیع کے لئے دن رات سرگرم تھے اس وقت پھر ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ دارالعلوم کی دوسری منزل پر اسحاق صاحب، ہم اور (حکیم) تسنیم الحسن ندوی ایک ہی کمرے میں رہتے تھے، اور تقریباً ایک سال تک ہم نوالہ وہم پیالہ رہے، نہ جانے کتنی سنجیدہ و غیر سنجیدہ حرکتوں میں شریک، کتنے رازوں کے امین، کتنے پروگراموں میں حصہ دار۔ اسی زمانہ میں محمد میاں اور اسحاق صاحب نے اسلامی ڈائجسٹ نکالنے کا منصوبہ بنایا، اس وقت پاکستان کا اردو ڈائجسٹ بہت مقبول تھا لیکن ہندوستان میں کوئی ڈائجسٹ نہیں نکلا تھا، اسحاق صاحب نے مجلس ادارت میں مجھے بھی شریک کیا۔ میں نے اس کے پہلے شمارے کے لئے ایک عربی افسانہ کا ترجمہ کیا تھا۔ محمد میاں نے اس پر بہت داد دی تھی۔ پہلے شمارے کی کتابت بھی ہو چکی تھی۔ اشتہارات حاصل کرنے میں بھی میں ان کے ساتھ رہا۔ لیکن افسوس یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور وہ بعض گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے ندوہ سے چلے گئے، اس رخصتی سفر میں بھی میں اور حکیم تسنیم الحسن ندوی بھوپال تک ان کے ساتھ رہے اس سفر میں ان کی دو عادتوں کا مشاہدہ ہوا۔ ایک تو یہ کہ اغل بغل جو بھی ملا اس سے تعارف و گفتگو، اس سلسلے میں کئی زبانوں پر قدرت سے ان کو مدد ملتی۔ دوسرے ہر بڑے اسٹیشن پر کچھ نہ کچھ کھانے کو ملتا۔ اس معاملہ میں وہ مارواڑی ذوق کے واقع ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ سفر میں رشید احمد صدیقی کا وہ مضمون یاد آیا جس میں انہوں نے مارواڑی عورتوں کے آداب و عادات سفر کا تذکرہ کیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ پکوڑے چٹ کرنے کے بعد وہ سب پتے اور دونے نصیحت یا فضیحت کے لئے کمپارٹمنٹ ہی پر چھوڑ دیتیں اور یہ صفائی ستھرائی کا خیال رکھتے۔

کچھ دنوں بعد وہ کتب خانہ کی جدید ترتیب کے لئے بلائے گئے۔ تعمیر حیات کی ادارتی ذمہ داریاں بھی انہی کو سونپ دی گئیں۔ ان دنوں میں ندوہ میں مدرس تھا۔ ساتھ ہی ندائے ملت کے ادارۂ تحریر سے بھی وابستہ۔

اور یہ دونوں پرچے ایک ہی "مہر تاباں" کے گرد گھومنے والے تھے، اس لئے دونوں کا باہمی تعلق ضروری تھا اور اکثر باہم مشورے ہوتے اور بعض مضامین بھی دونوں میں مشترک ہوتے اسی زمانہ میں لکھنؤ میں ربیع الاول میں میلاد کے موقع پر روشنی کرنے، قمقمے لگانے اور مکانات ہی نہیں بلکہ محلے اور سڑکیں تک سجانے کا رواج زور پکڑ گیا اور غریب مسلمان اپنی دولت اس قطعی غیر مفید کام میں برباد کرنے لگے۔ یہ رواج معاشی اعتبار سے تباہ کن اور شرعی اعتبار سے غلط تھا، چنانچہ حضرت مولانا کی توجہ سے اس میں اصلاح کے لئے لکھنؤ شہر میں ایک تحریک چلائی گئی، شہر کے ممتاز مسلمانوں سے اور محلوں کی میلاد کمیٹیوں کے ذمہ داروں سے ملاقاتیں کی گئیں۔ ان کو سمجھایا گیا اور اس کے مضر اثرات کی طرف توجہ دلائی گئی، اسحاق صاحب اس میں پیش پیش تھے اور انہوں نے مجھے بھی ساتھ رکھا۔

اسحاق صاحب میں جرأت، قوت کار اور سلامتی طبع کے ساتھ ظرافت بھی بہت تھی، وہ بات بات پر نکتہ پیدا کرتے، ساتھیوں پر جملے کستے۔ ان کے اس طرح کے جملوں کا نشانہ کبھی کبھی میں بھی ہوتا، لیکن جب تقریب ہوا۔ اور بے تکلفی بڑھی تو اس "کار خیر" میں میں بھی ان کا شریک ہوگیا، کبھی کبھی مل کر جملے کرتے۔ ان حملوں کا نشانہ اکثر وہ طلبہ ہوتے جن میں اپنی عظمت واہمیت کا احساس یا خود نمائی کی عادت ہوتی۔ ہم لوگوں کے بے تکلف گروپ میں مظفر الحق ندوی سب سے مالدار گھر کے تھے۔ ان کو گھیر کر ہوٹل لے جاتے اور دولت کا ٹیکس وصول کرتے۔ مزہ اس وقت آتا جب کوئی "ناجنس" مل جاتا۔ ہم لوگ اپنے "شکار" کو گھیر کر بیٹھ جاتے، چہروں پر نیکی اور سعادتمندی کے آثار اور گفتگو میں ادب واحترام کا پاس ولحاظ، اور ہلکے سوالات شروع ہوجاتے۔ اسی کے دوران ہلکے ہلکے لطیف جملے بھی آتے جاتے اس طرح کہ کبھی "شکار" کو محسوس بھی نہ ہوتا کہ اس پر حملہ ہورہا ہے۔ اور اگر احساس ہوتا بھی تو درد کی ٹیس تو محسوس کرتا لیکن کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ ان مہمات میں اسحاق صاحب ہم لوگوں کے "سرخیل" ہوتے۔ لیکن وہی اسحاق صاحب جب کام پر آتے تو بھوت کی طرح کام کرتے۔ انہوں نے کام کے سامنے کبھی نہ آرام کا خیال کیا نہ صحت کا۔ ان کی ذہانت، قوت کار، صبر وضبط اور دوسری صلاحیتیں جب مفید کاموں کی طرف متوجہ ہوئیں اور حضرت مولانا جیسا مرشد مل گیا تو انہوں نے بہت جلد ترقی کرلی اور تھوڑی سی عمر میں بہت کام کر ڈالا۔ اخیر زمانہ میں ان کی ساری صلاحیتیں انتہائی مفید اور تعمیری کاموں میں صرف ہورہی تھیں۔ ان کو حضرت مولانا اور ندوہ سے تعلق پر فخر تھا اور مولانا کو بھی ان پر ناز۔ انہوں نے مولانا ہی کی تربیت وبرکت سے اپنی طبیعت کی تیزی پر بھی حیرت انگیز طریقے سے قابو پالیا تھا جو انہیں آباء واجداد سے وراثت

میں ملی تھی۔

وہ کتب خانہ ندوۃ العلماء، تعمیر حیات اور تحریک پیام انسانیت، تینوں کی ذمہ داریاں بیک وقت سنبھالے ہوئے تھے اور اخیر تک پوری سرگرمی اور تندہی سے کام کرتے رہے۔ ان کے انتقال سے یہ ساری سرگرمیاں دھیمی پڑ گئیں، مجلسیں ویراں ہوگئیں اور دور تک کوئی ان جیسا آدمی نظر نہیں پڑتا۔

ایسی سنسان کبھی پہلے نہ تھی ہجر کی رات
دور تک قافلۂ صبح کے آثار نہیں

کچھ اس اشاعت کے بارہ میں

مذکورہ بالا تینوں شخصیتوں کی وفات قومی و ملی سانحہ ہے، ندوۃ العلماء کے لئے ناقابل تلافی نقصان اور خود میرے لئے ذاتی طور پر انتہائی المناک ان تینوں مرحومین کے ساتھ میرے بڑے اچھے اور قریبی تعلقات تھے، میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور پایا تھا۔ ان کے حقوق میرے اوپر تھے۔ میں ان تینوں حضرات پر کچھ لکھنا بھی چاہتا تھا، بعض اساتذہ نے جن کا اشارہ بھی میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے اس کی طرف توجہ بھی دلائی تھی، اور اتفاق سے ایسے وقت قاہرہ سے پانچ سالوں کے بعد لوٹ رہا تھا جب ان حادثات کا غم تازہ تھا اور زخم ہرے تھے اور تعمیر حیات کا خاص نمبر زیر غور تھا، میری خواہش تھی کہ اس موقعہ پر ہندوستان آرہا ہوں تو نمبر کی تیاری اور ترتیب میں میں شریک ہوں کہ اس طرح تینوں مرحومین کا حق کسی حد تک ادا ہو سکے، میں ندوہ پہنچا تو مخدوم معظم حضرت مولانا علی میاں نے اس نمبر کی ذمہ داریاں میرے سپرد کردیں۔ حضرت مولانا کی شفقت و محبت اور ان کا یہ اعتماد میرے لئے بہت قیمتی سرمایہ ہے۔ ان سطور کے لکھتے وقت مجھے اپنا وہ خواب یاد آرہا ہے جس کا ذکر میں شروع میں کر چکا ہوں اس کی تعبیر اس طرح سامنے آئی کہ "مجلس ماتم" سجانے کی ذمہ داریاں میرے ہی سپرد ہوئیں۔

اس نمبر کی تیاری کی تاریخ بھی دردناک ہے اور مذکورہ بالا حادثات کے ساتھ وابستہ۔ اسحاق صاحب نے محمد میاں کے انتقال پر "محمد الحسنی نمبر" نکالنے کا اعلان کیا تھا اور اگست ۷۹ء کی تاریخ

بھی متعین کر دی تھی۔ اگر ان کو موقعہ مل جاتا تو بہتر سے بہتر شکل میں یہ نمبر مرتب کرتے اور اپنے خونِ جگر کی آمیزش سے اس کو لالہ زار بنا دیتے، لیکن نمبر کے لئے پورے مضامین بھی مہیا نہیں کر سکے تھے کہ خود اپنے مرحوم دوست سے جا ملے اور وصیت کے مطابق انہیں کے پہلو میں محو خواب ہوئے۔ پھر یہ سوچا گیا کہ اسحاق صاحب کو بھی اس نمبر میں شامل کر لیا جائے لیکن ان دونوں حادثوں پر جی بھر کے رو بھی نہ سکے تھے کہ تیسرا حادثہ مولانا عبدالسلام صاحب کا پیش آ گیا،

حق تو یہ تھا کہ ان تینوں بزرگوں پر تعمیرِ حیات الگ الگ مستقل نمبر شائع کرتا، لیکن اس میں بعض دشواریاں ہیں اور بہت وقت درکار ہے اور اس وقت حال یہ ہے کہ ؎

گذرتے وقت کے ہر چاپ سے میں ڈرتا ہوں
نہ جانے کون سا لمحہ اداس کر جائے

بالآخر فیصلہ یہ کیا گیا کہ تینوں شخصیتوں کے تذکرہ کو ایک خصوصی اشاعت میں جمع کر دیا جائے اور جتنی جلد ہو سکے اسے شائع کر دیا جائے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس کی تیاری کے لئے جتنا موقعہ چاہیئے تھا نہیں مل سکا۔ مختصر مدت میں پوری کوشش کے بعد جو کچھ ہم کر سکے ہیں وہ سامنے ہے۔ اس کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، اس طرح کہ اگر کوئی الگ کرنا چاہے تو الگ کر سکتا ہے، اور تینوں حصوں میں ایسے مضامین شامل ہیں جن سے مرحومین کے علم و فضل، کمالات، خصوصیات، خدمات اور ان کی سیرت و شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں، ابھی اور بہت سے پہلو باقی ہیں جن پر لکھنے کی گنجائش ہے اور جن کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، اور ہمیں امید ہے کہ ابھی بہت سے لوگ ان پہلوؤں پر لکھیں گے۔ اس خصوصی اشاعت کے سلسلہ میں جن حضرات نے ہمارا تعاون کیا، ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اپنی کوتاہیوں پر معذرت خواہ ہیں۔

نور عظیم ندوی
مہمان خانہ ندوۃ العلماء
لکھنؤ

۳۰ ر ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ
۲۱ ر نومبر ۱۹۷۹ء

تعمیر حیات

کی

خصوصی اشاعت

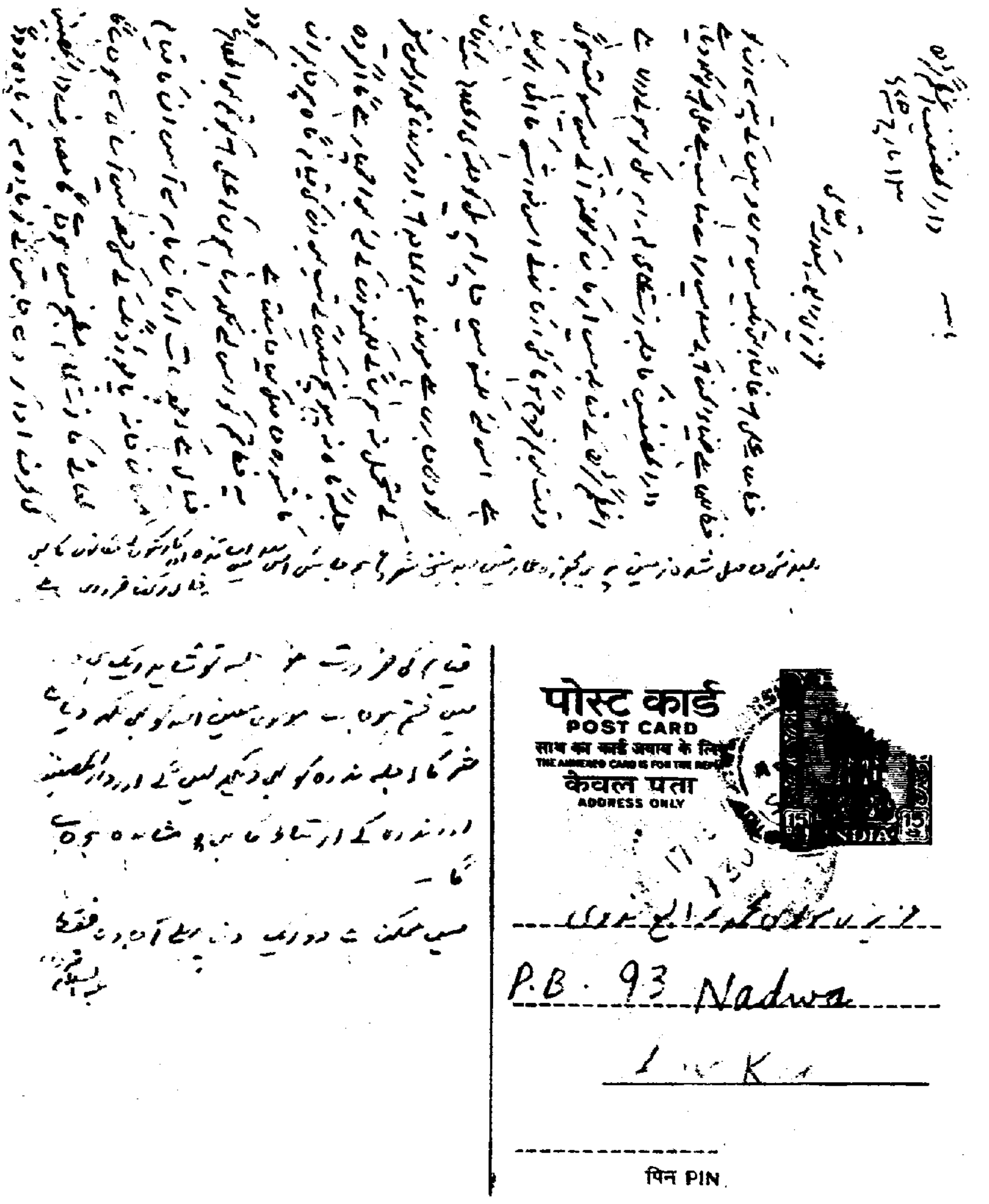
بیادگار

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی

چند اہم اہلِ قلم

مولانا ابو الحسن علی ندوی
سید صباح الدین عبد الرحمٰن
قاضی زین العابدین
ڈاکٹر مشیر الحق
مولانا ابو العرفان ندوی
مولانا محمد رابع حسنی ندوی
ڈاکٹر احتشام احمد ندوی
مولانا بدر الدین
محمود الازہار ندوی

نشانِ خط مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم



مولانا عبدالسّلام قدوائی ندویؒ

حیات و واقعات ایک نظر میں

(۷؍مارچ ۱۹۰۷ء ——— ۲۴؍اگست ۱۹۷۹ء)

جائے پیدائش و جائے وفات: تھولینڈی ضلع رائے بریلی

۱۹۲۴ — ۱۹۳۰ دورِ طالب علمی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۹۳۰ — ۱۹۳۲ دورِ طالب علمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

۱۹۳۲ — ۱۹۳۴ روزنامہ خلافت بمبئی کے عملہ ادارت میں شمولیت

۱۹۳۴ — ۱۹۴۲ استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جنوری ۱۹۴۰ / جولائی ۱۹۴۲ ماہوار "الندوہ" لکھنؤ کی ادارت

مئی ۱۹۴۳ / اگست ۱۹۵۱ بانی و مہتمم ادارہ و تعلیمات اسلام لکھنؤ

۱۵ستمبر ۱۹۴۸ / جون ۱۹۵۲ پندرہ روزہ رسالہ تعمیر (ادارہ تعلیماتِ اسلام) کی ادارت

۱۷اگست ۱۹۵۱ / ۳۱اپریل ۱۹۷۲ استاد اسلامیات و ناظم دینیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ

جنوری ۱۹۶۹ / تاوفات ممبر مجلس ادارت سہ ماہی اسلام اور عصر جدید، دہلی

۵اکتوبر ۱۹۷۲ / تاوفات معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء

مارچ ۱۹۷۵ / تاوفات ناظم علمی اور مدیر معارف، دارالمصنفین، اعظم گڑھ

حسب ذیل اداروں کی مجالس اعلیٰ کے وقتاً فوقتاً ممبر رہے

- مجلس عاملہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- مجلس عاملہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ
- مجلس تعلیمی (اکیڈیمک کونسل) ۔ مجلس منتظمہ (اکزیکیٹیو کونسل)
- انجمن (کورٹ) جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
- مجلس عام ۔ مجلسِ عاملہ، اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی، دہلی۔

(مرتبہ: ڈاکٹر شبیر الحق ندوی

مولانا عبد السّلام قدوائی ندوی مرحوم

چند حسرتیں ـــــ چند آنسو

از: مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی

قلب و قلم کو دنیا میں کیسے کیسے مشکل کام کرنے پڑتے ہیں کہ اگر اللہ ہی ہمت و قوت نہ دے اور ایمان اور رضا بالقضا کا سہارا نہ ہو تو دونوں جواب دے جائیں اور کسی کام کے نہ رہیں۔ ع

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

انہی تین مہینوں میں دو ایسے عزیز جدا ہوئے جن میں سے ایک لخت جگر تھا، دوسرا قوت بازو، اب یہ تیسرا حادثہ ایک ایسے ہمدم دیرینہ، ایک ایسے دوست و رفیق کی جدائی کا پیش آیا جس کا تقریباً نصف صدی کا ساتھ رہا، ساتھ پڑھا، ساتھ پڑھایا، دار العلوم کی تعلیم و تدریس اور ندوۃ العلماء کی تعمیر و ترقی میں چولی دامن کا ساتھ رہا۔ "الندوہ" (دور سوم) کی ادارت و ذمہ داری، پھر ادارۂ تعلیمات اسلام کے قیام و استحکام اور اس کے ذریعہ قرآن مجید کی خدمت اور عربی زبان کی تعلیم و اشاعت اور اس کے ترجمان اخبار "تعمیر" کی ادارت و ترتیب میں ہم دونوں ایک دوسرے کے رفیق کار و شریک حال رہے، پھر ندوۃ العلماء کے کاموں میں (بحیثیت معتمد تعلیمات) ان کے گراں قدر مشورے، دار المصنفین میں بحیثیت شریک ناظم ان کی قیمتی رہنمائی و اعانت اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی پوری پوری نیابت کس کس چیز کو یاد کیا جائے اور بیک وقت یہ سب مسندیں خالی، اور محفلیں سونی ہو جائیں، تو کس طرح دل کو تسلی دی جائے اور آنکھوں کے سیل رواں کو تھاما جائے۔ ع

یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

عقیدہ و مسلک سے لے کر تاریخ اسلام کے نظریات، قدیم نظام تعلیم و تربیت کے بارے میں خیالات، ندوہ کے مقاصد اور ان کی صداقت اور اس عہد میں ان کی ضرورت پر غیر متزلزل یقین، اسلام کی دین و دنیا کی جامعیت پر کامل شرح صدر، قدیم و جدید کے صالح و نافع اجزاء کے خوشگوار امتزاج کی ضرورت پر مستحکم عقیدہ، علماء،

کے منصب قیادت سے دست کش یا معزول ہو جانے اور دین و سیاست کی تفریق کو زوال امت کا اصل سبب قرار دینے پر پورا وثوق اور اس صورت حال کو تبدیل کرنے کی شدید خواہش، اصلاح نصاب، علوم اسلامیہ اور علوم عصریہ کے عمیق و تحقیقی مطالعہ کے ذریعہ علماء کو ان کا کھویا ہوا مقام دلانے کی کوشش یہ سب وہ افکار و خیالات ہیں جن سے مولانا عبدالسلام صاحب عمر بھر وابستہ اور ان کے پرجوش داعی رہے اور جو ان کے عقیدہ کا جزء بن گئے تھے اور جس نے کسی دور میں بھی ان کو ندوۃ العلماء کی تحریک اور اس کی دعوت سے بے تعلق نہیں ہونے دیا، ان مقاصد کے حصول کا سب سے مؤثر ذریعہ اور ان کے لیے کوشش کرنے کا سب سے مناسب میدان وہ ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم کو سمجھتے رہے، آج جب وہ دنیا میں نہیں ہیں تو ان سطور کے لکھنے والے کو اس کے اعلان و اعتراف میں ذرا تامل نہیں بلکہ خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اس نے ان خیالات و نظریات میں مولانا سے بہت کچھ سیکھا اور ان پر اس کے یقین کے مستحکم ہونے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

راقم السطور کہنے کو تعلیم کے آخر مرحلے میں ان کا رفیق درس رہا، لیکن دونوں کی عمروں میں کئی سال کا تفاوت تھا، میں جب دارالعلوم آیا تو اگرچہ عربی زبان و ادب کا (عرب اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے) مجھے خصوصی ذوق پیدا ہو گیا تھا، لیکن عام معلومات اور مطالعہ کی وسعت و تنوع میں مولانا مجھ سے بہت فائق تھے، وہ نابغۂ جواں سال و جواں مرگ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ندوی نگرامی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فیض صحبت و تربیت سے (جن سے وہ سب سے زیادہ متاثر تھے) اُردو کے ایک اچھے مقرر اور مضمون نگار بن چکے تھے، اور ان کا فکر و شعور بیدار ہو چکا تھا، ۱۹۲۶ء کے ندوۃ العلماء کے اجلاس کانپور میں جہاں میں ایک کمسن تماشائی کی حیثیت سے گیا تھا، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی صدارت اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں اور بہت سے مشاہیر ہند اور زعمائے ملت کی موجودگی میں مولانا کی اُردو میں تقریر ہوئی تھی، وہ مولانا شبلی مولانا سید سلیمان ندوی اور ندوۃ العلماء۔ اور دارالمصنفین کے پیدا کیے ہوئے لٹریچر پر پورے طور پر حاوی تھے۔ ندوۃ العلماء کی تحریک کی پوری تاریخ ان کے دماغ میں محفوظ تھی، ندوۃ العلماء کے بانیوں اور کارکنوں اور ان کے مراتب و درجات سے بھی وہ خوب واقف تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو سلامت طبع، ذہنی اعتدال، تواضع اور شرافت نفس کی دولت سے بھی بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا، اس لیے وہ سب کے مرتبہ شناس اور قدرداں تھے، غلو، مبالغہ اور عصبیت سے ان کو فطری طور پر مناسبت نہ تھی اور دل آزاری اور کسی کی توہین و تحقیر (خواہ وہ ادارہ ہو یا فرد) ان کے مسلک میں کبیرہ گناہ تھا، نصاب تعلیم کے تغیر پذیر اور علوم اسلامیہ کے ترقی پذیر ہونے

پر ان کا پختہ عقیدہ تھا، ان کے نزدیک ان میں زمانہ کا ساتھ دینے بلکہ اس کی قیادت کرنے اور اس کے جائز تقاضوں کے پورا کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، سیاسی خیالات میں وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ تھے، ان کا ذہنی نشوونما "الہلال" و "ہمدرد" کے مضامین، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کی تقریروں اور تحریک خلافت کے دور میں ہوا تھا، اور ان کے اثرات سے وہ آخر عمر تک آزاد نہیں ہوئے۔

۱۹۳۴ء سے ہم دونوں دارالعلوم کے حلقۂ تدریس سے وابستہ ہوگئے، ابتداء میں ان کا تقرر تاریخ واقتصادیات کے استاذ کی حیثیت سے ہوا لیکن جلد ان کو عربی اور دینیات کے اسباق پڑھانے کو مل گئے، مولانا کی طبیعت چونکہ بڑی بے ہمہ و باہمہ واقع ہوئی تھی، ان میں بڑی بے تکلفی و سادگی تھی، طلبہ پر شفقت ان کے ذاتی معاملات سے بھی دلچسپی وہمدردی اور ان کے ساتھ مساوات کا معاملہ ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، وہ ضوابط واحکام اور سرزنش وتعزیر سے زیادہ افہام وتفہیم اور نصیحت وتلقین کی افادیت پر یقین رکھتے تھے، اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملہ میں محبت وہمدردی اور اخلاق کے اثر کے قائل تھے، اس لیے طلبہ ان سے سب سے زیادہ مانوس اور ان سے قریب ہو گئے تھے، طلبہ کے ساتھ ان کا یہ طرز عمل بعض اوقات منتظمین کے لئے مشکلات کا باعث بن جاتا، اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی سادگی، صاف گوئی اور بے تکلفی بعض مرتبہ طلبہ کے لیے وجہ آزمائش بن جاتی، اس سلسلہ میں یہ لطیفہ قابل ذکر ہے کہ چوں کہ ان کے سامنے ندوۃ العلماء کے اعلیٰ مقاصد اور اس کے دارالعلوم کا وہ اونچا تخیل تھا جو اس کے بانیوں نے پیش کیا تھا، اس لئے وہ اکثر طلبہ سے بے تکلف کہہ دیا کرتے تھے کہ "بھئی ہم لوگ اس دارالعلوم میں تعلیم ورہنمائی کے منصب پر فائز ہونے کے لائق نہیں، علمی اور ذہنی حیثیت سے ہم سے کہیں بلند پایہ استاذ دارالعلوم کے شایان شان تھے، مگر کیا کیا جائے کہ قحط الرجال کی وجہ سے یہ خدمت ہم جیسوں کو انجام دینی پڑ رہی ہے۔" یہ بات انھوں نے بار بار کہی، میں نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ "مولانا اب زمانہ اس تواضع وکسر نفسی کا قدرداں نہیں، آپ تو یہ بات تواضعاً کہتے ہیں لیکن طلبہ اس کو نہ صرف حقیقت سمجھ لیں گے بلکہ وہ اساتذہ کو اسی نظر سے دیکھنے لگیں گے، اور اپنے کو مظلوم سمجھیں گے کہ ایسے کم مایہ اساتذہ ان کو پڑھانے پر مامور ہیں، اس سے بجائے فائدہ پہنچنے کے نقصان پہنچے گا اور اساتذہ کی وقعت ان کی نگاہ میں اور کم ہو جائے گی، جس کی وجہ سے وہ استفادہ سے محروم رہیں گے لیکن یہ مولانا کا مزاج تھا اور وہ اس عادت کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔

وہ نہ صرف درجہ کے استاد تھے بلکہ طلبہ کے اتالیق و نگراں اور ان کے مطالعہ اور علمی ترقی کے مشیر و رہنما بھی تھے، طلبہ کی انجمن "الاصلاح" کے وہ ناظم بھی رہ چکے تھے اور اس کی افادیت کے بڑے قائل تھے، وہ اس کے اردو کے ذخیرۂ کتب اور رسائل سے فائدہ اٹھانے کا برابر مشورہ اور ترغیب دیتے رہتے تھے، اور ان کی اس ہدایت و ترغیب سے بہت سے ذہین طلبہ نے فائدہ اٹھایا اور وہ اردو کے اچھے مضمون نگار اور صحافی اور مصنف بن گئے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ندوۃ العلماء کے ناظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب (معتمد تعلیمات مولانا سید سلیمان ندوی) اور مہتمم ان کے استاذ اور شیخ مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ تھے، تینوں ان کی صلاحیتوں کے قائل اور ان پر اعتماد رکھتے تھے، جہاں تک مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کا تعلق ہے ان کے تلامذہ میں مولانا عبدالسلام صاحب اور مولوی رئیس احمد جعفری ان کے محبوب ترین و مقرب ترین شاگرد تھے، مولانا سے (جن کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے خلافت حاصل تھی) انھوں نے بیعت و ارادت کا تعلق بھی قائم کر لیا تھا، طلبہ کے ساتھ اس خصوصی تعلق کی بنا پر طلبہ کے معلوماتی دوروں اور ہندوستان کے تاریخی شہروں اور علمی مرکزوں میں جانے کے لیے طلبہ کے ساتھ بحیثیت نگراں اور سرپرست کے انہی کا انتخاب ہوتا، اس سلسلہ میں وہ طلبہ کو دیوبند، سہارنپور اور لاہور تک لے گئے، ان سب مرکزوں میں طلبہ دارالعلوم کی بڑی پذیرائی ہوئی استقبالیہ جلسے ہوئے، جن میں وہاں کے بڑے اساتذہ اور سرپرستوں نے تقریریں کیں، دیوبند میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے اور مظاہر العلوم میں مولانا اسعد اللہ صاحب نے تقریر فرمائی اور مولانا نے اس کا موزوں طریقہ پر جواب دیا۔ لاہور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے شفقت و عنایت کا معاملہ فرمایا، ایک مرتبہ مجھے بھی ان کے اور طلبہ کے ساتھ دہلی اور آگرہ جانے کا اتفاق ہوا، ہندوستان کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا، اس لیے ان کی رفاقت سے طلباء کو گراں قدر علمی فائدے ہوئے۔

جنوری ۱۹۴۰ء (مطابق ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ) میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے حکم سے "الندوہ" کا سہ بارہ اجراء ہوا، اس کی ادارت کے لیے قرعۂ فال ہم دونوں کے نام پڑا، اس وقت اس اشتراک عمل کا ایک دوسرا میدان سامنے آیا، جنوری ۱۹۴۰ء تا جولائی ۱۹۴۲ء تک جاری رہنے کے بعد مالی دشواریوں کی بنا پر رسالہ کو بند کرنا پڑا یہ دور تھا جب ندوۃ العلماء مالی بحران کے دور سے گزر رہا تھا، تنخواہوں کا بھی وقت پر تقسیم ہونا مشکل ہو رہا تھا، اس بنا پر ناظم صاحب ندوۃ العلماء کی ہدایت پر ایک وفد کا جنوبی ہند کا دورہ

طے پایا، یکم مئی ۱۹۳۷ء کو یہ وفد روانہ ہوا، اس وفد کے قائد و سرپرست حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ تھے اور رکن ہم تین، مولانا مرحوم، مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی نائب مہتمم دارالعلوم اور یہ راقم السطور، اس وفد نے ناگپور اور مدراس کا دورہ کیا، سفر میں ایک دوسرے کا ایسا تجربہ ہوتا ہے جو حضر میں سالہا سال کی یکجائی میں نہیں ہوتا، بہت سی کمزوریاں جن پر پردہ پڑا رہتا ہے سفر میں بے نقاب سامنے آجاتی ہیں، مولانا کی بےنفسی سادگی اور تواضع کھل کر سامنے آئی اور ہم میں سے کسی کو اس طویل سفر میں دوسرے سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

مولانا کی حدیث پر اچھی نظر تھی، دارالعلوم کے استاد حدیث اور اپنے وقت کے ممتاز محدث مولانا حیدر حسن خاں صاحب حدیث میں ان کے استاذ تھے جنکو حدیث اور علوم حدیث پر عبور حاصل تھا اور اسانید اور رجال پر گہری نظر تھی، ________________ استاذ کے تبحر علمی اور شاگرد کے شوق و ذہانت کی وجہ سے ان میں حدیث کا بڑا اچھا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ ان کو حدیث کے استناد، اس کے دین کا ایک بنیادی ماخذ ہونے، زندگی میں اس کی ضرورت و افادیت اور محدثین کی اس سلسلہ میں جانفشانی و احتیاط پر پورا اعتماد و وثوق تھا۔ جس وقت انکار حدیث کا فتنہ اٹھا اور ایک اونچے مسلمان سرکاری عہدہ دار نے اس خیال کی تبلیغ و وکالت شروع کی اور اس وقت کے ایک بڑے مقبول ادبی رسالہ "نگار" نے اس کی ترجمانی کا کام اپنے ذمہ لیا تو مولانا نے اس خیال کی تردید کے لیے کہ حدیث کی جمع و تدوین کا کام بہت تاخیر سے، تیسری صدی میں شروع کیا گیا۔ "حدیث کے پانچ اولین صحیفے" کے نام سے ایک محققانہ کتاب لکھی، جس میں یہ ثابت کیا کہ یہ خیال جہالت و ناواقفیت پر مبنی ہے، حدیث کی جمع و تدوین کا کام عہد رسالت ہی میں شروع کر دیا گیا جو مسلسل جاری رہا۔ دارالعلوم میں بھی مولانا نے حدیث کے بعض اسباق لئے اور سنن ابوداؤد بھی پڑھائی۔

پھر ۱۹۴۳ء میں وہ وقت آیا کہ بعض خاص حالات کی بنا پر ان کو دارالعلوم سے علٰحدگی اختیار کرنی پڑی یہ ان کے لیے زندگی کا بہت سخت مرحلہ تھا کہ ندوۃ العلماء کی تحریک اور اس کا دارالعلوم ان کے دل و دماغ میں ایسا رچ بس گیا تھا اور ان کی زندگی اس سے ایسی مربوط ہو گئی تھی کہ اس سے علٰحدگی و کنارہ کشی ان کے لیے ایک ذہنی صدمہ تھا، اس سے ان کی زندگی میں ایک ایسا خلاء پیدا ہوتا تھا جس کا کسی اور چیز سے پُر ہونا مشکل تھا، خدا جزائے خیر دے لکھنؤ کے ان چند صاحب ذوق، عالی ہمت عمائد اور حکومت کے اعلیٰ

عہدہ داروں کو جوان کے درس قرآن میں شرکت کرتے تھے کہ انھوں نے لکھنؤ میں ایک ادارہ کی بنیاد ڈال دی جس کا نام "ادارۂ تعلیمات اسلام" تھا۔ ان میں پیش پیش سید صغیر حسن صاحب اسسٹنٹ سکریٹری حکومت یوپی، شیخ ظہور الحسن صاحب ڈپٹی سکریٹری حکومت یوپی (بعد میں ریونیو سکریٹری اترپردیش) اور سید صغیر حسین صاحب گورنمنٹ ایڈووکیٹ یوپی تھے، اس طرح مولانا کی دار العلوم کی علاحدگی ایک بڑے خیر کا ذریعہ بن گئی۔ "ادارۂ تعلیمات اسلام" میں مولانا نے قرآن مجید کے ذریعہ اور کم سے کم قواعد کی مدد سے عربی زبان سکھانے اور قرآن مجید کے فہم و مطالعہ کے لیئے تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے اس کے لیے "عربی زبان کے دس سبق" کے نام سے ایک رسالہ تیار کیا جو ہندوستان میں بہت مقبول ہوا، اور ہزاروں آدمیوں کے عربی زبان سے واقف ہونے اور اس کا طالب علم بننے کا سبب بن گیا، بہت جگہ یہ رسالہ نصاب میں بھی داخل ہے، اور اس کے بار بار ایڈیشن نکلے، اس کے ساتھ انھوں نے تمرین الدروس (۱-۲-۳) اور قرآن مجید کی پہلی، دوسری، تیسری کتاب کا بھی سلسلہ شروع کیا۔ لکھنؤ میں سکریٹریٹ اور دفتروں میں کام کرنے والوں کالجوں میں پڑھنے والوں، اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد یہاں عربی زبان سیکھنے اور قرآن مجید پڑھنے آنے لگی اور اس میں دینی ذوق اور عربی کا شوق پیدا ہوا اور بہت سے لوگ اس قابل ہو گئے کہ وہ قرآن مجید سمجھ کر پڑھنے لگیں، مولانا کی محبت و اخلاق اور سادگی و تواضع نے ان کو اور گرویدہ کیا اور یہ ان کے دین اور علمائے دین سے قریب ہونے کا ذریعہ بنا۔

ان باقاعدہ اسباق اور جماعتوں کے علاوہ ادارہ میں دو عمومی درس ہوتے تھے ایک قرآن شریف کا جس کا ذمہ میں نے لیا تھا اور ایک حدیث شریف کا جو اکثر مولانا دیا کرتے تھے۔ قرآن شریف اور حدیث کے درس میں حاضرین کی تعداد سیکڑوں تک پہنچنے لگی حتیٰ کہ ادارۂ تعلیمات اسلام کا ہال اس کے لیے ناکافی ثابت ہوا، اور اس کا انتظام عمارت کی وسیع چھت پر کیا گیا، اس وقت اس درس اور ادارۂ تعلیمات اسلام کی طرف ایسا رجوع ہوا کہ اگر لکھنؤ میں جمعہ کے دن بعد مغرب کسی اعلیٰ عہدہ دار مسلمان اور صاحب ذوق انگریزی داں کو تلاش کرنا ہو تو اس کے ملنے کی جگہ یہی تھی۔

اسی کے ساتھ مسلمانوں کے شعور کی تربیت (جس کی ضرورت ۴۲، ۴۳ء کے بعد شدت سے محسوس ہونے لگی تھی) اور دینی واقفیت کے لیے "تعمیر" کے نام سے ستمبر ۱۹۴۰ء سے ایک دینی رسالہ کا اجراء بھی عمل میں آیا، مولانا اور راقم السطور کا نام بحیثیت مدیر کے درج ہوتا تھا، اس رسالہ میں بڑے فکر انگیز اور

ایمان افروز مضامین شائع ہوئے اور یہ پرچہ سنجیدہ حلقوں میں مقبول ہوگیا، واقعہ یہ ہے کہ "ادارہ تعلیمات اسلام" ایک ایسا ثقافتی اور تربیتی مرکز بن گیا تھا، جس کی دور دور مثال نہیں تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعض ذہین فضلاء جن میں مولانا عبدالغفار ندوی (حال سکریٹری جماعت اسلامی اترپردیش) علی احمد کیانی مرحوم، مشیر الحق صاحب بحسرآبادی (حال ڈاکٹر مشیر الحق صدر شعبۂ اسلامیات و عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کچھ دن فاضل گرامی عم محترم مولانا سید محمد طلحہ صاحب ایم۔ اے نے بھی وقت دیا اور لوگوں نے ان کے وسیع علم و تبحر سے فائدہ اٹھایا۔

مگر افسوس ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جو باد خزاں چلی اس نے اس پھلنے پھولنے والے درخت کو بھی خشک کر دیا، اس کی مالی حالت شروع سے غیر مستحکم تھی، اس کا انحصار صرف اس کے بانیوں کی اعانت۔ اور مولانا عبدالسلام صاحب کے جذبہ ایثار و قربانی اور ان کے چند رفقاء کے خلوص و تعاون پر تھا، کچھ عرصہ تک تو مولانا اور ان کے رفقاء نے ان حالات کا مقابلہ کیا اور اس کو قائم رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے لیکن بالآخر حالات کے سامنے ان کو سپر ڈالنا پڑی، وہ چراغ کو تیل بتی کے بغیر زیادہ دن جلا نہیں سکتے تھے یہی زمانہ تھا جب مولانا کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ دینیات کی نظامت کی پیش کش ہوئی۔ جامعہ سے ان کے گوناگوں تعلقات تھے وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعد وہیں چلے گئے تھے اور کئی سال رہ کر انھوں نے انگریزی زبان اور جدید علوم سے واقفیت میں اضافہ کیا تھا، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ان کے پرانے استاذ اور بزرگ تھے۔ وہ ان کی علمی و ذہنی صلاحیتوں اور خوبیوں سے واقف تھے، مولانا نے اس کو لطیفۂ غیبی سمجھا اور رفقاء نے بھی زیادہ مزاحمت نہ کی کہ وہ خود خدمت کا ایک بڑا میدان ہے اور مولانا اپنے مذاق و مزاج اور اپنے ذہن و قلب کی وسعت کی وجہ سے وہاں بڑی مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ مولانا نے اس پیش کش کو قبول کیا، ۱۹۵۱ء میں وہ جامعہ منتقل ہوگئے، مولانا نے نہ صرف یہ کہ اس شعبہ کے معیار و روایات کو (جس پر کبھی مولانا خواجہ محمد عبدالحی فاروقی اور مولانا محمد اسلم جیراجپوری فائز رہ چکے تھے) برقرار رکھا بلکہ اس کے وقار میں اضافہ کیا، وہ بہت جلد وہاں کی مرکزی دینی شخصیت بن گئے، اس شعبہ کی سربراہی کے فرائض کے علاوہ جمعہ کا خطبہ دیتے تھے اور گویا جامعہ کے امور مذہبی کے پورے نگراں و ذمہ دار تھے، وہ اپنی فراخدلی اور فراخ نظری کی وجہ سے قدیم و جدید دونوں حلقوں میں مقبول و معتمد بن گئے، ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب دونوں ان کے علم، ان کی شرافت اور ان کے خلوص کے قائل تھے۔

وہ عابد صاحب کے رسالہ "اسلام اور عصر جدید" کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہو گئے اور اس کی کمیٹی کے رکن رکین بن گئے۔ اور آخر وقت تک رہے۔

بالآخر جامعہ سے بھی سبکدوشی کا زمانہ آیا اور وہ بہت اعزاز و احترام کے ساتھ اس سے رخصت ہوئے انھوں نے بقیہ زندگی علم و دین کی خاموش خدمت لکھنے پڑھنے اور اپنے وطن مالوف میں گزارنے کا ارادہ کرلیا ندوۃ العلماء کے وہ قدیم زمانہ سے رکن چلے آرہے تھے، اب اس سے بہتر موقع نہ تھا کہ ان کے علم و تجربہ اور خلوص و دلسوزی سے فائدہ اٹھایا جائے، چنانچہ مجلس انتظامی نے (۲۶ شعبان ۱۳۹۲ھ ۵ اکتوبر ۱۹۷۲ء) ان کو باتفاق آراء دارالعلوم کا معتمد تعلیمات منتخب کیا اور اسی حیثیت سے انھوں نے ۷۵ء کے پچاسی سالہ تاریخی جشن ندوۃ العلماء میں اپنی فاضلانہ رپورٹ پڑھی، ندوۃ العلماء کے مزاج اور دارالعلوم کی تعلیمی ضروریات سے ان سے زیادہ پورے حلقہ میں کوئی واقف نہ تھا، ندوۃ العلماء کے مقاصد کے بارے میں وہ بڑے ذکی الحس اور غیور واقع ہوئے تھے اور دارالعلوم کو اس کی اسی حقیقی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے جو بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری اور علامہ شبلی کی تمناؤں اعلانوں اور ان کی تحریروں اور خطوط میں پائی جاتی ہے ان کو عمر بھر اسی خواب کی تعبیر کے دیکھنے کی تمنا رہی جو ان دونوں بزرگوں اور ان کے باکمال و روشن ضمیر رفقاء نے گزشتہ صدی عیسوی کے آخر میں دیکھا تھا، وہ ہمیشہ اسی پیمانہ سے ندوۃ العلماء کی ترقیات کو جانچتے اور پرکھتے تھے اور اسی نقطۂ نظر سے خود میرا اور دوسرے رفیقوں کا محاسبہ کیا کرتے تھے ان کے نزدیک ندوۃ العلماء کی کامیابی کا حقیقی پیمانہ یہ تھا کہ مختلف علوم اسلامیہ کے ماہرین فن اور صاحب تحقیق و نظر عالم پیدا ہوں جو اس عہد انقلاب میں مسلمانوں کی دینی علمی رہنمائی علیٰ وجہ البصیرۃ کر سکیں اور علماء کا اعتماد بحال اور علوم اسلامیہ کے تفوق کا نقش قائم کر سکیں۔ افسوس ہے کہ ان کی وفات کے بعد اب ایسا کوئی آدمی نہ رہا جو خود ذمہ داران و کارکنان ندوۃ العلماء کا احتساب کر سکے اور ان کی خامیوں، اور غلطیوں پر ان کو متنبہ کرے۔ ع

وہ کوہکن کی بات گئی کوہکن کے ساتھ

مولانا ان سب حیثیتوں اور مختلف ذمہ داریوں کے ساتھ جن کا اپنے اپنے موقعوں پر ذکر آیا، اردو کے ایک منجھے ہوئے پختہ کار و کہنہ مشق لکھنے والے تھے۔ ان کی تحریر میں زبان یا محاورے کی غلطی ڈھونڈھے سے نہیں ملتی تھی، انھوں نے اردو کے عناصر اربعہ (مولانا حالی، مولانا شبلی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی

محمد حسین آزاد) اور اساطین ادب کی تصنیفات بچپن سے پڑھیں اور ان کے ذہن و ذوق نے ان کو پورے طور سے اپنا لیا تھا، وہ بعض ہندگیر شہرت رکھنے والوں کی تحریروں میں زبان کی غلطی نکالتے تھے، وہ اودھ کی تہذیب و معاشرت اور خاندانوں کے رکھ رکھاؤ سے خوب واقف تھے، بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت اسی انداز سے کرتے تھے جیسا شرفائے اودھ کا دستور رہا ہے، وہ اپنے چھوٹے عزیزوں اور رفیقوں کی پوری حوصلہ افزائی اور قدر دانی کرتے اور ان کی ترقی و کامیابی سے خوش ہوتے، ان کو نیک مشورہ دیتے اور چاہتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علمی کمال و فنی امتیاز پیدا کریں۔

میں بھی ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا کہ طالب علمی سے فراغت کے بعد ایک زمانہ میں جب تصوف کی بعض کتابوں کے مطالعہ سے مجھ پر زبان و ادب کی بے حقیقتی کا غلبہ ہوا۔ اور طبیعت ادب و انشاء سے اچاٹ بلکہ بیزار ہونے لگی اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی ساری دلچسپیوں اور توجہات کو مقاصد اور دینی علوم کے دائرہ میں محدود کروں گا، اسی زمانہ میں اپنے وطن رائے بریلی جاتے ہوئے لکھنؤ سے پھراواں تک (جو مولانا کا وطن ہے) میرا ان کا ساتھ ہو گیا۔ میرے اس رجحان سے وہ واقف تھے، سارے راستے وہ مجھے اس سے باز رکھنے اور دینی مقاصد اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے زبان و ادب کی اہمیت کی ضرورت کو میرے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے رہے، انھوں نے اس منفی رجحان کے نقصانات سے (جو غلو اور مبالغہ سے خالی نہ تھا) مجھے ہوشیار کیا اور تاکید کی کہ میں خدا کی بخشی ہوئی اس صلاحیت کو ضائع اور اس کی ناقدری نہ کروں جس سے میں دین کی خدمت میں بڑا کام لے سکتا ہوں، ان کی اس تلقین سے میرے اس خیال میں تزلزل پیدا ہو گیا اور میں اس غلطی سے بچ گیا۔

وہ اگر تصنیف کے کام میں مسلسل حصہ لیتے اور ان کی دوسری مصروفیات اس راہ میں حائل نہ ہوتیں تو ان کا شمار ہندوستان کے عظیم مصنفوں اور اہل قلم میں ہوتا، ان کا طبعی اور پسندیدہ موضوع تاریخ تھا، اس میں ان کے قلم کے دو نقش "ہماری بادشاہی" (مختصر تاریخ اسلام) اور "ہندوستان کی کہانی" (مختصر تاریخ ہند) اہل نظر سے داد تحسین لے چکے ہیں اور بہت جگہ نصابوں میں داخل ہیں۔

ان کی تیسری کتاب جو ان کے وسیع مطالعہ کی آئینہ دار اور قیام جامعہ کے زمانہ کی تصنیف ہے "دنیا اسلام سے پہلے اور اس کے بعد" ہے جس میں جاہلیت اور عہد ماقبل اسلام کی تصویر تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، قیام دار المصنفین کے زمانہ میں انھوں نے علامہ شبلی کی مقبول عام شہرۂ آفاق

سیرۃ النبیؐ کی تلخیص شروع کی تھی جس کی پہلی جلد تیار ہو گئی۔

مولانا بہت سادہ اُردو لکھتے تھے اور اسی کو پسند کرتے تھے لیکن ان کی تحریر میں خاص حلاوت، روانی اور برجستگی ہوتی تھی "معارف" کے وہ شذرات جوان کے قلم سے ہیں، وفیات اور مقدمے، جو انھوں نے بعض کتابوں پر لکھے ہیں، ان کی طرز تحریر کا دلکش نمونہ ہیں، ان کی تقریر بھی سادہ پر مغز اور پر از معلومات ہوتی تھی، اس میں اتار چڑھاؤ اور الفاظ کی صناعی بالکل نہیں ہوتی تھی خاص طور پر سیرت کے موضوع پر وہ بڑی اچھی تقریر کرتے تھے، حقیقت میں ان کی طبیعت ہر قسم کے تکلفات سے بری تھی، یہ بات بعض اوقات ان کے ساتھیوں اور خوردوں کے لیے تفریح کا موضوع بن جاتی تھی۔

وہ قرآن بھی بہت سادہ پڑھتے تھے، اکثر وہ لطیفہ یاد دلاتے تھے کہ ایک مرتبہ وہ دارالعلوم کی مسجد میں نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شوخ اور ذہین طالب علم نے ایک دوسرے طالب علم سے وضو کرتے ہوئے کہا کہ "جلدی کرو آج نماز اُردو میں ہو رہی ہے۔" اکثر مسکراتے ہوئے کہتے تھے میں تو نماز بھی اُردو میں پڑھاتا ہوں لیکن ان کا یہی وصف، جو دوسروں کی نگاہ میں بعض اوقات نقص معلوم ہوتا، حقیقت پسندوں کی نگاہ میں اس دور تصنع وتکلف بلکہ دور نفاق وریا میں بڑا کمال اور قابل رشک صفت تھی۔

پھر جب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی وفات سے دارالمصنفین میں مسند سلیمانی دوبارہ خالی ہوئی تو پھر پورے دبستان شبلی اور بزم سلیمانی میں نظر انتخاب پر پڑی اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ دارالمصنفین میں قیام اختیار کریں اور "معارف" کی ادارت اور رفقاء کی رہنمائی وتربیت میں ان دونوں گرامی مرتبت پیش رووں کی نیابت کریں، اس درخواست میں میں پیش پیش تھا، آخر میں میرا اصرار ان کی معذرت پر غالب آیا اور انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کی اور محترمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو اس سے بڑی تقویت اور مدد ملی، ان کو مولانا کی موجودگی میں اور زیادہ دلجمعی اور سکون خاطر کے ساتھ ادارہ کی توسیع وترقی کا موقع ملا اور اسی اطمینان کی بنا پر وہ کئی کئی مہینے دارالمصنفین سے باہر رہ کر اس کے مالی وسائل کی فراہمی میں ساعی وسرگرم رہے اور وہ خلا نہیں محسوس ہونے پایا جو ایک صاحب نظر عالم دین کی (جو اصل دینی وعربی مآخذ پر براہ راست نظر رکھتا ہے اور علوم اسلامیہ میں اس کی نظر وسیع و گہری ہے) غیر موجودگی میں ایسے ادارہ میں محسوس ہو سکتا ہے جس کا مزاج دینی وعلمی ہے اور جس کا خمیر سیرت وتاریخ اسلام سے اٹھا ہے۔

یہ تو ان کی علمی حیثیتوں اور کمالات کی طرف چند اشارے تھے، ان کی تمام صفتوں پر جو صفت میسر

نزدیک سب پر غالب تھی وہ ان کی شرافت نفس، انسان دوستی، بے آزاری اور عام ہمدردی کی صفت تھی، اللہ نے ان کو بچوں کی سی معصوم فطرت دی تھی، وہی بے ساختگی، وہی بے تکلفی کسی کو نقصان پہونچانے، کسی کا دل دکھانے کی یا تو ان میں صلاحیت نہیں تھی یا تھی تو بہت محدود جس کو انھوں نے شاید عمر بھر استعمال نہ کیا ہو، ہر ایک سے محبت و سادگی سے ملنا، اس کا حال احوال پوچھنا، اس کی ضرورتوں سے واقف ہونے کی کوشش کرنا، اس کی مدد کرنے کی خواہش اس چیز نے ان کو اپنے قصبہ میں بھی اور جہاں جہاں وہ رہے بڑا محبوب اور ہر دل عزیز بنا دیا تھا، اس کا پورا اندازہ اس وقت ہوا جب ان کی وفات کی خبر قصبہ پر بجلی بن کر گری، اس وقت ہندو مسلم سب سوگوار نظر آتے تھے، سب ان کی شفقتوں کو یاد کر کر کے روتے تھے مسلمان تو مسلمان غیر مسلم بھی ان کے دروازہ پر جمع ہو گئے اور جب تک جنازہ نہ اٹھا وہ وہاں سے ہٹے نہیں، عید کا دن تھا اور نماز کا وقت لیکن ایک شخص بھی ان کے جنازہ کو چھوڑ کر عیدگاہ نہیں گیا، اللہ نے ان کو موت بھی ایسی نصیب فرمائی جس کی اولیاء اللہ دعائیں اور تمنّائیں کرتے ہیں۔ رمضان کی ۳۰ تاریخ کو جمعہ کے دن اذان کے وقت ان کی روح نے اپنے مرکز اصلی کی طرف پرواز کی اور یکم شوال کو عین عید کا دوگانہ ادا کرنے کے بعد ہزاروں کے مجمع نے جس میں اطراف و نواح کے بھی لوگ تھے ان کو سپرد خاک کیا، عید کے دن جو مسلمانوں کے لیے خوشیوں کا دن ہوتا ہے راقم سطور کے لیے مقدر تھا کہ عین نماز کے بعد اپنے نصف صدی کے ساتھی، شریک کار اور غم گسار کو سپرد خاک کرے اور جس دن دوست دوستوں سے عید ملتے ہیں اس دن ایک دوست کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہی جائے، ادھر کئی سال سے ان کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ عید کی شام کو یا دوسرے دن رائے بریلی آتے۔ وہ اعظم گڑھ سے اس پروگرام کی اطلاع دے چکے تھے لیکن بجائے اس سفر کے انھوں نے آخرت کا سفر اختیار کیا۔ وما عند اللہ خیر وابقیٰ۔

انتقال کے ۳۔۴ دن بعد جب تعزیت کے سلسلہ میں دوبارہ جانا ہوا تو یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی کہ ان کا غم تازہ ہے، ہندو مسلمان دونوں یکساں طریقہ پر مغموم و متاثر نظر آتے ہیں، غیر مسلم اُن کی محبت و شفقت کی باتیں یاد کر کے روتے ہیں اور ان کے واقعات سناتے ہیں، گویا انھوں نے اس شعر پر عمل کیا ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو　　　　ہمہ خنداں بدند تو گریاں

پس چناں زی کہ بعد مردن تو　　　　ہمہ گریاں بوند تو خنداں

اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کے درجے بلند کرے کہ وہ اچھے رہے اچھے گئے، لیکن اب ہم غم نصیبوں کو یہ فکر کھائے جارہی ہے کہ ان کی خالی کی ہوئی جگہ کس طرح پُر کریں اور اُن اداروں کو پھر اُن جیسا باکمال اور جامع صفات آدمی کہاں سے ہاتھ آئے۔

علم و سیاست

یونانی فلسفہ کے رواج کے زمانہ میں تو صرف علمی طور پر مسلمان اس سے متاثر تھے، سیاسی میدان میں ان کی بالادستی قائم تھی اور چین سے مراکش تک عباسیوں کا پرچم لہرا رہا تھا اور اسپین سے فرانس اور اٹلی کے حدود تک خلفاء اندلس کا جھنڈا اڑ رہا تھا، اس بناء پر وہ احساس کمتری سے محفوظ تھے اس لئے علماء اسلام کو صرف فلسفۂ یونان کی کمزوری واضح کرنی تھی، لیکن انیسویں صدی عیسوی کی تاریخ ہی کچھ اور تھی، اس زمانہ میں سیاسی میدان میں بھی یورپ کا بول بالا تھا۔ مسلم ممالک یا تو زیر ہو چکے تھے یا زیر کئے جارہے تھے، اور سیاست و معیشت، تہذیب و تمدن اور علم و فن کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو یورپی اثرات سے محفوظ ہو۔ ایک طرف یورپین فوجیں مسلمان ملکوں کو فتح کرتی جارہی تھیں دوسری طرف مغربی مفکرین کے خیالات و عقائد، اعمال کی دنیا میں تہلکہ برپا کئے ہوئے تھے۔ تیسری طرف مسیحی مشنری انجیل ہاتھ میں لئے شہروں اور گاؤں میں پھر رہے تھے اور پریشان حال مسلمانوں کو آسمانی بادشاہت کی بشارت سنا رہے تھے، اور دنیا میں مصائب و آلام سے نجات دلا کر عزت و آرام سے زندگی بسر کرنے کا یقین دلا رہے تھے، ان کی طرف سے غریبوں کی امداد کے لئے محتاج خانے، بیماروں کے علاج کے لئے شفا خانے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے اسکول و کالج کھلے ہوئے تھے جن پر بے دریغ دولت صرف کی جارہی تھی۔

(مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

آہ مولانا عبد السّلام قدوائی!

سید صباح الدین عبد الرحمٰن دار المصنفین اعظم گڑھ

آنکھیں اشکبار ہیں، دل اندوہ وغم کا جو ُبار ہے، جب یہ قلم فگار ہو کر لکھ رہا ہے کہ مولانا عبد السّلام قدوائی جو دار المصنفین کی علمی اور نجی مجلسوں کی رونق، عزّت اور آبرو تھے، ہم سب کو چھوڑ کر یکایک آغوش رحمت الٰہی میں چلے گئے۔

وہ ۱۹۷۵ء میں دار المصنفین اس وقت آئے جب جناب شاہ معین الدّین احمد ندوی سابق ناظم دار المصنفین کی رحلت سے یہاں کا پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، سوگوار اور بے رونق ہو رہا تھا، وہ یہاں آئے تو اپنے جلو میں علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی بے پناہ عظمت، اپنے اُستاد مولانا سیّد سلیمان ندوی کی غیر معمولی عقیدت، جناب شاہ معین الدّین احمد ندوی مرحوم کی شخصیت سے اپنی مخلصانہ محبّت اور خود اپنی ذات کی لینت، مروت اور ملاطفت کا لشکر ساتھ لائے، اور اس راقم سے ایسے گھل مل گئے کہ ہم دونوں کے درمیان شیر و شہد کی کوثر بہتی نظر آنے لگی، اُن کی آمد سے دار المصنفین کی سرگرمیوں میں شادابی، اس کی امیدوں کے پھولوں میں رعنائی اور اس کی تمناؤں کے مرغزاروں میں دل فریبی پیدا ہونے لگی۔ مگر معلوم نہیں مصلحتِ خداوندی کیا تھی کہ دار المصنفین کے رفقاء اُن کی علمی بصیرت اور بزرگانہ الفت سے ہر طرح کا استفادہ کر رہے تھے کہ وہ اچانک دائمی طور پر اُن سے جدا ہو گئے، وہ ۲۷ رمضان المبارک کو تراویح پڑھ کر اور تہجد اور فجر کی نماز ادا کر کے چار بجے صبح اعظم گڑھ سے اپنے وطن تھلینڈی ضلع رائے بریلی عید منانے روانہ ہوئے، وہاں پہنچنے کے دوسرے روز سحری کے وقت اٹھے، یکایک بے ہوش ہوئے اور جمعہ کے روز گیارہ بجے دن کو اللہ کو پیارے ہو گئے، دوسرے دن عید کی نماز کے بعد ان کی طالب علمی کے محبوب اور شفیق ترین ساتھی اور اسلامی ممالک کے فاضل اجل مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اُن کے سات سوگوار بیٹوں اور ہزاروں آدمیوں کے ساتھ اُن کے جنازہ کی نماز پڑھائی، اور وہیں گوناگوں خوبیوں کا یہ مجسمہ سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اُن کا سنہ پیدائش ۱۹۰۶ء تھا، ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تحصیل علوم کے بعد مزید تعلیم کے لیے جامعہ ملیہ دہلی

گئے، وہاں سے بمبئی کے اس زمانہ کے مشہور اخبار خلافت کی مجلسِ ادارت میں شریک ہو گئے، پھر ۱۹۳۲ء میں ندوہ میں مدرّس کی حیثیت سے بلا لیے گئے۔ لکھنؤ میں ادارۂ تعلیماتِ اسلام قائم کیا، جہاں تعلیم یافتہ حضرات کو کلام مجید کا درس دیتے، اور آسان ریڈروں کے ذریعے عربی سکھاتے، یہاں سے ایک جریدہ تعمیر بھی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ شائع کرتے رہے، پھر جامعہ ملّیہ میں دینیات کے استاد مقرر ہوئے، جہاں اکیس سال تک اس درس گاہ کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کرتے رہے۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد ندوہ کے اعزازی معتمد تعلیم بنائے گئے، پھر جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے بعد مولانا ابوالحسن علی کی خواہش پر دارالمصنفین کی کشتی کے دیدبان بن کر آئے،

ان تینوں اداروں سے اُن کو عشق رہا، ندوہ اُن کی لیلیٰ تھی، جامعہ ملّیہ اُن کی عذرا تھی، دارالمصنّفین اُن کے لیے شیریں بنا ہوا تھا، یہاں فرہاد بن کر اس کے لیے جوئے شیر نکالنے کی فکر میں تھے کہ اسی فکر کا تیشہ لیے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی،

اُن کی شخصیت ایک عطر مجموعہ تھی، وہ ایک بہت اچھے انسان، بہت اچھے دوست، بہت اچھے شاگرد بہت اچھے استاد، بہت اچھے شوہر، بہت اچھے باپ اور بہت اچھے عالم تھے، اُن کا دل چیر کر دیکھا جاتا تو اُن کے سویدائے دل کے اندر حسین اور شامہ نواز گلاب کی پنکھڑیاں رکھی ہوئی دکھائی دیتیں، وہ بولتے تو معلوم ہوتا کہ مصری ڈلی چبا رہے ہیں، اور اپنے مخاطب کا من موہ رہے ہیں، جس کے ساتھ رہیے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ وہ حبیب ہیں کہ محبوب، ندوہ میں اُن کے ہم درس رئیس احمد جعفری مرحوم تھے، جو اُردو کی بے شمار تصانیف کے مشہور مصنّف ہوئے، اُن سے بچھڑے ہوئے خدا جانے کتنی مدّت گزر چکی تھی، مگر شاید ہی کوئی روز ایسا گزرتا، جب وہ اُن کی یادوں کی برات نہ سجاتے، مولانا ناظم ندوی بھی ان کے ہم درس تھے، اب وہ کراچی میں ہیں، ان کا تذکرہ آتا تو کہتے کہ ان سے ایک بار ملاقات ہو جاتی تو پھر دنیا سے جانے کا افسوس نہ ہوتا، ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بھی ان کا ساتھ رہا، ان کی ہر دلعزیزی کے جلووں، انکی محبوبانہ اداؤں، اور ان کی علمی دلربائیوں کا تو وظیفہ پڑھتے رہتے۔

اُن کے تین محبوب استاد تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا حیدر حسن خاںؒ اور مولانا شبلی جیراجپوری مرحوم ان تینوں کا ذکر خیر اس طرح کرتے، جیسے ابھی ابھی اُن سے مل کر آئے ہیں، سید صاحبؒ کی گھریلو زندگی کے کچھ واقعات ایسے سناتے کہ ان کی خبر مجھ کو بھی نہ تھی، حالانکہ مجھ کو اُن کے گھر کے اندر بھی ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، و

سید صاحبؒ کی علمی جلالت کے بے حد قائل تھے، کہتے کہ ان کے ایسا روشن دماغ اور دیدہ ور عالم عرصۂ دراز تک پیدا نہ ہو سکے گا، وہ مولانا حیدر حسن خاںؒ سے گرویدہ ہو کر اُن سے بیعت بھی ہو گئے تھے، اُن کی آن بان اور تدریسی شان کا ذکر مزے لے لے کر کرتے، معارف میں اُن پر جو مضمون لکھا تو لکھتے وقت اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دینے کی فکر میں رہے، انھوں نے مولانا شبلی جیراجپوری پر بھی معارف میں ایک مضمون لکھا تو اُن کے پاس خطوط آئے کہ مولانا مرحوم کی اصلی عظمت اس مضمون سے معلوم ہوئی۔

کلام مجید کا درس دینے اور عربی زبان سکھانے میں ان کو خاص لذت ملتی، تاریخی لطیفوں، علمی چٹکلوں، اور ادبی بذلہ سنجیوں کے ساتھ کلام پاک کے رموز و نکات مزے لے لے کر بیان کرتے، چالیسؔ روز میں عربی سکھا دیتے، ان کے عربی کے قاعدے ہندوستان اور پاکستان میں بہت مقبول ہیں، بچوں کی ذہنی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے، دارالمصنفین سے بچوں کے لیے ان کی دو کتابیں ہماری بادشاہی اور ہندوستان کی کہانی شائع ہوئیں جو ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہوتی رہتی ہیں، وہ جہاں بھی رہتے، اپنے شاگردوں کو بہت عزیز رکھتے، ان کی خاطر ارباب حل و عقد سے بھی اختلاف کرتے، چاہے وہ ان کے عزیز دوست ہی کیوں نہ ہوتے۔

وہ ایک شفیق شوہر بھی تھے، ان کے دوستوں کی بیویوں کو رشک ہوتا کہ اُن کے شوہر بھی اُن ہی کی طرح ہوتے، ان کے بچے ان کی شفقت و محبت کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں جس طرح پلے، کم بچے اپنے باپ کے زیر سایہ اس طرح پلے ہوں گے، ان کے یہاں دھتکار اور پھٹکار کی کوئی گنجائش نہ تھی، اُن کے پیار اور چمکار سے اُن کے گھر کی فضا خوشگوار بنی رہتی۔

اُن کی خطابت کی بھی عجیب دلربایانہ شان تھی، جمعہ کے روز منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تو معلوم ہوتا کہ

ع بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

وہ چٹکلے اور گھریلو قصے بیان کر کے اُن کو کلام پاک کی آیات، حدیث کی روایات اور اسلامی تاریخ کے واقعات سے اس طرح جوڑ دیتے کہ اُن سے نہ صرف اُن کی بالغ نظری اور روشن ضمیری کی فضا پیدا ہو جاتی، بلکہ سامعین بھی اپنی روح میں ایک طرح کی بالیدگی اور ذہن میں ایک قسم کی بیداری محسوس کرتے، دارالمصنفین اُن کے خطبے کی وجہ سے بھی بیت الحکمت اور مذہبی تربیت گاہ بن گیا تھا۔

ان کا علمی مطالعہ بھی بہت وسیع تھا جو کچھ پڑھا تھا، مستحضر رہا۔ کلام پاک، تفسیر، حدیث، رجال، علم کلام

تصوّف، تاریخ، ادب، سیاست حتیٰ کہ ناول نگاری اور افسانہ نویسی پر جب کبھی گفتگو آجاتی تو کچھ نہ کچھ ایسے نکتے بیان کرجاتے کہ یکایک ذہن کے دریچے کھل جاتے، یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ راقم نے ان کے بعض ایک دو جملوں پر معارف کے لیے لمبی لمبی تحریریں لکھیں، وہ علمی شوشے کچھ ایسے میٹھے اور پیارے انداز میں دیتے کہ موضوع کی بہت سی گتھیاں سلجھ جاتیں، وہ علمی کاوشوں کے لیے جس طرح اکساتے، خفتہ علمی جذبات کو جس طرح بیدار کرتے، پھر ان میں جس طرح جوت جگا دیتے، وہ نہ صرف میرے بلکہ دارالمصنفین کے لیے بڑی دولت رہی، وہ ان لوگوں میں سے تھے، جن سے علمی بصیرت کا درس لیا جاسکتا تھا، بشرطیکہ کسی میں یہ درس لینے کی صلاحیت ہو،

وہ مسلمان اور عصری تقاضے، سورۂ بقرہ کی تفسیر، ہماری بادشاہی، ہندوستان کی کہانی، عربی کے دس سبق، قرآن مجید کی پہلی کتاب، (پارہ الم) اور قرآن مجید کی دوسری کتاب (سیقول) وغیرہ کے مصنف تھے مگر میرے لیے وہ بہت سی اوریادیں بھی چھوڑ گئے ہیں، اُن کا وہ درد بھی یاد آئے گا جو دارالمصنفین کے لیے اپنے پاک اور بلور کی طرح جھلکتے ہوئے دل میں رکھتے تھے، وہ لمحات بھی یاد آئیں گے جب ہم دونوں دارالمصنفین کے سبزہ زار پر بیٹھ کر اس کے مستقبل کو سوچتے وہ سامنے کھلے ہوئے گلاب کو دیکھ کر کہہ اٹھتے کہ اس ادارہ کی علمی روایات میں گلاب ہی کی شادابی اور رنگینی رہی ہے، کیا وہ آئندہ بھی باقی رہے گی، پھر مایوسانہ لہجے میں کہتے کہ دارالمصنفین کے اسلاف نے خدمت اور ایثار کے جو نمونے پیش کئے ہیں، وہ اب نہیں ملیں گے، یہ پیسے کے پیچھے دوڑ لگانے کا دور ہے مگر وہ اس مایوسی کو دور کرنے کی کوشش کرتے، کبھی چاندنی راتوں میں ہم دونوں دارالمصنفین کے صحن میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے، تو وہ بشارت دیتے کہ ہم لوگوں کو پرامید رہنا چاہیے۔ اس علمی مرکز پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کی چاندنی انشاء اللہ برابر چھٹکی رہے گی۔

وہ حوصلہ افزائی کرنا خوب جانتے تھے، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی وفات سے میرا سینہ اندوہ و غم کا آتشدان بنا ہوا تھا، مگر انھوں نے اپنی مدبھری باتوں سے اس کو امیدوں کا گلزار بنا دیا تھا، کیا معلوم تھا کہ اس قدر جلد پھر یہ سوز غم کا تنور بن جائے گا، یہ اب ایک گنجِ شہیداں بن چکا ہے، اس میں استاذی المحترم مولانا سید سُلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، اور اب مولانا عبدالسّلام قدوائی مدفون ہیں، میری حیثیت اب ایک مجاوِر کی ہے، جو اپنے سینے کے قبرستان میں اُن کی یادوں کا لوبان جلانے کے لیے رہ گیا ہے۔

چوالیسؔ سال پہلے دارالمصنفین آیا تو اس کو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی وجہ سے علم کا

عشرت کدہ سمجھنے میں لذت محسوس کی، پھر مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ کے زمانہ میں بھی اس کو اپنے لیے علم کا گل کدہ سمجھتا رہا، مولانا عبدالسلام قدوائی کی رفاقت سے بھی یہ میرے لیے علم کا خم کدہ بنتا جارہا تھا مگر اب زندگی کی اس منزل میں ہوں کہ کہیں مجھ کو خود یہ نہ کہنا پڑے۔

ع ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کی نیکیاں اور خوبیاں اُن کے سفر آخرت کے لیے زادِ راہ ہیں، دعا ہے کہ ان ہی کی بدولت مغفرت کی کوثر و تسنیم سے ضرور سیراب ہوں، آمین، ثم آمین، ان کی سیرت کی رعنائیوں ان کے کردار کی دل آویزیوں، اور ان کی گوناگوں خوبیوں کو سلام اور لاکھوں سلام بھیجتا ہوں تو اس وقت دارالمصنفین کی ہر سمت سے یہ صدا سنائی دیتی ہے۔

ع گلے برفت نیاید بہ صد بہار دگر

دین و دنیا

مسلمان جب عرب کے سادہ ماحول سے باہر نکلے اور رومی و ایرانی تہذیب اور یونانی علوم و فنون سے سابقہ ہوا تو نئے افکار و خیالات اور نئے انداز و اطوار سامنے آئے اور آہستہ آہستہ زندگی ان سے متاثر ہونے لگی لیکن جب عباسی عہد میں حکمائے یونان کی کتابوں کے ترجمے عربی میں شائع ہوئے تو فلسفہ و حکمت کے مسائل نے ذہن و دماغ میں ہلچل پیدا کر دی اور مذہبی عقائد و اعمال کے بارہ میں بحثیں ہونے لگیں اور عملی موشگافیوں نے طرح طرح کے شبہات پیدا کر دئے۔ پرانے بزرگ اس صورت حال سے کڑھتے تھے لیکن خاطر خواہ اس کا تدارک نہیں کر پاتے تھے فلسفہ کی راہ سے جو اعتراضات ہو رہے تھے اُن کا جواب وہ لوگ کس طرح دے سکتے تھے جنھوں نے کبھی اس کوچہ میں قدم نہیں رکھا تھا، بالآخر یہ بات سمجھ میں آئی کہ علوم دین سے تعلق رکھنے والے فلسفہ و حکمت کے مسائل سے بھی واقفیت حاصل کریں تاکہ ان کو پیش نظر رکھ کر دینی مسائل کی ایسی تشریح کر سکیں جو نوجوانوں کی خلش مٹا سکے اور فلسفہ کے اعتراضات کا جواب فلسفہ کی زبان میں دیا جا سکے۔ (مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

رفیق شفیق مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

محب مکرم مولانا عبدالسلام قدوائی جنہیں مرحوم ومغفور لکھتے ہوئے قلم رُکنے لگتا ہے اور دل بجھنے لگتا ہے، گذشتہ رمضان المبارک کی آخری تاریخ کو داغ مفارقت دے گئے۔

غالباً عید سے اگلے روز نامہ الجمعیۃ دہلی میں یہ خبر نظر سے گزری اور تھوڑی دیر کے لئے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

جولائی ۱۹۶۳ء کے وسط میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے جامعہ کالج کے اسٹاف میں شامل ہوا اور مولانا مرحوم کی رفاقت کا فخر مجھے حاصل ہوا، اور غالباً اپریل ۱۹۷۸ء تک جب مولانا جامعہ سے ریٹائر ہوئے یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح چودہ پندرہ سال تک ہم دونوں نے ایک ہی ادارہ کے ایک ہی شعبہ (اسلامک اسٹڈیز) میں دوش بدوش کام کیا۔

جامعہ آنے سے پہلے مولانا قدوائی سے معمولی تعارف تھا، ایسا ہی تعارف جیسا ارباب قلم کے حلقوں میں ایکدوسرے سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ کسی زمانہ میں لکھنؤ گیا تھا اور امین آباد پارک کے بازار سے گزر ہوا تو ایک کمرہ پر "ادارۂ تعلیمات اسلام" کا بورڈ لگا ہوا نظر آیا۔ ادارہ کے نام اور کام سے کچھ تھوڑی سی واقفیت تھی۔ کمرہ کا دروازہ پیچھے گلی میں تھا۔ اوپر چڑھ گیا۔ کمرہ میں چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا اور الماریوں میں کچھ کتابیں لگ رہی تھیں۔ مولانا جو اس ادارہ کے مدیر تھے بڑی خندہ پیشانی سے ملے اور بڑی محبت سے چائے پلائی۔ عربی زبان کی تعلیم کو سہل اور عام کرنے کے موضوع پر کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ مولانا اس مقصد کے لئے "عربی کے دس سبق" اور چند دوسرے رسالے لکھے تھے اور ادارہ میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو عربی زبان سکھانے اور اسلامی تعلیمات سے واقف کرنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ میں نے بھی "کلام عربی" کے نام سے دو حصوں میں ایک کتاب لکھی تھی۔ موضوع دونوں کی مشترک دلچسپی کا تھا۔ یہ مختصر سی ملاقات تھوڑی دیر رہی تھی۔ مگر میں اسے بھولا نہیں تھا۔

کالج کھلنے کے پہلے ہی دن، دوپہر کے وقت کالج کے لان میں ملاقات ہوئی، مولانا بڑی محبت سے ملے اور جامعہ میں میری خلاف توقع آمد پر مسرت کا اظہار کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جامعہ میں میری آمد، خود میرے لیے بھی خلاف توقع تھی۔ میں اس زمانہ میں میرٹھ اپنے وطن سے ماہ نامہ "المحرم" نکالتا تھا۔ کچھ تصنیف و تالیف کا بھی مشغلہ تھا اور اپنی کتابیں، اپنے مکتبہ سے شائع کرتا کرتا تھا اس کے علاوہ کچھ آبائی دینی ذمہ داریاں بھی انجام دینی پڑتی تھیں۔ رسالہ اور کتابوں کی طباعت کا مکمل کام دہلی میں انجام پاتا تھا اور اشاعت میرٹھ سے ہوتی تھی۔ اسی دوران ایک مخلص دوست نے برسبیل ملاقات تذکرہ فرمایا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وہاں کے ممتاز استاذ مولانا محمد اسلم جیراج پوری کی وفات سے تفسیر و تاریخ اسلام کے پروفیسر کی جو جگہ خالی ہوئی ہے اور دو سال سے خالی پڑی ہے، اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کے لئے پرنسپل کالج اعزاز الدین خاں اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب سے تحریک کروں۔ میں نے جواب کے لئے کچھ مہلت طلب کی۔ میں نے غور کیا۔ چونکہ میرے اشاعتی و طباعتی کام کا زیادہ تر تعلق دہلی سے تھا پھر دہلی اور میرٹھ کے درمیان صرف ۴۴ میل کا فاصلہ تھا، نیز جو کام جامعہ میں مجھے انجام دینا تھا، اس میں دو تین گھنٹے روزانہ سے زیادہ کی مصروفیت نہ تھی اور تنخواہ بھی اس زمانہ کے لحاظ سے معقول تھی، اس لئے میں نے غور کرنے کے بعد اپنے دوست کو ارباب جامعہ سے گفتگو کی اجازت دیدی۔ پرنسپل صاحب اور شیخ الجامعہ سے مختصر ملاقات کے بعد فوراً ہی میرے پاس شیخ الجامعہ کا خط آگیا جس میں مجھے اس وقت کے جامعہ کے سینیر گریڈ میں جامعہ کالج کے شعبہ اسلامیات کی پروفیسری کی پیشکش کی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے تو نہیں مگر میری کتابوں سے متاثر ہو گئے تھے جن کو میں ملاقات کے وقت ان کی خواہش کے مطابق ساتھ لیتا گیا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میرے تقرر سے مولانا کی کچھ حق تلفی ہوئی تھی، مگر غالباً

تعطیلات کے بعد جب وہ جامعہ تشریف لائے تو ان کو اچانک میری آمد کا علم ہوا، وہ مجھ سے بڑی بشاشت اور تپاک کے ساتھ ملے اور صرف یہ فرمایا کہ "مجھے خیال نہ تھا کہ آپ بھی جامعہ آنا چاہیں گے" پھر ہمیشہ میرے ساتھ ان کا برتاؤ محبت، کرم، اخلاص اور ایثار کا رہا۔ وہ میری بڑی لڑکی کی شادی میں میرٹھ بھی تشریف لائے۔ پھر ہمیشہ دوبارہ میرٹھ آنے کا شوق ظاہر کرتے رہے۔ کام کی تقسیم کے سلسلہ میں طریقہ یہ رہا کہ انٹرمیجیٹ اور بی۔اے کی دو دو کلاسوں میں سے، ترتیب وار، ایک دن ایک کلاس میرے پاس رہتی تھی اور دوسری ان کے پاس۔ پھر دوسرے سال برعکس (ایم۔ اے کی کلاسیں جاری نہیں ہوئی تھیں) اپنے شعبہ کا ٹائم ٹیبل ہم دونوں مل جل کر بنالیتے تھے اور کوئی اہم کام ایسا نہ تھا جس میں مولانا میری رائے معلوم نہ کر لیتے ہوں۔ مولانا بڑے حلیم الطبع، متواضع اور شیریں کلام تھے۔ گفتگو کا انداز بڑا متواضعانہ اور مخلصانہ تھا اس لئے پندرہ سال کی طویل معاصرانہ رفاقت

یں کبھی کشمکش اور آویزش کی صورت پیش نہ آئی۔ اور ہم دونوں کے تعلقات محبانہ ومخلصانہ رہے۔

مجھے اپنے متعلق اعتراف ہے کہ میں تیز مزاج ہوں، مگر میرے مزاج کی تیزی مولانا کی حد سے بڑھی ہوئی نرمی کے ساتھ مل کر نقطۂ اعتدال پیدا کر دیتی تھی اور جلد ہی مجھے ندامت اور معذرت کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جانا پڑتا تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد جب مولانا سے ملاقات ہوتی مولانا اکثر فرماتے "قاضی صاحب ہم اور آپ اتنی مدت ساتھ رہے کبھی ہمارے درمیان اَن بن نہیں ہوئی"۔ میں اس کی تصویب کرتا، مگر کہہ دیتا مولانا اس کا کریڈٹ آپ ہی کو پہنچتا ہے۔ مولانا مسکرا کر فرماتے نہیں یہ بات نہیں ہے۔

دراصل مولانا اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہم مزاج تھے جن کا قول تھا "اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال برابر بھی تعلق ہو تو میں اس کو منقطع نہیں ہونے دیتا۔ جب وہ اسے کھینچتے ہیں تو میں ڈھیل دے دیتا ہوں اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں"۔ پھر مولانا قدوائی مرحوم جو کچھ زبان سے فرماتے تھے وہ ان کے دل کی آواز ہوتی تھی۔ ریا اور نفاق آج ہمارے معاشرے کے عام مرض ہیں جن سے نہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب محفوظ ہیں نہ ہمارے اہل علم اور دیندار طبقہ کے لوگ۔ مولانا کو اس مرض کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ ان کی زبان جتنی شیریں تھی دل بھی اتنا ہی صاف تھا، میں نے کبھی نہیں سُنا کہ انہوں نے پسِ پشت بُرائی کی ہو۔

ابھی ان کے صاحبزادے مولوی محمد سالم قدوائی کا علی گڑھ سے خط آیا ہے جو میرے تعزیت نامہ کے جواب میں ہے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں،

"آپ ان سے اور وہ آپ سے جامعہ کی زندگی میں بہت قریب رہے، ہمیشہ آپ کا ذکر بہت ہی اچھے انداز میں کرتے تھے"۔

یہ محض مولانا کی عالی ظرفی تھی ورنہ "من آنم کہ من دانم"، میری ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ میرے اور مولانا کے درمیان اگرچہ مادرِ علمی کا اشتراک نہ تھا وہ ندوۃ العلماء کے فاضل تھے، اور میں دار العلوم دیوبند کا فیض یافتہ مگر مسلک و مشرب کے لحاظ سے ہم دونوں بہت قریب تھے۔ مولانا، شاہ ولی اللّٰہی حنفی تھے، یعنی فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے حدیث صحیح کو نظر انداز نہیں کرتے تھے میں بھی اس کو اہمیت دیتا ہوں۔

وہ بدعات سے نفور تھے میرا بھی مزاج کچھ ایسا ہی ہے۔ مولانا اسلامی جماعتوں میں جمعیۃ علماء سے زیادہ قریب تھے میرا بھی یہی طرز عمل ہے البتہ وہ مجھ سے کچھ بڑھ کر پکے کانگریسی بھی تھے۔ چنانچہ ہمیشہ گاندھی کیپ اور گاڑھے کے کپڑے استعمال کرتے رہے۔

تحریک خلافت کے زمانہ شباب میں ان کے تعلیمی دور کا آغاز ہوا، کسی زمانہ میں اپنے رفیق درس مولوی رئیس احمد جعفری ندوی مرحوم کے ساتھ مل کر اخبار "خلافت" بمبئی کے ادارتی فرائض بھی انجام دیے۔ انکی کانگریسیت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی زمانہ کی دین تھی۔ وہ اکابر جامعہ، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے شاگرد بھی رہ چکے تھے جن کو گاندھی جی کے معتقدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ان کے ان اساتذہ کو ان پر فخر اور اعتماد تھا۔

ندوۃ العلماء میں انہوں نے اسلامی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی تھی اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ آکر انہوں نے انگریزی اور علوم جدیدہ کی تحصیل کی تھی۔ اس لئے تفسیر وحدیث وفقہ میں عالمانہ بصیرت کے ساتھ ان کو حالات زمانہ اور عصری ضروریات سے واقفیت بھی تھی۔ چنانچہ عصر جدید کے پیدا شدہ مسائل، فقہ اسلامی کی تدوین جدید، موجودہ معاشی مسائل کے اسلامی حل، ہندوستانی سیاسیات میں مسلمانوں کی راہ عمل، قدیم تعلیمیافتہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ دانشوروں کے درمیان فکری وعملی ارتباط کی ضرورت، عربی مدارس کے قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح جیسے مباحث میں مولانا کی رائے بڑی معتدل، متوازن اور مبصرانہ ہوتی تھی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ارباب فکر اسے بڑی اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ عصر جدید اور اسلام سوسائٹی کے سیمناروں اور اس کے آرگن "عصر جدید اور اسلام" ان موضوعات پر ان کے جو مقالات اور مضامین پڑھے گئے اور شائع ہوئے، وہ جدید تعلیم یافتہ حلقوں میں خصوصیت کے ساتھ پسند کئے گئے۔ وہ ڈاکٹر عابد حسین مرحوم کی قائم کردہ اس سوسائٹی کے رکن اور اس کے ترجمان عصر جدید اور اسلام کے ادارتی بورڈ کے رکن بھی تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اس ادارہ کے لئے اسلامی افکار وتعلیمات پر ایک کتاب بھی لکھ رہے تھے۔

ان کا انداز تحریر، سادہ مگر شگفتہ موثر دل نشیں اور فکر انگیز ہوتا تھا۔ مختصر الفاظ میں سہل طریقہ پر کام کی بات کہنا پسند کرتے تھے۔ الفاظ کی طلسم بندی اور عبارت آرائی ان کی تحریر میں نہ ہوتی تھی۔ ان کی تقریر کا بھی انداز یہی تھا۔ جامعہ کے سیرت کے جلسوں میں اور جمعہ کے دن خطبہ میں وہ تقریر فرمایا کرتے

تھے۔ کوئی آیت یا حدیث پڑھ کر اس کی آسان زبان میں تفسیر و تشریح فرماتے اور مختصر الفاظ میں ایسی کام کی باتیں بیان کرتے جو عقیدہ و عمل کی اصلاح میں کارگر ہوتیں، میں نے ان کی کوئی تقریر آدھ گھنٹہ سے زیادہ کی نہیں سنی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دانشور جو دینی معاملات میں اختصار پسند ہیں ان کی اس ادا کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کی تصنیفات کا دائرہ بھی مختصر اور محدود ہی رہا۔ ان کی کتابیں ہماری بادشاہی (مختصر تاریخ اسلام) اور ہندوستان کی کہانی (مختصر تاریخ ہند) جامعہ کے دور سے پہلے کی ہیں اور سہولت اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ اکثر مدارس میں داخل نصاب ہیں۔

جامعہ آنے کے بعد، انہوں نے "دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد" کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب لکھی جسے اہل علم و نظر کے حلقوں میں پسند کیا گیا، اس کے علاوہ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ بھی "مکتبہ جامعہ دہلی" کے اہتمام سے شائع ہوا۔ طلبہ جامعہ کے لیے انہوں نے اسلامی و تاریخی مضامین کے دو مجموعے بھی ترتیب دیے جو مکتبہ جامعہ سے ہی شائع ہوئے۔ عصر جدید اور اسلام سوسائٹی کی طرف سے شائع ہونے والی زیر ترتیب کتاب کا ذکر میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ خدا کرے وہ مکمل طور پر مرتب ہو چکی ہو۔

ان کے علاوہ ان کی ایک کتاب بقامت کہتر و بقیمت بہتر "عربی زبان کے دس سبق" بھی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قواعد عربی میں سے دس اہم اور بنیادی قواعد سہل اور دلچسپ انداز میں سمجھا کر مشقوں میں ان کا اجراء کرایا ہے۔ یہ کتاب عربی کی ابتدائی تعلیم کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی ہے اور ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد، دار المصنفین اعظم گڑھ کے قیام کے مختصر زمانہ میں انہوں نے "سیرۃ النبیؐ" کے ابتدائی حصوں کی تلخیص بھی کی ہے۔

سلاست، سہولت، جامعیت، افادیت اور اختصار ان سب کتابوں کا مشترک وصف ہے۔

مولانا کا علم و فضل اور ان کی قدرت تحریر اس سے زیادہ کی متقاضی تھی مگر طلبہ کے مسائل سے عملی دلچسپی، ان کی خدمت و تربیت، اور اپنے اور بیگانے ہر ضرورتمند کی ضرورت کی تکمیل میں مصروفیت، ان کو اس سے زیادہ کا موقعہ نہ دے سکی۔

مولانا کی عادت تھی کہ وہ ہر شخص سے اس کے مذاق کے موضوع پر بات کرتے تھے۔ مجھ سے گفتگو میں

اکثر وہ اکابر دیوبند کے فضائل و مکارم کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت مولانا میاں اصغر حسین رحمہما اللہ سے زیادہ مستفید و متاثر ہوئے تھے۔ اس عقیدت کی بنیاد ان دونوں بزرگوں کی تصنیفات تھیں جن کا مولانا نے شوق اور غور اور دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا۔

اس سلسلہ میں وہ اپنے دیوبند کے اس سفر کا تذکرہ جو انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کے ساتھ، ان کے نگراں اور رہنما کی حیثیت سے کیا تھا، بھی کیا کرتے۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں ان کے اور طلبہ ندوہ کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی جلسہ ہوا تھا۔ ان کو تخت پر بٹھایا گیا اور اکابر دارالعلوم ان کے ساتھ بیٹھے دیوبند کے استاذ حدیث حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ندوہ اور دیوبند کے اکابر کے تعلقات کا تذکرہ فرمایا اور ندوۃ العلماء کے نمائندہ کی حیثیت سے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ جواباً انہوں نے بھی علماء دیوبند سے اپنی عقیدت اور محبّت کا اظہار کیا۔

اپنی مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے انہیں قلبی و ذہنی ارتباط تھا اپنی تعلیم اور پھر اپنی تدریس کے زمانہ کا وہ بڑے جذباتی انداز میں ذکر کیا کرتے تھے۔ جو عمر کا حصہ وہاں گزرا اسے ''حاصل زندگانی'' سمجھتے تھے۔ جامعہ آنے کے بعد بھی اس کے تعلیمی و انتظامی مسائل سے ان کو گہری دلچسپی رہی۔ وہ ندوہ کو مولانا شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمہما اللہ کی آرزؤں اور تمناؤں کا پیکر اور ان کے حسین خوابوں کی تعبیر دیکھنا چاہتے تھے اور اپنی خصوصیات میں اسے ہندوستان کے دوسرے قدیم و عظیم مدارس سے ممتاز دیکھنا چاہتے تھے مخلصی مولانا ابوالحسن علی میاں کا ذکر محبت اور احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرتے ان کے زمانہ میں ندوہ نے جو صوری و معنوی ترقی کی ہے اور اسے عالم اسلام کا مطمح انظار بنادیا ہے اس کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ''اب تو ندوہ اور مولانا علی میاں لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔'' ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے تو وہ رکن عرصۂ دراز سے ہی تھے۔ جامعہ سے ریٹائر ہونے کے بعد، ندوہ سے اسی گہرے تعلق کی بناء پر ان کو بالاتفاق دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ''معتمد تعلیمات'' منتخب کیا گیا۔ یہ منصب ندوہ میں دارالعلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات کے منصب کے مماثل ہے۔ کسی زمانہ میں علامہ سید سلیمان ندوی اس منصب کی زینت تھے، پھر جب ندوۃ العلماء کے علمی و تصنیفی ادارہ دارالمصنفین میں، مولانا شاہ معین الدین احمد مرحوم کی یکایک وفات پر ناظم دارالمصنفین کی مسند خالی ہوئی تو ارباب ندوہ کی نظر ان ہی پر پڑی اور ان کو اس منصب پر بھی فائز کیا گیا اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے ساتھ

دارالمصنفین کے شہرۂ آفاق ترجمان "معارف" کا مدیر بھی بنایا گیا۔ یہ سہ گانہ ذمہ داریاں وہ بڑی مستعدی اور شوق سے زندگی کے آخری لمحات تک ادا کرتے رہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی ان کی مادر علمی تھا۔ اس سے بھی ان کو محبت اور قلبی تعلق تھا۔ مولانا کے ریٹائرمنٹ پر انکو الوداعی پارٹی دی گئی تو اس میں الوداعی تقریر کرتے ہوئے ان کی آواز گلوگیر ہوگئی اور پھر جب وہ میرے ساتھ کمرہ سے باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے سیلاب اشک رواں تھا۔

مولانا کا ایک اہم کارنامہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی عمارتوں میں ایک حسین و شاندار مسجد کا اضافہ ہے۔ جامعہ میں ماضی قریب تک کوئی مسجد موجود نہ تھی۔ جمعہ کی نماز بھی مدرسہ ابتدائی کے ایک بڑے کمرہ میں ہوتی تھی جسے "محمد علی ہال" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ جامعہ کے دین دار حلقوں میں اس کا شدید احساس تھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہوتے ہوئے بھی اسلامیت کی امتیازی علامت سے محروم ہے۔ مولانا اور ان کے ساتھ جناب ڈاکٹر سعید انصاری اور یہ خاکسار، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (جو اس وقت نائب صدر جمہوریہ تھے) اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب سے اس سلسلہ میں بار بار ملے، آخر یہ جدوجہد کامیاب ہوئی اور اب الحمدللہ، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے مقبرہ اور جامعہ لائبریری کی شاندار عمارتوں کے جھرمٹ میں ایک حسین و جمیل مسجد کے بلند و بالا مینار یہ اعلان کرتے نظر آتے ہیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں کا تعلیمی مرکز ہے۔ اس مسجد کا نقشہ عالم اسلام کے مشہور ماہر تعمیرات محمد فیاض الدین صاحب حیدرآبادی کے موئے قلم کا شاہکار ہے اور دہلی کی عالیشان مسجدوں میں یہ مسجد ایک قابل دید اضافہ ہے۔

مولانا کی زندگی قلندرانہ گزری۔ جامعہ کے آخری دور میں اگرچہ تنخواہ معقول ملتی تھی، مگر اپنی ذات پر کم ہی صرف کرتے تھے۔ ماشاء اللہ اولاد خاصی تھی اور سب کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ طلباء اور دوسرے ضرورتمندوں کی خاموش دستگیری کرتے تھے۔ ان کے مردانہ کے مختصر کمرہ میں کوئی نہ کوئی طالب علم بھی مقیم رہتا تھا بلکہ اپنے تعلق رکھنے والے ضرورتمندوں کو بعض اوقات گھر کے ایک حصہ میں جگہ دیدیتے تھے۔

مولانا ۱۹۴۸ء میں، خواجہ عبدالحی صاحب مرحوم کے ترک ہندوستان کرنے کے بعد جامعہ آگئے تھے۔ اس زمانہ میں جامعہ نگر میں ہو کا عالم تھا۔ چاروں طرف میدان کے میدان خالی پڑے تھے۔ ان کے ساتھیوں نے اس زمانہ میں آٹھ آنے گز پر زمینوں کے سودے کر کے شاندار اور وسیع کوٹھیاں تعمیر کرلیں، مگر مولانا نے جامعہ میں جامعہ ہی کے ایک پرانے مکان میں زندگی گزار دی اور ریٹائرمنٹ کے بعد بستر باندھ کر اپنے وطن

تھولینڈی (ضلع رائے بریلی) کا راستہ لیا۔

مولانا کی وفات بھی قابلِ رشک طریقہ پر ہوئی۔ رمضان المبارک کے آخری دنوں میں، عید منانے، اعظم گڑھ سے اپنے وطن تشریف لائے۔ ۳۰ رمضان المبارک کی شب کو سحری کے وقت اٹھے، گھر والوں کو سحری کے لئے جگایا، تہجد کی نماز کے لئے وضو کیا تو کمزوری محسوس کی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ صبح ہوتے دماغ پر فالج کا حملہ ہوا اور جمعۃ الوداع کی اذان کے وقت اپنے مولائے کریم کے دربار میں حاضری دی۔

اگلے روز عید تھی۔ عیدگاہ میں ہزاروں غم گساروں نے اس محبوب مقتدا کی نمازِ جنازہ ادا کی، اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے جمِ غفیر نے، سوگوار چہروں اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ سپردِ خاک کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ہ وانا بفراقہ لمحزونون۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً شاملۃً کاملۃً۔

دعوت اتحاد و تعاون

. . . یہ باتیں عرصہ سے ہو رہی ہیں اب شاید مشکل ہی سے کوئی حلقہ ایسا ہو جو حالات کی نزاکت کو محسوس نہ کرتا ہو اور اس کے تدارک کے لئے بے قرار نہ ہو۔ ضرورت ہے کہ یہ باتیں اب عمل کا قالب اختیار کریں اور خیالی خاکوں میں حقیقت کا رنگ بھرا جائے۔ دین و ملت کے خدمت گذار کسی جگہ جمع ہوں، جزئی اور فروعی اختلافات نظر انداز کر کے مستقبل کی فکر کریں اور آنے والے خطرات کے پیشِ نظر ایک نئی تنظیم اور ایک نئے اتحاد کی بنیاد ڈالیں، جہاں تک ندوہ کے خادموں کا تعلق ہے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اتحاد و تعاون کے لئے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں۔

(مولانا عبد السلام قدوائی ندوی مرحوم)

"میرے مولانا"

"میرے مولانا" کی ترکیب عربی قواعد کی رو سے بھلے ہی غلط ہو
لیکن اس میں جو اپنائیت ہے وہ قواعد کے اعتبار سے صحیح لفظ
"مولانا" میں کہاں!

ڈاکٹر شبیر الحق (پروفیسر مطالعۂ اسلامیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)

اسی رمضان (۱۳۹۹ھ) کی ۳۰ تاریخ تھی اور جمعۃ الوداع کا مبارک دن۔ عیسوی کلنڈر کے حساب سے ۲۴ اگست ۱۹۷۹ء ۔ کہ دار المصنفین کے ناظم علمی اور مدیر معارف، دار العلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیمات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق استاد اسلامیات اور ناظم دینیات، میرے محترم استاد مولانا عبد السلام قدوائی ندوی نے اپنے وطن مالوف تھولینڈی (ضلع رائے بریلی) میں اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی کہ اس کی دی ہوئی تھی، دوسرے دن دوگانۂ عید کے بعد ملک کے مشہور عالم اور مولانا کے عمر بھر کے ساتھی، استاد محترم، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور ان کے گاؤں کے ہزاروں ہندو اور مسلمان ان کے جسد خاکی کو خود انھیں کے اپنے لگائے ہوئے آموں کے باغ کے ایک کونے میں سپرد خاک کر آئے، بیماری اور موت سب کچھ اتنی چٹ پٹ ہوئی کہ جب تک لوگ ان تک آتے آتے وہ سب سے منہ موڑ کر جا چکے تھے، اپنے رب سے ملنے کے لئے۔

مولانا سے میرا تعلق دسمبر ۱۹۴۵ء یا جنوری ۱۹۴۶ء سے شروع ہوا جو پورے تسلسل کے ساتھ ان کی وفات تک باقی رہا، ۳۳ برس کی مسلسل رفاقت کوئی معمولی رفاقت نہیں ہوتی، خصوصاً جب تعلقات اپنی ظاہری نوعیت کے اعتبار سے مختلف نہج کے ہوں، اس پوری مدت میں ان کا اور میرا تعلق افسر و ماتحت کا بھی رہا ہے اور استاد و شاگرد کا بھی ۔ باپ اور بیٹے کا بھی، اور شاید لوگ اسے

چھوٹا منہ اور بڑی بات سمجھیں لیکن بے تکلف دوست اور رازدار رفیق کا بھی۔ اس طویل مدت میں مولانا کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا ہے اور اگر یہ دعویٰ کروں کہ اتنے قریب سے دیکھا ہے جہاں درمیان میں کوئی کا پردہ نہیں رہ جاتا تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کسی شخص سے بہت زیادہ قربت مفید بھی ہوتی ہے اور مضر بھی۔ سب سے بڑا نقصان یہی ہوتا ہے کہ زبردستی کا اوڑھا ہوا لبادہ نظروں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور انسان کی اصل شخصیت عریاں ہو کر سامنے آجاتی ہے، مولانا کے جسم پر بھی ایسا کوئی لبادہ نہیں رہ گیا تھا لیکن خدا گواہ ہے کہ ان کے ظاہر و باطن میں مجھے کوئی فرق نظر نہ آیا، وہ گھر بازار، درجہ دفتر دارالعلوم یونیورسٹی ہر جگہ یکساں تھے۔

میرے مولانا ایک بڑے عالم اور ایک بہت ہی پیارے انسان تھے، ان کی ذات میں علم اور انسانیت دونوں ہی کچھ اس طرح رچ بس گئی تھیں کہ انھیں الگ الگ کرنا ممکن نہ تھا، اپنے دوسرے بہت سارے ہم عصر علماء کے برخلاف مولانا نے صرف روایتی معنوں میں دینی اور مذہبی ماحول میں زندگی بسر نہیں کی تھی، بلکہ دینی کے ساتھ ساتھ وہ دنیاوی ماحول میں بھی رہے، لیکن کنول کے پھول مولانا کو فخر کرنے کا پورا موقع حاصل تھا کہ وہ ہندوستان کی دو مشہور دینی اور دنیاوی درس گاہوں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے طالب علم بھی رہ چکے تھے اور استاد بھی۔ اس کے علاوہ وہ جامعہ کے ناظم دینیات بھی تھے اور ندوہ کے معتمد تعلیمات بھی۔ پھر آخر آخر میں جب دارالمصنفین کو ان کی خدمات کی ضرورت پڑی تو انھوں نے خرابی صحت کے باوجود وہاں کی نظامت علمی کا بار بھی اٹھا لیا، لیکن جو کام صرف ان کا اپنا اکیلا کہا جائے گا وہ ادارۂ تعلیمات اسلام لکھنؤ کا قیام تھا، انھیں اس بات کی بہت فکر رہتی تھی کہ پڑھے لکھے، کام دھندے کے لگے ہوئے لوگوں کو کم سے کم وقت میں اتنی عربی کسی نہ کسی طرح ضرور سکھا دی جائے کہ وہ اس کے سہارے قرآن شریف کو خود سے سمجھ کر پڑھ سکیں، اس کے لئے انھوں نے عربی زبان کے دس ضروری اور بنیادی اسباق مرتب کئے جن کو ختم کر لینے کے بعد بالغ تعلیم یافتہ طالب علم قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنے کی ابتدا کر دیتا تھا۔ جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمت تدریس سے الگ ہوئے تو مئی ۱۹۴۲ء میں انھوں نے لکھنؤ کے مرکزی علاقہ امین آباد میں ایک مکان کرایہ پر لے کر ادارہ تعلیمات اسلام کی بنیاد ڈالی، یہ ادارہ دیکھتے ہی دیکھتے لکھنؤ کی علمی اور دینی زندگی کا مرکز بن گیا، لکھنؤ سے باہر کے طالب علموں کو خط و کتابت

کے ذریعہ تعلیم دی جاتی تھی ہر جمعہ او رسنیچر کو بعد نماز مغرب درس قرآن اور درس حدیث ہوا کرتا تھا۔ درس قرآن کی ذمہ داری مولانا علی میاں کے سر تھی اور درس حدیث میرے مولانا دیا کرتے تھے، عربی زبان کی تعلیم کے علاوہ مولانا کم تعلیم یافتہ اردو دانوں کے لیے سیرت و تاریخ کے موضوع پر چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرنے شروع کیے۔ آج تو بازار میں اس قسم کے کتابچوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن جس وقت مولانا نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا اس وقت یہ ایک بالکل بنجر میدان تھا۔ شروع شروع میں ادارہ کی مالیات کی ذمہ داری اٹھانے والے لکھنؤ کے چند اہل دل مسلمان سرکاری ملازمین تھے جن میں سرفہرست سید اصغر حسن صاحب اسسٹنٹ سکریٹری محکمہ انہار (یوپی) اور شیخ ظہور الحسن صاحب مرحوم (محکمہ مال) تھے۔ ہاں ادارہ کے ایک اور پرجوش مبلغ انشاء اللہ خاں صاحب بھی تھے۔ یہ یوپی سکریٹریٹ میں غالباً سپرنٹنڈنٹ تھے اور دینی ذوق کی وجہ سے صغیر صاحب اور ظہور صاحب کے حلقہ احباب میں آ گئے تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ ادارہ نے "دس دن میں عربی سیکھئے"، کے عنوان سے جو چھوٹے چھوٹے اشتہارات شائع کیے تھے انھیں اپنی چھتری پر چپکا کر بلا تکلف بازاروں میں گھومتے تھے۔ اس طرح یہ ادارہ کا چلتا پھرتا اشتہار بن کر رہ گئے تھے۔

ادارہ ابھی اچھی طرح اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا اور ادارہ اور اسکے ہمدردوں کی بساط پلٹ گئی۔ اب تو وہ زمانہ تاریخ کا ایک ورق بن کر رہ گیا ہے لیکن اس تاریخ کے عینی شاہد ابھی باقی ہیں۔ وہ ایک ایسا افراتفری کا دور تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ کی خبر نہیں ہوتی تھی ہندوستانی مسلمانوں کا پورا جسم ایک طرح سے پیر بن کر رہ گیا تھا۔ لوگوں کے قدم اکھڑ چکے تھے۔ اس وقت ادارہ سے ایک پندرہ روزہ رسالہ نکالنے کا منصوبہ بنایا گیا جس کا پہلا شمارہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۸ء کو "تعمیر"، کے نام سے مولانا اور ان کے رفیق کار مولانا علی میاں کی ادارت اور میرے اہتمام میں نکلا۔ تعمیر کا اس وقت صرف یہی ایک بنیادی مقصد تھا کہ مسلمان اپنے دلوں سے ہر قسم کے خوف اور اندیشے کو نکال دیں اور ہجرت کے بہانے اس ملک سے نہ بھاگیں، یہیں جمے رہیں اور ثبات قدمی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں۔ تعمیر میں لکھنے والوں کا حلقہ بہت محدود تھا، یہ نہیں کہ لکھنے والوں کی کمی تھی بلکہ اس لیے کہ ایک خاص لگن سے لکھنے والے کم تھے اور جو تھے وہ پا بہ رکاب تھے، اس لئے زیادہ تر مضامین اہل ادارہ ہی کے ہوتے تھے۔ اگرچہ

تعمیر کی ادارت دو عالموں کے سر تھی لیکن پہلے ہی شمارہ سے اس بات کا اہتمام رکھا گیا تھا کہ سنجیدہ مضامین کے ساتھ ساتھ کہانیوں اور ڈراموں کے انداز میں ہلکی پھلکی چیزیں اور کچھ نظمیں اور غزلیں بھی ضرور ہوا کریں۔ "ادب لطیف" لکھنے کی ذمہ داری تو مولانا نے میرے سر ڈالی۔ مجھے اس میں فن اور دلچسپی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ صفحات اور کبھی کبھی سطروں کی گنتی کو بھی ذہن میں رکھنا پڑتا تھا کیونکہ اکثر "جائے تنگ" والی بات آپڑتی تھی۔ نظموں اور غزلوں کا معاملہ کچھ ایسا تھا کہ وہ بن مانگے بھی مل سکتی تھیں لیکن دشواری انتخاب کی تھی۔ شعرا اپنے ہر شعر کو حاصل کلام جانتے تھے اور مولانا مقراض ادارت کے بے دھڑک استعمال کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس طرح بہت سے آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ شروع میں اس کا حل یہ نکالا گیا کہ غیر مطبوعہ کلام کے بجائے زندہ اور مردہ شاعروں کے مجموعوں میں سے "حسب منشا" اشعار نکال کر ان پر اپنی طرف سے حسب حال سرخی جما کر انھیں شائع کیا جاتا تھا۔ اس طرح جب وہ غزلیں اور نظمیں تعمیر میں شائع ہوتی تھیں تو پڑھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ میر و مرزا اور جوش و فیض نے یہ چیز "خاص برائے تعمیر" لکھی تھی۔ ادارہ کی مالی حالت روز بروز گرتی ہی چلی گئی۔ رہی سہی کسر تعمیر نے پوری کر دی۔ عوامی چندہ تو ادارہ کو کبھی ملا نہیں، دو ایک ہمدرد جو اپنی جیب سے کچھ دیا کرتے تھے وہ یا تو پاکستان جا چکے تھے یا جو رہ گئے تھے وہ گاڑی کو گھسیٹتے گھسیٹتے تھک چکے تھے۔ کتابوں کی فروخت ـــ واضح رہے کہ آمدنی نہیں ـــ صرف فروخت سے دن و رات کٹ رہے تھے۔ تعمیر کا خرچ خریداروں کے چندہ کی آمدنی سے زیادہ تھا۔ ۵۰۔۱۹۵۱ء تک پہونچتے پہونچتے ادارہ پر پوری طرح سے بیغمبری وقت پڑ چکا تھا۔ کارکنوں کی تنخواہیں باقی رہ جاتی تھیں کیونکہ قومی اداروں کی سب سے کمزور مخلوق یہی ہوتی ہے۔ کاغذی، کاتب، پریس مین، مالک مکان، کسی کا بل کوئی ادارہ نہیں روک سکتا۔ قربانی کی چھری جب گرتی ہے تو بے چارے کارکنوں کی گردنوں پر، لیکن خون کے چھینٹے کسی کو نظر نہیں آتے۔ بہر حال حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور ادارہ کو بند کر دینے کی بات دلوں سے نکل کر زبانوں پر آنے لگی۔

مولانا کے ندوہ اور جامعہ کے دور طالب علمی کے ساتھی اور بہت ہی گہرے دوست رئیس احمد جعفری مرحوم تقسیم کے بعد پاکستان جا چکے تھے۔ انہوں نے اور مولانا نے جامعہ کے بعد روزنامہ خلافت بمبئی سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ مولانا تو دو ہی ایک برس میں وادی صحافت سے نکل کر ندوہ میں استاذ کی

حیثیت سے آ گئے لیکن جعفری صاحب کو یہ میدان ایسا بھایا کہ وہ اس سے باہر نہ نکل سکے۔ تمام عمران کی یہ خواہش رہی کہ مولانا بھی کسی طرح ان کے پاس پہونچ جائیں سنہ ۱۹۴۳ء میں جب مولانا ندوہ سے علٰحدہ ہوئے تھے تو جعفری صاحب یہ چاہتے تھے کہ مولانا ان کے پاس بمبئی چلے جائیں لیکن مولانا ادارہ کی دوکان لگا کر لکھنؤ ہی میں بیٹھ رہے۔ تقسیم کے بعد جب ادارہ کی مالی حالت قابو سے باہر ہوتی گئی تو رئیس صاحب نے اصرار کرنا شروع کیا کہ مولانا کراچی چلے آئیں۔ ادارہ کے حالات جب بالکل ہی غیر یقینی ہو گئے تو مولانا بھی ترک وطن کی بات سوچنے لگے اگر مولانا سفر سے گھبراتے نہ ہوتے تو شاید یہ حادثہ ہو بھی جاتا لیکن اپیا (اہلیہ مولانا) اور چھوٹے بچوں کو ساتھ لے کر کراچی کی طرف ہجرت کرنا مولانا کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر اس وقت کوئی ایسی صورت نکل آئی ہوتی کہ اپیا اور بچے کسی کے ساتھ پاکستان چلے گئے ہوتے تو مولانا بھی اس "عذر" پر پاکستان چلے جاتے کہ بیوی بچوں کو کیسے چھوڑ دیا جائے۔ ان دنوں وہ پاکستان جانے کے سلسلے میں اتنے سنجیدہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے کسی فیصلہ پر پہونچنے کے لیے صلوٰۃ استخارہ پڑھنی شروع کر دی کم ہی لوگ جانتے ہوں گے کہ جب مولانا کو کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا تو وہ استخارہ کی نماز پڑھتے اور خواب میں اشارہ کے منتظر رہتے۔ بہر حال سفر پاکستان کے سلسلے میں انہوں نے جو خواب دیکھا اور اس کی جو تعبیریں دی گئیں وہ خود اپنی جگہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے۔ ایک رات مولانا نے خواب میں اپنے کو کراچی کی ایک بڑی مسجد میں جمعہ کی نماز کے وقت دیکھا۔ مسجد اپنی ظاہری شکل وصورت سے مملکت اسلامیہ کے دارالسلطنت کے اگرچہ شایانِ شان نہیں تھی لیکن لوگوں سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ مگر لوگ نماز پڑھنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے زور زور سے آپس میں کچھ بحث کر رہے تھے۔ کچھ لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر مسجد میں لیٹے ہوئے تھے۔ مولانا کو بمشکل آخری صف میں جگہ ملی۔ منبر کی طرف انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک شخص ننگے سر، گھٹنوں سے اوپر تک نیکر پہنے ہوئے خطبہ دیتا ہوا نظر آیا لیکن جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ شور و غل کی وجہ سے سنائی نہیں پڑ رہا تھا۔ مولانا نے منبر تک پہونچنے کی کوشش کی لیکن بھیڑ کی وجہ سے پہونچ نہیں پائے اور ان کی آنکھ کھل گئی۔ صبح جب انہوں نے یہ خواب سنایا تو ان لوگوں نے جو مولانا کے پاکستان چلے جانے کے حق میں تھے، اس خواب کو پاکستان جانے کی تائید میں سمجھا۔ انہوں نے اس کی تعبیر یہ نکالی کہ پاکستان کا دینی ماحول بگڑتا جا رہا ہے اس لیے اشارۃً یہ بتایا گیا ہے

کہ اچھے لوگوں کو وہاں پہونچ کر اصلاح حال کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس خواب کا ذکر مولانا نے جب مولانا محمد منظور نعمانی سے کیا جو اس وقت بریلی سے منتقل ہو کر لکھنؤ آگئے تھے تو انہوں نے اس کا مطلب یہ نکالا کہ مولانا کو پاکستان جانے کے ارادہ سے روکا جا رہا ہے۔ مولانا اپنے خواب میں مسجد کی آخری صفوں سے آگے نہیں بڑھ پاتے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مولانا کو پاکستان میں کام کے مواقع حاصل نہیں ہونگے مولانا چونکہ خود بھی سفر کرنے کے لیئے تیار نہیں تھے اس لئے مولانا محمد منظور نعمانی کی تعبیر ان کے دل کو زیادہ بھائی۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جامعہ میں ان کی ملازمت کے حالات پیدا ہو گئے۔ ناظم دینیات اور استاذ اسلامیات (جامعہ کالج) کے عہدوں کی جامعہ کی طرف سے انہیں پیش کش ہوئی جسے کچھ تھوڑے سے تامل کے بعد انہوں نے قبول کر لیا، اور ۷ اگست ۱۹۵۱ء کو جامعہ چلے آئے۔ ان کے جامعہ چلے آنے کے بعد ان کے دوسرے سینیئر رفیق مولانا عبدالغفار ندوی بھی کل وقتی طور پر جماعت اسلامی کی خدمت میں لگ گئے، اور ادارہ میں صرف میں اور احتشام صاحب (احتشام علی ندوی رحیم آبادی) رہ گئے۔

مولانا کے جامعہ چلے جانے کے بعد تقریباً دو برسوں تک کسی نہ کسی طور سے تعمیر نکلتا رہا۔ اب ادارۂ تحریر میں میرا نام بھی شامل کر لیا گیا تھا، کیونکہ مولانا دہلی میں رہتے تھے اور مولانا علی میاں اپنا زیادہ تر وقت تبلیغی جماعت اور ندوہ کو دیتے تھے۔ بہرحال کچھ دنوں تک لشٹم پشٹم تعمیر نکلتا رہا۔ آخر کار ۱۹۵۳ء میں رسالہ نے آخری ہچکی لے لی۔ مولانا کے جامعہ چلے جانے کے بعد میں ایک شبینہ اسکول میں سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اس اسکول کے ذریعہ میں نے ۱۹۵۲ء میں یو پی بورڈ کا ہائی اسکول اور ۱۹۵۴ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا۔ لکھنؤ میں پرائیوٹ طور سے بی۔ اے کرنے کی سہولت نہ تھی۔ ان امتحانات کے دوران مجھ پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا تھا کہ میں ریاضی کا اچھا طالب علم ہوں۔ اس وجہ سے میں انٹرمیڈیٹ کے بعد انجینیرنگ کی لائن میں جانا چاہتا تھا۔ لکھنؤ کے ہیوٹ انجینیرنگ کالج میں داخلہ منظور بھی ہو گیا تھا لیکن مالی ذرائع لکھنؤ میں ایسے میسر نہ تھے کہ اپنے گھر والوں کے اخراجات کے ساتھ اپنے تعلیمی اخراجات بھی پورے کر سکتا۔ اس لئے میں نے مزید تعلیم کا خیال چھوڑ کر لکھنؤ ہی میں ملازمت کے لئے کوششیں شروع کیں۔ مولانا نے اس سے اختلاف کیا اور مجھے جامعہ میں داخلہ لینے کی رائے دی۔ مولانا کا کہنا یہ تھا کہ جب تک میں نے ہائی اسکول اور ایف۔ اے کے امتحانات نہیں پاس کئے تھے اس وقت تک میں اپنی ندوہ کی تعلیم کی بنیاد

پر پڑھے لکھوں کی محفل میں پڑھا لکھا شمار کیا جا سکتا تھا لیکن اب تعلیم کا رُخ بدل دینے کے بعد اگر میں نے یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کی تو میں کسی طرف کا نہ رہوں گا۔ میری اتنی عمر ہونے کو آئی لیکن یہ فلسفہ میں نے صرف مولانا کی زبان سے سنا کہ آدمی کو اپنی پسند کی تعلیم حاصل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے لیکن وہ جس لائن کو بھی اختیار کرے اس لائن کی اعلیٰ ڈگری اس کے پاس ہونی چاہیئے۔ اعلیٰ ڈگری حاصل کر لینے کے بعد یہ ضروری نہیں ہے کہ اسے ملازمت بھی اعلیٰ مل جائے لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوا جب بھی کم از کم دنیا اس کے ساتھ ہمدردی تو کرے گی اور زمانے کی ناقدری کو روئے گی لیکن اگر اعلیٰ ڈگری نہ ہو تو بے کاری کے ساتھ پڑوسیوں کے طعنے بھی سننے کو ملیں گے کہ اپنے کو اچھی ملازمت کے قابل تو بنایا نہیں اب زمانے کو کس منہ سے گالیاں دیتے ہو۔ بہرحال قصہ مختصر میں ۱۹۵۴ء میں جامعہ آ گیا۔ اور بی۔ اے کے پہلے سال میں مجھے داخلہ مل گیا۔ بورڈنگ کے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہ تھا اس لئے مولانا نے اپنے ساتھ ہی مجھے رکھا۔ جامعہ کی طرف سے فیس تعلیمی معاف کر دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مولانا کی سعی و سفارش سے میں جامعہ کے مختلف شعبوں اور دفتروں میں مختلف اوقات میں کام کر کے اتنا حاصل کر لیتا تھا کہ اپنی اور گھر والوں کی ضروریات کو کسی نہ کسی طرح پورا کر لوں۔ جامعہ میں اس وقت یہ عام رواج تھا کہ لوگ جامعہ کے مطبخ سے ایک متعین رقم کے عوض کھانا جاری کرا لیا کرتے تھے۔ گھروں گھر اسی طرح کھانا جایا کرتا تھا۔ اپیا ان دنوں زیادہ تر ہالینڈ ہی میں رہا کرتی تھیں، کچھ اس لئے بھی مولانا کے یہاں حسب ضرورت کھانا مطبخ سے آتا تھا۔ کبھی کبھی دسترخوان پر اضافہ یا تبدیلی کی خاطر گھر میں بھی کچھ پک جایا کرتا تھا۔ اس طرح میں نے دو سال مولانا کے گھر پر گذارے لیکن کسی ایک دن بھی مجھے ناشتہ دان لے کر مطبخ نہیں جانا پڑا۔ یہ ڈیوٹی مولانا کے لڑکوں کے سر تھی۔ ان میں آپس میں کبھی کبھی باری کے تعین پر اختلاف بھی ہو جاتا تھا لیکن یہ مسئلہ کبھی نہیں اٹھا کہ میری باری کیوں نہیں لگتی۔ ایک دو دن اس قسم کا انتظام چل سکتا ہے لیکن پورے دو سال تک اسے نبھا لیجانا آسان نہ تھا۔ جس زمانے میں اپیا نہ ہوتیں کھانے کے بعد ہر شخص کو اپنی اپنی پلیٹیں خود دھونی پڑتی تھیں، اس میں نہ مولانا کی تخصیص تھی اور نہ میری۔ اس سلسلے میں یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ جب میں جامعہ آیا تو مولانا نے یہ طے کیا کہ میں ہر ماہ انھیں ایک معمولی سی متعینہ رقم دیدیا کروں اور اس کے بعد کھانے، ناشتے، دھوبی کی دھلائی وغیرہ کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں۔

یہ رقم مطبخ کی ماہوار فیس سے کچھ کم ہی تھی۔ جب میں تعلیم سے فارغ ہو کر جامعہ ہی میں کام سے لگ گیا تو ایک دن مولانا نے مجھ سے خود ہی کہا کہ میں تم سے ہر ماہ جو رقم لیا کرتا تھا اس سے تمہیں تکلیف ضرور ہوتی رہی ہوگی اور تم سوچتے رہے ہوگے کہ میں تمہیں کام دلانے کے لئے دفتروں میں مارا مارا پھرتا ہوں لیکن اپنی طرف سے اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ تم سے کھانے کے دام نہ لوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی کبھی ایسی بات سوچی ضرور تھی لیکن اب جب وقت گذر چکا تھا تو مولانا سے کیا کہتا۔ میں نے ان کے جواب میں کہا تو یہ کہا کہ نہیں نہیں مولانا، آپ یہ کیا کہہ رہے۔ مجھے تو اس کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ رقم ہی کون سی زیادہ تھی۔ اتنے میں تو مجھے مطبخ سے دو وقت کا کھانا بھی نہیں مل سکتا تھا۔ لیکن مولانا نے کہا، خیر یہ بات تو تم سعادت مندی میں کہہ رہے ہو، تمہیں خیال ضرور آیا ہوگا۔ خود میری بیوی نے اکثر مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ تم مشیر سے ہر ماہ روپے کیوں لیتے ہو؟ خواہ مخواہ کا نام ہوتا ہے اور اگر لینا ہی ہے تو پھر باقاعدہ حساب کر کے پورے پیسے لو۔ لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ وقت گذر جائے گا، آگے چل کر کسی کو کیا، خود تم کو بھی یہ یاد نہیں رہے گا کہ کتنے روپے تم دیتے تھے —— اور یہ واقعہ ہے کہ اب مجھے بالکل صحیح صحیح رقم یاد نہیں ہے —— صرف اتنی بات لوگوں کو یاد رہ جائے گی کہ تم میرے گھر اپنے خرچ پر رہتے تھے۔ اس طرح میرے اعزہ واقربا تمہیں کبھی طعنہ نہ دے سکیں گے کہ تم ان کے کسی عزیز کی روٹیوں پر پلے ہو۔ اور تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے گھر والوں کی نظریں بھی میرے گھر والوں کے آگے نیچی نہیں ہوں گی —— نیکی کر کے دریا میں ڈالنے والے تو آج بھی مل جائیں گے لیکن مولانا کے ایسے کتنے لوگ ملیں گے جو اس فکر میں لگے رہتے ہوں کہ ان کی طرف ان کی اپنی نیکیوں کی بھی نسبت نہ ہونے پائے۔

جس زمانہ میں مولانا جامعہ کے ناظم دینیات تھے اس وقت جامعہ کے دستور کی رو سے یونی ورسٹی کی دینی زندگی میں ناظمِ دینیات بہت اہم حیثیت کا مالک ہوتا تھا۔ وہ مختلف مجالس اعلیٰ کا اپنے عہدہ کے اعتبار سے ممبر ہوتا تھا، لیکن سب کچھ جامعہ کی "دستوری کتاب" کی رو سے تھا ورنہ عملاً اس کی حیثیت دورِ وسطیٰ کے مضبوط، خود مختار مسلمان بادشاہوں کے شیخ الاسلام سے زیادہ نہیں تھی۔ جامعہ میں مولانا کے کچھ پرانے ساتھی اپنی نجی صحبتوں میں جامعہ کی دینی زندگی میں انحطاط کا رونا رویا کرتے تھے۔ یہ لوگ خود ارباب حل وعقد میں شمار ہوتے تھے لیکن خود سامنے آنے کے بجائے مولانا کو کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے اکسایا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ کے

امراء اور صوبے دار علم بغاوت تو بلند کرنا چاہتے ہیں لیکن عواقب کے ڈر سے شیخ الاسلام کے کندھے کو استعمال کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن مولانا دوسروں کو بندوق ٹکانے کے لئے اپنا کندھا پیش کرنے پر کبھی راضی نہ ہوئے۔ میں اگرچہ جامعہ کے "بڑوں" کی محفلوں میں بہت خورد یا یونیورسٹی کی زبان میں بہت جونیر تھا لیکن مولانا کے ساتھ ہمہ وقت رہنے کی وجہ سے اونچی بارگاہوں میں رسائی تھی، اور میری موجودگی میں لوگ بلا تکلف ایسی باتیں کہہ جاتے تھے جن کا سننا عام حالات میں میرے لئے ممکن نہ تھا۔ جامعہ آنے سے قبل لکھنؤ میں مولانا نے پاکستان کی نسبت سے جو خواب دیکھا تھا وہ اب محسوس ہو رہا تھا کہ شاید جامعہ سے متعلق تھا۔ ایک بار جب اس خواب کا تذکرہ ہو رہا تھا تو میں نے مولانا سے کہا بھی کہ آپ کا استخارہ کس قسم کا تھا کہ آپ نے دیکھا تو پاکستان کے سلسلے میں تھا اور وہ نکلا جامعہ کے بارے میں۔

اختلاف وانتشار سے دامن بچائے رکھنے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ مولانا جامعہ کے ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ مولانا حق بات کہنے سے بچتے رہے ہوں۔ اس کے برعکس وہ ہر موقع پر حق کا اظہار ضروری سمجھتے تھے لیکن اظہار کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ ان کے منہ سے نکلا ہوا حق اپنی کڑواہٹ کھو چکا ہوتا تھا۔ جمعہ اور عیدین کا خطبہ اول وہ بالالتزام اردو میں دیا کرتے تھے، بہت ہی مختصر اور بے لاگ۔ ان خطبوں میں جامعہ کی "سیاست" پر تنقید ہوتی تھی، ملک کے حالات پر تبصرہ ہوتا تھا، اخلاقی سدھار کی طرف اشارات ہوتے تھے غرضیکہ سب ہی کچھ ہوتا تھا لیکن تنقید کا رُخ کبھی ذاتی نہیں ہوتا تھا۔ تقریر میں کسی کی تنقیص نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باوجود سمجھنے والے سمجھ جاتے تھے کہ اس ہفتے مولانا نے کسے اپنا نشانہ بنایا۔

ناظم دینیات ہونے کے ناطے مولانا کے پاس ضرورت مند لوگ فتوی حاصل کرنے کے لئے بھی آیا کرتے تھے، لیکن مولانا نے شاید کبھی کسی فتوے پر دستخط کئے ہوں۔ عام طور سے وہ یہ کہہ دیتے تھے کہ دیوبند یا دہلی کے کسی عالم سے فتویٰ حاصل کر لیجئے۔ اگر کوئی صاحب مولانا ہی کے فتوے پر اصرار کرتے تو مولانا یہ جواب دیتے کہ اگر مجھے یہ کام کرنا ہوتا تو اس اس طرح کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک عیدالاضحیٰ کے موقع پر جامعہ کے ایک راج مستری محمد جمیل صاحب مولانا کے پاس آئے اور بولے کہ انہوں نے بکری کا ایک بچہ قربانی کی نیت سے پالا تھا وہ کھاپی کر خوب تگڑا ہو گیا ہے لیکن اب حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ وہ قربانی کی متعینہ عمر سے کچھ کم ہے، تو کیا اس کی قربانی نہیں ہو سکتی۔ مولانا نے مستری صاحب کو ان صحابی کا قصہ سنایا جنھوں نے اسی قسم کا سوال اپنے بھیڑ

کے بچے کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا اور آپؐ نے انہیں قربانی کی اجازت دیدی تھی۔
قصہ سنانے کے بعد مولانا نے مستری صاحب سے کہا کہ آپ کسی عالم سے فتویٰ لیں گے تو وہ یہی کہے گا کہ اس صورت میں قربانی جائز نہیں ہے، لیکن اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو گھر جا کر اس بچے کی قربانی کر دیتا۔ مستری صاحب یہ سن کر واپس چلے گئے اور انہوں نے اسی سال اسی بچے کی قربانی کی۔ اس کے برعکس جب پڑھے لکھے لوگ فتویٰ لینے کے لیئے مولانا کے پاس آتے تو صاف معلوم ہوتا کہ وہ اپنے دل کی کھٹک دور کرنے کے لئے نہیں بلکہ بحر اختلاف میں ایک نئی لہر پیدا کرنے کے لئے ایک ڈھیلا پھینکنے کی اجازت لینے آئے ہوں۔
ایک عید کی صبح کا واقعہ مجھے یاد ہے، دہلی میں عید کا چاند نظر نہیں آیا تھا لیکن ریڈیو پر رات ہی سے ہندوستان و پاکستان کے مختلف شہروں سے عید کے منائے جانے کی خبریں آرہی تھیں۔ مولانا نے روزہ توڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے گھر کے سامنے باہری چبوترے پر بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ اب جو بھی فتوی پوچھنے کے لئے آتا تو مولانا اسے چائے کی پیالی دکھا کر کہتے کہ میں نے ابھی ابھی چائے پی ہے۔ چھوٹے لوگ تو مزید سوال وجواب کئے بغیر مطمئن ہو کر گھر چلے جاتے تھے لیکن اہل علم آتے تو مولانا کی رائے معلوم کرنے کے لئے لیکن مولانا کے عملی جواب پر بحث کرنے کی کوشش کرتے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں دہلی کے ان علماء کے نام گنواتے جو اس روزہ کے حق میں تھے۔ مولانا بحث کرنے کے بجائے صرف یہی کہتے کہ ٹھیک ہے جب تک آپ کا دل مطمئن نہ ہو جائے اس وقت تک آپ روزہ قطعاً نہ توڑیں۔ چونکہ آپ خود اہل علم ہیں اس لئے آپ کے لئے مناسب نہیں ہے کہ آپ میرے عمل کو مثال بنائیں۔ آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ دہلی کے دوسرے علماء کے فتوے کا انتظار کریں۔ پھر ایسا ہوا کہ شام ہوتے ہوتے دہلی کے علماء نے بھی روزہ توڑنے کا حکم دیدیا۔ جن لوگوں نے مولانا کی پیروی میں صبح ہی کو روزہ توڑ دیا تھا وہ مسلسل اصرار کر رہے تھے کہ مولانا اسی دن عید کی نماز بھی پڑھا دیں۔ لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ دہلی شہر میں عید کا اعلان نہیں ہوا ہے اس لئے اتحاد ملت کا تقاضا ہے کہ جامعہ میں بھی عید کی نماز نہ ہو، روزہ کھولنا تو اس لئے ضروری تھا کہ میرے اپنے خیال میں آج کا روزہ مجھ پر حرام ہے لیکن عید کا دوگانہ آج کے بعد کل بھی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں کے اصرار کے باوجود مولانا اس تجویز کے کبھی بھی مؤید نہ ہوئے کہ جامع مسجد، فتح پوری مسجد، اور دہلی رویت ہلال کمیٹی کی طرح جامعہ بھی اپنے تئیں رویت ہلال کی شہادتوں کو اکٹھا کرنے کا انتظام کرے اور شہر کے اعلان کا انتظار کئے

بغیر نتیجہ کا اعلان کر دیا کرے۔

مولانا کو جم کر تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ ادارہ کے زمانہ میں انہوں نے جو کچھ لکھا اس کی حیثیت ایک خاص قسم کی نصابی کتابوں کی سی ہے۔ "تعمیر" کے صفحات میں یہ گنجائش نہ تھی کہ اعلیٰ علمی اور تحقیقی مضامین شائع ہو سکتے۔ ہاں تعمیر میں انہوں نے تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا جو سورۂ بقرہ کے ختم تک پہونچ پایا تھا کہ تعمیر کی اشاعت رُک گئی۔ وفات سے کچھ دن پہلے میرے اصرار پر انہوں نے اس پر نظر ثانی کر کے مکتبہ جامعہ کو اشاعت کے لئے دیا تھا، کتابت قریب قریب پوری ہو چکی تھی کہ انکا آخری وقت آ گیا اور اسے کتابی شکل میں دیکھنے کے لئے اس دنیا میں نہ رہے۔ مولانا دراصل لکھنے سے بہت بھاگتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا لکھنے کو ٹالتے رہتے۔ حقیقتاً انہیں گفتگو کرنے میں "مزا" آتا تھا۔ اس لئے جب بالکل ہی سر پر پڑ جاتی تو مضمون املا کرا دیا کرتے۔ ان کے اکثر و بیشتر مضامین املا کرائے ہوئے ہیں۔ ان کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے مضامین صرف وہ ہوں گے جنھیں لکھانے کے لئے کوئی شخص انھیں نہ ملا ہوگا۔ املا کرا دینے کے بعد عبارت کی نوک پلک درست کرنے کے لئے مضمون پر نظر ثانی کی عادت نہیں تھی۔ جو بول دیا سو بول دیا، ہاں جن مضامین کے لکھنے والے چھوٹے درجوں کے طالبعلم ہوتے تھے ان پر املا کی غلطیوں کے پیش نظر ایک نظر ڈال لیتے تھے۔

اس نہیں نہیں کے باوجود مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اسے ان کی تدریسی اور ادارتی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے کچھ بہت زیادہ کم نہیں کہا جا سکتا۔ مولانا جب ندوہ میں استاد تھے تو اس کے ساتھ رسالہ "الندوہ" کے شریک مدیر بھی تھے۔ ادارت کا یہ دور تقریباً ۳۔۴ سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ مضامین تو اس میں بھی ان کے ہوں گے۔ پھر ادارہ میں پندرہ روزہ "تعمیر" کی ادارت ان کے سر تھی اور تعمیر کا شاید ہی کوئی پرچہ ایسا ہو جس میں ان کے قلم سے کوئی چیز شائع نہ ہوئی ہو۔ جامعہ آنے کے بعد رسالہ جامعہ میں ان کے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔ پھر ۱۹۶۶ء سے اسلام اور عصر جدید کی مجلس ادارت کے رکن ہو گئے تھے۔ اور بالکل آخر میں تو معارف کی ادارتی ذمہ داری ان کے سر آ پڑی تھی۔ اس لئے اگر دیکھا جائے تو جتنا وہ لکھنے سے بھاگتے تھے اتنا ہی قدرت انہیں لکھنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ رسالوں میں منتشر مضامین کے علاوہ ان کی جو کتابیں اور رسالے علحدہ سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس سے ایک طرف اگر موضوع

کا تنوع ظاہر ہوتا ہے تو دوسری طرف ان موضوعات پر مولانا کی قدرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بہرحال انکی تصنیفات کی ایک غیر تشریحی فہرست حسب ذیل ہے:۔

۱۔ ہماری بادشاہی (تاریخ اسلام) مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ (کئی اڈیشن شائع ہو چکے)

۲۔ ہندوستان کی کہانی (تاریخ ہند) " " " (" ")

۳۔ حدیث نبوی کے اولین صحیفے (حدیث) ادارہ تعلیمات اسلام، لکھنؤ (دو اڈیشن: دستیاب نہیں)

۴۔ عربی زبان کے دس سبق (عربی زبان کی تعلیم کا سلسلہ) " " " (لاتعداد اڈیشن، بیشمار جعلی اڈیشن)

۵۔ قرآن مجید کی پہلی کتاب (" " ") " " " (کئی اڈیشن)

۶۔ قرآن مجید کی دوسری کتاب (" " ") " " " (" ")

۷۔ قرآن مجید کی تیسری کتاب (" " ") " " " (" ")

۸۔ حضرت بلال (سوانح) " " " (دو یا تین اڈیشن: اب دستیاب نہیں)

۹۔ مثالی حکمراں (تاریخی واقعات) " " " (ایک اڈیشن: اب دستیاب نہیں)

۱۰۔ آدرش شاشک (ہندی ترجمہ مثالی حکمراں) ادارہ تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ (غالباً ایک اڈیشن)

۱۱۔ تعلیمات اسلام دو جلدیں (اسلامیات) مکتبہ جامعہ نئی دہلی (ایک اڈیشن)

۱۲۔ دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد (مجموعہ مضامین: اسلامیات) " " (" ")

۱۳۔ مسلمان اور وقت کے تقاضے (" ") " " (" ")

۱۴۔ تفسیر سورہ بقرہ (مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہونے والی ہے)

۱۵۔ سیرۃ النبیؐ (علامہ شبلی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی ۶ جلدوں میں لکھی ہوئی سیرۃ النبیؐ کی ایک جلد میں تلخیص۔ دارالمصنفین سے شائع ہونے والی ہے)۔

مولانا کے یہاں صوفیوں والی وسیع المشربی اور سچے عالموں کی وسعت قلبی تھی۔ وہ کسی کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اشخاص اور جماعتوں پر تنقید کرنے میں بہت احتیاط برتتے تھے۔ مولانا نے کبھی کسی جماعت سے اپنا باقاعدہ تعلق نہیں قائم کیا لیکن ان کے اکثر و بیشتر رفقاء کسی نہ کسی جماعت سے پوری طرح منسلک تھے۔ بایں ہمہ ان کے تعلقات ہر شخص سے اس کی ذات کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ ادارہ کی زندگی میں مولانا

کے ساتھ کام کرنے والوں میں اگر ایک طرف تبلیغی جماعت کے رکن رکین مولانا علی میاں تھے تو دوسری طرف جماعت اسلامی کے سرگرم رکن مولانا عبد الغفار ندوی تھے مگر دونوں مولانا کے چہیتے تھے۔ مولانا کی زندگی میں بہت سارے مسلم قائدین اور جماعتوں پر علماء اظہار رائے کرتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بات ہوش کی سرحدوں سے نکل کر جوش کے حدود میں داخل ہو جاتی، لیکن یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مولانا کی ایک سطر بھی ایسی نہیں مل سکتی جس میں انہوں نے کسی شخص یا کسی جماعت کو اسلام کے لئے خطرہ محسوس کر کے سب وشتم کا انداز اختیار کیا ہو۔ اگر تمام دنیا کسی شخص کو برا کہتی جب بھی مولانا اکثریت کی رائے سے متاثر ہو کر عوامی دھارے میں نہیں بہہ سکتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب قادیانی مسئلہ کے سلسلہ میں پاکستانی عدالت نے مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنائی اور ان کے دن گنے جانے لگے تو ہندوستان کے مسلم اخبار و رسائل نے عام طور سے اس فیصلے کے خلاف اداریے لکھے۔ اس فیصلہ پر تعمیر کے لئے میں نے بھی ایک نوٹ تیار کیا تھا۔ میں جماعت سے کبھی بھی منسلک نہیں رہا لیکن غیر جماعتی حیثیت سے لکھنؤ کی زندگی میں بے تکلفی کے تعلقات جماعتی شعراء وادبا ہی سے تھے۔ ویسے بھی نوجوانی کا زمانہ تھا، خون کی حدت شباب پر تھی۔ اس لئے میرا نوٹ مولانا کے نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ آتشیں ہو گیا تھا۔ مولانا اس نوٹ کی اشاعت کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ نوٹ کی آتش نوائی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے، کیونکہ یہ چیز تو جس راہ کے وہ مسافر ہیں اس کا تحفہ ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ تم مولانا کو بالکل بے قصور اور حکومت پاکستان کو سرتاپا مجرم سمجھ رہے ہو، حالانکہ تمہارے پاس کوئی ایسا آزاد اور قابل اعتماد ذریعہ ایسا نہیں ہے جس کی بنیاد پر تم یہ کہہ سکو کہ پاکستانی عدالت نے مولانا پر جتنے الزامات لگائے ہیں وہ سب کے سب غلط اور بے بنیاد ہیں۔ "تعمیر" جماعت کا ترجمان نہیں ہے اس لئے صحافتی انصاف کا تقاضا ہے کہ تم جوش میں آکر خود جج نہ بن جاؤ۔ بہر حال مولانا نے اس مضمون پر اس طرح نظر ثانی کی کہ وہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ میں اس واقعہ سے متاثر ہو کر کئی روز تک منہ پھلائے گھومتا رہا اور مولانا چھیڑ چھیڑ کر مجھے مناتے رہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا، مولانا کا لکھنا مجبوری کا لکھنا تھا۔ جب کسی عذر سے کام نہ چلتا تو مجبوراً لکھتے۔ اس کے برخلاف ان کے رفیق، مولانا علی میاں ایک داعی کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے بجا طور سے

وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ لوگوں تک پہونچ جائے۔ مولانا علی میاں کا یہ عالم کچھ آج نہیں ہوا ہے، ادارہ کے زمانہ میں بھی وہ اسی جذبہ کے تحت لکھتے تھے۔ اس موجودہ نسل میں کم ہی لوگ ہوں گے جنھوں نے علی میاں کے رسالہ "ٹنڈن جی سے خطاب" کو پڑھا ہوگا۔ یہ بات ۴۸ء کی ہے۔ ٹنڈن جی غالباً اس وقت صدر کانگریس تھے۔ اب مجھے اس مضمون کی تفصیلات اچھی طرح یاد نہیں ہیں لیکن ہوا یہ تھا کہ ٹنڈن جی نے اپنی ایک تقریر میں کچھ ایسی باتیں کہہ دی تھیں جن سے مسلمانوں کے دلوں کو تکلیف پہونچی تھی۔ علی میاں نے اسی تاثر میں یہ اور چند رسائل لکھے تھے۔ اسی دوران جے پور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا اس لئے بعض لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ ان رسائل کو جن میں سے اکثر کا ترجمہ ہندی اور انگریزی میں بھی ہوگیا تھا وہاں لے جائیں

دن رات ایک کر کے رسالہ کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ اگر حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو انگریزی ترجمہ غالباً ابرار احمد صاحب نے کیا تھا جو ادارہ کے طالب علم تھے اور یوپی سکریٹریٹ میں کلرک تھے۔ آج کل وہ شاید اسسٹنٹ سکریٹری ہیں۔ بہرحال اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں رسالے کو شائع کیا گیا اور اجلاس میں تقسیم کرنے کے لئے ندوہ کے ایک استاد مولانا محمد اسحاق سندیلوی (حال مقیم پاکستان) کے ساتھ میں نے جے پور کا سفر کیا۔ اس واقعہ کا ذکر میں نے اس لئے کیا ہے کہ آپ کو بتا سکوں کہ مولانا علی میاں جب کچھ لکھتے تھے تو اسے من وعن زیادہ سے زیادہ لوگوں تک فوراً پہونچانا ضروری سمجھتے تھے۔ مولانا اس طرز فکر سے متفق نہیں تھے۔

مولانا کی تحریر ان کی شخصیت کی طرح ہر قسم کے تکلفات سے پاک ہوتی تھی۔ ان کے مضامین میں نہ تو لمبی تمہید ہوتی تھی اور نہ مترادفات کی بھرمار۔ وہ اپنی تحریر اور خصوصاً تقریر میں تفصیلات سے اس حد تک احتراز کرتے تھے کہ کبھی کبھی تو بات صرف اشاروں تک محدود رہ جاتی تھی۔ ان کی تقریر میں اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کوئی واقعہ بطور مثال بیان کرنا شروع کرتے۔ جب قصہ کلائمکس پر ہوتا اور سب لوگ دھیان سے سن رہے ہوتے کہ اچانک نتیجہ بنا کر قصہ کو یوں ختم کر دیتے گویا کہہ رہے ہوں کہ تفصیلات کا علم تو آپ سب لوگوں کو ہے، وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ میں نے ان سے کئی بار اس بات کی شکایت کی کہ آپ واقعات اور مثالوں کو درمیان ہی میں چھوڑ دیتے ہیں۔ جواب میں وہ یہی کہتے کہ یہ کون سا اہم واقعہ تھا، سب ہی لوگ جانتے ہونگے یہ بات مولانا کے دل میں کبھی نہ اتر سکی کہ وہ اپنے سامعین کے علم کا کچھ زیادہ ہی اندازہ لگایا کرتے ہیں۔

تحریر میں مرادفات کے استعمال کے سلسلے میں مولانا نے کئی بار یہ واقعہ مجھے سنایا تھا کہ جامعہ کے طالب علمی کے زمانہ میں علماء کی اردو پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان سے ایک بار کہا تھا کہ آپ لوگ مزے میں ہیں ہر ہر جملے کو اس طرح دہراتے اور تہراتے ہیں کہ ضرورت پڑ جائے تو ایک کتاب کو آسانی سے تین کتاب بنا کر شائع کر سکتے ہیں۔ دوسروں کی تحریر پڑھتے وقت بھی مولانا پر ایک خاص قسم کی عجلت طاری رہتی تھی۔ میں بہت پہلے کی بات تو نہیں جانتا لیکن پچھلے ۳۲، ۳۳ برسوں کے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا نے قرآن کے علاوہ کسی کتاب کو بھی شروع سے آخر تک حرفاً حرفاً نہ پڑھا ہوگا۔ وہ آنکھوں سے پڑھتے تھے اور پیراگراف کے پیراگراف غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے۔ ناول اور افسانوں کے بارے میں تو وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھ میں طالب علمی کے زمانہ ہی سے یہ عادت پیدا ہوگئی ہے کہ کچھ شروع، کچھ درمیان اور کچھ آخر سے پڑھ کر یہ معلوم کر لیتا ہوں کہ قصہ کا انجام کیا ہوا۔ میری یہ عادت اچھی نہیں ہے کیونکہ یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ یہ انجام ہوا کیوں۔ لیکن اس کے لئے دس بیس صفحے کون پڑھے! اردو اور عربی زبان کی کتابوں میں تو یہ بات آسانی سے چل جاتی تھی لیکن انگریزی پر چونکہ پوری طرح قدرت نہیں تھی اس لئے وہاں یہ بات نہیں چل پاتی تھی۔ مگر عادت سے مجبور تھے۔ یہی عمل وہاں بھی رہتا تھا اور بعد میں خود اپنی شکایت کرتے تھے کہ چھوڑ چھوڑ کر پڑھتا ہوں اس لئے پوری طرح سے بات پلے نہیں پڑتی۔

مولانا میدان سیاست کے شہ سوار کبھی نہیں رہے۔ وہ کبھی جیل بھی نہیں گئے۔ میں نے انھیں کبھی سیاسی جلسوں میں شریک ہوتے نہیں دیکھا۔ بایں ہمہ وہ پختہ سیاسی شعور رکھتے تھے۔ ان کا سیاسی ذہن الہلال اور البلاغ پڑھ کر بنا تھا۔ وہ اوائل عمر میں خلافت کے جلسوں میں شرکت کر چکے تھے۔ ذہنی طور سے وہ قوم پرور سیاست کے حامی تھے لیکن کسی جماعت کے باقاعدہ ممبر نہیں تھے۔ تحریک عدم تعاون کے اثر سے انہوں نے بچپن ہی سے کھدر پہننا شروع کر دیا تھا، لیکن جب سے میں نے انہیں دیکھا وہ کھدر کے بجائے زیادہ تر مارکین پہنتے تھے اور کہتے تھے کہ اب کھدر کا پہننا کم آمدنی والوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ پارلیمانی طرز حکومت کو اس کی تمام خرابیوں کے باوجود دوسری قسم کی حکومتوں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ اسی لئے ووٹ کے استعمال پر زور دیتے تھے اور اشخاص کے بجائے پارٹی کو ووٹ دینے پر اصرار کرتے تھے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے مولانا اپنے خیالات کے اعتبار سے تمام عمر کانگریسی رہے اور غالباً انہوں نے

ہمیشہ کانگریس ہی کو ووٹ دیا سوائے ایک بار کے، جس کا ذکر میں نے ان کی زندگی ہی میں ان کا نام لئے بغیر اپنی ایک انگریزی کتاب میں کیا ہے ۱۹۴۵ء میں پاکستان کے سوال پر جب جنرل الکشن ہو رہا تھا تو مسلم لیگ کے پروپگنڈے کی وجہ سے بڑے بڑے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ پاکستان کا قیام برصغیر میں دارالاسلام کے مرادف ہے۔ مولانا اس منطق سے اتفاق نہیں کرتے تھے اور کانگریس کو ووٹ دینا طے کر چکے تھے لیکن جوں جوں ووٹنگ کا دن قریب آنے لگا۔ مولانا کی ذہنی بے چینی بڑھنے لگی اور وہ اس انداز پر سوچنے لگے کہ جمعیۃ علماء ہند کا دعویٰ ہے کہ متحدہ ہندوستان میں اسلام کا مستقبل زیادہ روشن اور خوش آیند ہے۔ مسلم لیگ یہ کہتی ہے کہ جب تک مسلمانوں کو ایک الگ خطہ زمین نہیں ملے گا اس وقت تک برصغیر میں اسلام قائم نہیں ہو سکتا۔ صحیح علم تو اللہ کو ہے لیکن اگر جمعیت کی بات درست ہے تو ملک کے تقسیم ہو جانے کے بعد بھی ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں دونوں کو ایک ساتھ رہنے کا موقع ملے گا اس لئے اگر متحدہ قومیت والا فارمولا درست ہے تو آزاد ہندوستان میں اس کا مظاہرہ ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر مسلم لیگ اپنے دعوے میں صادق ہے تو جب تک اسے کوئی علاقہ نہ ملے اس وقت تک اس کا امتحان نہیں ہو سکتا۔ اگر پاکستان بن جانے کے بعد وہاں اسلام قائم نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے سامنے مطالبہ پاکستان کے حامی لوگ جوابدہ ہوں گے۔ لیکن اگر مسلم لیگ کی منطق درست ہے اور مسلمانوں کے ووٹ نہ دینے کے باعث پاکستان نہیں بنتا تو پھر وہ تمام مسلمان خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے جو پاکستان کے خلاف ووٹ دیں گے۔ گویا مولانا کی منطق کے مطابق پاکستان کا قیام مسلمانوں کے لئے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ سوچ رہے تھے کہ اگر انہوں نے مسلم لیگ کو ووٹ نہیں دیا اور مطالبہ پاکستان صرف ایک ووٹ کی کمی کی وجہ سے منظور نہ ہو سکا تو اس کی ذمہ داری براہ راست انہیں کے سر ہو گی۔ بہرحال یہ فرض کفایہ والی بات مولانا کے ذہن پر اتنی طاری ہوئی کہ وہ پاکستان کے حق میں ووٹ دے آئے۔ میرے اس پوچھنے پر کہ ووٹ دینے کے بعد آپ پاکستان کیوں نہیں گئے انہوں نے کہا کہ میں نے تو یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ اسلام کے قیام کے لئے ایک الگ خطہ زمین چاہیئے۔ جن لوگوں نے دعویٰ کیا تھا انھیں پر فرض تھا کہ وہ پاکستان جائیں اور اپنے دعوے کو صحیح ثابت کریں۔

مولانا اپنے استاد حضرت مولانا حیدر حسن خاںؒ کے وسیلے سے مہاجر مکی حضرت حاجی امداد اللہ کے سلسلے میں اپنی نوجوانی ہی میں بیعت ہو چکے تھے۔ اب یا تو اس سلسلے کی خصوصیت ہے یا یہ بھی مولانا کی اپنی

انفرادیت تھی کہ ان کے رات و دن کے ساتھیوں کو بھی شبہ تک نہیں ہو پاتا تھا کہ وہ عملاً حلقۂ تصوف سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوتے میں وہ اوراد و وظائف پڑھتے رہے ہوں تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن ویسے کبھی بھی میں نے انھیں مراقبہ کرتے، یا متعین اوقات پر ذکرِ خفی یا ذکرِ جلی میں مشغول نہیں دیکھا۔ دراصل مولانا کی زندگی میں عبادت کا الگ سے کوئی خانہ نہیں تھا۔ زندگی کے اور تمام کاموں کی طرح عبادت کو بھی وہ ایک کام سمجھتے تھے اور دوسرے کاموں کی طرح اسے بھی سمجھ کر ایمانداری سے کرتے تھے۔ وہ دن میں کوئی نہ کوئی موقع نکال کر تھوڑی سی تلاوت کر لیتے تھے، پانچوں وقت کی فرض اور ضروری مسنون رکعتوں کی ادائگی کے پابند تھے۔ "نوافل" کو واجب کی طرح پابندی سے ادا کرتے ہوئے میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ رمضان کے روزے وہ کہا کرتے تھے کہ انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی رکھنے شروع کر دئیے تھے جس کے آخر دم تک پابند رہے۔ رہی زکوٰۃ تو جب تک کہ انھیں جامعہ کی ملازمت سے سبکدوش ہوجانے کے بعد پراوڈنٹ فنڈ نہیں مل گیا ان پر فرض ہی نہیں ہوئی۔ ہاں خیر خیرات کے لئے وہ ایک رقم ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ حساب کتاب کے کھرے تھے۔ اپنے اوپر کسی شخص کی ایک پائی بھی نہیں رہنے دیتے تھے۔ سماجی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ہمیشہ فکر رکھتے تھے۔ ان کے یہاں جو لوگ ملنے ملانے کے لئے آتے تھے کوئی نہ کوئی موقع نکال کر وہ ان کے گھروں پر بازدید کے لیے ضرور جاتے تھے۔ اگر کسی کے یہاں مہمان جاتے تو واپسی کے وقت صاحب خانہ کے ملازم کو انعام کے نام سے کچھ نہ کچھ ضرور دیتے۔ ہر شخص کو اس کے نام سے یاد رکھتے اور اگر کبھی کسی کو نہ پہچان پاتے تو اس پر اس کا اظہار نہ ہونے دیتے بلکہ اس سے گفتگو اس انداز سے کرتے رہتے کہ اسے شبہ بھی نہ ہونے پاتا کہ مولانا نے اسے پہچانا نہیں ہے۔ خطوں کا جواب فرض سمجھ کر دیتے تھے لیکن لکھتے ہمیشہ پوسٹ کارڈ تھے۔ لفافے وغیرہ شاذونادر ہی استعمال کرتے مگر ان کا لکھا ہوا پوسٹ کارڈ دوسروں کے دو تین پوسٹ کارڈوں کے برابر ہوتا تھا۔ گفتگو مخاطب کے ذوق کے مطابق کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ملنے والوں میں اگر ایک طرف جامعہ کے اساتذہ، اہل فکر اور دانشور حضرات تھے تو دوسری طرف ان کے پاس آکر بیٹھنے والوں میں جامعہ نگر کے کسان، معمولی ملازمین اور خالص دیہاتی اور کاروباری لوگ تھے اور یہ تمام لوگ مولانا سے گفتگو کرنے کے بعد یکساں طور سے مطمئن ہو کر جاتے تھے۔

۴ جن لوگوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ مولانا اپنے متوسلین کی فلاح و بہبود کی فکر میں ہر وقت لگے رہتے تھے۔ ۱۹۷۶ء میں جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مطالعہ اسلامیات کا پروفیسر

ہو کر آیا تو مولانا نے اپنے کئی خطوں میں دلی خوشی کا اظہار کیا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ مجھے مزید مطالعہ کرنے پر ابھارتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک خط نقل کرنے کو جی چاہتا ہے جس میں ایک طرح سے انھوں نے میرے لیے مطالعہ اسلامیات کا نصاب بنا کر بھیجا تھا۔ خط کا نصف اول ان کے بڑے لڑکے سالم کے متعلق ہے۔ نصف آخر میں لکھتے ہیں:۔

"خیر یہ تو سالم کے بارہ میں تھا۔ اب جی چاہتا ہے کہ تم سے بھی کچھ کہوں۔ اگرچہ رئیس احمد جعفری مرحوم مجھ سے کہا کرتے تھے کہ بے طلب مشورہ نہ دیا کرو مگر خلوص کی بنا پر ان کی رائے پر عمل نہیں کرپاتا ہوں اور خواہ مخواہ مشورے دیتا رہتا ہوں۔ اب اللہ تعالیٰ نے تم کو پروفیسر اسلامیات اور صدر شعبہ بنا دیا ہے اس لئے تھوڑا وقت اسلامیات کے مطالعہ پر ضرور لگاؤ کسی ترجمے کے ساتھ قرآن مجید کا (ھکذا) پڑھ ڈالو۔ انگریزی میں عبداللہ یوسف علی اور اردو میں مولانا آزاد اور مودودی صاحب کے ترجمے مناسب رہیں گے۔ تاریخ اسلام کی کوئی ایک مختصر کتاب اگر زیادہ موقع نہ ہو تو ہماری بادشاہی پر ایک نظر ڈال لو۔ اس سے پوری اسلامی تاریخ اور مسلم حکومتوں کا ایک تصور ذہن میں آجائے گا۔ اسی طرح مشکوٰۃ پوری مظاہر حق کے ساتھ پڑھ ڈالو اس سے تم احادیث کے ذخیرہ سے فی الجملہ باخبر ہو جاؤگے۔ مظاہر حق شاہ عبداللہ رحمۃ اللہ کی مختصر شرح ہے اس کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے، ۱۰ منٹ روز بھی صرف کروگے تو انشاء اللہ ایک سال میں پوری مشکوٰۃ کے مطالب ذہن نشین ہو جائیں گے

فقہ میں قدوری پوری پڑھ ڈالو، عبادات کے مسائل تو جانتے ہی ہو جی چاہے اتنا حصہ چھوڑ دو۔ باقی معاملات، قضا شفعہ، حوالہ، وکالۃ، بیوع، نکاح، طلاق، خلع وغیرہ تم کو خاص طور سے پڑھنا چاہیئے کیونکہ معاملات ہی میں زمانہ کے تغیرات کی بنا پر اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدوری مرکزی متن ہے اس کو پڑھ لیتے تو پورا اسلامی قانون جو سابق مسلم حکومتوں کے دور میں نافذ تھا تمہاری نظر میں آجائے گا۔ قدوری کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک کتاب اصول فقہ کی ضروری ہے۔ اصول الشاشی چھوٹی سی کتاب ہے اس کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ علی گڑھ میں انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں میں نے

دیکھا تھا۔"

مولانا کے انداز شکایت پر بھی بے اختیار پیار آتا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۶ء میں جامعہ میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے عنوان پر ایک سیمینار ہونے والا تھا، مولانا بھی اس میں مدعو تھے۔ سیمینار کے سلسلے کی خط وکتابت میرے سپرد تھی۔ ان دنوں مولانا کے بعض خطوط عدیم الفرصتی کے باعث جواب دینے سے رہ گئے اس پر انہوں نے اعظم گڑھ سے ایک چھوٹا سا پرچہ کسی اور کے خط میں رکھ کر میرے پاس بھیجا۔ شکایت کا انداز دیکھئے:۔

"اب تو شاید کئی خطوں کے بعد تم جواب لکھو گے۔ کبھی کبھی شکایت ہوجاتی ہے۔ دہلی آیا تو باتیں ہوں گی۔ میرا جی یہاں سے اُکتا گیا ہے دیکھو کب اور کس طرح فرصت ملتی ہے۔ اب جی چاہتا ہے زندگی کے آخری دن فرصت، اطمینان، بے فکری اور سکون سے گذاروں۔ جھمیلوں میں طبیعت گھبراتی ہے۔"

جامعہ کے احاطہ میں ایک ٹیلے کے اوپر بہت ساری قبروں کے ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی بھی قبر ہے ان کی قبر پر قرآن کی آیت " یالیت قومی یعلمون بما غفر لی ربی وجعلنی من المکرمین "، کندہ ہے۔ قبروں پر کندہ کی جانے والی دوسری آیتوں کے مقابلے میں مولانا اس آیت کو بہت پسند کرتے تھے اور اس شخص کے ذوق کی داد دیتے تھے جس نے ڈاکٹر انصاری کے کتبہ قبر کے لئے اس آیت کا انتخاب کیا تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ کاش پیچھے رہ جانے والوں کو کسی طرح معلوم ہوسکتا کہ مرنے والا اپنے کس عمل کی بنا پر بخشا گیا ہے۔ اب جب کہ میرے مولانا خود زمرۂ "مکرمین"، میں داخل ہوچکے ہیں تو ان کے دل کی کرید تو ختم ہوگئی ہوگی لیکن ہماری خاطر تو وہ کہتے ہی ہوں گے کہ ،

"یالیت قومی یعلمون بما غفر لی ربی وجعلنی من المکرمین"

مولانا عبد السّلام قدوائی ندوی مرحوم کی یاد میں

مولانا ابو العرفان ندوی
صدر شعبۂ علوم دینیہ دار العلوم ندوۃ العلماء

مولانا عبد السلام قدوائی ندویؒ میرے استاذ مربی اور محسن تھے، ان کی شفقت و عنایت میرے حال پر ۱۳۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۷۹ء ان کی وفات تک مسلسل چالیس سال برابر قائم رہی اس لئے جب عید بعد شوال کی تیسری یا چوتھی تاریخ کو میرے ایک عزیز ندوی نے جونپور میں ان کے حادثۂ وفات کی اطلاع زبانی دی تو مجھ پر شدید احساس اور حزن و غم کی کیفیت طاری ہوئی اور میں نے اس عزیز سے وہ اخبار لے کر مزید توثیق کی جس میں اس حادثہ کی خبر درج تھی، چالیس سال کا یہ طویل عرصہ نظروں کے سامنے پھر گیا اور ان کی محبت و شفقت اور عنایت کے واقعات ایک ایک یاد آنے لگے۔

۱۳۹ء میں جب میں پہلی بار ندوہ میں داخلہ کے لیے آیا تو سیدھے مولانا مرحوم کی قیام گاہ شبلی ہوسٹل کمرہ ۹ میں پہنچا اور اپنا سامان بھی مولانا کے کمرہ میں رکھا، یہ مولانا مرحوم سے میری ملاقات کا پہلا دن تھا۔ مولانا مرحوم اس وقت دار العلوم کے صف اول کے استاد تھے اور اس وقت کے بڑے لڑکوں کے دار الاقامہ شبلی ہوسٹل کے نگراں و اتالیق تھے اس لئے قدرتی طور پر مولانا مرحوم سے ہر وقت سابقہ رہنے لگا۔ اور بہت جلد میں نے اپنے کو مولانا سے ذہنی طور پر قریب کر لیا۔ مولانا مرحوم کا تعلق شبلی ہوسٹل کے تمام طلبہ سے بہت محبت و شفقت کا رہا کرتا تھا اور خاص کر مولانا جن طلباء کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق خصوصی ہدایات سے اس کو فائدہ پہنچے گا۔ اس سے خود مولانا بہت قریب ہو جایا کرتے تھے۔ میرا داخلہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں اس وقت کے درجہ ہفتم عربی میں ہوا، درجہ ششم عربی میں عالم کی سند ملتی تھی اور درجہ نہم عربی میں فضیلت کی سند طالب علم پاتا تھا، یعنی درجہ فضیلت تین سالہ نصاب کا تھا، اور میرا داخلہ فضیلت کے پہلے سال میں ہوا، اس سے پہلے تک میری تعلیم کا بڑا حصہ اگرچہ شخصی اساتذہ کا مرہون منت رہا لیکن مدرسوں سے متعلق ہو کر۔ ان مدارس میں درس نظامیہ کا نصاب درس رائج تھا۔ ندوہ میں آکر

مجھے نئے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم سے سابقہ پڑا اور میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی عربی مدرسہ میں طلبہ کی یونین اور اس میں اخبارات ورسائل اور کتابوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھی۔ مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم طلبہ کو ان کی ذہنی وفکری استعداد وصلاحیت کو دیکھ کر خارجی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کی قوت فیصلہ اور ارشاد ورہنمائی کی صلاحیت بڑی ممتاز تھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت کے دارالعلوم کے اسٹاف میں مولانا اس حیثیت سے منفرد تھے کہ خارجی مطالعہ اور اردو زبان میں مختلف علوم وفنون پر جو کتابیں اس وقت تک آچکی تھیں ان پر مولانا کی گہری نظر تھی اور ہر کتاب کا اپنے موضوع پر جو مقام تھا اس کی صحیح تشخیص کا بڑا ملکہ تھا اور اسی طرح ان کتابوں کے مصنفین کے بارے میں ان کی معلومات بہت ہی تفصیلی اور مفید ہوا کرتی تھی۔ مولانا کی رہنمائی اور نگرانی میں کتابوں کا مطالعہ بہت ہی مفید ہوتا تھا اور جو لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے وہ بہت جلد اپنے عام مطالعہ کی سطح بہت بلند محسوس کرنے لگتے تھے۔ مولانا اس بات کی بھی فکر رکھتے تھے کہ جب کسی طالب علم کو کسی کتاب کا مشورہ دیتے تھے تو دو چار دن کے بعد اس سے پوچھتے بھی تھے کیا تم نے وہ کتاب پڑھی اور اگر پڑھ رہے ہو تو کہاں تک پڑھی ہے، اگر وہ یہ محسوس فرماتے تھے کہ طالب علم کا مطالعہ صحیح راہ پر چل رہا ہے تو پھر اس کتاب کے اہم ابواب اور مطالب پر کچھ زبانی فرمادیا کرتے تھے۔ طلباء دارالعلوم کی انجمن الاصلاح کی کتابوں سے استفادہ جتنا بہتر مولانا مرحوم کی نگرانی میں ہوا کرتا تھا، سچی بات یہ ہے کہ اس کے بعد ایسا مرتب اور منظم اور مفید مطالعہ کا دور نہیں آیا۔ درحقیقت دارالعلوم ندوہ میں طلبہ کی انجمن الاصلاح ان کی عام علمی استعداد کو وسیع کرنے اور علمی وفکری سطح کے بلند کرنے میں بہت معین ومددگار رہی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ انجمن الاصلاح دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نظام تعلیم کا ایک اہم اور مفید جزء ہے جو طلباء انجمن کی اس حیثیت کو سامنے رکھ کر اس سے استفادہ کریں گے، انشاء اللہ ان کے لئے الاصلاح بہت نافع ومفید ثابت ہوگی، افسوس ہے کہ مرتب اور منظم مطالعہ کی عادت عزیز طلبہ کو نہیں ہے اس لئے وہ انجمن الاصلاح سے وہ فائدہ نہیں اٹھاپاتے ہیں جیسا کہ اس کا حق ہے۔ ابھی کچھ ماہ پہلے مولانا مرحوم سے اثناء گفتگو میں میں نے یہ بات عرض کی تھی کہ دارالاقامہ میں رہنے والے طلبہ کی نگرانی کے دو حصے ہیں اور یہ دونوں حصے اپنی جگہ پر اہم اور ضروری ہیں، ایک عام قواعد وضوابط کی پابندی، پنجگانہ نماز باجماعت کی ادائیگی کی طرف توجہ، پابندی سے درجات میں حاضری کا خیال وغیرہ وغیرہ اور دوسرا حصہ طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت واصلاح، مفید

کتابوں کی طرف ان کی رہنمائی اوران کی عمومی ثقافت کی سطح کو بلند کرنا ہے، میں نے مولانا مرحوم سے عرض کیا کہ یہ حصہ آپ کی نگرانی میں بہت کامیابی سے انجام پاتا تھا اب سرے سے یہ حصہ ختم ہوچکا ہے اور یہ ایسا خلاء ہے جس کا پر ہونا ضروری ہے، اگر آپ اس کی طرف بحیثیت معتمد تعلیم توجہ فرمائیں تو زیادہ بہتر تھا، بات چونکہ مولانا کی ذات سے متعلق تھی اس لئے زیادہ صفائی سے تونہیں فرمایا لیکن اس کی ضرورت واہمیت کا اعتراف کیا۔

مولانا مرحوم کے اوصاف میں سے ایک وصف نرم خوی اور ملاطفت بھی تھی اپنے اتالیقی کے عہد میں ہم طلباء کو وقتاً فوقتاً فارسی کے اس شعر کی طرف متوجہ فرمایا کرتے تھے ؏

آسائش دوگیتی تفسیر ایں دوحرف است

بادوستاں تلطف بادشمناں مدارا

مولانا مرحوم کی پوری زندگی اس شعر کا نمونہ اور مصداق تھی، اتالیقی کی خدمت اور ذمہ داری ایسی ہے کہ اس میں زجروتوبیخ اور تنبیہ وتادیب اور سزاوعقوبت ایک ناگزیر مرحلہ ہے لیکن مولانا مرحوم ایسے مواقع پرجس خوش اسلوبی اور حکمت کے ساتھ صورتحال پر قابو پاتے تھے وہ بیان سے باہر ہے، ناگوار و سخت لہجہ میں کسی طالب علم سے گفتگو کرنا اور تہدید وتوبیخ کے کلمات استعمال کرنا مولانا جانتے ہی نہیں تھے اور یہی وجہ ہے بعض شرپسند طبیعتیں جو سختی اور تلخی کی عادی ہوتی ہیں اور بغیر اس کے ان کی اصلاح نہیں ہوتی ہے وہ مولانا کے اس اتالیقی اور نگرانی کے نظام سے بہت غلط فائدہ اٹھاتی تھیں لیکن مولانا کی اتالیقی سے ان طلبہ کو بہت فائدہ پہنچتا تھا، جو مولانا کے لطیف اشاروں کو بھی اپنے لئے بہت بڑی تنبیہ سمجھتے تھے۔

۷ اردو زبان میں اس وقت تک جتنے علوم وفنون پر کتابیں طبع ہوچکی تھیں مولانا مرحوم کو ہر کتاب اور اپنے موضوع پر اس کے درجہ ومقام اوراس کے مصنف کی منزلت کا تفصیلی علم تھا اور جب مولانا کسی کو کسی کتاب کے پڑھنے کی ہدایت کرتے تھے تو اس کتاب کی اہمیت اوراس کے مصنف کے مقام ومنزلت سے بھی آگاہ فرمادیا کرتے تھے اوراس سے ہم طلبہ کو کتاب کے پڑھنے میں اوراس سے استفادہ میں بڑی مدد ملتی تھی، غیر درسی کتب کے مطالعہ کے لئے مولانا ایک بہترین مرشد ورہنما تھے۔

درسی مضامین میں مجھے مولانا مرحوم سے تاریخ اسلام، ابوداؤد شریف اور مقدمہ ابن خلدون پڑھنے

کی سعادت حاصل ہوئی، تاریخ اسلام پر مولانا کی نظر بہت گہری اور تفصیلی تھی اور مولانا درس میں ان واقعات کی نشاندہی فرماتے جاتے تھے جن کی حیثیت سنگ میل کی ہوتی تھی اور طالب علم میں تاریخ کے فن سے ایک ذوق پیدا ہو جاتا تھا، چونکہ مولانا مرحوم ہمارے نگراں بھی تھے اور مولانا کا قیام رواق شبلی کے مشرقی بازو میں تھا اور میں بھی اسی حصّہ کے ایک کمرہ میں رہتا تھا، اس لئے برابر میں یہ دیکھتا تھا کہ ابوداؤد شریف کے درس کے لئے مولانا کس اہتمام سے مطالعہ فرماتے تھے۔ اور باقاعدہ تیار ہو کر درس میں تشریف لے جاتے تھے۔ مولانا مرحوم کی عام شہرت ایک مؤرخ اور ادیب کی حیثیت سے ہے لیکن یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ فن حدیث میں ان کی نظر گہری تھی اور انھوں نے یہ فن مولانا حیدر حسن خاں صاحب مرحوم سابق شیخ الحدیث و مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء سے اپنے زمانۂ طالب علمی میں پڑھا تھا اور ان کو شیخ صاحب مرحوم کی ذات سے غیر معمولی تعلق و عقیدت بھی تھی جس پر ان کا مضمون گواہ ہے۔ استاذ حدیث سے یہ قلبی ربط و تعلق کی وجہ بھی یہی ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنے استاذ سے فن حدیث بہت محنت و توجہ سے پڑھا تھا، مولانا مرحوم کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک بڑی صفت کتمان تھی وہ اپنی فضیلت ولیاقت دوسروں پر مسلّط نہیں کرتے تھے، اس لئے بہت کم لوگوں کو ان کے مقام و منزلت کا احساس ہوتا تھا۔

ہندوستان میں تحریک خلافت سے لے کر مسلمانوں کے اہم دینی علمی اور سیاسی تنظیمات و تحریکات اور اشخاص کے متعلق ان کا علم بڑا گہرا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کا عہد بہت ہی گوناگوں اہمیتوں کا حامل ہے، ہندوستان کی سیاسی جدوجہد برطانوی استعمار سے مقابلہ اپنی آخری منزل میں داخل ہو رہی تھی اور ہندوستان کی سیاسی کشمکش اور مسلم و غیر مسلم زعماء کی قربانیاں اور کوششیں ثمرات و نتائج کی شکل میں ظاہر ہونے والی تھیں، ہندوستان نے واضح طور پر آزادی کی ایک ابتدائی قسط ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے ذریعہ حاصل کی اور اس کے نتیجہ میں ہندوستان کے تمام صوبوں میں بااختیار اور منتخب ہندوستانی نمائندوں پر مشتمل حکومتیں بنیں، اسی عہد میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک وہ مشہور عالمگیر جنگ ہوئی ہے جس نے پورے عالم کا جغرافیہ بدل ڈالا اور ساری دنیا اس سے متاثر ہوئی، اسی عہد میں ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم اور اس کے نتیجہ میں اس برصغیر میں ہندوستان اور پاکستان کے نام سے دو مملکتوں کا قیام عمل میں آیا اور اسی عہد میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کانگریس و مسلم لیگ کی آویزش اپنے شباب پر تھی اور اسی شدید اختلاف کی حالت میں ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے

ہندوستان کی تقسیم اور نئی مسلم اسٹیٹ کے وجود کا مطالبہ کیا۔ مسلم رائے عامہ نے اس مطالبہ کو جس تیزی سے قبول کیا ہے اور اس پر متفق ہوئی ہے اتنا بڑا اتفاق تحریک خلافت کے بعد کسی اور بات پر نہیں ہوا تھا یہاں تک کہ یہ مسئلہ مسلم لیگ کے مطالبے کے بجائے پورے ہندوستانی مسلمانوں کا مطالبہ بن گیا، اس کے نتیجہ میں ہندو مسلم منافرت بھی اپنے برے اثرات دکھانے لگی تھی، مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم ان تمام سیاسی معاملات میں اپنی ایک پختہ اور علیٰ وجہ البصیرت رائے رکھتے تھے اور جب مجلسوں میں ان تمام چیزوں کو شرح وبسط کے ساتھ فرمایا کرتے تھے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ اور سننے والوں کو بہت سیاسی اور تاریخی نفع پہنچتا تھا۔ مولانا مرحوم کا رجحان نیشنلسٹ جماعتوں کی طرف تھا لیکن مولانا نے کبھی بھی دارالاقامہ میں اپنی اس رائے کو دوسروں پر نہیں تھوپا اور نہ سیاسی معاملات میں طلبہ کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ لیکن جو لوگ مولانا کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے اور ہندوستان کی سیاست پر ان کی رائے اور گفتگو سنتے تھے وہ متاثر ضرور ہوتے تھے اور اسی طرح طلبہ کی بڑی تعداد اپنے سیاسی آراء میں نیشنلسٹ خیالات کی تھی۔

مولانا کے علمی افادہ وافاضہ کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں تھا بلکہ جس وقت بھی ان سے کوئی بات پوچھ لی جاتی وہ برجستہ اس کو تفصیل سے بیان فرماتے اور کبھی تو یہ مجلس درس کھڑے کھڑے ہوا کرتی تھی اور بہت دیر تک اس کا سلسلہ قائم رہتا اور جب کوئی طالب علم ان سے کسی تحریک کے بارے میں یا کسی اہم تاریخی واقعہ کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا تو مولانا مرحوم بڑے انشراح ومسرت کے ساتھ اور بہت مزہ لے لے کر اس بات کے جملہ متعلقات بیان فرماتے تھے۔

میرے زمانۂ طالب علمی میں چار ایسے اساتذہ تھے جن سے علمی وفکری استفادہ عام طور پر طلبہ کیا کرتے تھے اور یہ چاروں استاذ دارالعلوم کی صف اول کے ممتاز اساتذہ میں تھے، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم جن کی وسعت معلومات اور قوت حافظہ ضرب المثل تھی، اہم سے اہم اور دقیق سے دقیق مسائل کے سمجھنے میں جب مولانا مرحوم سے رجوع کیا جاتا تھا تو وہ برجستہ اس موضوع سے متعلق کتاب ومصنف کے حوالہ کے ساتھ زبانی عبارت پڑھنا شروع فرماتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی اس موضوع پر مولانا کتاب دیکھ کر چلے آرہے ہیں، کسی مسئلہ کی تحقیق کے سلسلے سے اگر یہ معلوم کرنا ہوتا کہ یہ بات کس کتاب میں ملے گی تو مولانا مرحوم فوراً کتاب کا حوالہ بتلاتے تھے، اور اگر یہ کتاب کتب خانہ میں ہوتی تو فوراً

کتاب نکلواکر مطلوب کتاب کے جس حصّہ میں ہوتی تھی کھول کر دکھاتے، فن حدیث اور اس کے متعلقات پر شاہ صاحب مرحوم کی نظر بہت ہی گہری اور محققانہ تھی، شاہ صاحب سے صحیح استفادہ وہی کرسکتا تھا جو پہلے سے بھی معلومات کا ذخیرہ رکھتا ہو، اس لئے عام طور پر ہم طلبہ کا ان سے استفادہ مجلس درس تک محدود رہتا تھا۔

دوسری شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء دامت برکاتہم کی ہے، ذہن و فکر کو صحیح سمت میں موڑ دینا اور طالب علم کی فکر و تدبّر کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کر دینا مولانا کی خصوصیت خاصہ تھی اور ہے۔ اور زمانہ طالب علمی سے لے کر اب تک الحمدللہ مولانا مدظلہ سے میرا استفادہ جاری ہے، دینی اور علمی، فکری اور دعوتی میدان میں مولانا کے جو کارہائے نمایاں ہیں اور جو تصانیف کثیرہ ہیں، اس مضمون میں اس کی تفصیل کا موقعہ بھی نہیں ہے، وہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

تیسری شخصیت استاذ محترم مولانا محمد ناظم صاحب ندوی ادیب دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ہے، جو اس وقت کراچی میں مقیم ہیں، ادب اور اس کے متعلقات پر مولانا کی نظر بہت عمیق اور وسیع تھی، مجھے زمانہ طالب علمی کے بعد بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ کسی خاص لفظ یا عربی کے کسی خاص جملے یا کسی شعر کا مطلب پوچھنا چاہا تو برجستہ مولانا فرماتے کہ کیا تم آج کل فلاں کتاب دیکھ رہے ہو اور واقعہ بھی یہی ہوتا تھا میرے ہاں کہنے کے بعد مولانا پھر اس سوال کا جواب بڑی تفصیل سے اور دوسرے شواہد اور متعلقات کو بیان کر دیا کرتے تھے اور چوتھی شخصیت مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کی تھی، بلا مبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اُردو ادب کے پورے سرمایہ پر مولانا مرحوم کی نظر تھی، میں پورے یقین و وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ۳۵ءسے لے کر ۴۵ء تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ میں جس کو جو کچھ بھی حاصل ہوا وہ انھیں چاروں مذکورہ بالا حضرات کے ربط و تعلق اور علمی استفادہ سے حاصل ہوا۔ مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کی ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ اپنے شاگردوں اور خوردوں کو بھی خصوصی اہمیت دیا کرتے تھے اور ان سے بھی رائے و مشورہ لیا کرتے تھے اور اس معاملہ میں ان کا طرز عمل اور انداز گفتگو اس طرح ہوتا تھا کہ گویا ایک دوست اپنے دوسرے دوست سے مشورہ لے رہا ہے، مولانا مرحوم اپنی رہائش اور لباس اور کھانے میں مزاجاً بہت سادہ تھے، لیکن ان کا ذوق اور معیار ان سب چیزوں میں بہت بلند تھا، طلبہ کی عزت نفس اور ان کی خودداری کا بڑا خیال رکھتے تھے اور ان کو رکھ رکھاؤ کی بڑی ہدایت فرمایا کرتے تھے، مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ

زمانہ طالب علمی میں مجھے اہتمام کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ شیروانی پہنا کرو میں نے ان سے کہا کہ میرے پاس صرف ایک شیروانی ہے جو اس وقت دھلنے کو گئی ہے تو فرمایا دوسری بھی بنوالو، چنانچہ ان کے حکم کی تعمیل میں میں نے ایک اور شیروانی بنوائی اور میرے پاس دو شیروانی ہو گئیں۔

مولانا مرحوم کی وفات سے میں اپنے ایک شفیق استاذ اور ایک ہمدرد و بہی خواہ سے محروم ہو گیا اور یہ میرا ایک ذاتی نقصان ہے۔ مولانا مرحوم نے ہمیشہ مجھے عرفان کہہ کر پکارا اور ان کے اس طرح آواز دینے میں میں جو اپنائیت و حلاوت محسوس کرتا تھا، اس کو بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں بے شک صرف عرفان کہنے کا حق رکھنے والے اب بھی کچھ بڑے موجود ہیں لیکن کہتے صرف حضرت مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم ہی تھے۔

رحمہ اللہ وغفر لہ مغفرۃ واسعۃ

دین وملّت کے سپاہی

عربی مدارس کے قیام کی سب سے بڑی غرض یہ تھی کہ یہاں دین و ملت کے ایسے سپاہی تیار کئے جائیں جو ہر حال میں اسلام کی حفاظت کر سکیں اور الحاد و بے دینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکیں، آغاز کار کے وقت ان درسگاہوں نے اس زمانہ کے حالات کے مطابق مفید و مؤثر لائحہ عمل تیار کیا تھا، اور نصاب و نظام تعلیم کے ایسے خاکے بنائے تھے جو اس وقت کی ضرورت کے مطابق تھے، جب تک وہ فضا قائم رہی یہ نظام تعلیم مفید اور کارگر ثابت ہوا لیکن اب جب کہ عرصہ سے حالات بدل چکے ہیں ضرورت ہے کہ ہماری درسگاہوں میں بھی انقلاب ہو، زمانہ کی نئی ضرورتوں کے مطابق پھر سے نصاب تعلیم مرتب ہو اور تعلیم و تربیت کے ایسے اسلوب اختیار کئے جائیں جو طلبہ کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق زندگی کے نئے میدانوں کے لئے تیار کر سکیں، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج کے طلبہ کل کے علماء ہوں گے، قوم کی باگیں ان کے ہاتھ میں ہوں گی اور یہی کشتیٔ ملت کے ناخدا ہوں گے۔

(مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

علم و تعلیم کی فکرمندی

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کے خطوط کی روشنی میں

(مولانا محمد رابع حسنی ندوی، صدر شعبۂ ادب عربی دارالعلوم ندوۃ العلماء)

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ کی شخصیت گوناگوں قسم کے اوصاف کی حامل رہی ہے وہ علمی و ادبی میدان میں نمایاں شخصیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اچھے استاد، اچھے مصنف اور اچھے ماہر تعلیم تھے، ان کو بیک وقت علوم دینیہ میں بھی نمایاں دستگاہ حاصل تھی اور علوم حاضرہ میں بھی مولانا ضروری واقفیت رکھتے تھے، انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم گاہ سے جس نے علوم دینیہ اور علوم حاضرہ کو جمع کرنے کا ایک انقلابی تجربہ کرنے کی کوشش کی تھی پورا استفادہ کیا تھا۔ وہ ایک طرف قرآن و سنت کے علوم سے آگاہ تھے، دوسری طرف انھوں نے علم کلام اور تاریخ و ادب میں بھی مقام پیدا کیا تھا، عصر جدید کی ضرورتوں کو سمجھنے کے لئے انگریزی زبان کی ضروری صلاحیت بھی حاصل کرلی تھی، چنانچہ وہ مراکز دینیہ کے علمی و تعلیمی ماحول میں ممتاز شخصیتوں میں شمار کئے گئے اور انھوں نے عصری تعلیم کے ماحول میں بھی قدر و منزلت حاصل کی۔ ان کو ندوۃ العلماء میں تعلیمی خدمت انجام دینے کے بعد جامعہ ملیہ میں بھی فائدہ پہنچانے کا موقع ملا، پھر وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد ایک طرف ندوۃ العلماء کے اعزازی معتمد تعلیمات رہ کر ندوۃ العلماء کے مقاصد و تعلیمی نظریات کو مفید طریقہ سے بروئے کار لانے میں اپنے مشوروں اور رہنمائیوں سے فائدہ پہونچایا دوسری طرف دارالمصنفین جیسے وسیع تحقیقی و تصنیفی ادارہ کی سرپرستی بھی کی، انھوں نے ان تمام جگہوں اور منصبوں میں اپنے قیمتی تعاون و رہنمائی کے ایسے آثار چھوڑے جن کی یاد عرصہ تک باقی رہے گی۔

مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت ایک بڑے استاذ کے اچھا عرصہ گزارا تھا اور دارالعلوم میں رہتے ہوئے دارالعلوم کے طلبہ اور وہاں کی علمی و ادبی زندگی میں اچھی رہنمائی کا فرض انجام دیا تھا پھر انھوں نے شہر لکھنؤ میں ہی عربی زبان اور قرآن مجید کی تعلیم کا ایک مختصر اور مفید نظام چلایا تھا، اس

سلسلہ میں انھوں نے ایک جامع اور مفید نصاب بھی تیار کیا تھا۔ بعد میں ان کو جامعہ ملیہ میں ناظم دینیات کی حیثیت سے بلالیا گیا، وہاں ریٹائرمنٹ کی عمر تک وابستہ رہے، وہاں کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیمات کی ذمہ داری سنبھالی اسطرح دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ و طلبہ سے دوبارہ اور زیادہ ذمہ دارانہ طریقے سے تعلق پیدا ہوا اور انھوں نے دارالعلوم کی ترقی میں پورا حصّہ لیا۔ اسی زمانہ میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کے شریک ناظم بھی منتخب ہوئے، اور چونکہ معتمد تعلیمات دارالعلوم کے لئے دارالعلوم میں باقاعدہ رہنے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے قیام تو مولانا کا اصلاً دارالمصنفین اعظم گڑھ رہتا تھا لیکن دارالعلوم ندوۃ العلماء سے برابر ربط اور یہاں کے معاملات سے براہ راست تعلق تھا، ان کی دلچسپی کے لیے یہ بات مزید تھی کہ اسی زمانہ میں ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور دارالعلوم کے مہتمم مولانا محب اللہ لاری ندوی ایم اے علیگ ان کے پرانے رفیق بھی تھے جن کا ندوۃ العلماء میں تعلیم کے دوران ساتھ رہ چکا تھا اور آپس میں ہم آہنگی اور قریبی ربط و تعلق تھا اس کی وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمت کے سلسلہ میں اس کے تینوں بڑے ذمہ داروں کے درمیان یکجہتی اور ہم ذوقی کی اچھی صورت پیدا ہوئی۔

مولانا مرحوم کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے اور ترقی دینے کی بڑی فکر رہتی تھی وہ اس سلسلہ میں صرف اپنے ہم منصب رفقاء سے ہی مشورہ و تبادلۂ خیال پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے خوردوں سے بھی بعض وقت تبادلۂ خیال کرتے تھے۔

اس کا تجربہ مجھے ذاتی طور پر بھی ہوا، مولانا مرحوم سے میرا تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی وساطت سے بچپنے ہی سے تھا، لیکن اس وقت مولانا کا تعلق اس شفقت کی شکل میں تھا جو خاندان کے کسی بزرگ کو اپنے کسی خورد عزیز سے ہوتی ہے، لیکن جب مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بحیثیت معتمد تعلیمات کے زیادہ قریب ہوئے تو دارالعلوم کے ایک استاد کی حیثیت سے میرے ساتھ مولانا کے تعلق میں بھی اضافہ و تبدیلی ہوئی، اس وقت مولانا مرحوم کی مذکورہ بالا صفت کا قریب سے اندازہ ہوا، مولانا مرحوم جب کسی موقع پر خطوط تحریر فرماتے تو اس میں بھی مولانا کی اس فکرمندی کا اظہار ہوتا اور بعض مرتبہ مولانا مرحوم زیادہ تفصیل اور بے تکلفی سے کام لیتے۔

ذیل میں مولانا کے اس پہلو کو ان کے مکاتیب کی روشنی میں پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا اپنے ایک مکتوب میں جو ستمبر ۴۷ء کا لکھا ہوا ہے۔ بعض اساتذہ کے معمر اور کمزور ہوجانے اور

بعض کے سفر پر جانے پر اپنے احساس اور اس سلسلہ میں دارالعلوم کے معاملات میں فکرمندی کا اظہار فرماتے ہیں:۔

"مجی علی صاحب کے نام جو کارڈ لکھا تھا وہ امید ہے کہ تم نے بھی دیکھ لیا ہوگا. امسال مدرّسوں کی بڑی کمی ہوگی، مولوی عبدالنور اور ارشاد جا چکے، خطیب صاحب کا استعفا آگیا، مولانا وجیہ الدین از کار رفتہ ہو رہے ہیں۔ اب کام چلانے کی یہی شکل ہے کہ تم اپنے شاگردوں پر نظر ڈالو، فضیلت سے فارغ ہونے والوں میں سے کتنے مزید تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں، تم کس کس کو اہل سمجھتے ہو، ادب و دینیات دونوں کے حساب سے سوچو. تخصص کے جن طلبہ نے امتحان دیا ہے ان میں کتنے اہل نکل سکتے ہیں، خوب غور کر لو۔"

مولانا اسی خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"جلال صاحب مقدمہ میں کامیاب ہو گئے ہیں، ان کی جگہ ایک اچھا انگریزی ماسٹر رکھنا پڑے گا اور ایک ماسٹر شاہد صاحب کے ضعف کی بنا پر .... ضمیر صاحب بھی خاصے کمزور ہیں، بہرحال دو اچھے انگریزی داں اگر آجائیں تو ان کے ساتھ شاہد صاحب اور ضمیر صاحب کچھ عرصہ اور چل جائیں گے۔"

آگے مولانا گرانی کا ذکر کرتے ہیں اور منتہی تعلیم کے طلبار کے وظائف کے بارے میں اضافہ کی ضرورت کا احساس ظاہر کرتے ہیں۔

"چھ ماہ میں گرانی کتنی بڑھ گئی ہے، دال چار روپے کیلو اور گیہوں دو روپے پہنچ گئے ہیں، تیل بارہ روپے کیلو ہو گیا ہے، لوگ کس طرح گزر کریں، وہ کس طرح بال بچوں کو پالیں، نرخ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔"

مولانا تحریر کرتے ہیں۔

"اختصاص اور فضیلت میں بھی کچھ عام وظیفہ کے علاوہ امتیازی امدادی وظائف نقد دیئے جائیں... باہر سے آنے والوں میں اگر جانچ اور تجربہ کے بعد کسی کی غیر معمولی صلاحیت ہو تو کھانے کے عام وظیفہ کے علاوہ اس کو کچھ مزید اعتراف لیاقت کا وظیفہ بھی دیا جائے۔"

مولانا آگے تحریر کرتے ہیں:۔

"مجھے کب تک آجانا چاہیے، عید بعد پہنچنے کا ارادہ ہے، چاہتا ہوں کہ ادارہؔ کی طرح بڑی عمر کے لوگوں کا ایک کورس بھی شروع کردوں، اگر ایسا ہو جائے تو میں بھی جم کر رہنے کی ضرورت محسوس کروں۔"

ایک بار مولانا دہلی جاکر علیل ہوئے اور ایک ماہ مسلسل علیل رہے، اس کا تذکرہ اپنے ایک خط میں جو انھوں نے یکم اپریل ۴۸ء کو جامعہ نگر سے جہاں مولانا مقیم تھے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔ جامعہ کے حالات پر تبصرہ بھی کرتے ہیں جو کہ ان دنوں فکر و تشویش کے چل رہے تھے۔

"۶۹ نزد چوپال جامعہ نگر   ار اپریل ۴۸ء

عزیزی رابع اسعدک اللہ

یہاں آکر ایسا بیماریوں میں مبتلا ہوا کہ نقل و حرکت دشوار ہے، زکام نزلاوی بخار کے ساتھ خونی بواسیر نے بہت کمزور کردیا ہے، رات سے علاج بدلا ہے، صبح سے قدرے کمی محسوس ہو رہی ہے، اب اعظم گڑھ سے آئے ہوئے بہت دیر ہو چکی ہے۔"

مولانا آگے تحریر فرماتے ہیں:

"محب اللہ اور مولوی معین اللہ، افتخار نجم الدین وغیرہ کو حالات بتادینا۔ جامعہ کے حالات خراب ہوتے جارہے ہیں، مجھے تو آثار اچھے نظر نہیں آرہے ہیں، اللہ مولانا محمد علی، شیخ الہند حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ کے قائم کردہ ادارہ کو آفات و فتن سے محفوظ رکھے، اسی کا سہارا ہے۔"

مولوی سعید الرحمٰن اور واضح غالباً مصر کے لئے پابہ رکاب ہوں، اللہ تعالیٰ اس سفر کو مبارک فرمائے۔

اب برابر یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔"

درجہ خصوصی کے نحو کے نصاب کے سلسلہ میں مولانا اپنے خط میں جو علی گڑھ سے نومبر ۴۷ء میں تحریر کیا تھا

ؔ اس سے مراد ادارہ تعلیمات اسلام امین آباد لکھنؤ جس کو مولانا مرحوم اور مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے مل کر قرآن مجید اور عربی کی تعلیم کے لئے قائم کیا تھا اور وہ ایک عرصہ تک کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔

لکھتے ہیں۔

بیت الفرح سر سید نگر دودھ پور۔ علی گڑھ

۲۶ نومبر ۷۳ء

"عربی کا معلم" کو فرصت کے اوقات میں ایک بار شروع سے آخر تک پڑھ لو تاکہ اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکو۔"

تعمیرات کے سلسلہ میں مولانا اپنے خط میں جو دارالمصنفین سے مارچ ۷۵ء میں تحریر کیا تھا لکھتے ہیں۔

"دارالمصنفین ۱۳ مارچ ۷۵ء

خدا کرے مسجد کے بعد نئی حاصل شدہ زمین پر بھی مجوزہ عمارتیں بننی شروع ہو جائیں، اس سلسلہ میں اساتذہ اور کارکنوں کے مکانوں کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔"

اور ذیل میں مولانا کا وہ مفصل مکتوب پیش کیا جا رہا ہے جو مولانا مرحوم نے اپنی وفات سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل اعظم گڑھ سے تحریر فرمایا ہے، اور جس میں نصاب تعلیم کے سلسلہ میں متعدد امور کا تذکرہ ہے، نیز مولوی محمد الحسنی مرحوم کے انتقال سے صرف ایک ماہ بعد مولوی اسحاق جلیس ندوی صاحب کے بھی انتقال کر جانے پر اپنے تاثر کا اظہار فرمایا ہے۔

۱۲/۷/۷۹ء

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڑھ

عزیزی رابع اسعدک اللہ تعالیٰ

خط اور معہد کا نصاب آئے ہوئے کئی دن ہو گئے، اس درمیان "معارف" کی مصروفیت ایسی رہی کہ غور کر کے جواب لکھنے کا موقع نہ ملا، رائے بریلی میں جو باتیں ہوئی تھیں وہ تمھارے حافظہ نے اچھی طرح محفوظ رکھیں۔ اب ان اشارات کو کسی قدر واضح الفاظ میں مہتمم صاحب کے حوالہ کر دو تاکہ عمل میں لانے میں دشواری نہ ہو۔

معلومات کے سلسلہ میں بترتیب ہر درجہ کی سطح کے مطابق کچھ عنوانات مقرر کر دینے چاہئیں تاریخ و جغرافیہ کا تو الگ عنوان ہے ہی، کسی زمانہ میں ماسٹر عبدالسمیع صاحب نے ایک مختصر سی کتاب جغرافیہ کی لکھی تھی، اب حالات بہت بدل گئے ہیں، اس لیے اس میں کافی ترمیم کی ضرورت ہے۔

طالب علم کو جغرافیہ کی اصطلاحات، ہندوستان کے طبعی و سیاسی حالات اور پھر دنیا کے سیاسی و طبعی جغرافیہ کا مختصر طور پر عام فہم زبان میں طلبہ کے سامنے ذکر کیا جائے۔ مخدومی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم نے ایک مختصر کتاب لکھوائی تھی جو شاید ..اصفحات سے بھی کم تھی مگر تمام ضروری باتیں اس میں آگئی تھیں، لیکن طبع نہیں ہوئی تھی، طلبہ کو نوٹ کے طور پر ضروری باتیں لکھا دی جاتی تھیں۔ ہندوستان کی تاریخ بھی اسی قسم کی مختصر تھی۔ "ہماری بادشاہی" میں ہندوستان کے بارے میں جو دس بارہ صفحات کا باب ہے بس اُس سے دو نے ڈھائی گنے صفحات میں قدیم عہد، مسلمانوں کا دور اور انگریزی عہد اور آزادی کے بعد کے زمانہ کے واقعات اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے تھے۔

آگے چل کر جب دارالعلوم کی منزل شروع ہو تو وہاں اختیاری مضامین کے طور پر علوم جدیدہ کی گنجائش رکھی جائے۔ عربی مدارس میں شروع سے آخر تک تمام مضامین لازمی ہوتے ہیں اور فن کے ساتھ کتابیں بھی لازمی ہوتی ہیں، اس کی وجہ سے طالب علم پر بار بھی ہوتا ہے اور اسکی واقفیت بھی نہیں بڑھتی، اگر کتابوں کے بجائے اعلیٰ درجات میں مضمون پڑھایا جائے، استاد مطالعہ کرکے لکچر دے تو زیادہ مفید ہو۔

یہ چند باتیں تمھارے غور کے لئے لکھ دی ہیں، ہمارے منتہی طلبہ کو کم از کم ایک اسلامی اور ایک عصری مضمون سے گہری واقفیت ہونی چاہئے، اس کے بغیر ہمارا اثر نہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر پڑے گا نہ قدیم پر ہم اپنے معمولی علم سے صرف عوام کے درمیان کام کر سکتے ہیں، خواص کی نگاہ میں ہمارا کوئی وزن نہیں ہوگا۔

میں خود بھی ندوہ آنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں مگر میری صحت کا جو حال ہے اس کی بنا پر اعظم گڑھ سے لکھنؤ کے صبر آزما سفر کی فی الحال ہمت نہیں پاتا، تقریباً سارا دن بیٹھے بیٹھے گزرجاتا ہے، اس کی وجہ سے سارا بدن چور چور ہوجاتا ہے اور کئی کئی دن درد رہتا ہے، انشاء اللہ عید بعد آؤں گا اور ایک ہفتہ قیام کرکے تم لوگوں کے ساتھ نصاب و نظام تعلیم کے بارے میں مشورہ کروں گا، اس اثناء میں تم لوگ بھی غور کرلو اور میں بھی ایک خاکہ بنالوں۔

ڈاکٹریٹ کا جو سلسلہ شروع ہوا اس کو آگے بڑھانا چاہئے، طلبہ کو تدریس کے لئے تیار کرنے کی مہم بھی بے حد ضروری ہے، اساتذہ میں سے کئی اب عمر رسیدہ اور خستہ حال ہو چکے ہیں۔ دو

تین سالوں میں ان کے جانشین تیار کرنے کی فکر ضروری ہے ورنہ اگر استاد لائق نہ ملے تو طلبہ کے اندر لیاقت کس طرح پیدا کی جاسکتی ہے، فرصت کم ہے اور کام زیادہ ہے، منزل تک پہنچنے کے لئے تیز گامی ناگزیر ہے۔

محب اللہ صاحب کی صحت اب کیسی ہے؟ کتب خانہ کا کیا حال ہے؟ عمارتیں کس مرحلہ میں ہیں؟ تحقیقات و نشریات اسلام کی کتابوں کا کیا ہوا؟ قمر صاحب غالباً واپس آگئے ہوں یا ان کا خط آیا ہو، خدا کرے نقصان سے ادارہ محفوظ رہے، مکانات کی کیا حالت ہے، امید ہے کہ اب آباد ہوگئے ہوں گے اور مزید کی فکر ہو رہی ہوگی، تکیہ کا کیا حال ہے، آج کل تو سناٹا ہوگا، علی صاحب آجائیں گے تو رمضان میں آبادی کمیت اور کیفیت دونوں میں بڑھ جائے گی۔ شیخ سہارنپور پہنچ گئے ہیں یا ابھی دہلی میں ہی ہیں، امسال ان کے یہاں توقع ہے کہ بہت بڑا مجمع ہو جائے۔

عبداللہ میاںؐ کا تقرر امید ہے کہ ہو گیا ہوگا، استاد کی تنخواہ کے علاوہ الرائد سے بھی کچھ الاونس مقرر کرنا چاہیے، تاکہ مالی پریشانی زیادہ محسوس نہ ہو اور کسی قدر دلجمعی کے ساتھ مطالعہ اور تعلیم میں لگ سکیں، اللہ تعالیٰ انھیں علم و عمل کی جامعیت عطا فرمائے اور اپنے باپ دادا اور بزرگوں کے نام کو روشن کرنے کی توفیق نصیب فرمائے، ان کے دوسرے بھائیوں کی طرف بھی خصوصی توجہ رکھنی چاہیئے۔

جولائی کے معارف میں محمد میاں کے متعلق چند صفحات لکھے ہیں، غالباً ۲۲ر جولائی تک رسالہ تم لوگوں کو مل سکے۔ اس مرتبہ کاتبوں کی بے توجہی کی وجہ سے کسی قدر تاخیر کا امکان ہے۔

فقط

عبدالسلام قدوائی

کل یہ خط لکھ کر ڈاک خانہ بھیج رہا تھا کہ معلوم ہوا آج پوسٹ ماسٹر زیر رخصت ہے، اور رجسٹری نہیں

لہ اس سے مرحوم مولوی سید محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی کے بڑے صاحب زادہ مولوی عبداللہ حسنی ندوی مراد ہیں جو دو سال قبل دارالعلوم سے فارغ ہوئے اور گزشتہ دنوں حدیث کی تکمیل میں مشغول رہے، ان کے والد کا انتقال ابھی چند دنوں قبل ہوا۔ دارالعلوم کے ذمہ داروں نے اب ان کے لئے باقاعدہ تدریس کی حیثیت سے تقرر کا فیصلہ کیا تھا۔

ہو سکتی، اس لئے دوسرے دن کے لئے لفافہ رکھ دیا، رات میں عشاء کی نماز پڑھ کر نو بجے کے قریب قیام گاہ پر آیا تو تمہارا تار ملا کر اسحاق جلیس بھی رخصت ہوگئے۔ محمد میاں کی اچانک موت کی یاد تازہ ہوگئی، ابھی بیس ہی دن تو ہوئے جب وہ میرے ساتھ ۲۲ جون کو رائے بریلی گئے السران کو عرصہ سے تھا۔ بہتوں کو ہوتا ہے اور زندگی بھر رہتا ہے، ان کی حالت دیکھ کر کوئی قریبی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا مگر کیا معلوم تھا کہ چند ہی دن میں رخت سفر باندھ لیں گے، ان کی وفات کا سانحہ ان کے خاندان کے لئے ہی نہیں بلکہ ندوہ کے لئے بہت بڑا سانحہ ہے، وہ بڑی اچھی صلاحیت رکھتے تھے، علمی بھی اور عملی بھی، جو کام ان کے سپرد کیا جاتا خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے مختلف میدانوں میں ان کا تجربہ کیا گیا اور ہر جگہ کامیاب رہے، تعمیر حیات اور کتب خانہ کے علاوہ پیام انسانیت کا کام انھوں نے بہت اچھی طرح کیا، ان کی صلاحیت وکارکردگی دیکھ کر توقع تھی کہ جلد یہ پیام ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچ جائے گا۔ لیکن افسوس کہ کام ابھی ابتدائی منزل ہی میں تھا اور اس کا نقیب اٹھ گیا۔ دارالعلوم کے موجودہ لوگوں میں کوئی ان کا جانشین نظر نہیں آتا، نہ پیام انسانیت کے لئے نہ تعمیر حیات کے لئے۔ علی صاحب یہ خبر سنیں گے تو اور نڈھال ہوجائیں گے۔ ان کو اسحاق صاحب پر بڑا اعتماد تھا، وہ بھی ان کی خوب سمجھتے تھے، بڑی سرگرمی کے ساتھ دورہ کر رہے تھے، اب ان کی صلاحیت نمایاں ہوئی تھی، پاریکھ صاحب تو خود ہی بیمار ہیں۔

میرا خیال ہے کہ علی میاں کو مدینہ منورہ ہی میں اطلاع ہوجائے تو زیادہ اچھا ہے وہاں وہ سکون کا موقع زیادہ پاسکیں گے، یہاں آنے پر خبر ہوئی تو تکلیف زیادہ محسوس کریں گے۔

میں تمھارے پہلے خط اور معین اللہ کے خطوط کے بعد ہی سے لکھنؤ آنے کو سوچ رہا ہوں لیکن صحت ایسی ہے کہ سفر کی ہمت نہیں پڑتی ہے، طبیعت تھکی تھکی رہتی ہے، بدن میں درد رہتا ہے۔"

مولانا مرحوم کے چند مختلف خطوط سے کچھ اقتباسات اور یہ مذکورہ بالا ان کا آخری مکتوب تقریباً پورا کا پورا پیش کیا گیا۔ ان اقتباسات سے مولانا مرحوم کی علم وتعلیم اور ندوہ کے سلسلہ کی فکر مندی کا

عکس نمایاں ہوتا ہے۔

افسوس ہے کہ مولانا آج ہمارے درمیان نہیں رہے وہ اپنے مالک و پروردگار کے حضور میں پہونچ گئے جہاں پروردگار عالم ملت اور دین و علم کے لئے ان کی فکرمندیوں کا بہترین صلہ عطا فرمائے گا۔

ملت اور ندوۃ العلماء کے سلسلہ میں اب ان کی بیش قیمت رائیں حاصل نہ ہوسکیں گی۔ یہ ایک خسارہ ہے جس کی تلافی کے لئے اور اسی کے ساتھ مولانا مرحوم کے لئے مغفرت اور درجات کی بلندی کے لئے اللہ تعالیٰ سے ہم سب کی مخلصانہ دعا ہے۔

قدیم وجدید کا امتزاج

عہد عباسی میں یونانی علوم و فنون کے فروغ کے بعد ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ مذہبی علوم کے ساتھ فلسفہ و حکمت اور ریاضی و ہیئت کو نصاب درس میں شامل کیا جائے تاکہ علماء کو زمانہ کے حالات کا اندازہ ہو اور جو زہر نئی راہوں سے پھیل رہا ہے اس کا تریاق تیار ہو سکے۔ نئے ابن رشد و ابن حزم اور نئے غزالی اور رازی ہوں جو حریفوں کو انہیں کے ہتھیاروں سے شکست دیں وہ نئے حالات کو سمجھیں، وقت کے تقاضوں سے باخبر ہوں، نئی تہذیب و معاشرت کا اندازہ کریں اور زندگی کے میدان میں نئے سازو سامان سے آراستہ ہو کر قدم رکھیں وہ کتاب و سنت پر گہری نظر رکھتے ہوں، فقہاء اسلام کی کاوشوں سے واقف ہوں، متکلمین کے کارناموں پر ان کی نظر ہو، اور جدید علوم و آداب سے باخبر ہوں تاکہ قدیم و جدید کے امتزاج سے وہ اکسیر تیار ہو جو ملت کے امراض کہنہ کو دور کر دے اور اس کے تن ناتواں کے اندر نئی روح پھونک دے جس سے اس کے اعضاء و جوارح میں ایسی قوت و توانائی پیدا ہو جو اس کے لئے کامیابی کے دروازے کھول دے۔

(مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

دبستانِ ندوہ کا ایک گوہر شب چراغ

(پروفیسر سید احتشام احمد ندوی، صدر شعبہ عربی کالی کٹ یونیورسٹی)

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی شخصیت اس دور قحط الرجال میں سرمۂ چشم بصیرت تھی۔ وہ علم و عمل کا سنگم تھے، پاک ذات و پاک صفات۔ وہ خیالات کے لحاظ سے روشن خیال تھے مگر عملی زندگی میں اسلامی نظریات اور مظاہر کا پورا لحاظ رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کے متعدد پہلو ان کے سوچے سمجھے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے تھے۔ دبستانِ ندوہ ان کی ذات میں پوری طرح جلوہ گر تھا۔ وہ ہماری علمی انجمن کا ایک روشن چراغ تھے۔ وہ دبستانِ شبلی کے ترجمان اور بزم سلیمانی کے راز داں تھے۔ وہ ندوہ کے مقاصد کے علمبردار تھے، ندوہ کو ایک عظیم تحریک، ایک اعلیٰ نصب العین کا ترجمان، ایک انداز فکر، ایک دبستان کا نقیب اور علمی میراث کا آئینہ دار تصور کرتے تھے۔ اپنی صبح و شام کی گفتگو میں وہ اپنے نظریات اس طرح ذہن نشین کر دیتے کہ ندوہ کے اعلیٰ مقاصد کی عظمت سے ہمارے دل سرشار ہو جاتے۔

مولانا اکثر فرماتے کہ علماء کو عمدہ لباس پہننا چاہیئے، صاف و ستھرا رہنا چاہیئے تاکہ انکے بارے میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں۔ مولانا فرماتے کہ ندویانہ تعلیم کا عمدہ نمونہ ڈاکٹر عبدالعلیؒ ہیں جنھوں نے اعلیٰ تعلیم اپنے دور کے ماہر علماء سے حاصل کی، جدید تعلیم میڈیکل کالج سے اور یونانی طب حکیم اجمل خاں سے پڑھی، اس طرح وہ جدید و قدیم کا سنگم بن گئے۔

مولانا کو اپنے معاصرین اور اکابر ندوہ سے غیر معمولی واقفیت تھی، ان کے بارے میں مولانا جچی تُلی رائے رکھتے تھے۔ اشخاص اور اداروں کے بارے میں ان کی معلومات نہایت وسیع تھیں اور خود اس میں ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو بھی دخل تھا۔

اللہ اللہ کتنی بڑی دولت ہم سے چھن گئی۔ وہ علمی گفتگو، موقع و محل کی رعایت، قصّے اور حکایتیں، لطیفے اور ظرافتیں مگر علمی وقار اور علمی معیار کے اندر، فرماتے کہ میرا اصل شوق گفتگو

کا ہے چونکہ کلاس بھی ایک طرز کی گفتگو ہے لہذا اس کو مولانا بڑے شوق سے پڑھاتے۔

میں نے مولانا کو لکھا کہ آپ اپنی سوانح عمری مرتب کریں اور اس میں ان اہل علم کے خیالات اور تجربات بھی درج فرمادیں جن کو دیکھنے اور پرکھنے کا آپ کو موقع ملا ہے۔ غالباً اس سلسلہ میں کچھ ارادہ بھی کیا تھا مگر ادھر صحت کی خرابی کے باعث کام آگے نہ بڑھا۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ مولانا نے اپنے کسی بچے کو عربی و اسلامیات میں اپنے ندویانہ تصور کے مطابق تعلیم نہ دلائی۔[1] فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ آخر تم سب کو کیوں انگریزی تعلیم کی طرف لے گئے، کیا تم کو رزق عطا نہیں کیا گیا؟ فرماتے کہ میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ فرماتے کہ اللہ نے مجھے بغیر ڈگری کے ملازمتیں عطا کیں۔ واقعی مولانا اسٹرائک کے باعث ندوہ سے جامعہ چلے گئے اور کورس پورا نہ کرنے باعث ندوہ کی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ ایک بار فرمایا کہ کسی صنفیت کی طویل ڈگری مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ نے مجھے دی تھی بس وہی ایک سند ہے، ظاہر ہے کہ وہ شخصی ہے کسی ادارہ کی نہیں ہے۔

مولانا کو جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ میں خلافت بمبئی میں ملازمت مل گئی اور وہ بغیر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے مشورہ کے تعلیم چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے سنا تو افسوس کیا اور فرمایا کہ قدوائی صاحب سمجھتے تھے کہ میں ان کو ایسی ملازمت نہیں دلا سکتا۔ مولانا کو جدید تعلیم کی تکمیل نہ کر سکنے کا بھی افسوس تھا مگر چونکہ گھریلو حالات اور عمدہ ملازمت پھر رئیس احمد جعفری کی دوستی نے ان کو بمبئی کھینچ لیا۔

وہ مولانا علی میاں ندوی مدظلہ، سے قلبی تعلق رکھتے تھے میں موجود ہوتا تو مجھ کو رائے بریلی ساتھ لے جاتے۔ ان کا ذکر فرماتے۔ ایک زمانہ میں مسلم مجلس کا زور تھا میں اور مولانا تکیہ گئے وہاں حضرت مولانا نے مسلمانوں کے بارے میں اپنی اضطرابی کیفیت کا اظہار دل کھول کر کیا اور قیادت کے لئے کسی شخصیت کے سامنے آنے پر زور دیا۔ جب ہم لوگ سوئے تو مولانا نے فرمایا کہ علی صاحب

---

[1] مگر مولانا کے بڑے صاحبزادے ندوہ کے عالم اور علی گڑھ سے عربی میں پی۔ ایچ ڈی ہیں۔

(مولانا اکثر ساتھی ہونے کے ناطے اسی طرح فرماتے تھے) پر حالات کا بڑا اثر ہے خلوص وجذبات کے باعث اضطراب محسوس کرتے ہیں۔

فرمایا کہ مولانا علی میاں نے اشخاص کی تربیت کرکے ہر کام کے لئے ایک پوری ٹیم تیار کردی ہے اور اشخاص کا انتخاب ہر کام کے لیے نہایت موزوں کیا ہے۔

ایک بار فرمایا کہ جتنا علمی کام مولانا علی میاں نے کر لیا ہے وہ کئی نسلوں کی عظمت علمیت کے لئے کافی ہے۔

اکثر فرماتے کہ کوئی تاریخ اسلام کو افسانوی انداز میں صحت واقعات کے ساتھ اس طرح لکھ دیتا کہ اسلامی تاریخ کی روح مصور ہو جاتی، کبھی یہ بھی فرماتے کہ تاریخ اسلام کو اوسط درجہ کے حجم کے ساتھ ترتیب سے لکھنے کی اردو میں ضرورت ہے۔ ایک بار مولانا پروفیسر خلیق احمد نظامی سے ملنے گئے لوٹ کر آئے تو فرمایا کہ خلیق صاحب کا خیال ہے کہ اردو میں جو ضخیم جلدیں تاریخ اسلام پر منشی ذکاء اللہ نے تیار کی ہیں ان کو تلخیص وتدوین کے ذریعہ دوبارہ پیش کیا جائے، ان میں فارسی اور دوسرے بنیادی مآخذ سے مواد پوری طرح اخذ کیا گیا ہے۔

مولانا اکثر اس رائے کا اظہار کرتے کہ مسلمان خود اسلامی نظام کے دشمن ہیں وہ خود اسکے مخالف ہیں اور اسلامی زندگی کو پسند نہیں کرتے۔

مولانا دوسروں کے بارے میں بڑے تسامح اور فراخ دلی سے کام لیتے مگر خود شرعی امور کی سختی سے پابندی کرتے۔ پائجامہ ہمیشہ ٹخنے سے اونچا رہتا، بال بڑھنے نہ دیتے۔ فرماتے بھائی ہم لوگ کیا کرتے ہیں کم سے کم جو شرعی احکام ہیں ان کو الٹا سیدھا ادا کر لیتے ہیں۔

مولانا زور سے کم ہی ہنستے تھے ایک بار میں اور مولانا دونوں باغ جا رہے تھے راستہ میں ایک پاسی ملا جو کہیں سے لوٹ رہا تھا، مولانا نے پوچھا کہاں سے آرہے ہو ؟ بولا "مولانا بھیا دہی کٹھ پٹت ینٔ ماں پھنسے ہَنٔ " کٹھ پتیا کا مطلب مولانا نہ سمجھے، کافی گفتگو کے بعد معلوم ہوا کسٹوڈین کا کوئی معاملہ تھا۔ اس پر مولانا نے میری طرف دیکھا اور ہنس کر فرمایا کہ کیسے الفاظ یہ لوگ بنا لیتے ہیں۔

مولانا کے حسن اخلاق کا عجیب عالم تھا میں ساتھ چلتا پاسی، چمار، تیلی، برہمن، قصائی کوئی ملتا سلام کرتا اور مولانا کھڑے ہو جاتے اس کی خیریت اس کے معاملات مسائل اور ذاتی حالات دریافت کرتے، مشورہ دیتے اور ایسی محبت سے ملتے کہ آدمی ان کا گرویدہ ہو جاتا، ہندو مسلمان سب مولانا کی عظمت کے قائل تھے۔

ایک بار مولانا نے مجھے ایک مشورہ دیا اور فرمایا، "من نکردم شما حذر بکنید" مگر خود ان کا عمل اس کے خلاف تھا میں نے مشورہ ناپسند کیا اور مولانا کو اس کا اندازہ ہو گیا۔ فوراً بولے بھائی معاف کرنا اگر تم کو برا لگا ہو۔ دو بار فرمایا تو میں پانی پانی ہو گیا۔

ایک بار مجھ سے مولانا نے پیسے لئے پھر اس کا پورا حساب کر کے واپس کر دیا اور فرمایا کہ پیسے کے معاملات میں صفائی ضروری ہے ورنہ دل میں ملال ہوتے ہوتے تعلقات مکدر ہو جاتے ہیں۔

میں نے مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کو اس وقت دیکھا جب مولانا ادارہ تعلیمات اسلام امین آباد لکھنؤ میں سرگرم عمل تھے اور میں مخدوم پور پیرزادگان سلطان پور سے تھولینڈی آیا تھا۔ میں اس وقت ۹۔۱۰ برس کی عمر کا ایک طالب علم تھا اور اردو مکتب تیسری کلاس میں تھا۔ مولانا کی عظمت و شخصیت سے کما حقہ واقف نہ تھا مگر چونکہ مولانا کا مکان میرے مکان کے سامنے تھا ہر وقت آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا اور معاشرتی زندگی میں قریبی تعلقات کے باعث میں ان کی ذات سے زیادہ مانوس ہو گیا۔ مولانا عموماً گرمیوں کی چھٹیوں میں مع اہل وعیال تشریف لاتے اور دو ماہ قیام فرماتے۔ درمیان میں بھی وقتاً فوقتاً آتے رہتے اور ان کی آمد سے تھولینڈی کی فضا پر نور بن جاتی۔

ماہ مئی کی شدید گرمیوں میں مولانا کے گھر میں ڈرائنگ روم کے بعد والا کمرہ نہایت ٹھنڈا رہتا ہے، میں ان کے گھر چلا جاتا اور دوپہر بھر انہیں کی خدمت میں گذارتا۔ وہیں قیلولہ کرتا اور کبھی کبھی عشاء کی نماز پڑھ کر مولانا کے ساتھ واپس آتا۔ مولانا اپنے گھر چلے جاتے اور میں اپنے گھر۔ اس طرح پانچ وقت نمازوں میں اور گھر میں ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ اکثر محفل مولانا کے دروازہ یا ہمارے دروازہ پر ڈاکخانہ میں جمتی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مولانا صبح کو خط لکھنے یا ڈالنے کے لئے تشریف لاتے۔ اس وقت ڈاک خانہ ہمارے گھر میں تھا۔ کبھی باہر بیٹھ جاتے اور کبھی گھر آجاتے اور وہیں خط لکھنا شروع کر دیتے اور ساتھ ہی گفتگو بھی فرماتے رہتے۔

جب مولانا کے بارے میں یہ سطور قلم بند کر رہا ہوں تو ہزاروں محفلیں ذہن کے گوشوں سے ابھر رہی

ہیں۔ صبح دوپہر شام اور رات کے کتنے مناظر ہیں جہاں مولانا کی باغ و بہار شخصیت سراپا نور بن کر نگاہوں کے سامنے کھڑی ہے۔ اللہ اللہ کیسی کیسی پرنور صحبتیں گذری ہیں۔ مولانا کے الفاظ، انداز بیان کردہ واقعات، کیسے کیسے حقائق کے چشمے ابلتے نظر آتے ہیں، کیسے کیسے فکر انگیز خیالات دریا کی طرح رواں ہیں، کبھی امت اسلامیہ کی داستان ہے کبھی مسلمانوں کی پستی کا بیان ہے کبھی علمار کی صفات سے محفل پرنور ہے کبھی گاؤں کے کسی واقعہ کی دلچسپ حکایت ہے کبھی خاندان کا کوئی دلکش پہلو زیر بحث ہے کبھی آبا واجداد کی کہانی ہے، کبھی کسی شخصیت کے بارے میں گہرافشانی اور کبھی ندوہ کا ذکر ہے تو کبھی جامعہ ملیہ کے حالات زیر بحث ہیں۔ غرض مولانا کی خدمت میں رہ کر ایک عجیب عالم نظر آتا۔ مجھے یہ سعادت برسہا برس حاصل رہی کہ مولانا سے بہت قریب رہا اور مسلمانوں کے سربرآوردہ اشخاص علمار اور اداروں کے بارے میں ان کے خیالات سے مستفید ہوا۔ الحمدللہ

میں لکھنؤ میں مولانا کے ساتھ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک رہا۔ ان تین برسوں میں ان کی زندگی کو قریب سے دیکھا ان کے گھر میں رہتا تھا پھر ادارہ تعلیمات اسلام میں پڑھنے جاتا تھا ساتھ جاتا اور ساتھ ہی لوٹتا۔ مولانا کی زندگی بڑی سادہ تھی اور ہم سے بڑی بے تکلفی سے گفتگو فرماتے اور اس گفتگو میں بہت سی ایسی معلومات ہم کو حاصل ہو جاتی تھیں جو کسی دوسرے ذرائع سے ہم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

ایک دن میں مولانا کے ساتھ نئے گاؤں سے ۳۸ امین آباد پارک ادارہ تعلیمات جارہا تھا، راستے میں ایک سیاہ فام، کلین شیو، گداز بدن، متوسط قد، سر پر انگریزی بال، لکھنوی کرتے اور پیجامہ میں ملبوس ایک صاحب اپنے وسیع مکان کے دروازے پر کھڑے تھے جو اس موڑ پر واقع ہے جو نئے گاؤں میں ڈاکٹر بوس کے مکان کے قریب ہے۔ مولانا نے ان کو سلام کیا اور خیریت پوچھی انہوں نے اسی احترام سے مولانا کو جواب دیا پھر ہم لوگ آگے بڑھ گئے۔ مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ یہ نیاز فتحپوری تھے۔

اسی دور میں ایک بار ایسا ہوا کہ میں مولانا عبدالسلام ندوی اور ان کے بڑے صاحبزادے تینوں ساتھ جارہے تھے کہ ذکر نکلا مولانا سید سلیمان ندویؒ کا۔ میں نے سید سلیمان ندوی کہا تو مولانا کو ناگوار ہوا، فرمایا کہ ان کا نام احترام سے لینا چاہیئے۔ اشارہ اس طرف تھا کہ نام کے ساتھ مولانا بھی کہنا چاہیئے تھا۔

سید صاحب کے بارے میں اکثر گفتگو فرماتے اتفاق سے وہ ایک بار لکھنؤ تشریف لائے تو مولانا کی کوششوں سے خود ادارہ تعلیمات اسلام میں جلوہ افروز ہوئے اور انما الاعمال بالنیات پر ایک دلکش

تقریر فرمائی۔ میں نے پہلی بار مولانا سید سلیمان ندویؒ کو قریب سے دیکھا اور ان کی تقریر سُنی۔ دوبارہ ندوہ کی طالبعلمی میں اس وقت ان کی زیارت سے نگاہیں شاد ہوئیں جب وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں آل پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کے بعد ندوہ تشریف لائے اور دو دن قیام فرمایا، اس وقت بھی ان کی دو تقریریں سننے کا اتفاق ہوا، ادارہ میں تین سال قیام نے مجھے ندوہ کے تمام سربرآوردہ اشخاص سے واقف کرادیا تھا اور مولانا کی صحبتوں میں ان تمام بزرگوں کے حالات اور ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے اس طالبعلم کا ذہن روشن ہوگیا تھا۔ اسی زمانہ میں مولانا نے "تعمیر" نام کا ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا۔ یہ اخبار کئی برس نکلتا رہا۔ اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کا نام تھا۔ جب پہلا رسالہ نکلا تو اس میں دو بزرگ ہستیوں کے پیام تھے، ایک مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا اور دوسرا ڈاکٹر سید عابد حسین کا۔ چونکہ وہ دور جس میں مولانا قدوائی نے یہ رسالہ جاری کیا تھا بڑا نازک تھا، ملک کی تقسیم ہوچکی تھی، فضا کہر آلود تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ہم لوگوں نے اپنا گاؤں چھوڑ کر لکھنؤ میں پناہ لی تھی اور ہر طرف مسلمانوں کا قتل عام ہورہا تھا۔ جب لکھنؤ پڑھنے آیا اور مولانا کے ساتھ قیام کیا تو اس وقت بھی مسلمانوں کا مستقبل غبار آلود تھا ہر طرف یاس کا عالم تھا خوف وہراس طاری تھا۔ مولانا آزاد کی وہ کانفرنس لکھنؤ میں ہوچکی تھی جس میں مولانا نے مسلمانوں کو نصیحت کی تھی کہ وہ فرقہ وارانہ سیاست کو چھوڑ دیں۔ اس کانفرنس کے چرچے عام تھے اور ہر شخص کی زبان پر تھے، رسائل میں اس کا ذکر تھا۔

غرض اس فضا میں مولانا نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے "تعمیر" جاری کیا، جس کی اچھی پذیرائی ہوئی اور اس نے جلد ہی دینی وعلمی حلقہ میں اپنا مقام پیدا کرلیا۔ اس وقت تعمیر کے تبادلے میں ہندوستان اور پاکستان سے بہت سے رسالے آنے لگے اور مجھ کو موقع ملا کہ طرح طرح کے رسالے پڑھوں اور ان سے اپنے دل کی دنیا روشن کروں، چنانچہ ان رسائل میں "صدق"، "لکھنؤ"، "بصیرت" لاہور، نئی روشنی، جامعہ، معارف، الفرقان، برہان، خاص طور سے یاد ہیں۔ ان کے ذریعہ ایک طرف اعلیٰ زبان سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی اور دوسری طرف ذہن مخصوص اسلامی، ادبی اور علمی سانچے میں ڈھلنے لگا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مولانا کے ایک عظیم کارنامے پر روشنی ڈالوں۔ مولانا قدوائی نے ندوہ میں ایک طویل مدت بحیثیت استاذ گذاری اور حضرت مولانا علی میاں کے ساتھ بسر کی، اس دور میں مولانا عبدالسلام

قدوائی ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابو اللیث ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی جیسے مشاہیر اہل علم ایک ساتھ ندوہ میں بحیثیت اساتذہ موجود تھے۔ اسی فضا میں علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریک پر "الندوہ" جس کو علامہ شبلی مرحوم نے ندوہ کے علمی ترجمان کی حیثیت سے نکالا تھا اس کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور "الندوہ" مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی ادارت میں نکلا۔

مولانا قدوائی فرماتے تھے کہ الندوہ کے آخری شماروں میں انہوں نے عربی سکھانے کے اپنے مخصوص طریقہ پر ایک مضمون سپرد قلم کیا جس سے لکھنؤ کے چند اونچے حلقہ کے اصحاب ذوق متاثر ہوئے۔ انہوں نے مولانا سے تعلق پیدا کیا اور عربی پڑھنے کی خواہش کی مولانا نے پڑھانا شروع کر دیا، چونکہ مولانا نے اپنے گاؤں تھولینڈی ضلع رائے بریلی میں اس طریقۂ تعلیم کا آغاز اس طرح کیا کہ ان کے ایک عزیز مرحوم عبدالحی صاحب نے ان سے کہا کہ مجھے قرآن پڑھائیے، مولانا کی سمجھ میں پہلے نہ آیا کہ یہ کام کیسے شروع کریں کہ بغیر قواعد، نحو وصرف کے براہ راست قرآن پڑھانا شروع کر دیں، مگر جب انہوں نے اصرار کیا تو مولانا نے چند ضروری باتیں بتا کر قرآن مجید شروع کرا دیا اور اس میں اُن کو کامیابی ہوئی۔ اس تجربہ کی بنیاد پر انہوں نے "دس سبق" مرتب کئے یعنی دس دن میں عربی کے بنیادی قواعد بتا کر قرآن مجید با قاعدہ معانی کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہی ندوہ میں اسٹرائک ہوئی اور مولانا نے ندوہ کو چھوڑ کر اپنا ایک ادارہ قائم کر لیا جس کا نام رکھا "ادارہ تعلیمات اسلام" اس کا محل وقوع تھا لکھنؤ کا مرکزی بازار امین آباد پارک ۳۸ ـ یہاں مولانا نے کافی عرصہ گذارا تقسیم سے قبل یہ کام شروع کیا اور اس کے بہت سے معاون پیدا ہوتے گئے۔ ادارہ نے بڑی ترقی کی، مولانا کے شاگردوں نے اس میں حصہ لیا اور مولانا کی تحریک پر ادارہ نے کتابیں شائع کرنی شروع کر دیں، ایک مکتبہ قائم ہو گیا اور دس سبق، قرآن مجید کی پہلی کتاب، قرآن مجید کی دوسری کتاب اور قرآن مجید کی تیسری کتاب خود مولانا نے لکھی۔ مولانا کے ایک لائق شاگرد جو خود ادارہ میں آ گئے تھے یعنی مولانا احمد علی کیانی ندوی انہوں نے مولانا قدوائی کی کتابوں کے الفاظ پر مشتمل تین کتابیں تصنیف کیں۔ پہلی کتاب ہے تمرین الدروس حصہ اول جو دس سبق کے الفاظ پر مشتمل ہے، دوسری کتاب ہے تمرین الدروس جلد دوم جو قرآن مجید کی دوسری کتاب پر مبنی ہے اور تمرین الدروس

حصہ سوم قرآن مجید کی تیسری کتاب کے الفاظ سے لکھی گئی ہے۔ ان کتابوں کی زبان آسان اور موضوعات اسلامیات سے متعلق ہیں جن سے مرحوم مولانا احمد علی کیانی ندوی کی انشا پردازی، ذہانت اور عربی زبان پر غیر معمولی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دراصل مولانا عبدالسلام قدوائی کے اندر طلبہ سے ان کی صلاحیت کے مطابق کام لینے کا بڑا عمدہ سلیقہ تھا، اسی فطری صلاحیت سے انہوں نے بعض ایسے حضرات سے بھی کام لے لیا جنھوں نے عمر میں اُس ایک کتاب کے علاوہ کچھ نہیں لکھا جو مولانا نے ان سے لکھوالی تھی۔ عربی زبان اور قرآن مجید کی تعلیم کے سلسلہ کی مذکورہ سات کتابوں کے علاوہ مولانا نے اختشام علی رحیم آبادی ندوی سے تین حصوں میں تفہیم الدروس کے نام سے ۳ جلدیں لکھوائیں جو قرآن مجید کی تینوں کتابوں کے حل پر مبنی ہیں۔

مولانا قدوائی نے مولانا عبدالغفار ندوی سے جو درحقیقت ادارہ تعلیمات اسلام میں مولانا قدوائی کے بعد سب سے زیادہ صاحب علم تھے، القصص الشہیرۃ کے نام سے عام مشہور قصّوں کو عربی میں لکھوا کر شائع کرایا۔ اسی طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی دو مختصر کتابیں عام مطالعہ کے لئے "من دون احد" اور "الحنین الی الشہادۃ"، شائع کیں۔

ادارہ سے مولانا قدوائی نے عام اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ایک ایسا سوانح عمریوں کا سلسلہ شروع کیا جو صحابہ کرام، بزرگانِ دین اور مصلحین امت پر مشتمل تھا اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے شاگردوں سے بہت سی کتابیں لکھوا کر خود نظر ثانی کی اور ان کو ادارہ کی طرف سے شائع کیا۔ بعض وقت فرماتے کہ دیکھو میں نے فلاں صاحب سے یہ کتاب لکھوالی حق یہ ہے بعضوں کا سرمایہ صرف وہ کتاب ہے جو مولانا نے ان سے لکھوالی ورنہ انہوں نے پوری عمر کچھ نہیں لکھا۔

اسی ادارہ سے مولانا نے ایک پندرہ روزہ رسالہ "تعمیر"، کے نام سے بڑی آب و تاب کے ساتھ نکالا. جس کی بڑی اہمیت ہوئی اور علمی و دینی حلقوں میں وہ مقبول ہوا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس طرح ادارہ نے پورے ہندوستان میں ایک مقام پیدا کر لیا تھا" تعمیر"، کے علاوہ مولانا نے قرآن مجید اور ریاض الصالحین پڑھانے کا ایک کورس جاری کیا جو تین ماہ کے اندر ایک طالب علم کو اس لائق بنا دیتا تھا کہ وہ عربی اچھی طرح سمجھ سکے چنانچہ میرے سامنے ہی ایک یا دو گروپ ایسے آئے جنھوں نے پورا قرآن تین ماہ میں ختم کر لیا۔ ڈاکٹر رضوان علی ندوی جو اب سعودیہ عربیہ میں معلم ہیں انہوں نے اسی طرز سے تعلیم حاصل کی اور میں نے عربی میں ڈاکٹریٹ کی

ڈگری حاصل کی۔ یہ راقم آثم بھی اسی طرز تعلیم سے مستفیض ہے۔

ڈاکٹر مشیر الحق صاحب کو بھی مولانا نے ادارہ کے اسٹاف میں شامل کر لیا اور ان کی تربیت کی اور ان سے بہت علمی کام کروالئے۔

ادارہ تعلیمات اسلام دراصل لکھنؤ میں قلب شہر میں ایک اہم اسلامی اور تمدنی مرکز بن گیا تھا۔ ادارہ میں ہر ہفتہ ایک بڑا اجتماع ہوتا تھا جس میں قرآن مجید پر تقریر ہوتی تھی۔ یہ درس قرآن مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی پابندی سے ہر اتوار کو دیتے تھے ان کی عدم موجودگی میں مولانا عبدالسلام قدوائی درس قرآن دیتے تھے۔ درس سے پہلے اکثر میں دیکھتا کہ مولانا تفسیر ابن کثیر اور تفسیر کبیر رازی کا مطالعہ فرماتے۔ ان جلسوں میں دراصل شہر کے مسلم معاشرہ کا منتخب طبقہ شریک ہوتا تھا خصوصًا سکریٹریٹ کے اونچے آفیسر، وکلاء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہر ہفتہ پابندی سے آتا اور جلسہ کے بعد بھی بعض حضرات گھنٹوں مولانا قدوائی سے اسلامی مسائل پر مصروف گفتگو رہتے، خود مجھ کو بھی ان گفتگوؤں سے فائدہ پہونچتا ان بزرگوں میں چند نام ذہن میں رہ گئے، یعنی ظہور الحق صاحب، اقبال علی صاحب ایڈوکیٹ، نبی احمد صاحب ایڈوکیٹ، فیاض علی صاحب، ابرار احمد صاحب اور اصغر علی صاحب وغیرہ۔

ان بزرگوں کے موضوعات وسیع اور اہم ہوتے تھے خصوصًا موجودہ زمانہ کی مشکلات سے متعلق ایک صاحب نے مولانا قدوائی سے پوچھا کہ لونڈیوں سے حسن سلوک تو ٹھیک ہے مگر ان سے جنسی تعلق کیوں جائز کیا گیا؟ جواب تو مجھے یاد نہیں رہا مگر مولانا نے تسلی بخش جواب دیا۔

تقسیم ہند کا اثر ادارہ پر بہت بُرا پڑا اور بہت سے مخلص مددگار پاکستان چلے گئے، مگر پھر بھی کام چلتا رہا۔ میں ادارہ میں موجود تھا اور مولانا کے حکم سے کبھی کبھی کسی طالب علم کو پڑھاتا بھی تھا اور خود مختارات مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مشکوٰۃ اور شرح وقایہ پڑھتا تھا ادب میں عیون الاخبار مولانا خود پڑھاتے تھے۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر سید عابد حسین نے مولانا کو یاد کیا۔ وہ جامعہ گئے۔ ڈاکٹر عابد صاحب نے اصرار کر کے ان کو روک لیا اور ان کی اٹیچی اپنے پاس رکھ لی اور فرمایا کہ اب آپ کو جامعہ آکر یہاں ناظم دینیات کے عہدے کے علاوہ عربی و اسلامیات کے شعبوں کی صدارت قبول کرنی پڑے گی۔ مولانا واپس تشریف لائے اور بار بار فرماتے کہ معلوم نہیں کہ یہ "ابتلاء" ہے یا "انتظام"۔ اس لئے کہ ان کو معلوم تھا کہ ادارے شخصیات سے چلتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ ادارہ تعلیمات اسلام مولانا قدوائی کے جامعہ ملیہ جانے کے بعد چند برس قائم رہا مگر اس کی روح اسی دن

نکل گئی جب مولانا اس کو چھوڑ کر دلی چلے گئے۔ اور پھر وہ ٹوٹ ہی گیا۔ مجھے اس کا بڑا افسوس ہوا اور اب تک ہے۔ مولانا قدوائی نے یہ ایک بڑا اہم اور عظیم کام کیا تھا یعنی انگریزی داں طبقہ کو تھوڑے عرصہ میں عربی پڑھانا اور اُن کو براہ راست قرآن اور حدیث سے استفادہ کرنے کے لائق بنا دینا۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے ایک نوجوان جو سکریٹریٹ میں ملازم تھے، ملبے، چوڑے، وجیہ، گورے چٹے مولانا کی خدمت میں آتے اور عربی پڑھتے۔ بعد میں قرآن مجید ختم کر لیا تو ایک دن کچھ عرصہ کے بعد تشریف لائے نہایت گھنی اور بڑی ریش مبارک کے ساتھ۔ دوران گفتگو مولانا نے پوچھا کہ کیا آپ تبلیغ سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے کہا بالکل نہیں، پھر پوچھا آپ کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے؟ بولے نہیں۔ تب مولانا نے دریافت کیا کہ یہ تبدیلی کیسے آئی؟ انہوں نے کہا کہ میں نے قرآن مجید آپ سے پڑھا، حدیثیں پڑھیں، دل پر اثر ہوا، اور میں نے اپنی شکل کو اسلامی بنانا ضروری سمجھا۔ جب وہ چلے گئے تو اس واقعہ کا ذکر مولانا نے ہم لوگوں سے اپنی محفلوں میں بار بار کیا۔ بعد میں کئی حضرات ایسے آئے جن کی زندگیاں مولانا کی نظر کیمیا اثر سے بالکل تبدیل ہو گئیں۔

وہ دلکش محفلیں اکثر یاد آتی ہیں جن میں شام کو عشاء کے بعد مولانا قدوائی، مولانا عبدالغفار ندوی، مشیر الحق صاحب، احتشام علی صاحب جمع ہوتے اور مختلف موضوعات زیر بحث آتے۔ میں اور مولانا کے بڑے صاحب زادے سالم قدوائی دونوں موجود ہوتے اور بقدر استطاعت ان مجلسوں سے استفادہ کرتے۔

ادارہ میں مولانا کے اثر سے اہل علم برابر آیا کرتے اور ان کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا مجھے موقع ملتا۔ یہیں میں نے مولانا سید محمد طلحہ حسنی کو دیکھا جو لاہور سے تشریف لائے تھے اور انکی جو کتابیں ادارہ میں رکھی تھیں ان کو وہ لے گئے۔ بعد میں مولانا قدوائی نے فرمایا کہ یہ بڑے صاحب نظر اور ذی علم عالم ہیں، انہوں نے ایک ڈکشنری لکھی تھی عربی اردو، مگر ناشروں نے معاوضہ دے کر حق تصنیف لے لیا اور کتاب پر ان کا نام تک نہیں لکھا۔ فرمایا کہ مولانا طلحہ صاحب کو علم نجوم سے بڑا شغف ہے راتوں کو اٹھ کر ستارے دیکھتے ہیں اور رصد کرتے ہیں۔

مولانا ناظم ندوی کو بھی بار بار ادارہ میں دیکھا اس وقت میں مبادئ القرأة الرشیدة پڑھ رہا تھا مولانا ناظم ندوی کی شخصیت سے واقف نہ تھا بعد میں وہ پاکستان چلے گئے اور جامعہ عباسیہ بھاول پور کے مہتمم مقرر ہو گئے۔ کچھ عرصہ مدینہ یونیورسٹی میں بھی استاذ رہے۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگردوں میں ہیں ان کی کتاب

"رحمت عالم" کا عربی میں ترجمہ کیا ہے عربی میں شاعری بھی کرتے ہیں۔ عربی زبان پر ان کی نظر عالمانہ ہے۔ میں نے جس زمانہ میں ان کو دیکھا اس وقت تو کچھ جانتا نہ تھا ۱۱۔۱۲ برس کی عمر تھی محض ذہن میں ایک تصور باقی رہ گیا ہے اور بس البتہ مولانا برابر ادارہ آتے رہتے اور مولانا قدوائی سے گھنٹوں باتیں کرتے، مولانا قدوائی کے دوستوں میں مجیب احمد سہالوی بھی تھے وہ اکثر آتے اور گھنٹوں باتیں کرتے، باتیں سب علمی اور مذہبی ہوتیں۔ مجیب صاحب قومی آواز میں ملازم تھے۔

ادارہ ایک ایسی جگہ تھا جہاں لوگ اطراف واکناف سے آتے رہتے تھے۔ عام اصول یہ تھا کہ صبح آٹھ بجے سے ایک بجے تک عربی پڑھائی جاتی پھر شام ۴ بجے سے ۷ بجے تک درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ لوگ آتے رہتے اور اپنے اسباق پڑھ کر چلے جاتے۔ یہ تعلیم فی سبیل اللہ تھی کسی سے مولانا کوئی معاوضہ نہ لیتے۔

میں جس زمانہ میں ادارہ میں تھا اس وقت نبی احمد صاحب ایڈوکیٹ اور ان کے ساتھ ایک دوسرے ایڈوکیٹ پڑھنے آتے تھے۔ نبی احمد صاحب ایڈوکیٹ سے بعد میں مجھ سے اچھا تعارف ہوگیا تھا۔ وہ ایک بار انکے گھر بھی گئے۔ وہ کچھ عرصہ تبلیغی جماعت سے متعلق تھے ایک بار تبلیغی جماعت کا ذکر کر کے مسکرا کر کہنے لگے میں نے کلمہ تو اس سے ختم کرا دیا چونکہ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ تبلیغی گشت میں مخاطب کو کلمہ سناتے اور اس سے سنتے تھے تاکہ اگر کوئی غلط پڑھتا ہو تو اس کی تصحیح ہوجائے۔ وکیل صاحب نے یہ طریقہ ختم کردیا۔ سنا ہے کہ انہی کی حسن توجہ سے لکھنؤ کا تبلیغی مرکز بنا ہے۔ بعد میں انہوں نے جماعت اسلامی سے تاثر قبول کر کے وکالت چھوڑ دی۔

اس زمانہ میں کبھی کبھی مولانا کو میں نے سائیکل چلاتے بھی دیکھا ہے سائیکل وہ تیز نہیں چلاتے تھے مگر چلاتے شاذونادر ہی تھے، فرماتے تھے کہ سائیکل چلانا آدمی کبھی بھولتا نہیں۔

اس دور میں مولانا علی میاں کا تعلق ادارہ تعلیمات اسلام سے بہت زیادہ تھا یعنی ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک وہ علاوہ ہفتہ وار درس دینے کے کبھی کبھی ۹۔۱۰ بجے ادارہ مولانا قدوائی سے ملنے آجاتے۔ مولانا علی میاں کے درس قرآن نے میرے ذہن کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا۔

"تعمیر" نکلا تو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی برابر اس میں لکھتے رہے اور ان کے مضامین کا بڑا اثر پڑا۔ یہ مضامین بعد میں الگ سے پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہوئے۔

اس زمانہ میں ہم لوگ "نیا گاؤں" محلہ میں رہتے تھے جو لاٹوش روڈ کے بعد ہے۔ یہ مکان مولانا

قدوائی نے بہت پہلے کرایہ پر لیا تھا، اوسط قسم کا تھا ایک چھوٹا سا کمرہ اوپر بھی تھا۔ اس مکان سے ملحق ایک بڑا مکان تھا جس میں اعجاز صاحب رہتے تھے جو گورنمنٹ سکریٹریٹ میں ملازم تھے، مولانا کے ان سے بڑے گہرے تعلقات تھے اور ہم لوگ اکثر ان کے گھر جاتے اور ان کی بچیاں بھی ہمارے یہاں آتی رہتیں۔ مولانا کے تعلقات تمام پڑوسیوں سے بڑے عمدہ تھے۔ عجب اتفاق تھا کہ ہمارے گھر سے ملا ہوا گھر ایک ریڈیو گویئے کا تھا وہ صبح وشام خوب گاتا اس کے بال بچے بھی نہ تھے یار واحباب کا مجمع رہتا اور ہر وقت طرح طرح کے گانے چلتے رہتے مگر مولانا کی زبان سے تین برس میں ایک لفظ بھی ان کے بارے میں نہیں سنا، کبھی وہ سامنے آجاتا تو مولانا اُس سے گفتگو بھی فرمالیتے اور اس کی خیریت بھی دریافت کر لیتے۔

اس دور میں جب میں لکھنؤ پڑھنے کے لئے حاضر ہوا تو مولانا ماشاء اللہ تندرست تھے البتہ آگے کے چند دانت ٹوٹ گئے تھے مگر انہوں نے لگوایا بھی نہیں تھا۔ بعد میں دانت بنوائے غالباً دہلی جاکر۔ مولانا کی شخصیت میں بھولا پن، خلوص، حسن عمل اور نیک نیتی کا اجالا ہے، وہ جب کسی کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں عمدہ عمدہ خصوصیات کو چن لیتے ہیں مگر ضمناً کبھی عیوب کا ذکر کر دیتے ہیں۔

مولانا کے پڑوسی اعجاز صاحب مجھ سے بہت خوش رہتے اور کبھی اپنا سودا مجھ سے منگوالیتے اور بولتے کہ یہ لڑکا بڑا عمدہ سامان لاتا ہے، کبھی مولانا مسکرا کر فرماتے کہ اعجاز صاحب تمہاری تعریف کرتے ہیں۔

مولانا کی خوبی یہ ہے کہ ہم بچوں سے وہ ایسی عمدہ اور سنجیدہ باتیں کرتے کہ ایک طرف تو انکی شخصیت سے قربت ہو جاتی دوسری طرف ہماری معلومات میں ان کی صحبت میں برابر اضافہ ہوتا رہتا۔ میں مولانا کی خدمت میں تین برس لکھنؤ میں اور پانچ برس جامعہ ملیّہ دہلی میں رہا اور پھر گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی اکثر ان کی صحبت میسر آجاتی تھی، ظاہر ہے کہ ۸ برس مسلسل ساتھ رہنے بلکہ گرمیوں کے دو ماہ کا عرصہ بھی اگر شامل کر لیا جائے تو دس برس ان کی خدمت میں رہنے کا مجھے شرف حاصل ہے۔ میں نے اس طویل مدت میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے ان کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز میری نگاہوں میں ہیں۔ مولانا کو میں نے کبھی غصہ میں نہیں دیکھا۔ انہوں نے کبھی اپنا توازن واعتدال نہیں کھویا، اعزہ واحباب سے تعلق استوار کرنے کی برابر کوشش میں رہتے ان کا انداز نظر درحقیقت اس شعر کی سراپا تصویر تھا، ع

تو برائے وصل کردن آمدی ⁂ نے برائے فصل کردن آمدی

مجھے یہاں چند واقعات یاد آرہے ہیں جن کا بیان اس موقع پر مولانا قدوائی کی عظمت، تحمل، اور حسن سلوک کا غماز ہے۔

مولانا کے بڑے صاحبزادے کو گاؤں میں ایک شریر لڑکے نے ایک دھار دار کنکر سے مار دیا جس سے ان کے کان کی لو کٹ گئی مگر مولانا نے اس لڑکے کے والد سے نہ کوئی شکایت کی اور نہ کسی قسم کا غم وغصہ کا اظہار فرمایا صرف گاؤں کے ایک جراح کو بلوا کر کان میں ٹانکے لگوا دیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسا معمولی واقعہ تو نہ تھا کہ آدمی خاموش ہو جائے، مگر میں نے مولانا کے برتاؤ میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ پایا اگرچہ اس لڑکے کے والد پشیمان تھے مگر مولانا کا برتاؤ ان کے ساتھ اور بھی محبت بھرا تھا۔

گاؤں میں ایک صاحب ذرا تیز مزاج تھے ان سے کسی سے بنتی نہیں تھی۔ مولانا کی بیگم پر وہ کسی غیر معقول بات پر ناخوش ہو گئے اور بری طرح اُن کو گالیاں دیں آنا جانا چھوڑ دیا اور قطع تعلق کر لیا مگر مولانا کا یہ حال کہ جب وہ تھولینڈی تشریف لاتے تو اکثر پہلے انہی صاحب کے یہاں جاتے اور ان سے ایسا حُسن سلوک کرتے کہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ مولانا کے گھر والوں سے ان کے تعلق اس قدر خراب ہیں کبھی کبھی بیگم صاحبہ فرماتیں کہ جو لوگ مجھے گالیاں دیتے ہیں اُن سے مولانا کا حُسن سلوک اور بڑھ جاتا ہے۔

گاؤں میں ایک قانون گو آئے ہوئے تھے مولانا دلّی میں تھے ان کے بعض اعزّہ نے مولانا کا مکان انکو دے دیا اور وہ اس میں ان کی اطلاع کے بغیر رہنے لگے، جب مولانا کو اس کا علم ہوا تو ان کو ناگواری ہوئی۔ انہوں نے مکان خالی کرانے کے لئے لکھا مگر وہ کسی طرح خالی نہ کیا گیا آخر مولانا اور ان کے بال بچے بھی پہونچ گئے تب بھی قانون گو صاحب نے مکان خالی نہ کیا، اس پر مولانا کو بڑی ناگواری ہوئی اور پھر یو پی حکومت کے ایک بڑے عہدہ دار کو لکھ دیا، انہوں نے قانون گو سے کہہ دیا اور مکان خالی ہو گیا مگر جب مولانا تشریف لائے تو قانون گو سے بڑے خلوص سے ملے اور کسی قسم کی ناخوشگواری کا احساس بھی باقی نہ رہا۔

میں نے جو خاص بات محسوس کی وہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں دوسروں پر احسان کر کے جتانے کی عادت نہیں بلکہ وہ عمداً اپنے احسانات کے ذکر کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کا ذکر ٹال جاتے تھے۔

مولانا کا خاندان "بھیا لرے" ضلع بارہ بنکی سے تھولینڈی آیا تھا جہاں اس کو جاگیر عطا ہوئی تھی۔ قدوائی خاندان دراصل ضلع بارہ بنکی سے تعلق رکھتا ہے حضرت شاہ قدوۃ الدین کی نسبت سے یہ قدوائی خاندان کہلاتا

ہے جن کی قبر کہتے ہیں کہ اجودھیا میں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ حسینی سید ہیں، بعد میں جاگیر رہن ہو گئی، اور مولانا کو جائیداد کا بہت تھوڑا حصہ پہونچا۔ مولانا کے دادا غضنفر علی قدوائی نے اپنے نام سے تھولینڈی سے ملحق ایک گاؤں بسایا تھا جو آج بھی غضنفر کھیڑا کہلاتا ہے۔

مولانا کے والد عبدالرؤف صاحب کو میں نے دیکھا ہے ۹۰ برس سے زیادہ عمر پائی کئی نسلوں سے بس اولاد کا سلسلہ ایک ایک بیٹے سے چل رہا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے مولانا کو علم وعمل کی نعمتوں کے ساتھ اولاد کی نعمت سے بھی نوازا۔ ماشاء اللہ مولانا نے سات بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑیں۔

بچوں کو اعلیٰ مغربی تعلیم دلائی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کو بچوں کو جامعہ میں تعلیم دلانے کا شوق تھا، اتفاق بھی ایسا ہوا کہ ان کو ملازمت بھی وہیں مل گئی۔

مولانا نے تعلیم پہلے اپنے گاؤں میں پھر بچھراواں ضلع رائے بریلی میں مڈل تک حاصل کی پھر لکھنؤ تشریف لے گئے حضرت علیا بیگم صاحبہ نے مجھ سے بیان فرمایا کہ مولانا جب ندوہ میں پڑھنے گئے تو داخلہ ہوسٹل میں نہ ملا ایک مسجد میں قیام فرمایا۔

مسجدوں میں بیت الخلاء تو ہوتا نہیں وہاں رہتے ندوہ میں پڑھتے مگر یہ مشکل بڑی پریشان کن تھی پھر کھانا اپنے ہاتھ سے پکاتے، گرمیوں کے دن، سارے جسم پر سُرخ دانے پڑ گئے۔ اس زمانہ میں میرے نانا مرحوم سید محمد حسین اور میرے بابا مرحوم سید اصغر حسین دونوں صاحبان پولیس میں کانسٹبل تھے وہ ان کے یہاں گئے اور تعلیم کے لئے رہنے کی خواہش کی نانا نے جواب دیا کہ وہ قلیل تنخواہ پاتے ہیں خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ بابا مرحوم کی اہلیہ یعنی میری بڑی اماں نے مجھ سے بتایا کہ وہ بہت کم کھانا کھاتے تھے میرے یہاں ایک بار آئے تھے۔

غرض بعد میں ندوہ میں داخلہ ہو گیا تو یہ مشکل حل ہو گئی مگر کافی دنوں شہر میں رہ کر مولانا نے تکلیفیں برداشت کیں۔ یہاں جو اتفاق ہوا وہ یہ کہ میرے نانا نے ان کو اپنے گھر میں نہ رکھا مگر ان کے نواسے یعنی راقم آثم کو مولانا نے آٹھ برس اپنے پاس رکھ کر علم کی اعلیٰ منزلوں تک پہونچا دیا۔

یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ مولانا پھول کی طرح پالے گئے تھے اور شبنم کی طرح نازک تھے کہ چودہ[۱۴] بچوں میں وہ تنہا زندہ رہے باقی تیرہ[۱۳] بھائیوں کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا، لہذا والدین کی آنکھ کا تارا تھے اور لاڈ پیار اور ناز ونعمت اور ہر قسم کی سہولت ان کے لئے میسّر تھی۔ گاؤں والے کہتے ہیں کہ مولانا بچپن میں

تیز اور بڑے متحرک تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذہانت کی دلیل ہے۔ چنانچہ باشعور ہو کر نہایت نیک سیرت اور صاحب علم بنے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مولانا نے اپنی والدہ کا دودھ کبھی نہیں پیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ تیرہ بھائی مر چکے تھے۔ والدین کو وہم ہو گیا کہ ماں کے دودھ میں شاید کوئی خرابی ہو لہذا گاؤں میں متعدد عورتوں کے دودھ پر پلے۔ ایک قصائی محلہ کی عورت کا دودھ مولانا نے پیا تھا چنانچہ مولانا کی رضاعی بہن اس رشتہ سے آ کر ان کے یہاں قیام کرتیں اور مولانا نے باوجود اتنے غیر معمولی فرق کے کبھی ان سے بے توجہی کا برتاؤ نہ کیا ہمیشہ خلوص سے ملتے اور وہ جب تک چاہتیں مولانا کے یہاں رہتیں۔

ادارہ کے قیام کے زمانہ میں مولانا نے آموں کا ایک باغ لگوایا۔ یہ دس بیگھے کا باغ بہت دلکش ہے۔ خوب آم پھلتے ہیں۔ مولانا لوگوں کو دل کھول کر بانٹتے اور کھلاتے تھے۔ جب میں آموں کی فصل میں جاتا روز آم بڑی محبت سے کھلاتے اور دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ مولانا کی عادت یہ بھی تھی کہ کوئی نیا آدمی عزیزوں میں سے آئے یا کوئی جاننے والا آجائے فوراً اس کی دعوت کر دیتے۔

مولانا کی بیگم صاحبہ بھی بڑی محنت کش ہیں وہ کبھی کام کرنے سے اکتاتی نہیں ہیں باوجود ایک بڑے خاندان کی ذمہ داریوں کے برابر ان کے یہاں مہمانوں کا جمگھٹا رہتا ہے لوگ آتے ہیں، آم کھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

مولانا کی کتاب زندگی کا سب سے روشن ورق وہ ہے جو ان کی عظمت کے مینار کو بلند اور ان کے خلوص کی چاندنی کو وسعت عطا کرتا ہے یعنی مولانا کا اپنے گھر کو دارالطلبہ بنانا، مولانا ہمیشہ اپنے گاؤں اور خاندان اور محلہ میں سے ضرورتمند لڑکوں کو اپنے گھر میں رکھ کر پڑھاتے رہے ہیں یہ سلسلہ ندوہ کی ملازمت سے لے کر جامعہ کی ملازمت سے ریٹائر ہونے تک قائم رہا، اس عرصہ میں انہوں نے مندرجہ ذیل لوگوں کو اپنے پاس رکھا اور ان کی تربیت کی اور اکثر کو بام عروج تک پہونچایا۔

پروفیسر مشیر الحق، احتشام احمد (یہی راقم آثم) عبدالحفیظ قدوائی، عرفان شبلی، سجاد علی احتشام علی رحیم آبادی (جامعہ میں ساتھ رہے)۔

اور بھی کئی طلبہ نے دو سال چار سال مولانا کے ساتھ قیام کیا۔ خاص بات یہ ہے کہ مولانا کو ۱۹۵۲ء میں جب میں جامعہ گیا تو درحقیقت لکچرر کی تنخواہ ملتی تھی اور وہ اسی تنخواہ میں اپنے سات بیٹے دو بیٹیوں کی

پرورش کے علاوہ ضرورت مند طلبہ کو اسی سے فیض پہونچاتے تھے۔

مولانا گاؤں والوں کی بھی مدد کرتے تھے، چنانچہ گاؤں میں ایک مشہور حافظ قرآن تھے ان کا نام تو لیاقت علی تھا مگر معروف تھے حافظ کلو کے نام سے۔ حافظ صاحب بڑے دلچسپ بزرگ تھے وہ مولانا کے بھی استاذ رہ چکے تھے اور انہوں نے کئی نسلوں کو تعلیم دی تھی عمر بھی اللہ کے فضل سے ۹۰ برس کی پائی۔ گاؤں کے اسکول میں ملازم تھے مگر جب ضعیفی زیادہ بڑھی تو کام کرنے سے معذور ہو گئے اس وقت مولانا نے ان کے نام ایک مختصر سی رقم جاری کردی اور وہ ان کو انتقال تک ملتی رہی۔

مولانا کے ہم عمر لوگوں میں تھویلینڈی میں ہمارے ایک عزیز تھے جو مرزاپور میں جاکر بس گئے تھے، شروع میں ان کے دن بڑے اچھے تھے اور بڑی فیاضی سے انہوں نے خاندان والوں اور متوسلین کو نوازا مگر پھر کاروبار بیٹھ گیا اور بیچارے کا تنہائی میں بڑی کسمپرسی کے عالم میں انتقال ہو گیا۔ مولانا کو معلوم ہوا کہ ان کے بچے بہت پریشان ہیں تو ایک رقم ان کے لئے باندھ دی جو کئی برس تک ان کو ملتی رہی۔

قرض کے بارے میں مولانا کا ایک مخصوص نقطۂ نظر تھا وہ کہتے تھے کہ قرض اتنا ہی دینا چاہیئے جتنا واپس نہ ملے تو کوئی غم نہ ہو اور اپنا کام نہ رکے، چنانچہ ایک بار ان کے ایک قریبی عزیز نے دو سو روپے قرض مانگے . . . مولانا کی بیگم صاحبہ چاہتی تھیں کہ قرض دیدیا جائے مگر مولانا کے پاس پیسے نہ تھے چنانچہ مولانا نے اُن عزیز کو لکھا کہ ۲۵ روپے حاضر ہیں اس سے زیادہ کی گنجائش میرے پاس نظر نہیں آتی۔

مولانا فرماتے تھے کہ روپے پیسے کے معاملات سے تعلقات خراب ہوجاتے ہیں، اگر آدمی کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کے پیسے کسی پر زیادہ خرچ ہو رہے ہیں مگر دوسرا فریق اس پر اتنے نہیں خرچ کرتا تو رفتہ رفتہ دل پر غبار آجاتا ہے۔ مولانا معاملات کو صاف رکھتے تھے اور پیسوں کے معاملات میں محتاط رہتے تھے، ہمارے ساتھ بھی ان کا یہی معاملہ تھا اکثر ساتھ سفر کرتے بعد میں پوچھ لیتے تھے کہ اگر کچھ باقی ہو تو بتا دینا۔

مولانا ان علماء میں سے تھے جو ندوہ کے مقاصد کو اپنا مقصد حیات سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ڈاکٹر سید محمود بہار کے وزیر تعلیم تھے اس وقت انہوں نے ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم کو لکھا کہ آپ ایک ایسا نصاب تیار کروائیے جو جدید و قدیم کا حامل ہو میں اس کو یہاں حکومت سے تسلیم کروا دوں گا۔ چنانچہ نصاب تیار ہوا مگر اسی دوران وزارت میں کچھ انقلاب آیا اور معاملہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ مولانا قدوائی اکثر افسوس کرتے اور

فرماتے اگر اس وقت یہ مسئلہ تکمیل کو پہونچ گیا ہوتا تو ندوہ کا اصل خواب شرمندۂ تعبیر ہو جاتا۔

وہ اس بات کی بار بار شکایت کرتے کہ ندوہ کے جلسوں کو روک دیا گیا، مولانا کو یہ بہت ناگوار تھا وہ ندوہ کے جلسوں کا ذکر جوش و خروش سے فرماتے اور تمنا کرتے کہ وہ جلسے دوبارہ شروع ہو جائیں۔ سالانہ جلسے تو نہ ہو سکے مگر ۸۵ سال کی ندوہ نے برسی منائی اور اکتوبر ۱۹۷۵ء میں ایک عظیم الشان بین الاقوامی جلسہ منعقد کیا جس میں بڑا دلکش اجتماع ہوا اور عرب بڑی تعداد میں جلسہ میں حاضر ہوئے۔

مولانا نے ایک محفل میں طویل مضمون ندوہ کے مقاصد پر پڑھا جو بڑا بصیرت افروز ہے۔ اور ندوہ کے مقاصد کا ماحصل ہے۔

مولانا کو قرآن سے بڑا شغف تھا اکثر وہ درس قرآن دیتے اور تفسیر بیان کرتے اپنے گاؤں تھولینڈی ہوتے تو وہاں بھی صبح کو تفسیر بیان کرتے۔ لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں غالباً دو بار پورے قرآن کے مطالب گھسیاری منڈی نیا گاؤں کے قریب والی مسجد میں بیان کئے۔ مولانا کا ایک مخصوص طریقۂ تفسیر تھا وہ محض وضاحت کرتے تھے نہ تفصیل میں جاتے اور نہ زیادہ اختصار کرتے۔ گاؤں میں بھی وہ تفسیر بیان فرماتے اور تسلسل سے نہیں بلکہ کبھی کوئی سورت لے لی اور کبھی کوئی دوسری۔ مگر مجھے یاد ہے کہ مولانا نے ایک بار پورے پارۂ عم کی تفسیر بیان فرمائی اور ترتیب وار چند دنوں میں والناس تک تفسیر بیان کی۔ اس وقت مجھے اس بات پر تعجب ہوا کہ آخری سورتوں میں الفاظ بہت سخت ہیں مگر مولانا کو سب یاد تھے اور ان کے معانی و مطالب پر پوری قدرت حاصل تھی پہلے وہ الفاظ کی تشریح فرماتے پھر معانی بیان کرتے۔ اس طرح کبھی کبھی ایک آدھ عربی شعر بھی بطور حوالہ پیش کر دیتے اور اس کی تشریح فرماتے۔ دراصل ادارہ میں درس قرآن کی مواظبت کے باعث ان کو قرآن مجید کے مطالب پر اور تفاسیر کے مطالعہ کے باعث اس کی آیات کی تاویلات پر اچھا ملکہ تھا۔ قرآن مجید پر مطالب و تشریح کے ساتھ مولانا نے تین پاروں کی تفسیر لکھی تاکہ عربی پڑھنے والے ان سے نفع اٹھائیں، ان کے نام بھی قرآن مجید کی پہلی کتاب، دوسری کتاب اور تیسری کتاب رکھا۔ ان کے بعد جب "تعمیر" نکلا تب اس میں مستقل تفسیر قرآن کے لئے دوسرا صفحہ مخصوص تھا۔ اس طرح مولانا نے ۶ پاروں کی تفسیر مکمل کر دی۔ فرماتے کہ ایک صاحب جنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر پر سخت اعتراضات کئے تھے جب انہوں نے (مولانا قدوائی کی) تفسیر دیکھی تو بڑی تعریف کی جس سے

مجھے محسوس ہوا کہ مولانا کو اس کی جانب سے اطمینان تھا، مگر اس تفسیر کو مکمل کرنے کے لئے جو لگن اور فرصت درکار ہے وہ مولانا کو حاصل نہیں اس لئے بظاہر یہ تفسیر بس انہیں چھ پاروں تک محدود رہ جائیگی پھر اس کو الگ کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تو ایک نفع بخش کام ہو جائے گا۔

مولانا کو علم حدیث سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ انہوں نے مولانا شاہ حلیم عطا کے مشورہ پر ایک کتاب احادیث نبوی ؐ کے اولین صحیفے کے عنوان سے . . . . . مرتب کی تھی جو اپنے موضوع اور تحقیق کے لحاظ سے ممتاز ہے اور جو ان معاندین اسلام کو دنداں شکن جواب ہے جو یہ تصور رکھتے ہیں کہ تمام احادیث عصر عباسی میں جمع کی گئیں۔ اس سے قبل آنحضرت ؐ کے زمانہ میں احادیث نبوی ؐ کے جمع کرنے کا کام مطلق نہیں ہوا۔ مولانا نے ان تمام صحابیوں کے نام اور ان کے مجموعۂ احادیث کا نام گنوایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ بہت سے مجموعے خود آنحضرت ؐ کی زندگی میں مرتب ہو گئے تھے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ کتاب عربی میں منتقل کر دی جائے تو اس کی اہمیت اور عظمت عربوں تک پہونچ سکے۔ اردو میں لکھنے کے باعث موضوع کا دامن ہندوستان تک محدود رہتا ہے۔

زندہ حقیقت

مذہب ایک زندہ حقیقت ہوتا اور مسلمان اسلام کی روشنی لے کر آگے بڑھتے اور زندگی کی شب تاریک سحر کر دیتے اور ان کے فیض سے دنیا کے خزاں رسیدہ چمن میں پھر بہار آجاتی، مرجھائے ہوئے پھول لہلہا اٹھتے، گل و لالہ پر نکھار آجاتا، سبزۂ پامال ہوا کی موجوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگتا اور یہ عالم پیر پھر نئے سرے سے جوان ہو جاتا۔ تہذیب و تمدن کو نئی آب و تاب نصیب ہوتی، سیاست نئی کروٹ لیتی، معیشت کے پیچ و خم دور ہوتے، معاشرت ایک نیا رنگ اختیار کرتی اور انسانیت کا درماندہ راہ قافلہ اسلام کی روشنی میں خیر و فلاح کی منزل کی طرف بڑھتا۔

(مولانا عبد السلام قدوائی ندوی مرحوم)

مولانا عبدالسلام قدوائیؒ
کے خطبات کا ایک اجمالی جائزہ

مولانا بدرالدین صاحب
لکچرار عربی و ناظم دینیات جامعہ ملیہ دہلی

اگر شعلہ بیانی اور پرتاثیر خطابت نے علماء ہند کی تاریخ میں مولانا محمد علی جوہرؒ مولانا آزاد سبحانی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسے علماء کو حیات جاوداں عطا کی ہے تو مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کو بھی اس صف میں شامل کر دیجئے کہ ان کے خطبات نے بھی ہزاروں پتھر دلوں کو موم کر کے اسلامی فکر سے بہرہ ور ہونے کے مواقع فراہم کئے۔

اگر ایک طرف ناقدر شناسان مذہب ان کی تقریروں کے طفیل دینی مزاج سے روشناس ہوئے تو دوسری طرف بے جان قلوب کو ان کے کلمات نے سرگرم مچلتی ہوئی روح دے کر ایک حیات متحرکہ کا تحفہ عطا کیا۔

ان کی تقریروں میں نہ جانے کیا جادو تھا، کیا شیرینی اور تاثیر تھی کہ نمازی گردن اٹھا اٹھا کر ان کی آمد کا انتظار کیا کرتے، جب وہ تشریف لے آتے تو خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی اور کبھی کسی مجبوری سے نہ آتے تو مایوسی کا اظہار کیا جاتا، وہ خطبہ کیا ہوتا تھا، قرآنی آیات، احادیث اور سلف صالحین کے مستند واقعات سے گندھا ہوا ایک گلدستہ، ایسا گلدستہ جس کے گلہائے رنگارنگ اگر ایک طرف تاریخ کے طالب علم کے لئے تسکین ذوق فراہم کرتے تو دوسری طرف تصوف کا شیدائی بھی اس میں اپنے لئے غذا تلاش کر لیتا۔

جہاں ایک عالم اس خطبہ کے رموز و کنایات، تشبیہات و اشارات سے بہت سی علمی گتھیاں سلجھاتا چلتا وہاں ایک ان پڑھ بھی اس کے سیدھے سچے واقعات کو اپنے لئے رہنما پاتا۔

اگرچہ مولانا مرحوم کے یہ خطبات مواد کے اعتبار سے اپنے جلو میں معاشرتی مذہبی اور سیاسی ہر طرح کے مسائل لئے ہوتے تھے، لیکن روحِ مذہب ان پر حاوی اور غالب ہوتی۔ آئیے اس مجلس میں ان خطبات پر ذرا تفصیلی نظر ڈالیں۔

جامعہ میں نیا تعلیمی سال شروع ہوا، طلبار کی آمد آمد ہے، داخلے ہورہے ہیں، گویا کام کا آغاز ہے، اس زمانہ میں مولانا جمعہ کے خطبہ کے لئے نیک نیتی کا عنوان منتخب فرماتے اور تقریر انما الاعمال بالنیات سے شروع ہوتی، اس حدیث کے بعد مربوط واقعات سے طلبار کو یہ تاثر دیا جاتا کہ حصولِ علم کا آغاز نیک نیتی سے ہونا چاہئے، صرف کمانے اور پیٹ پالنے کے لئے نہیں۔ علم برائے علم اور حصولِ علم دین کی نیت ہو تو ہر قدم پر رضارالٰہی شامل حال ہوگی جو مسلمان کی زندگی کا اصل مقصد ہے اور روزی تو ہر حال میں حاصل ہوجائے گی۔

سالانہ امتحان میں مولانا کا خطبہ روزِجزا اور حساب کتاب کے عنوان پر ہوتا جو صحیح معنی میں موقع محل کے لحاظ سے ایک مربوط درس ہوتا تھا۔ موضوع کے صحیح انتخاب کے بعد مولانا کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ عنوان کے تمام پہلوؤں کو خلط ملط کرکے الجھاتے نہ تھے بلکہ موضوع کے صرف ایسے نکتے کو لے کر چلتے جو عنوان کی جان ہوتا اور سامعین کے دل ودماغ کو اس کی حقانیت قبول کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ کردیتا۔ مثلاً حضرت نظام الدین اولیارؒ کے عرس کے زمانہ میں ان کے خطبہ کا موضوع یہی ہوتا مگر عام روش سے ہٹا ہوا۔

عام طور پر لوگ بزرگانِ دین سے متعلق تقریروں میں ان کے تاریخی واقعات یا کشف و کرامات کے قصے سناتے ہیں، جیسے حضرت نظام الدین اولیارؒ کا باؤلی بنوانے کا قصہ، جب وہ اپنی خانقاہ میں باؤلی بنوا رہے تھے، اس زمانہ میں غیاث الدین تغلق بادشاہ نے ناراضگی کی وجہ سے مزدوروں کو یہاں آنے سے روک دیا، محبوب الٰہیؒ کو معلوم ہوا تو انھوں نے مزدوروں کو رات میں بلوا کر کام لینا شروع کردیا، بادشاہ نے چراغوں کے لیے تیل کا حصول ناممکن کردیا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے چراغوں میں تیل کے بجائے پانی جلوایا اور کام ہوتا رہا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کی اس کرامت پر مسلمان تو یقین کرسکتے ہیں مگر کسی مادّہ پرست، یا غیرمذہبی آدمی سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ حضرت مولانا مرحوم محبوب الٰہیؒ کے ذکر کو ایسے نکتہ

سے شروع کرتے جس پر موجودہ مشاہدہ خود شاہد اور دلیل بن سکے۔

مولانا کا خطبہ اس آیت سے شروع ہوتا۔

الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

اولیاء اللہ پر نہ کسی طرح کا خوف ہوتا ہے نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوتے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا، یہاں جامعہ نگر سے تین چار میل دور آج کل بہت بھیڑ بھاڑ ہے، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا عرس ہو رہا ہے لوگ دور دور سے آرہے ہیں، دہلی والے انھیں سلطان جی کے نام سے یاد کرتے ہیں ادب کی وجہ سے نام نہیں لیتے، تاریخ تو نہیں بتاتی کہ محبوب الٰہیؒ کبھی سلطان الہند رہے ہوں ہاں اس کے برعکس اکبر اعظم کو ضرور پورے ہندوستان کا بادشاہ بننے کا موقع ملا مگر کبھی کوئی اس کو سلطان الہند کے نام سے یاد نہیں کرتا۔ نہ کوئی اس کے مزار پر فاتحہ اور عرس کے لئے آتا ہے۔

اس طرح ماہ محرم میں مولانا مرحوم حضرت امام حسینؓ پر خطبہ دیتے تو ان کی مشہور و معروف داستان مظالم نہ سناتے، بلکہ حضرت امام کے کردار کے اس نکتہ پر زور دیتے کہ یزید کی شخصیت ان کے نزدیک خلافت کے منصب کے لائق نہ تھی، لہٰذا انھوں نے حق کی خاطر آواز بلند کی، اور ظاہری وسائل کی کمی نیز حکمراں جماعت کی شدید مخالفت کے باوجود اس حد تک عملی قدم اٹھایا کہ اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان تک قربان کرنے میں دریغ نہیں کیا اور رہتی دنیا تک کے لئے ایک مثال قائم کردی۔

عیدالاضحیٰ کے مہینہ میں مولانا ہر جمعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق خطبہ دیتے، مختلف آیات اور احادیث کی تشریح ہوتی مگر خاص طور پر لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقویٰ منکم مولانا کی توجہ کا مرکز ہوتا۔

مولانا زور دے کر بار بار فرماتے، اللہ تعالیٰ کے پاس ہرگز نہ تو قربانی کا گوشت پہنچتا ہے نہ اس کا خون، بلکہ خدا تک رسائی تو قربانی کرنے والے کے جذبہ اور خلوص کی ہوتی ہے، اگر نیت خالص ہے اس میں کسی طرح کی ریاکاری کو دخل نہیں، تو قبولیت کی توقع کی جا سکتی ہے۔

مولانا کے خطبات کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مشکل سے مشکل موضوع کو ایسی مثالوں سے

واضح کرتے کہ کوئی الجھن ہی باقی نہ رہتی۔

مثال کے طور پر زہد و تقویٰ ہی کو لے لیجئے یہ مسلمان کی زندگی کا بڑا اہم مسئلہ ہے، عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ متقی ہونا بڑا مشکل کام ہے، ہر ایک کے بس کی بات نہیں، جو شخص مکمل صورت وسیرت عمل و کردار سے قرآن وسیرت رسول کا نمونہ ہو وہی متقی ہو سکتا ہے، ظاہر ہے اس مفہوم کی روشنی میں متقیوں کی فہرست بہت محدود رہ جاتی ہے، کیونکہ عام آدمی خود کو ان تمام صفات کے ساتھ متصف کرنے سے قاصر سمجھتا ہے۔

اب ملاحظہ فرمائیے تقویٰ کے اہم مسئلہ پر مولانا کا خطبہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝

اے ایمان والو تم اللہ سے ڈرو ایسا ڈرنا جو فی الحقیقت ڈرنا ہے اور دنیا سے اس حال میں جاؤ کہ اسلام پر ثابت قدم ہو۔

اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور وہ بھی مکمل تقویٰ لیکن سوال یہ ہے کہ تقویٰ کیا ہے اس سلسلہ میں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعب سے سوال کیا کہ تقویٰ کیا ہے پہلے انھوں نے کچھ تامل کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت عمرؓ خود واقف ہیں، جب ان کا اصرار ہوا تو فرمانے لگے امیرالمومنین کیا آپ کبھی جنگل میں کسی دشوار گزار راستے سے گزرے ہیں جو بہت پتلا ہو اور اس کے دونوں طرف کانٹے لگے ہوں فرمایا ہاں گزرا ہوں کہنے لگے کیسے، حضرت عمرؓ نے فرمایا اپنے کپڑوں کو سمیٹتا ہوا، بچاتا ہوا گزرا ہوں، حضرت ابیؓ نے کہا بس اسی کا نام تقویٰ ہے کہ دنیا کے مسائل سے نمٹتا ہوا اس طرح دامن بچا کر گزر جائے کہ گناہوں کے خار اس کے دامن سے نہ چمٹ جائیں۔

ایک مرتبہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کا کارندہ کسی شہر سے آیا، رات کے وقت شہر کے حالات سناتا رہا، جب ملکی حالات سنا چکا اور حضرت عمرؒ کے ذاتی حالات اور خیر و عافیت پوچھنے لگا تو خلیفہ نے حکومت کا چراغ گل کر دیا کیونکہ اب ذاتی گفتگو ہو رہی تھی اس میں حکومت کا چراغ جلنا جائز نہ تھا۔

میرے خیال میں مولانا کی ان دو مثالوں کے ذریعہ تقویٰ کی جو تشریح سامنے آئی ہے اس سے مسئلہ بہت آسان ہو جاتا ہے، اس روشنی میں ایک معمولی دکاندار، بس کا کنڈیکٹر اور دفتر کا کلرک

بھی چاہے تو اپنے منصب پر مامور رہتے ہوئے متقی کا کردار ادا کر سکتا ہے۔

روزہ کے فلسفہ اور فضائل پر آپ نے بہت سی تقریریں سُنی ہوں گی، اس موضوع پر بھی مولانا کا انداز انفرادیت رکھتا ہے

آپ کا معمول تھا رمضان کے پہلے جمعہ کو ذیل کی آیت تلاوت کر کے تقریر فرماتے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ علی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ٥

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے مگر روزہ اصل میں اس لئے نہیں کہ بھوکا رہنے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ پہونچتا ہے یا خاص طور پر صحت پر کوئی اثر پڑتا ہے بلکہ یہ تو گناہوں سے بچنے کے لئے مشق کرانے کا طریقہ ہے، جس طرح گھوڑا سواری سیکھنے میں پہلے گھوڑے کی ننگی کمر پر سواری کرائی جاتی ہے، تاکہ اس تکلیف کے ساتھ بیٹھنے کی مشق ہو جائے تو پھر زین وغیرہ کے ساتھ سواری کرنے میں بھی کوئی زحمت نہ ہو بلکہ آرام محسوس ہو، اس طرح روزہ میں اللہ تعالیٰ تمام جائز چیزوں سے پرہیز کراتے ہیں تاکہ آئندہ ناجائز کاموں سے تو پرہیز کرنے کا عادی ہو جائے جو روزہ کا اصل مقصد ہے۔

اب ایک خاص حادثہ سے متعلق مولانا کا خطبہ ملاحظہ فرمائیے۔

۱۹۶۷ء میں جب اسرائیل نے بیت المقدس پر اور نہر سوئیز پر قبضہ کیا تو عالم اسلام میں غم وغصہ کی ایک لہر دوڑ گئی تھی، ہر شخص مغموم ومتفکر نظر آتا تھا مگر اس موقع پر بھی سنجیدہ ذہن یہ سمجھتے تھے کہ ظلم کچھ بھی ہوا ہو اس کا حل صرف یہ نہیں ہے کہ ہاتھ اٹھا کر اسرائیل کو بددعائیں دیتے رہو یا امریکہ پر تبرا پڑھتے رہو بلکہ مرض کا اصل سبب دور کرنے کی ضرورت ہے، مولانا مرحوم بھی اس حادثہ سے متاثر تھے، اور کئی ماہ ان کے خطبوں سے اس کا اثر عیاں ہوتا رہا مگر ان کے خطبوں سے نہ تو آہ وبکا ظاہر ہوتی تھی نہ صرف دشمن پر نکتہ چینی، بلکہ ان کی نگاہ اصل مرض پر تھی جس کی نشاندہی وہ اس طرح کرتے ہیں۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ۔

یہ آیت مسلمانوں کے ایسے دور میں نازل ہوئی جبکہ اسلام کا بالکل ابتدائی دور تھا اور اس وقت کے مسلمان بقول قرآن کریم ایسے تھے کأنھم بنیان مرصوص ، لیکن اس کے باوجود باری تعالیٰ نے انھیں ان الفاظ کے ساتھ نصیحت فرمائی اور کہا کہ آپس میں جھگڑا فساد نہ پیدا کرو، اس سے تمھاری طاقت بھی ختم ہوجائے گی اور تمھاری ساکھ اکھڑ جائے گی،

تو درحقیقت مسلمان جب تک اس بات کو پیش نظر رکھ کر اپنی زندگی گزارتے رہے، ان کی ساکھ بھی بنی رہی، طاقت بھی نہ ٹوٹی۔

مٹھی بھر مسلمانوں کی تعداد ہزاروں مسلح فوجوں کے مقابلہ میں فتح وکامرانی حاصل کرتی رہی اس لئے کہ وہ جو کام بھی کرتے تھے خدا کے لئے کرتے تھے، اس کے اصولوں کی روشنی میں کرتے تھے لہذا کامیابی قدم چومتی تھی۔ بعض جنگوں میں کافروں نے مسلمان فوجوں کے نیزوں اور تیروں کو چرخے کے تکلوں سے تعبیر کر کے طعنے دیئے ہیں کہ یہ ان تکلوں سے جنگ لڑیں گے مگر وہ جانباز اسلامی سپاہی انہیں تکلوں سے بڑی بڑی فوجوں کا منھ موڑ دیتے تھے۔

یہ رسول خدا کی تعلیم اور اسلام کا اثر تھا کہ جو اسلام کے دشمن سرزمین عرب سے مسلمانوں کی بیخ وبنیاد مٹانے کا ارادہ رکھتے تھے، انھوں نے ہی مسلمان ہو کر اسلام کے نام پر اپنے جان ومال نثار کر دیئے۔

حضرت عکرمہؓ ابن ابی جہل کا مشہور قول ہے جو جنگ یرموک میں فرماتے تھے کہ میں جب تمام جنگوں میں رسول اللہؐ کے مقابلہ میں لڑتا رہا ہوں تو آج ان کافروں کے سامنے سے کیسے منہ موڑ لوں گا، یہ سب آنحضرتؐ کی تعلیم اور صحبت کا نتیجہ تھا جس نے ان لوگوں کو اس منزل پر لا کھڑا کیا تھا، کافروں کے متعلق قرآن کریم نے کہا تحسبھم جمیعا وقلوبھم شتیٰ کہ ان کے قلوب یکجا نہیں ہیں، اگرچہ تم ان کو ایک جماعت خیال کرتے ہو، اور مسلمانوں میں اسلامی جذبہ کارفرما ہونے کی وجہ سے اس کے برعکس حال تھا، وہ ہمیشہ ایک خیال ایک جان رہے۔

مگر آج اس کے برخلاف مسلمانوں کی حالت ہے کہ ان کو بظاہر ایک جماعت دیکھا جاتا ہے مگر ان کے قلوب ایک دوسرے کی طرف سے کدورت اور بغض سے بھرپور ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا شیرازہ منتشر ہے، جماعت اور قوم کا کوئی وزن نہیں شکست پر شکست کھا رہے ہیں۔

اس زمانہ میں مسلمان درجنوں اور پھر سیکڑوں کی تعداد میں تھے مگر ہزاروں اور لاکھوں پر بھاری تھے، قادسیہ وغیرہ کے معرکے اس کے شاہد ہیں۔

آج مسلمان مراقش سے جاکرتا تک کروڑوں کی تعداد میں پھیلے ہیں مگران پر وہ قومیں حاوی ہیں جو چند لاکھ کی تعداد میں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری کامیابی کا جو امتیاز تھا وہ باقی نہیں رہا، اب ہم میں نہ توحید پرستی کی قوت ہے نہ وحدت اور ایکتا کی طاقت جس کا نتیجہ سامنے ہے۔

اس کے بعد ایک مسئلہ رہ جاتا ہے، اردو خطبات کے بارے میں مولانا کا فقہی مسلک اور عمل۔

میں نے اس سلسلہ میں مولانا سے وضاحت چاہی تو فرمایا "بھائی، حنفیہ کے نزدیک تو غیر عربی زبان میں خطبہ مکروہ ہے مگر میں نے عوام کے فائدہ کے پیش نظر اس کراہت کو ہلکا کر لیا ہے۔ میں پہلے خطبہ میں بھی اول آخر عربی کی عبارت پڑھتا ہوں درمیان میں بھی آیات واحادیث کے ٹکڑے آتے رہتے ہیں۔ دوسرا خطبہ مکمل عربی میں ہوتا ہے۔

اور یہ میں نے اس لئے کیا کہ لوگ لمبی چوڑی تقریریں پسند نہیں کرتے، جمعہ کی نماز میں بھی پہلے سے نہیں آتے تو خطبہ ہی میں کوئی بات ان کے کان میں پڑ جائے، اسی لئے میں خطبہ بہت مختصر رکھتا ہوں، کسی جماعت یا فرد پر تنقید نہیں کرتا، کسی کا نام نہیں لیتا، اسی لئے لوگ راغب ہوتے ہیں"۔ اس کے بعد موضوعات کے لحاظ سے ہم مولانا کے خطبات کی تین تقسیمیں کر سکتے ہیں۔

۱۔ مستقل موضوعات۔

۲۔ غیر مستقل واقعاتی یا حادثاتی۔

۳۔ عبادات، اخلاقیات اور معاملات۔

پہلے نمبر کے موضوعات میں نماز، رمضان المبارک، ختم قرآن مجید، عید الفطر، عید الاضحیٰ، عشرۂ محرم، سیرۃ النبیؐ، شب برات، حضرت نظام الدینؒ اور خواجہ اجمیری کے عرس کی تقریبات، تعلیمی سیشن کے آغاز میں نیک نیتی پر اور سالانہ امتحان کے زمانہ میں قیامت اور روز جزا پر۔

دوسرے نمبر کے خطبات میں خطبۂ نکاح، کسی لیڈر کی موت، عالمی یا ملکی حالات اور حادثات جامعہ نگر کی زندگی میں انفرادی یا اجتماعی تنازعات، کسی خصوصی مہمان کی آمد وغیرہ۔

تیسرے نمبر کے خطبہ میں، عقیدۂ توحید، اسلام، ایمان کامل، احسان، حسن ظن، ایثار، جبن کی مذمت، برائی پر صبر، انفاق فی سبیل اللہ نبی کی شفقت، موت کا تصور تخلقوا باخلاق اللہ تزکیۂ نفس، اخلاق کریمانہ، تضحیک کی مذمت، بزرگوں کی عزت، دنیا کی بے ثباتی، حلال وحرام روزی، تقویٰ اور حقوق العباد۔

مندرجہ بالا خطبات مولانا کی حیات میں قلم بند کر لئے گئے تھے، اب ان کی ترتیب و تدوین کا کام زیر تکمیل ہے۔

روشن ضمیری

ندوہ کے بانیوں کی روشن ضمیری محتاج ثبوت نہیں رہی۔ ہر چند کہ قدیم وجدید کی آمیزش اور عقل ونقل کا امتزاج اس اعلیٰ معیار کے مطابق نہ ہو سکا جو ندوہ کے کارکنوں کے پیش نظر تھا مگر محدود تجربہ نے بھی مقصد کی صداقت عیاں کر دی اور اس کے فرزندوں کی عملی مثال نے دوسرے رہ نوردوں کے لئے راہ عمل نمایاں کر دی، فکر ونظر کے گوشے ہوں یا تحریر و تقریر کے میدان، تصنیف و تالیف کے ادارے ہوں یا درس و تدریس کی مسندیں، جلوت کے ہنگامے ہوں یا خلوت کے حلقے، اخبارات ورسائل کے مقالے ہوں یا ذکر و شغل کے مشغلے، سیاست کی پُرخار وادیاں ہوں یا معیشت کی پر پیچ راہیں، ادب کے گیسوؤں کی آرائش ہو یا علم وحکمت کی غواصی، کون سا کام منتسبین ندوہ کے نام سے خالی ہے۔ کس میدان میں اس کے فیض یافتوں کے قدم نہیں پہونچے، کون سی وادی ان رہ نوردان شوق سے ناآشنا ہے اور ان کے نقش پا کی شوخی کس منزل پر پکار پکار کر یہ اعلان نہیں کر رہی کہ ؎

"ابھی گذرا ہے کوئی اس طرف سے"

(مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

مولانا عبدالسّلام قدوائی ندویؒ

اور اُن کی تالیفات

محمود الازھار ندوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ فرزندانِ ندوہ کے اس حلقہ سے تعلق رکھتے تھے جن پر ندوہ کو ناز وفخر ہی نہیں تھا بلکہ وہ ندوی فکر وتخیل کے پوری طرح علمبردار ونمونہ تھے، مولانا کی تعلیم وتربیت خالص ندوی طرز فکر اور ماحول میں ہوئی، ان کے جلیل القدر اساتذہ میں مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا حیدر حسن خان کا نام نامی لیا جا سکتا ہے جن سے ان کو حد سے زیادہ لگاؤ اور محبت تھی۔ مولانا سادہ لوح اور خوش طبع اور خاموش کام کرنے والے انسان تھے اور یہ خوبیاں ان کی تعلیمی وتدریسی زندگی، رسالہ الندوہ کی ادارت، ادارہ تعلیمات اسلام کا قیام، درس قرآن، پھر رسالہ تعمیر کا اجرا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں صدر شعبہ دینیات اور آخر میں ندوہ میں معتمد تعلیمی اور دارالمصنفین میں شاہ معین الدین ندوی کے انتقال کے بعد نظامت، ان سب میں جلوہ گر نظر آتی ہیں، وہ جہاں بھی گئے اور جس حال میں رہے اپنی ملنساری کو باقی رکھا اور شگفتہ بیانی کی وجہ سے مقبول ومحبوب رہے اور مختلف طریقوں سے تشنگان علوم کی پیاس بجھاتے رہے، ان کی زندگی کا بڑا حصہ تدریس میں گزرا اور تصنیف وتالیف کی طرف ان کی طبیعت مائل نہیں تھی، اسی وجہ سے بہت کم لکھا لیکن وہ بہت کم بھی کچھ ایسا کم نہیں۔

مولانا نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور اکثر چیزیں ان کی تجرباتی زندگی کی دین تھی جو بعد میں افادہ عام کی خاطر زیور طبع سے آراستہ ہو کر آگئیں۔ یہاں پر ہم ان کی کتابوں کا تعارف پیش کرتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید کی پہلی کتاب (۲) قرآن مجید کی دوسری کتاب (۳) قرآن مجید کی تیسری کتاب

مولانا ندوہ سے جب الگ ہوئے تو احباب اور کچھ اصحاب خیر کے تعاون سے ادارۂ تعلیمات اسلام قائم

کیا اور درس قرآن دینے لگے۔ اس درس میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت رہتی تھی۔ ان کے سامنے قرآنی زبان (عربی) جو مشکل ترین زبان بنا کر پیش کی گئی تھی آسان اور ممکن الحصول بنا کر پیش کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس میں مولانا کو خاطر خواہ کامیابی بھی ملی اور عربی زبان کے دس سبق بہت مقبول اور مفید ثابت ہوئی، پھر مولانا نے غیر عربی داں حضرات کے لیے قرآن مجید کے معانی اور کسی حد تک تشریح و تفسیر کو بھی پڑھ لیں۔ مذکورہ بالا تینوں رسائل مرتب کئے۔ اس کی ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا رقمطراز ہیں۔ ترجموں کا حجاب دائرہ اثر کو بہت کم کر دیتا ہے۔ متکلم کے الفاظ کی تاثیر مترجم کے کلام میں تلاش کرنا بے سود ہے، کیونکہ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے بلیغ لفظوں اور پرزور فقروں کے اثر کو اپنی زبان میں منتقل کر سکے۔ ترجموں میں عبارت کی روانی، بیان کا زور اور فصاحت و بلاغت جس سے پڑھنے والے وجد میں آجائیں پیدا کرنی بہت دشوار ہے۔ اہل زبان کے لیے جو زبان تیر و نشتر کا کام دیتی ہے اسے دوسرے محسوس نہیں کرتے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ عربی زبان کو حاصل کر کے اسی کے ذریعہ براہ راست قرآن وحدیث کا مطالعہ کیا جا سکے، مگر عام طور پر لوگ اس جانب توجہ اس لئے نہیں کرتے کہ ان کے خیال میں عربی زبان اس قدر مشکل ہے کہ برسہا برس کی محنت و جدوجہد کے بعد بھی اتنی استعداد نہیں پیدا ہو سکتی کہ قرآن مجید یا احادیث کا مطالعہ کیا جا سکے، لیکن جیسا کہ ہم بار بار عرض کر چکے ہیں، یہ خیال صحیح نہیں زیادہ سے زیادہ دس دن میں اتنی استعداد پیدا ہو سکتی ہے کہ آسانی سے اصل عربی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا جا سکتا ہے اور اگر روزانہ ایک دو گھنٹے بھی کام کیا جائے، تو چھ مہینے میں پورے قرآن مجید کا ترجمہ ضروری تفسیر و تشریح کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں مولانا نے اصل عربی عبارت کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دے دیا ہے اور اخلاقی مضامین سے صرف نظر حکایات اور آسان تر اخلاقی قصے دیئے ہیں تاکہ ترجمہ میں قیاسی مدد ملے۔

مولانا نے اس کو اسی طور پر مرتب کیا کہ اگر کوئی شخص اس کے ذریعہ عربی زبان پڑھ کر حدیث شریف تفسیر فقہ اور تاریخ اسلام کی کتابیں کم از کم سمجھ سکے، اور اگر کوئی اپنا مطالعہ صرف قرآن مجید ہی تک محدود رکھنا چاہتا ہے تو اس کو صاف دل سے مشورہ دیا ہے کہ وہ عربی زبان کے دس سبق کے بعد اس کتاب کو بلا چون و چرا شروع کر سکتا ہے اور ایسے قرآن مجید کے معانی و مطالب کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

۲۔ عربی زبان کے دس سبق :

یہ کتاب مولانا کے اس کورس کا نتیجہ ہے جو انھوں نے غیر عربی داں تعلیم یافتہ طبقہ کو ڈاک کے ذریعہ عربی کی تعلیم کے لئے شروع کی تھی۔ مگر وقت اور ڈاک کے مصارف سے اجتناب کرتے ہوئے اس کو کتابی شکل میں پیش کیا گیا، تاکہ اس سے استفادہ عام ہو سکے۔

یہ کتاب عربی زبان کے صرف دس اسباق پر مشتمل ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس میں روزمرہ کی چیزیں اور قواعد کا مختصر تعارف بھی ہے تاکہ اگر کوئی اس کتاب کے بعد قرآن کا ترجمہ و تفسیر تھوڑا بہت پڑھنا چاہے تو اس کو قرآن مجید کی پہلی، دوسری اور تیسری کتاب پڑھ کر قرآن کے معانی و مطالب کسی حد تک سمجھ میں آجائیں ان اسباق میں دو باتوں کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور اس کا اظہار مولانا نے اس کتاب کے مقدمہ میں کر دیا ہے۔

(۱) قرآن مجید کے ابتدائی الفاظ سے واقفیت ہو جائے، دوسرے روزمرہ کے عربی الفاظ سے تعارف ہو جائے اس کے لئے عربی سے اردو اور اردو سے عربی کے جملے جمع کر دیئے گئے ہیں جس سے روزمرہ کی بات چیت میں سہولت ہو، نیز اس کتاب میں دیئے گئے قواعد میں اصطلاحات سے گریز کیا گیا ہے۔

یہ کتاب جدید غیر عربی داں طبقہ میں بے حد مقبول ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور بہت سے مدارس میں افادیت اور اختصار و جامعیت کے سبب داخل نصاب بھی ہے۔

ہندوستان کی کہانی :

مختصر تاریخ ہند، قدیم ہندوستان، مسلمانوں کی آمد سے قبل اور بعد کے واقعات پھر ہندوستان کے جن سیاسی حالات میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی، اس کا تذکرہ محمد بن قاسم کا داخلہ، غزنوی اور غوری کی آمد پھر ہندوستان میں خود مختار غلام حکومت کا قیام، خلجیوں اور تغلق خاندان کے عروج وزوال کی کہانی، افغان پٹھانوں کے کارنامے مغل حکمرانوں کے پرشکوہ دور کا تذکرہ اور انگریزوں کی غلامی سے لے کر آزاد ہندوستان تک تقسیم ملک سے لے کر آج کے دور تک کی تاریخ کو آسان زبان میں ابتدائی مدرسوں کے بچوں کے لئے پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب مفید اور پر از معلومات ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۰ء میں نکلا تھا اور اب تک اس کے دس سے زائد ایڈیشن طبع ہو کر ختم ہو چکے ہیں، اور اس اردو کشی کے دور میں بھی اس کی افادیت

اور اس سے استفادہ برقرار ہے۔

دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد:

یہ مولانا کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن کو مولانا نے درس و تدریس سے وقت نکال کر رسائل و اخبارات کے لئے مختلف موضوعات پر لکھے۔ اور اس کو نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں مکتبہ جامعہ نے شائع کیا۔ یہ "دنیا ڈیڑھ ہزار سال پہلے" "مصلح اعظم" "بنیادی عقیدہ" "انسانیت کی فصل بہار" جیسے اہم عناوین پر مشتمل ہے۔

حدیث نبوی کے اولین صحیفے:

اس میں حدیث کے ان صحیفوں کا تذکرہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں مرتب ہوئے۔ یہ "الندوہ" کے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا، اسی کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا، اسکو لکھنے کے اسباب کی طرف مولانا نے خود اشارہ کیا ہے۔ مخالفین اسلام نے ذخیرہ احادیث کو غیر معتمد اور غیر معتبر ٹھہرانے کی جو ناپاک سازشی مہم چلا رکھی تھی کہ یہ ذخیرہ دو ڈھائی سو سال تک یوں ہی بیان کیا جاتا رہا اور قرن اول و ثانی تک کتابت کا نظام نہیں تھا، بلکہ تیسری صدی ہجری میں کتابت کا دور شروع ہوا، مولانا نے اس سازش کو سامنے رکھ کر یہ مضمون تحریر فرمایا اور اس میں اپنے استاذ گرامی مولانا حیدر حسن خاں مرحوم سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء سے استفادہ فرمایا:

اس کتابچہ میں مولانا نے حدیث کی ضرورت، آنحضرتؐ کی توجہ، کتابت حدیث کی اجازت، عہد رسالت کی تحریری کوشش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے املا۔ عہد صحابہ کی تحریری جدوجہد، صحابہ کرام کے مرتب کردہ حدیث کے مجموعے حضرت عبد اللہ ابن عباس کی تصنیفات، حضرت ابوہریرہ کی کتابیں، حضرت عبد اللہ بن عمر کی روایات کی کتابیں حضرت جابر کے صحیفے، حضرت عائشہ کے تحریری مجموعے، حضرت ابوسعید خدری کی روایات، مکثرین صحابہ کی تصانیف حضرت عبد اللہ بن مسعود کی تصنیفات، حضرت زید بن ثابت کی مرویات دوسرے اہم صحابہ کی کتابیں جیسے عناوین کے تحت تحریر فرمایا ہے، جس میں کتابت حدیث رسول اکرمؐ کے عہد مبارک میں مل جاتی ہے۔

مثالی حکمراں:

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنت اہلِ دل فقر ہے، شاہی نہیں

"سروری در دیں ماخدمت گریست" کے عنوان سے ۱۹۴۸ء میں مولانا کا تحریر کردہ مضمون الفرقان میں شائع ہوا، اس کے بعد رسالہ "تعمیر" لکھنؤ میں کئی مہینہ تک ان مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔
ان مضامین کو پیش کرنے کی غرض خود مولانا نے مقدمہ میں تحریر فرمائی ہیں۔ "خوش قسمتی سے کاروانِ رفتہ کے نقوش اب بھی اوراقِ تاریخ میں محفوظ ہیں، ایک عرصہ سے جی چاہتا تھا کہ ان نقوش کو اوراقِ تاریخ سے نکال منظرِ عام پر لایا جائے اور ساتویں صدی کے جمہوری نظام سے بیسویں صدی کے جمہور کو باخبر کیا جائے۔
بعد میں دوستوں کے اصرار پر مولانا نے اس پر نظرِ ثانی کی اور اس کے تمام واقعات اصل مآخذ، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، مؤطا امام مالک، جامع ترمذی، دارمی مستدرک، طبقات ابن سعد، کامل ابن اثیر، تاریخ طبری، اصابہ، اسد الغابہ، استیعاب، کنز العمال، کتاب الخراج قاضی ابویوسف، ازالۃ الخفا، شاہ ولی اللہ، فتوح البلدان' بلاذری سے لئے گئے ہیں اور غور کرکے ان کی صحت کا اطمینان کرلیا گیا ہے، اس کتاب کا شمار مکتبہ تعلیمات اسلام کی اہم کتابوں میں ہے۔

ہماری بادشاہی:

یہ کتاب چھوٹے بچوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اس کی عبارت سادہ، طرزِ ادا سہل اور الفاظ چن چن کر آسان رکھے گئے ہیں اور زبان ایسی اختیار کی گئی ہے جو ان کے لئے دلچسپ اور پسندیدہ ہو اور واقعات میں اختصار کو ملحوظ رکھا گیا ہے تاکہ وہ یاد کرسکیں اور موقع سے ان کی قومی نخوت اور مذہبی غیرت کو بیدار کیا گیا ہے تاکہ تاریخ سے استفادہ کرسکیں۔
اس میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی سلطنتوں کی مختصر اور آسان تاریخ پیش کی گئی، جو گزشتہ صدیوں میں روئے زمین کے اطراف میں انھوں نے قائم کیں، اگرچہ اس میں تمام سلطنتوں کا استقصا

نہیں کیا گیا ہے، تاہم کوئی بڑی سلطنت چھوٹنے نہیں پائی ہے۔ یعنی آغاز اسلام سے لے کر عرب، مصر و شام، عراق وایران، ترکستان وافغانستان، ہندستان وروم، اندلس کی پوری اسلامی تاریخ کو مختصراً پیش کیا گیا ہے، اور بعد کے واقعات جیسے تقسیم ہند (قیام پاکستان) ایران، افغانستان کا تعارف، مصر میں بادشاہت کا خاتمہ سعودیہ میں آل سعود کی حکومت کا قیام عراق کی آزادی، اردن وشام اور یمن کا مختصر تذکرہ سوڈان صومالیہ اور لیبیا کی آزادی سے لے کر تیونس، الجزائر کی آزادی نائیجیریا، جمہوریہ مالی، کویت، لبنان، بحرین قطر، مسقط، عمان وزنجبار، انڈونیشیا، ملیشیا کی آزادی تک کے واقعات کا ذکر مختصراً کیا ہے۔

اس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۵۵ھ میں نکلا تھا اور زمانہ کی تبدیلیوں کے لحاظ سے اس میں اخیر کے ابواب میں ترمیم واضافہ ہوتا رہا ہے۔ یہ کتاب مدارس اسلامیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

حیدر حسن خاں:

مولانا نے اپنے استاد محترم جن سے ان کا قلبی لگاؤ تھا، احباب کے باربار اصرار پر، اپنے خیالات کو قلم بند کیا، اس سے مولانا کے خاندانی حالات ابتدائی تعلیم وتربیت اور حصول تعلیم کے لئے لاہور کا سفر اور وہاں کا قیام، زمانہ تدریس اور ٹونک کے مدارس کا تذکرہ، سفر حج اور اصحاب ثروت سے اعراض تدریس کی شہرت اور ندوہ میں بہ حیثیت شیخ الحدیث آمد، امام ابوحنیفہ سے غیر معمولی عقیدت و محبت نیز طریقہ درس اور اپنے چھوٹوں سے برتاؤ، غریب نوازی، مہمان نوازی، رواداری، شاگردوں کا خیال جدید مسائل سے دلچسپی، ندوہ سے استعفا اور اولاد وشاگرد سب کا ذکر خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔
مولانا خود اس کتاب کی ترتیب پر رقمطراز ہیں:۔

"علمائے سلف کے حالات کتابوں میں بہت پڑھے ہیں، ایسے چند ہی بزرگوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے جن کے اندر علم وعمل کا کمال نظر آیا، مولانا حیدر حسن رحمۃ اللہ علیہ نہی صاحب کمال بزرگوں میں تھے جن کو دیکھ کر علمائے سلف کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا اور کئی برس تک خلوت وجلوت اور سفر وحضر میں ان کے ساتھ رہنے کی سعادت نصیب ہوئی، جس قدر ان کے حالات سے واقفیت ہوئی اسی قدر عقیدت میں اضافہ ہوا، ان کا علمی تبحر اُن کا زہد وتقویٰ، اُن کا ذوقِ عبادت، اُن کا شوقِ خدمت، اُن کا حسنِ اخلاق، انکی انکساری، انکی

بے نفسی، ان کی بے نیازی، ان کی انسان دوستی، ان کا بزرگوں کا ادب، ان کی دوستوں پر نوازش ان کی خوردوں پر شفقت، ان کی عالی ظرفی، ان کی بلند ہمتی، ان کی فیاضی، ان کا حسن سلوک انکی بے خوفی، ان کی حق گوئی، ان کا استغنا، ان کا توکل، ان کا امیروں سے احتراز، ان کا غریبوں کا خیال محتاجوں کی حاجت روائی، تنگ دستوں کی دست گیری، کس کس بات کو یاد کیا جائے، ان کا خیال کرتا ہوں تو بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔

ع بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

امید ہے کہ اہل علم کے حلقہ میں دلچسپی سے پڑھی جائیں گی، ممکن ہے مولانا کے واقعاتِ زندگی کسی کو متاثر کریں اور ان کے اخلاق عالیہ کو معیار عمل بنانے کی رغبت ہو۔

میزان و منشعب جدید:

یہ مجموعہ "میزان" اور منشعب جدید" دو کتابوں پر مشتمل ہے، اس میں عربی زبان کے قواعد کو سہل اور آسان طریقہ پر پیش کیا گیا ہے، اس میں قواعد کے اجراء کے لئے تمرینات کا بھی سہارا لیا گیا ہے، تاکہ طالب علموں کے ذہن میں قواعد عربیہ جا گزیں ہو جائیں، اس کی اردو بہت آسان رکھی گئی ہے، پہلے یہ دونوں کتابیں الگ الگ تھیں مگر بعد میں طباعت کی سہولت کی خاطر یکجا کر دی گئیں۔

ندوۃ العلماء کے پچاسی سال

ماضی کی مختصر سرگزشت، حال کا جائزہ، مستقبل کا خاکہ

اس رپورٹ کو مولانا نے اجلاس تعلیمی منعقدہ ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۵ء کے لئے مرتب کیا تھا۔ اس میں قیام ندوۃ العلماء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک کی مختصر تاریخ آگئی ہے، قیام ندوۃ العلماء کے وجوہات اس کا بنیادی تخیل، اغراض و مقاصد اور تحریک ندوۃ العلماء کے مختلف ادوار اور ان اہم شخصیتوں کا تعارف آگیا ہے جنھوں نے ... اپنے خون جگر سے اس چمن کو سینچا، نیز اس میں فرزندان ندوہ کی علمی و فکری

وتعمیری کاوشوں کا خلاصہ بھی آگیا ہے، اور اس میدان میں طلبہ کا ذہن بنانے کے لئے جو اسباب ندوہ نے مہیا کئے ہیں ان کو بھی رپورٹ میں شامل کیا گیا ہے، ندوہ کی عربی واردو صحافت اور فرزندان ندوہ کی نتیجہ خیز علمی ودینی سرگرمیوں کا تعارف مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے اور یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ندوہ کی مختصر مگر جامع تاریخ مولانا کے ہاتھوں مرتب ہوکر ہمارے علمی ذخیرہ میں ایک نئے اضافہ کا سبب بنی ہے۔

طریقۂ کار

ندوہ کے کام کا یہ طریقہ تھا کہ عہدہ دار مجلس انتظامی کے مشورہ سے کام کرتے رہتے تھے سال بھر کے بعد عام جلسہ کسی مشہور مقام پر ہوتا تھا اس کے لئے کوئی نامور صاحب علم صدر منتخب ہوتا وہ ایک پر اثر خطبہ پڑھتا جس میں ندوۃ العلماء کے اغراض ومقاصد بیان کئے جاتے، ناظم سالانہ کارگذاری کی رپورٹ سناتا پھر مشہور مقرروں کی تقریریں ہوتیں جن میں عربی مدارس کے منتظمین کو آمادہ کیا جاتا کہ نئے حالات اور جدید ضروریات کے پیش نظر وہ نصاب تعلیم اور طریقۂ درس میں تبدیلی کریں لیکن صدیوں کے رائج شدہ نصاب کو بدلنا آسان نہیں تھا، طبیعتیں اس سے مانوس تھیں، اور ان کتابوں سے ایک خاص قسم کی محبت اور عقیدت پیدا ہوگئی تھی، اس لئے جلسوں کا اثر دیرپا نہ ہوتا۔ لوگ مصلحین کے خیالات کی زبان سے تائید کرتے مگر عمل کی راہ میں قدم نہ رکھتے وہی غالب کے شعر کا معاملہ تھا کہ ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

(مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم)

فتنۂ انکار حدیث اور مولانا عبد السلام قدوائی ندوی کی خدمات

سید محمد ظفر ندوی

حقیقت کسی رنگ و روپ میں ہو وہ عموماً سادہ ہی ہوا کرتی ہے اور شاعر کے کہنے کے مطابق ع
سادگی میں بھی قیامت کی ادا ہوتی ہے۔" قیامت کا کام کر جاتی ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکثر لوگ سادگی پسند ہوتے ہوئے بھی الفاظ اور اسلوب کی حد تک ظاہری رنگ و روپ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی مرحوم کچھ اور ہی ذوق کے تھے، ہر معاملہ میں حقیقت پسند واقع ہوئے تھے۔ ان کی زندگی سادہ، تحریر لفظی صناعی سے دور لیکن مؤثر، وضع قطع تکلفات سے پاک غرض ان کی ہر چیز سادہ تھی، کسی موضوع پر لکھتے ہوئے وہ ایسا انداز اختیار کرتے کہ ان کی بات دل پر احساس ہوئے بغیر اثر کر جاتی تھی۔ فتنۂ انکار حدیث کے سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ سادہ تحریر میں لکھا اور مؤثر لکھا۔ ان کی اس سلسلہ میں دوسری خصوصیت یہ رہی کہ رد انکارِ حدیث میں انھوں نے مثبت انداز اختیار کیا، واقعات و حالات اور عقل و نقل کی اس انداز سے تطبیق دی جس کو منکرین حدیث بھی (اگر انھوں نے ان کی تحریر پڑھی ہو) مان لیں۔

ہندوستان میں آج سے تقریباً پچاس سال پہلے پنجاب کی زرخیز زمین سے ایک نئے فرقہ کا ظہور ہوا۔ یہ فرقہ اپنے آپ کو اہل قرآن کہتا تھا، مولوی احمد الدین اس فرقہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ قلیل مدت کے بعد پورا ملک اس فتنہ کی زد میں آگیا۔ عبد اللہ چکڑالوی، ڈاکٹر برق جیلانی (جو بعد کو تائب ہو گئے) اور ان کے مشیر کار بلکہ ایک طرح سے راہنما نیاز فتحپوری، اور ان سے متاثر ہو کر ڈاکٹر پرویز اور ڈاکٹر عبد الودود اور دوسرے بہت سے پڑھے لکھے لوگوں نے انکار حدیث کو زور و شور سے چلایا کہ وہ باقاعدہ ایک مسلک و مشرب بنتا نظر آنے لگا حافظ اسلم جیراجپوری کسی سے پیچھے کیوں رہتے، انھوں نے آگے بڑھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسی معجزات کا انکار کیا اور غیر متواتر حدیثوں کو ظنی قرار دیا۔ اس مسلک نے قرآن کی نئی تفسیر پیش کی۔

چونکہ یہ سب جدید طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے فطری طور پر مسلمانوں کے جدید طبقہ میں ان کی اور

ان کے افکار و خیالات کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی اور صدیوں کا مسلمہ اصول (اقرار حجیت حدیث) مشکوک اور غیر معتبر قرار دیا جانے لگا، اس فتنہ کی حقیقت آشکارا کرنے کے لیے علماء امت نے قابل قدر اور قابل فخر کوششیں کیں، اور بڑی حد تک اس پر قابو بھی پا لیا لیکن اگر غائرانہ نظر سے دیکھا جائے تو شاید مثبت اقدام کی طرف توجہ نہیں ہوئی اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں ہے کہ ہر شخص کو ہر بات کی توفیق ہو۔

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی مرحوم عموماً ہر معاملہ کے مثبت پہلو کو تلاش کرتے اور اس راہ سے اصلاح وانقلاب کی بساط بھر کوشش کرتے تھے۔ انکار حدیث کے فتنہ کا جب انھوں نے تجزیہ کیا تو وہ سمجھ گئے کہ صحیح قرآن خوانی تو اس امت میں پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے لیکن صحیح قرآن فہمی کا ذوق ظاہر بینی اور انحطاط و زوال کا شکار ہو رہا ہے۔ قرآن فہمی کے ذوق صحیح کو عام کرنے کے لئے انھوں نے ۱۹۴۰ء میں ادارہ تعلیمات اسلام کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد رکھی اور حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کی رفاقت و مساعدت سے ستمبر ۱۹۴۸ء میں پندرہ روزہ دینی رسالہ "تعمیر" نکالنا شروع کیا، اس ادارہ کے مقاصد میں اگرچہ انھوں نے بصراحت اس امر کا اظہار نہیں کیا کہ اس سے ان کا مقصد انکارِ حدیث کا رد و ابطال ہے۔ لیکن ممکن ہے ان کے پیش نظر یہ مصلحت کار فرما ہو کہ اخفاء، اظہار کے مقابلہ میں زیادہ کارآمد ثابت ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، مبتلائے وہم و تشکیک کو احساس بھی نہ ہوتا تھا اور وہ محض قرآن کی تفسیر سمجھ کر یا کسی دینی موضوع پر تفصیلی روشنی سمجھ کر "تعمیر" کا مطالعہ کرتا تھا اور غیر شعوری طور پر اس کے رجحانات و خیالات میں رخنہ پڑ جاتا تھا۔ یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ ان کے اس تریاق نے کتنوں کا مرض دور کیا ہوگا، اور انھیں احساس بھی نہ ہوا ہوگا۔ تعمیر کے سیدھے سادھے مضامین غضب کا کام کر جاتے تھے۔

دوسری طرف انھوں نے شہر لکھنؤ میں درس قرآن اور درس حدیث کا سلسلہ شروع کیا، یہ درس ہر جمعہ کو بعد مغرب ہوتا تھا اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں:-

"قرآن شریف کے درس میں حاضرین کی تعداد سیکڑوں تک پہونچنے لگی حتیٰ کہ ادارۂ تعلیمات اسلام کا ہال اس کے لئے ناکافی ثابت ہوا اور اس کا انتظام عمارت کی وسیع چھت پر کیا گیا اس وقت اس درس اور ادارۂ تعلیمات اسلام کی طرف ایسا رجوع ہوا کہ اگر لکھنؤ میں جمعہ کے دن بعد مغرب کسی اعلیٰ عہدہ دار مسلمان اور صاحبِ ذوق انگریزی داں کو تلاش کرنا ہو تو اس کے ملنے کی جگہ یہی تھی۔"

میرے نزدیک یہ درس قرآن اور درس حدیث فتنہ انکار حدیث کا مثبت علاج تھا، اس کا اندازہ ان تفسیری نوٹس سے بخوبی ہوتا ہے جو رسالہ "تعمیر" میں انھوں نے تحریر کئے ہیں۔ اصلاح افکار و خیالات کا انھوں نے اس سے بڑا زبردست کام لیا ہے، اور ان قرآنی اشاروں کو واضح کرنے کی مؤثر کوشش کی ہے جو منصب نبوت اور اس کے عالی مقام کو متعین کرتے ہیں۔

منکرین حدیث نے قرآن سے استدلال میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں اور جس بے راہ روی کا وہ شکار ہوئے ہیں ان سے اہل نظر خوب واقف ہیں۔ مولانا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان لغزشوں کے اصل سبب کو تاک کر عربی زبان وادب کو سیکھنے اور عربی دانی کے بعد قرآن فہمی کا ذوق عام کرنے کے لئے چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ان کی کتاب "عربی کے دس سبق" (جو ہندوستان میں بہت مقبول ہوئی اور متعدد اسکولس اور کالجس میں داخل نصاب ہوئی) اور تمرین الدروس (۱،۲،۳) اور قرآن مجید کی پہلی دوسری تیسری کتاب انکار حدیث کو جڑ سے ختم کرنے کی بڑی عمدہ کوششیں ہیں۔ ان کتابوں اور ان درسوں نے جدید طبقہ پر گہرا اثر ڈالا اور جو لوگ اس سنہری سلسلہ سے منسلک ہوئے وہ بغیر کسی بڑی جدوجہد کے صرف کئے، انکار حدیث کے فتنہ سے محفوظ و مامون رہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں۔ "لکھنؤ میں سکریٹریٹ اور دفتروں میں کام کرنے والوں، کالجوں میں پڑھنے والوں اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد یہاں (ادارۂ تعلیمات اسلام) عربی زبان سیکھنے اور قرآن مجید پڑھنے آنے لگی اور اس میں دینی ذوق اور عربی کا شوق پیدا ہوا اور بہت سے لوگ اس قابل ہو گئے کہ وہ قرآن مجید سمجھ کر پڑھنے لگیں، مولانا کی محبت واخلاق اور سادگی و تواضع نے ان کو گرویدہ کیا اور یہ ان کے دین اور علمائے دین سے قریب ہونے کا ذریعہ بنے۔

منکرین حدیث کے نزدیک رسول کی حیثیت قاصد یا پیغام رساں یا مبلغ کی سی ہے، پیغام رسانی کے بعد نہ اس کے ذمہ کوئی اور فریضہ باقی رہتا ہے اور نہ ہی جن لوگوں تک وہ پیغام پہنچا ہے، ان کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ رسول کو "پیغام رساں" سے زیادہ اہمیت دیں، لکھنے والوں نے اس نظریہ کے باطل ہونے پر بہت کچھ لکھا لیکن ساری تحریریں صاف صاف اس بات کی غماز ہوتی ہیں کہ وہ منکر حدیث کو جواب دے رہی ہیں۔ اور افہام و تفہیم اور صلاح و اصلاح مقصود نہیں ہے بلکہ ؎

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

کا اظہار مقصود ہے۔ مولانا قدوائی مرحوم نے اپنی تحریر میں منکرین کے اعتراض کا بصراحت ذکر نہیں کیا کہ جواب سا معلوم ہونے لگے بلکہ طرز نگارش ایسا اختیار کیا جس سے محض حقیقت بینی اور حقیقت بیانی معلوم ہو اور انکار حدیث کے زہر کا تریاق بھی حاصل ہو جائے۔ نمونہ کے طور پر بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

تعمیر ۱۵/اپریل ۵۰ء مطابق ۲۶ جمادی الاخر ۱۳۶۹ھ کے اداریہ میں "لائق توجہ" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:-

"آپ پیغام الٰہی کے حامل تھے۔ آپ پر سب سے پہلے وحی الٰہی منکشف ہوئی تھی اور آپ ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی سے دنیا کو آگاہی ہوئی، اس لئے آپ احکام الٰہی کا صحیح مطلب سمجھتے تھے مرضی الٰہی سے بخوبی واقف تھے اور منشاء ربانی کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے قرآن مجید کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے ارشادات سے بخوبی اطلاع ہو، آپ کے حالات سے واقفیت ہو، آپ کی سیرت کے ایک ایک پہلو پر نظر ہو، آپ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کا علم ہو، اس کے ساتھ ساتھ ان بزرگوں کے حالات، عمل اور طرز زندگی سے بھی واقف ہونا ضروری ہے جو قرآن مجید کے اولین مخاطب تھے جنھیں صاحب قرآن کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل تھی۔ جس طرح سیرت نبوی سے الگ ہو کر قرآنی احکام کو سمجھنا دشوار ہے، اسی طرح صحابہ کرام کے حالات زندگی سے بے خبر رہ کر منشائے نبوت کو سمجھنا مشکل ہے، ایسا کرنے پر قدم قدم پر غلط فہمیوں اور گمراہیوں کا اندیشہ ہے۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جن لوگوں نے اس کی کوشش کی وہ کج روی اور گمراہی میں ایسے مبتلا ہوئے کہ پھر کبھی اس سے نہ نکل سکے۔"

ایک دوسرے مضمون میں رقمطراز ہیں:-

"عام قاعدہ ہے کہ کسی پیغام کو پورے طریقے سے سمجھانا مقصود ہوتا ہے اور صاحب پیغام کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شخص کے پاس پیغام بھیجا جا رہا ہے اسے مطلب سمجھنے میں کوئی غلط فہمی نہ ہو اس کے مطابق عمل کرنے میں کوئی دشواری ہو تو پیغام کسی معتبر شخص کی معرفت بھیجا جاتا ہے اور اسے پیغام کے مضمرات سے پورا باخبر کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس کی پوری توضیح کر سکے اور کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ بھی چاہتا تھا کہ جو پیغام وہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے بھیج رہا ہے اس کے سمجھنے میں لوگوں کو دشواری نہ ہو اور نہ اس پر عمل کرنے میں کوئی الجھن ہو اس لئے اس نے خالی کتاب بھیجنے کے بجائے یہ کیا کہ ایک بہت ہی معتبر ذات کو پیغامبری کے لئے منتخب کیا

اور اس کے ذریعہ اپنی ہدایات سے لوگوں کو مطلع کیا، اس نے نبی کو صرف آیات الٰہی سنانے پر مامور نہیں کیا بلکہ تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم کتاب اور تزکیۂ نفوس کی ذمہ داری بھی سپرد کی هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم آیاته و یزکیهم و یعلمهم الکتاب والحکمة۔

یہ اور ان کی ہم شبیہ تحریروں کو سامنے رکھئے اور سوچئے کہ ان کی اس سادہ بیانی نے غیر شعوری طور پر کتنے لوگوں کے ذہن و دماغ اور فکر و نظر کو بدل ڈالا ہوگا اور جو لوگ انکار حدیث کے فتنہ سے پہلے سے دور تھے، ان کے قلب و نظر کو بغیر کسی بڑی مشقت اور جد و جہد کے حقیقت آشنا اور صحیح اسلامی فکر کا مالک بنا دیا ہوگا، حق تو یہ ہے کہ جو فطری اثر سادگی میں ہے وہ بناوٹی زیب و زینت میں عنقا ہوتا ہے، عربی شاعر متنبی نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے ؎

حسن الحضارة مجلوب بتطرية
وفی البداوة حسن غیر مجلوب

(تہذیب و تمدن کا حسن کسبی اور مصنوعی ہوتا ہے اور دیہاتی حسن وہبی اور فطری ہوتا ہے۔)

منکرین حدیث نے سارا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ غیر متواتر حدیثیں ظنی ہیں کیونکہ ان کی قطعیت کا کوئی واضح اور ٹھوس ثبوت تاریخ اسلام میں نہیں ملتا، یہ مفروضہ ایک دوسرے مفروضہ پر قائم ہے وہ یہ کہ ڈھائی سو برس تک حدیثیں یوں ہی بیان ہوتی رہیں اور تیسری صدی ہجری میں کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولانا قدوائی مرحوم نے ان دونوں اعتراضات کی حقیقت واضح کرنے کے لئے ایک مقالہ تحریر کیا جو ۳۴ء میں جامعہ ملیہ دہلی کی ایک علمی انجمن میں پڑھا گیا، پھر مزید تحقیق و تفصیل کے ساتھ الندوہ ۴۱ء میں کئی ماہ اس موضوع پر لکھتے رہے، انہی مضامین کو اپنے بزرگوں اور دوستوں کے اصرار سے "حدیث نبوی کے اولین صحیفے" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔

اپنی اس کتاب میں مولانا نے بڑی جامع ترتیب کے ساتھ تدوین حدیث اور اس کے مراحل کا ذکر کیا ہے اور عہد رسالت کی تحریری کوششوں سے لے کر تیسری صدی ہجری تک کے تمام ذخیرہ کو خوبصورتی کے ساتھ اس کتابچہ میں جمع کر دیا ہے۔ اختتام پر لکھتے ہیں:۔

"مکثرین صحابہ کی تقریباً پچیس ہزار روایتوں کا ذکر گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے جو ان کے سامنے

ہی تحریر کا قالب اختیار کر چکی تھیں۔ سطور بالا میں چند اور مشہور صحابہ کے تحریری مجموعوں کا ذکر کیا گیا ہے جو یقیناً ہزار ہا حدیثوں پر مشتمل تھے، لیکن یہ تعداد یہیں پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ انہیں خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کے ان ہزاروں بلکہ لاکھوں خطوط کو بھی شامل کر لینا چاہیے جو انھوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمال، فوجی افسروں اور معلمین و مصلحین کے نام لکھے اور ان افسروں اور عاملوں کی جانب سے جو احکام و فرامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی روشنی میں لکھے گئے، اس طرح صحابہ کرام کے زمانہ ہی میں احادیث کے بہت سے مستقل اور بڑے بڑے کتابی مجموعوں کے علاوہ سارے اسلامی ممالک میں بے شمار تحریری روایتیں پھیلی ہوئی تھیں۔"

مولانا کی یہ کتاب اسی انداز پر لکھی ہوئی ہے جس میں ایک حقیقت کا اظہار نمایاں ہے نہ کہ کسی اعتراض کا جواب اور بلاشبہ وہ اپنی اس خصوصیت میں منفرد ہیں۔ ان کے اس طرز نگارش نے اس سلسلہ میں جو اصلاح و انقلاب برپا کیا ہے وہ اس موضوع پر بڑی بڑی بحثوں اور فلسفیانہ کتابوں کے اثر سے کہیں زیادہ وسیع اور عمیق ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں رد انکار حدیث پر ان کی خدمات کا احاطہ مقصود نہیں ہے محض اس پہلو کو اجاگر کرنا ہے کہ ندوۃ العلماء کے یہ معتمد تعلیم اور دار المصنفین اعظم گڑھ کے یہ قائد کس پایہ کے عالم تھے۔ افسوس ہے کہ پہلے ہی یہ امت ایجابی طرز فکر اور مثبت طریق عمل سے دور ہے اور اس طرح کی شخصیتوں کے اٹھ جانے سے مزید خلا پیدا ہو رہا ہے جس کا پر ہونا مستقبل قریب میں تو محال سا نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے، حسنات کو قبول فرمائے اور سیئات سے درگزر فرمائے۔ امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

فما کان قیس هلکه هلك واحد

ولکنه بنیان قوم تهدم

(قیس کی موت ایک فرد کی موت نہیں ہے بلکہ اس کی موت سے قوم کی عمارت گر پڑی ہے)

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کی تاریخی خدمات

(سید مشتاق علی ندوی، بھوپالی

انیسویں صدی عیسوی میں جب یورپ نے علمی و سائنسی بنیادوں پر ترقی کی منزلیں طے کیں جس سے اس کا نیا تمدن، نئی تہذیب وجود میں آئی تو یورپ کو فکر دامن گیر ہوئی کہ کس طرح اقوام عالم اور خاص طور پر ان قوموں کو جن سے اس کو اپنے آشیانہ کے مستقبل ہی کے بارے میں خطرہ تھا جن میں اس کی نظر اسلام اور مسلمانوں پر سب سے پہلے ٹھہری، کو اپنی تہذیب کا گرویدہ اور اپنے تمدن کا پابند بنایا جائے اور ان کے دلوں میں اپنی اور اپنی قوم کی برتری اور بلندی کا نقش اس طرح ثبت کیا جائے کہ انکو ان کی تہذیب و تمدن، ان کے اسلاف اور ان کے کارنامے اور ان کا مایۂ افتخار بے حقیقت ہی معلوم نہ ہو بلکہ وہ اس سے متنفر، بیزار اور دور ہو جائیں، اور کیونکہ یورپ طویل و تلخ تجربات اور خاص طور پر تاتاری اور صلیبی جنگوں سے اس نتیجہ پر پہونچ چکا تھا کہ مسلمانوں کو صراحتاً اور کھل کر ایمان و عقیدہ، عشق رسول، محبت صحابہ کرام اور عقیدت علماء عظام سے خالی اور دور کرنے کی دعوت دینا خود اپنے پیر پر کلہاڑی مارنے، دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دینے کے مرادف ہے۔

چنانچہ یورپ نے اب اپنی کوششوں بلکہ سازشوں کے لئے نیا میدان کار بنایا اور ایک نیا حربہ استعمال کیا کہ اسلام اور مسلمانوں کی شاندار و آبدار تاریخ کو داغدار اور عیب دار بنایا جائے اور ان کے اسلاف کے عظیم الشان کارناموں، ان کی فتوحات مادی و معنوی، جسمانی و روحانی کو اس رنگ میں پیش کیا جائے کہ کم از کم ہمارے محکوم ملکوں، آئندہ آنے والی نسلوں اور عوام میں بدگمانی و سوء ظن بلکہ نفرت و بیزاری کا جذبہ پیدا ہو اور وہ اپنے کو ان کی طرف منسوب کرنے میں بجائے عزّ و شرف کے ذلّت و عار محسوس کریں اور دبے الفاظ میں انکار پر آمادہ ہو جائیں تو پھر اس طرح ان کا تعلق ان کے اصل سرچشمۂ حیات اور منبع روح سے کٹ جائے پھر ان سے جو چاہیں گے کروائیں گے اور جہاں چاہیں گے استعمال کریں گے۔

چنانچہ مورخ اسلام سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں ہندوستان میں یہ حملہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا اور اس کے علمبردار ڈاکٹر اسپرنگر تھے اسکے بعد سر ولیم میور آئے اور پھر سلسلہ جاری رہا۔ انگلستان اور فرانس اور جرمنی میں یہ کام پوری مستعدی سے جاری تھا۔ ڈاکٹر جے۔ اے مولر، ڈاکٹر ویل، وان کریمر، برتھامی،

جائے کہ مسلمانوں کے دلوں سے ان کی محبت وعقیدت ختم ہو جائے۔

تو مولانا مرحوم نے وقت کی ضرورت اور غیرت دینی کا تقاضہ سمجھا کہ عام فہم، سادہ اور سلیس زبان میں ان ستاروں کے کارنامے اور ایک حد تک ان کی زندگی کا رُخ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے "مثالی حکمراں" کے نام سے ایک چھوٹی سی لیکن بہت ہی وقیع واہم تصنیف مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دی کہ وہ کسی طرح کے دھوکے اور احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ اس میں مولانا نے بڑی خوبی اور بہت اچھے انداز میں یہ بات واضح کی کہ اے اخوت ومساوات، ایثار وہمدردی، علم وحکمت کے دعویدار و! تمہاری زبان پر صرف یہ الفاظ ہیں جو کہ کبھی حلق سے نیچے نہیں جاتے، لیکن ایک ہمارے اسلاف تھے جنھوں نے اعلان اور نعرے بازی تو کبھی نہیں کی لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر دنیا کے سامنے ایسی عملی مثالیں پیش کیں جو تاریخ میں سنہری حروف سے تحریر کئے جانے کے قابل ہیں۔ اور کہیں کہیں تو مولانا کا قلم سیال کا دھارا بہت تیز ہو جاتا ہے اور پورے ایمانی جوش اور مؤرخانہ ہوش سے تیر ونشتر کی بوچھار کرتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جو قحط پڑا تھا اور اس میں حضرت عمرؓ کا جو رویہ رہا اور کس طرح وہ پورے زمانۂ قحط میں دیدۂ بے خواب اور ماہی بے آب بنے رہے اور کس طرح انہوں نے رعایا کے دکھ درد، تکلیف ومصیبت میں ساتھ دیا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا مرحوم کا قلم سیال رواں ہوتا ہے۔ "غور کیجئے ہے کوئی فرمانروا جس کا یہ مطمح نظر ہو، جو رعایا پروری کا یہ بلند نصب العین رکھتا ہو اور جو اخوت ومساوات کا ایسا گہرا جذبہ رکھتا ہو ـــ بلند بانگ دعوے آپ نے بہت سُنے ہوں گے۔ پرزور نعرے بارہا کانوں میں گونجے ہوں گے۔ لیکن سچ بتائیے رعایا پروری کے یہ واقعات کسی حکمراں کی زندگی میں نظر آتے ہیں اور اسلام کے سوا اخوت ومساوات اور ہمدردی وغمگساری کی مثال کہیں اور بھی پائی جاتی ہے؟[1]

خلفاء اربعہ کے بعد ان مفسدین کی پوری کوشش ومحنت اس پر صرف ہو رہی تھی کہ شاہانِ اسلام اور ان کی سلطنتوں کا ایسا نقشہ اور خاکہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے کہ اس کے دیکھنے سے نفرت ہو اور جس سے ان کی نااہلی، بے علمی کا نقش دلوں پر بیٹھ جائے اس کے لئے انہوں نے عام فہم اور سادہ وسلیس اسلوب میں تاریخ کو مرتب کر کے اسکولوں اور کالجوں میں داخل کرنا شروع کیا کہ اگر یہاں یہ بیج ڈال دیا گیا تو پھر زندگی بھر برگ و

---

[1] مثالی حکمراں ص ۳۳

بارلاتا رہے گا اور نقش کالحجر ہوگا۔ مولانا عبدالسلام مرحوم نے اس سم قاتل کے مضرات اور خطرات کا اندازہ کیا اور اس کے تریاق کی جستجو میں لگ گئے چنانچہ مولانا مرحوم نے سادہ، سہل اور دلچسپ و پسندیدہ اسلوب میں "ہماری بادشاہی" کے نام سے مختصر تاریخ اسلام مرتب کی تاکہ بآسانی مدارس و مکاتب، اسکولوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہوسکے اور نئی نسل کو صحیح معلومات فراہم ہوں اس میں مولانا نے صرف واقعات و فتوحات اور حادثات پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ علامہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں، "موقع موقع سے ان کی قومی نخوت اور مذہبی غیرت کو بیدار کیا گیا ہے تاکہ تاریخ کا فائدہ حاصل کریں[1]"

اس کی مثالیں کتاب میں جگہ جگہ ملتی ہیں مثلاً مولانا مرحوم اسلام نے عربوں میں جو انقلاب عظیم برپا کردیا تھا اور جو کایا پلٹ ہوئی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "ایمان کی قوت نے ہمت بلند کردی، وہی مفلس و قلاش اور غریب ولاچار عرب جن کی ساری زندگی بکریوں کی چرواہی اور اونٹوں کی دیکھ بھال میں بسر ہوئی تھی، بادشاہت و سلطنت کے ارادے کرنے لگے۔"

پھر اس کے بعد آگے چل کر بڑے جوش، بلکہ سنجیدگی اور ایمانی قوت سے سوال کرتے ہیں "سوچنے کی بات ہے کہ آخر چند برس میں یہ کایا پلٹ کیونکر ہوگئی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا وہ کون ذات تھی جس نے ساری دنیا بدل دی۔" (صلی اللہ علیہ وسلم)[2]

اسی طرح حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) کے کارناموں اور فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "لوگ حیران ہیں کہ ایکبارگی یہ کیا ہوگیا، لیکن اس میں تعجب کی کیا بات ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی ایسی زبردست تھی جہاں ایک بار اسلام کا اثر ہوا اور اللہ کا خیال دل میں جما، پھر کیا تھا ساری دنیا قدموں کے نیچے تھی، وہ اللہ کے ہوگئے تھے اللہ ان کا ہوگیا تھا۔"[3]

حضرت عمرؓ کے اوصاف حمیدہ اور خصائل جمیلہ زہد و ورع، عبادت و ریاضت، اخوت و مساوات، سادگی و تواضع کا ذکر کرتے ہوئے ان کی نوک قلم سے یہ الفاظ آشنا ہوتے ہیں: "خیال کرنے کی بات ہے کہ عرب و عراق، ایران و شام اور مصر جیسے ملک جس خلیفہ کے قبضہ میں رہے ہوں اس کی زندگی ایسی سادہ ہو۔"[4] کہیں کہیں اس میں مولانا مرحوم نے مرض کی تشخیص بھی کی اور ان مہلک و تباہ کن بیماریوں سے بچنے کی دعوت

---

[1] دیباچہ ہماری بادشاہی۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۵، [3] ایضاً صفحہ ۴۲، [4] ایضاً صفحہ ۴۳

سینٹ ہلیر، ڈوزی، ولہاؤسن، گولڈزیہر، ایمان وغیرہ یہ کام انجام دیتے رہے اور سب سے آخر میں پروفیسر مارگیولیوتھ اٹھے اور اس کا بیڑا اٹھایا[1] ادھر عیسائیوں نے خود مسلم ممالک کے اندر یہ کام شروع کیا جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال ان میں قابل ذکر ہیں۔

چنانچہ اس عظیم دور رس اور پُرفریب فتنہ سے عالم اسلام اور مسلمانوں میں جو ادارہ سب سے پہلے برسرپیکار ہوا وہ ندوۃ العلماء تھا جہاں شمس العلماء علامہ شبلی نعمانیؒ (م ۱۳۳۲ھ) نے "تصحیح اغلاط تاریخی"، کے نام سے ایک شعبے کی بنیاد رکھی اور اس کا سکریٹری اپنے ہونہار شاگرد رشید علامہ سید سلیمانؒ کو مقرر کیا، اور الجزیہ، الفاروق، المامون سیرۃ النعمان وغیرہ کے ذریعہ ان مستشرقین کے تمام راستے بند کر دیے کہ ان کو آنکھ اٹھا کر بات کرنے اور منھ ملانے کا موقع ملے، ادھر سید صاحب نے اپنی صلاحیت ولیاقت سے اپنے استاد کے کام کو پروان چڑھایا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کیا کہ اس فتنۂ عظیم سے مقابلہ کے لئے ایک پوری ٹیم تیار کر دی کہ وہ اس کا دنداں شکن اور حوصلہ شکن جواب دیتی رہے چنانچہ شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا ابوظفر ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی قدوائی انہی کے حلقۂ فیض سے فیضیاب ہوئے۔ اور زمانے کے فتنوں کا جواب دیتے رہے۔

چونکہ مستشرقین اور یورپی اہل قلم نے سب سے پہلے سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کو مورد الزام ٹھہرایا تھا اور آپؐ کی ذات والاصفات کو اس طرح پیش کیا کہ دیکھنے والے کے سامنے آپ کی اصلی تصویر کا ایک رُخ بھی نہ آئے تو مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے اس کو محسوس کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کرنے اور آپ نے دنیا پر جو انعامات واحسانات کئے ان کو پیش کرنے کی کوشش کی، چنانچہ مولانا مرحوم نے بڑی محنت وکاوش اور عرق ریزی سے "دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد" تصنیف کی جو بہت مقبول ہوئی، مولانا نے اس میں بہت ہی خوش اسلوبی سے یہ ثابت کیا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نہ ہوتی تو دنیا اعلیٰ صفات، بلند مقاصد، صحیح اغراض سے بالکل نابلد و بے خبر رہتی، آپؐ کے دنیا پر اور انسانیت پر وہ احسانات ہیں جو رہتی دنیا تک فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے بعد ان دجالین مغرب کا رُخ خلفاء اربعہ کی طرف تھا کہ کسی طرح ان کو اور ان کی حکومت کو ظالم وجابر ثابت کر دیا جائے اور ان کے زندہ جاوید کارناموں پر ایسا پانی پھیر دیا

---

[1] حیات شبلی ص ۳۰۲

دی، مثال کے طور پر اندلس کا ذکر بڑے گہرے رنج و افسوس اور حسرت بھرے الفاظ میں کرتے ہوئے کہتے ہیں، "غرض تھوڑے ہی عرصے میں سارا اندلس مسلمانوں سے صاف ہو گیا اور ایک آدمی بھی اللہ کا نام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والا باقی نہ رہا، اور یہ سب آپس کی نااتفاقی کی بدولت ہوا۔"[1]

مولانا مرحوم نے ہماری بادشاہی کے بعد اسی اسلوب میں الگ سے ہندوستان کی تاریخ مرتب کی جو "مختصر تاریخ ہند" کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی ہے، یہ بھی مولانا کی ایک اہم خدمت ہے جو آپ نے مسلمانوں کے لئے انجام دی۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند اور مسلمانان عالم کی طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ آمین اور ان کے اخلاف میں ان کے جانشین پیدا فرمائے جو کہ ان کے کام کو آگے بڑھائیں اور ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کے تاج محل تعمیر کریں۔ واللہ ھو الموفق۔

اسلام کامل

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح صرف چند دعاؤں اور عبادتوں تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے، دین و دنیا کی راہبانہ تفریق کی اسلامی تعلیم میں کہیں گنجائش نہیں، ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیم گاہوں کا نصاب و لائحہ عمل ترتیب دیتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہے تاکہ آئندہ کوئی بنیادی غلطی نہ ہونے پائے۔ اور ایسے تعلیمی مرکز قائم ہو سکیں جو دین و دنیا کی جامعیت کے نمونے ہوں، آج جو فتنے اٹھ رہے ہیں ان کا تدارک اگر ممکن ہے تو صرف اسی وقت جب کہ ہم اس بنیادی سوال کو حل کر لیں اور اس اصول کی روشنی میں اپنے مدارس پر ایک اصلاحی نظر ڈال لیں۔

(مولانا عبد السلام قدوائی ندوی مرحوم)

---

[1] ہماری بادشاہی صفحہ ۱۳

قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات

برادر محترم مولانا حاجی عبد السلام صاحب قدوائی مرحوم

از مصطفےٰ علی آسیر لکھنوی (ذاکر نگر۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵)

حیف ہے صد حیف ہے ہم سب سے رخصت ہوگئے — ندوۃ العلماء کے عالم با عمل عبد السلام
سنّت نبوی پہ عامل، متقی پرہیزگار — عابد پُر شوق زاہد بے ریا شیریں کلام
پاک صورت نیک سیرت پیکر انسانیت — مخلص و ہمدرد سب کے خاصۂ ربّ الانام
زائر حرمین ہونے کا شرف حاصل ہوا — فضل حق سے باطفیل رحمتِ خیر الانام
ذات تھی ان کی اہم دینی اداروں کے لیے — غم زدہ کیسے نہ ہوں فرقت میں علمائے کرام
تیسویں تاریخ ہجری عیسوی چوبیس اگست — جمعہ کا دن حامل اکرام رب ماہِ صیام
دو پہر قبل از زوال آیا فرشتہ موت کا — چل بسے مقبول خاص و عام مشہور الانام
فجر تک قائم رہے ان کے حواس و ہوش سب — ہوگئے بے ہوش پھر پی کر مئے عرفاں کا جام
نزع کا عالم ہوا طاری تو ایسے حال میں — نور تھا چہرے پہ لب پر کلمۂ حق لا کلام
آرزو تھی ان کی یہ مٹی وطن کی ہو نصیب — خوش نصیبی تھی کہ اپنے باغ میں پایا مقام
دل شکستہ مصطفیٰ کی رات دن ہے یہ دعا — رحمت رب با ابو بھائی کی لحد پر ہو دوام

مصرع تاریخ آیا "لوح زیبا" کو لیئے

۶۴

جنت الفردوس میں جنت نشیں عبد السلام

۱۹۱۵ + ۶۴ = ۱۹۷۹ء

دیگر

اٹھی ہے دنیا سے کون ہستی بچشم گریاں ہر آدمی ہے
ہے کس کا ماتم چہار جانب یہ تھولیڈی میں شور کیسا

ندا یہ آئی وہ مردِ مومن وہ آشنائے رموزِ ہستی

شریعتِ احمدی پہ عامل خدا تعالےٰ کا خاص بندا

رہا جو بندوں کے ساتھ شامل رہا جو اپنے خدا سے واصل

وہ سوئے ملکِ عدم گیا ہے ملا ہے اس کو مقام اعلا

ہیں رنج و غم سے نڈھال سارے رہے جو اس کے عزیز ہر دم

سبھی کو حیرت سبھی پریشاں کیا ہے اس نے سفر کہاں کا

مکینِ دنیا سنیں یہ دل سے برائے تاریخ سالِ رحلت

صدائے رضواں یہ آ رہی ہے سلام باغ جناں میں پہنچا

مولانا قدوائی کے حادثۂ انتقال پر

عامر قدوائی

اب کے گھٹا کچھ اور ہی گھنگھور چھا گئی
بارش تمام شہر کی رنگت اڑا گئی
آنگن کی ساری دھوپ مرے سر پہ آ گئی
ایسی ہوا چلی ہے کہ دیوار ڈھا گئی
بستی کے سارے لوگ ابھی تک ہیں اشکبار
آندھی جو ایک بوڑھے شجر کو گرا گئی
سائے کی شفقتوں سے بھی محروم ہو گئے
جس چھت کے نیچے بیٹھے تھے وہ آج ڈھا گئی
اب تک فضا ہے درد کی چیخوں سے ہولناک
آخر اجل یہ کون سا منظر دکھا گئی
اب ہم کہاں سے لائیں گے چہرے کی تازگی
ہم کو تو اور دھوپ غموں کی جلا گئی
دیکھا جو اب کی بار اُسے ہم نے گاؤں میں
عامر کی آنکھ دیکھتے ہی ڈبڈبا گئی

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم

ضیاء الرحمٰن اعظمی

وہ عبدالسلام، آہ وہ مردِ کامل
وہ بالغ نظر، سالکِ راہ منزل

وہ اک عالمِ دیں، چراغِ ہدایت
وہ پروانۂ شمعِ روئے رسالتؐ

خدامست تھا وہ، خود آگاہ تھا وہ
حقیقت میں دل کا شہنشاہ تھا وہ

شرافت کا ماہِ مبیں تھا وہ گویا
محبت کا چرخِ بریں تھا وہ گویا

اسے لالہ و یاسمن کیوں نہ کہئے
بہاروں کا رنگیں چمن کیوں نہ کہئے

نگاہوں میں اک دلنوازی بھری تھی
حرم کی طرح پاک بازی بھری تھی

تھی سیرت بڑی باصفا اللہ اللہ
تھا وہ کس قدر بے ریا اللہ اللہ

ہمیں شانِ مومن بتانے کی خاطر
حقیقت سے پردہ اٹھانے کی خاطر

روایاتِ ناقص مٹاتا رہا وہ
ستاروں کی محفل سجاتا رہا وہ

ہمیں عشق کا پھر وہی راز بخشا
وہی سوز بخشا، وہی ساز بخشا

جگر میں وہی تیر پھر سے چبھویا
دلوں میں تمنا کے پھر بیج بویا

زباں کی روانی نہ دیکھی تھی پہلے
وہ جادو بیانی نہ دیکھی تھی پہلے

بڑا پرکشش اس کا طرزِ سخن تھا
نہاں سادگی میں بھی اک بانکپن تھا

کھری، پُروقار، اور بلند اس کی باتیں
تھیں سارے جہاں کو پسند اس کی باتیں

نہ بھولے گی اس کی زباں ہم کو برسوں
نہ بھولے گا وہ مہرباں ہم کو برسوں

وہ روشن ستارہ چمکتا رہے گا
نگاہوں میں ہر دم دمکتا رہے گا

تاثرات

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی ملک کے ممتاز و مشہور اہل فکر و نظر میں تھے، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاذ رہے اور اپنے طلبہ میں بہت محبوب و مقبول، ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا، اور نہ جانے کتنے لوگ اس سے مستفید ہوئے۔ رسالہ تحریک کی ادارت میں شریک رہے۔ الندوہ کی ادارت میں شریک رہے، جامعہ ملیہ میں استاذ اور ناظم دینیات رہے، ندوہ کے معتمد تعلیم اور اسلام اور عصر جدید سوسائٹی کے ممبر رہے اور اخیر میں دارالمصنفین میں مسند شبلی و سلیمان تک پہنچے، اس طویل زندگی اور متنوع سرگرمیوں میں ہندوستان کے ہر حلقے کے ممتاز اہل دانش و بینش کے ساتھ تعلقات رہے۔ اور ان کے انتقال کے موقع پر ملک کے بے شمار لوگوں نے اپنے رنج و غم اور ان کی ذات و خدمات کے بارہ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا، اس طرح کے تعزیتی خطوط کئی جگہ بٹ گئے، ایک بڑا حصہ ان کے صاحبزادوں اور خاندانی عزیزوں کے نام کیا جو ہمیں نہیں مل سکا۔ کچھ خطوط حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور کچھ مکرمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب (دارالمصنفین) کے نام آئے۔ ہمیں جو خطوط مل سکے، ان کے اقتباسات یہاں دیئے جا رہے ہیں، ان میں اکثر سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے نام پر اور کچھ حضرت مولانا علی میاں کے نام۔ (مرتب)

میں کن لفظوں میں آپ سے تعزیت کروں کہ خود ہی تعزیت کا مستحق ہوں، دارالعلوم اور دارالمصنفین دونوں بلکہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کا پورا حلقۂ عقیدت متاثر و قابلِ تعزیت ہے، اور کیا عرض کروں۔

تن ہمہ داغ داغ شد　　پنبہ کجا کجا نہم

ابوالحسن علی ندوی

صباح الدین عبدالرحمٰن کے نام مکتوب

مولوی صاحب میں بہت سی خوبیاں تھیں، عالم، سمجھ دار، بااخلاق، منکسر مزاج، متواضع بزرگ تھے، آپ کو مولوی صاحب کے اعظم گڑھ آجانے سے تقویت تھی، آپ کے پاکستان کے طویل قیام کے دوران میں دارالمصنفین کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے رہے کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، جگہ خالی ہو گئی، جانشین ملنا آسان نہیں۔

عبیدالرحمٰن شروانی

(بذریعہ تار) مولانا عبدالسلام قدوائی کی وفات سے انتہائی مغموم اور رنجیدہ ہوں۔

محمد عمران خاں ندوی

بھوپال

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی مرحوم کی اچانک رحلت کی خبر سُن کر قلب پر چوٹ لگی پہلے سے ان کی علالت کی خبر نہیں تھی، اور شاید علیل رہے بھی نہیں، افسوس دارالمصنفین ایک فاضل مخلص اور بے لوث عالم دین اور بہت اچھے انشار پرداز سے محروم ہو گیا، مرحوم غیر معمولی خصوصیات اور کمالات کے امین تھے، پیکر اخلاق وانکسار، مجسم تواضع، ذہنی اعتبار سے نہایت متوازن، اپنے مسلک میں مضبوط اور دوسرے مسلکوں کے لئے کشادہ دل، یہ ہمارے اندازوں کی غلطی تھی اور یہ سمجھ رہے تھے کہ مرحوم ابھی بہت دنوں تک علم وادب کی خدمت کرتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، ازراہِ کرم تعزیت قبول فرمائیں۔

(مفتی) عتیق الرحمٰن عثمانی

صدر مسلم مجلس مشاورت

برادرم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی کی وفات کی خبر مجھ کو عید کے دن ملی، دل کو بڑا صدمہ ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، اور جملہ متعلقین اور احباب کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

مرحوم سے اس دن آپ کے ساتھ ملاقات ہوئی تو ماشاء اللہ صحت مند تھے، ان کا خلوص و محبت سے ملنا ابھی تک یاد ہے، کسے معلوم تھا کہ اتنی جلد وہ ہم سے جدا ہو جائیں گے، اور اس دن کی ان سے ہماری آخری ملاقات ہو گی۔

ایک دن تو ہر ایک کو جانا ہے۔ آج وہ تو کل ہماری باری ہے۔ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو کامیابی کے ساتھ مراحلِ حیات طے کرکے اپنی ابدی جائے قرار کے لئے روانہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو مرحوم سے حوض کوثر پر اُس دن ملادے جس دن ہر مومن بندہ اپنے بچھڑے ہوؤں کو پالے گا۔ اور پھر جدائی کا کوئی سوال نہ ہوگا۔

محمد یوسف

امیر جماعت اسلامی ہند

دارالعلوم ندوہ کے لئے یہ تیسرا زبردست حادثہ ہے، اور دارالمصنفین کے لئے بھی۔
میں آپ کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے، اور ان کے گھر کے لوگوں کو اور ان کے احباب و مخلصین کو صبر و سکون عطا کرے، آمین!

محمد امان اللہ قادری

پھلواروی

مشیت الٰہی یہی تھی اور رمضان مبارک کی رحمت و مغفرت اور رستگاری جہنم سے نوازنے کے لیے ان کو رمضان مبارک کے آخری دن جمعہ کے روز بلا لیا گیا، اور وہ رحمت و مغفرت کی چادروں میں ڈھانک لئے گئے، سچ ہے اور کہنے والے نے بالکل سچ کہا ہے۔

رحمت حق بہانہ می جوید رحمتِ حق بہانہ می جوید

مولانا بڑی مرنجاں مرنج طبیعت کے آدمی تھے، اور خاموشی کے ساتھ بہت مستحکم اور ٹھوس کام کرتے تھے، میری ملاقات اُن سے اس وقت سے تھی جب وہ دہلی جامعہ ملیہ اور تعلیمات اسلام وغیرہ میں تھے، اور بڑی بے تکلفانہ گفتگو مجھ سے فرماتے تھے، ادھر جب بھی ندوہ یا دارالمصنفین میں ملاقات ہوتی تو بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، اور محبت و شفقت سے باتیں کرتے، شاہ معین الدین صاحب مرحوم اور میرے یہاں کے شاہ عزالدین صاحبؒ اور مولانا قدوائی ایک ہی دور کے ندوی تھے، افسوس کہ ان میں سے کوئی نہ رہا۔

ع:۔ افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

عون احمد۔ پھلواری شریف

میں رمضان بعد ہی سے آپ کے یہاں آنے کا ارادہ کر رہا تھا اور قدرۃً اس خیال سے خوشی ہو رہی تھی کہ اس موقع پر مولانا عبد السلام صاحب سے بھی ملاقات ہوگی اور ان سے ہم کلام ہونے کی مسرت حاصل ہوگی، لیکن کل شام "دعوت" سے یہ معلوم کر کے کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

افسوس ہے کہ ہمارے لائق افراد یکے بعد دیگرے اٹھتے جا رہے ہیں، اور بظاہر ان کی جگہ لینے والے نظر نہیں آرہے ہیں، اللہ تعالیٰ امت مسلمہ پر رحم فرمائے۔

ندوہ کے لئے تو خاص طور سے ایک سنگین حادثہ ہے۔ ابھی دو زخم تازہ ہی تھے کہ تیسرے حادثہ سے بھی اسے دوچار ہونا پڑا۔

(مولانا) ابو اللیث ندوی

لیجئے ہمارے اور آپ کے مولانا بھی آپ کو تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، اور آپ کے لئے نئی آزمائشیں آکھڑی ہوئیں، یہ آپ کا ذاتی غم تو ہے ہی دار المصنفین کے لئے بھی ایک بڑا حادثہ ہے اور چونکہ آپ اور دار المصنفین ایک دوسرے سے الگ نہیں، اس لئے یہ دُہرا اور کاری زخم ہے جو آپ کو لگا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت اور قوت دیں کہ آپ اس غم کو مردانہ وار جھیل لے جائیں۔

مولانا علی میاں صاحب کے لئے بھی ایک بڑا حادثہ ہے، محمد الحسنی مرحوم اور اسحاق جلیس مرحوم کا غم ہی کیا کم تھا کہ تیسرا چرکہ ان کو لگا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کا سایہ ہم لوگوں پر قائم رہے۔

اہل جامعہ بھی مولانا مرحوم کی وفات سے بہت متاثر ہیں، آپ واقف ہیں کہ انھیں جامعہ اور اہل جامعہ سے کتنا گہرا تعلق تھا۔

ضیاء الحسن فاروقی

مرحوم عبدالسلام قدوائی صاحب سے مجھے مدتوں نیاز حاصل رہا، ان پر ندوہ اور جامعہ دونوں کی چھاپ تھی، صحیح معنوں میں عالم باعمل تھے اور اس دور میں جن علماء کو ہم واقعی روشن خیال کہہ سکتے ہیں، ان میں مرحوم کا بھی شمار ہوتا ہے، آپ کے تو رفیق کار تھے اور دارالمصنفین کے کاموں میں آپکے ساتھ تھے، ان کی پُروقار شخصیت اور ان کے چہرے کی مسکراہٹ آنکھوں میں پھر رہی ہے رمضان المبارک میں موت بھی خوش نصیبوں ہی کا حصّہ ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے، ان کے پسماندگان کو اور آپ جیسے ان کے رفقائے کار کو صبر جمیل عطا کرے۔

معین الدین حارث

(صدر انجمن اسلام بمبئی۔ چیرمین حج کمیٹی)

وہ میرے کرم بھی دیرینہ کرم فرما تھے، نہایت منکسرالمزاج اور صاحب کمال تھے، آپ کے دوست اور مددگار تھے، ان کی دائمی جدائی سے آپ کو بھی صدمہ ہوگا، اللہ پاک صبر کی توفیق عنایت فرمائیں اور اجر عظیم بھی عنایت فرمائیں، جو صاحب کمال اٹھ جاتا ہے، اس کی جگہ خالی رہتی ہے، نعم البدل کم ہی ملتا ہے یا ملتا ہی نہیں، اللہ پاک مرحوم کو سایۂ رحمت میں مقام عنایت فرمائیں اور حبیب اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل ان کے مراتب بلند فرمائیں۔ آمین ثم آمین

مولانا اخلاق حسین دہلوی

لال محل۔ بستی حضرت نظام الدین اولیائؒ دہلی ۱۱۰۰۱۳

میرا مرحوم کے ساتھ سترہ سال تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں رفاقت کا تعلق رہا، کبھی ان کی طرف سے کوئی بات ناگواری خاطر کی پیش نہیں آئی، محبت و اخلاص کا پیکر، اور رواداری و اعتدال فکر ونظر کا مجسمہ تھے، انہی اوصاف و محاسن کی وجہ سے جامعہ میں ان کے احباب اور نیازمندوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، ریٹائرمنٹ کے بعد دارالعلوم اور دارالمصنفین دونوں جگہ سہارا دیا اور اپنے بزرگوں کی جانشینی کا حق ادا کیا۔

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

صدر، مرکزی دینی تعلیمی بورڈ۔ دہلی

موصوف اپنے علم وفضل کی پختگی اور اعتدال فکر کے لحاظ سے نمایاں حیثیت کے مالک تھے، انتقال کے لئے بڑا اچھا وقت پایا، یہ ان کے اعمال حسنہ کی مقبولیت کی ایک علامت ہے کہ رمضان کے ماہ رحمت نے انھیں اپنی آغوش میں لیا۔ میں اہل علم حضرات کی جدائی کا صدمہ محسوس کرتا ہوں حق تعالیٰ مولانا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دیں اور آپ سب حضرات کو صبر جمیل اور ان کا نعم البدل عنایت ہو۔

سید محمد ازہر شاہ قیصر
دارالعلوم دیوبند

مولانا جہاں بھی رہے، ندوہ، جامعہ اور بالآخر دارالمصنفین میں، ہر جگہ انتہائی مقبول اور ہر دلعزیز رہے۔ ان کی نیکی، ان کی شرافت، ان کی سادگی، ان کا علم وفضل، ایک ایک کر کے سبھی چیزیں یاد آتی ہیں، جامعہ میں ان کے جمعہ کے خطبے لوگوں کو بہت پسند تھے، لوگوں کو انتظار رہتا تھا کہ مولانا آئیں تو ان کے خطبے سننے کو ملیں، وہ بہت تکلف کرتے۔ فرماتے کہ یہ مستقل امام کا حق ہے، ان ہی کو نماز پڑھانی چاہیئے اور خطبہ دینا چاہیئے، مگر جب خود امام صاحب اصرار کرتے تو وہ مجبور ہوجاتے، افسوس کہ ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ کے فاضل اور دارالمصنفین کے رفیق سے ہم لوگ محروم ہوگئے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو ان کی نیک صفات اور مخلصانہ خدمات کے عوض میں اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین

عبداللطیف اعظمی

اس واقعہ کا آنجناب پر جو اثر ہوا ہوگا اور مرحوم کے انتقال سے دارالمصنفین میں جو خلاء پیدا ہوگیا ہے، اس کا بخوبی اندازہ ہے مگر مشیت ایزدی میں بجز صبر چارہ کار ہی کیا ہے، اس لئے خود صبر وضبط سے کام لے کر دوسرے رفقاء کو بھی تلقین صبر کیجئے۔ یقیناً مرحوم کے انتقال سے جو علمی خلاء پیدا ہوگیا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے اور آپ کو ان کی وجہ سے جو تقویت و سہارا تھا اس کا بھی نعم البدل دشوار ہے ازراہ کرم جملہ رفقائے دارالمصنفین کو میرے کلمات تعزیت پہنچا کر تلقین صبر فرمادیں اور دعاء فرمائیں کہ اللہ پاک مرحوم کی تربت کو نور سے معمور فرما کر انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ میں بھی آج اپنے ایک شفیق استاد کی پدرانہ محبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔

اقبال انصاری

مولانا عبدالسلام قدوائیؒ مرحوم کے انتقال کی خبر سنکر مجھے بے حد صدمہ اور رنج ہوا، مولانا سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء میں ہوئی، جب میں نے لائبریری میں ملازمت حاصل کی جس لطف و مروت اور خوش خلقی سے مولانا مرحوم نے مجھ سے گفتگو کی وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس کے بعد جب تک مولانا یہاں رہے اکثر و بیشتر ملاقات کے مواقع ملتے رہے، ان کے جیسا عالم با عمل کم ہوتا ہے، مرحوم مجھ پر بے حد کرم فرما تھے۔

شہاب الدین انصاری

لائبریرین ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

مولانا عبدالسلام قدوائیؒ کی وفات کی اچانک خبر سن کر بے حد صدمہ ہوا، خداوند تعالیٰ ان کی یقیناً مغفرت فرمائے گا، اس درجہ نیک، مخلص، اور صالح دل و دماغ کا مالک انسان مشکل ہی سے مل سکے گا، ایسے ہی عالم کی موت عالم کی موت ہوتی ہے۔

عتیق صدیقی

جامعہ نگر دہلی

مولانا مرحوم ندوہ کے قدیم فضلاء میں سے تھے، پوری زندگی دینی اور علمی کاموں میں بسر کی، ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کی کچھ دنوں اخبار خلافت بمبئی میں رہے، پھر ندوہ میں مدرس ہوئے اور لکھنؤ میں ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کرکے اس کی طرف سے تعمیر کے نام سے ایک پرچہ نکالا۔ آخر میں جامعہ ملیہ میں دینیات کے استاذ ہوئے، اور کافی مدت وہاں گزاری۔ ۱۹۷۵ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ آئے اور نہایت شوق و ذوق اور انشراح کے ساتھ یہاں کے علمی کاموں میں شریک رہے۔ اخلاق، مروت، شرافت خوردہ نوازی، بے تکلفی، مجلسی آداب غرض کہ ہر خوبی کے جامع بزرگ تھے، دوسروں کی طرح راقم سے بھی اسی خلوص و محبت سے ملتے تھے، بلکہ بعض اوقات غریب خانہ پر بھی تشریف لائے، وہ بڑے تھے مگر کسی پر اپنی بڑائی ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ ہر موضوع پر بے تکلف گفتگو کیا کرتے تھے، باوجودیکہ ان کا انداز گفتگو معصومانہ تھا۔ مخاطب کو متاثر کر لیتے تھے غرض کہ مختلف اوصاف

کا مجموعہ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

قاضی اطہر مبارکپوری

ماہنامہ البلاغ، بمبئی

یہ معلوم ہو کر اہل علم کو صدمہ عظیم ہوا کہ ملک کے نامور عالم دین مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی سابق استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور حال معتمد دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ کو دفعتاً دماغ پر فالج پڑنے سے انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، مولانا مرحوم اپنی جماعت میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ نے بہت ساری خوبیوں سے نوازا تھا، دعا ہے، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اور متعلقین اور احباب کو صبر جمیل عطا کرے، افسوس ہے پرانی بساط سمٹتی جارہی ہے اور جانے والے کا کوئی صحیح معنی میں بدل پیدا نہیں ہوتا جو اس کی خالی جگہ کو پُر کر سکے، موصوف جہاں تک معلوم ہو سکا ہے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیمات بھی تھے، اس لئے یہ حادثہ ندوہ کے حلقہ میں خصوصی طور پر بہت ہی غم انگیز ثابت ہوگا۔

ظفر صدیقی

ماہنامہ بُرہان، دہلی

تعمیر حیات

کی

خصوصی اشاعت

بیادگار

مولانا محمد الحسنیؒ

چند اہم اہل قلم

مولانا ابوالحسن علی ندوی
مولانا محمد منظور نعمانی
مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ
مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل
مولانا محمد ثانی حسنی
ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی
مولانا محمد رابع حسنی ندوی
مولانا عبدالماجد ندوی
مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
مولانا واضح رشید ندوی
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
عبدالکریم پاریکھ

نشان خط مولانا محمد الحسنی مرحوم

بسمہٖ

مخدوم گرامی زید مجدکم راجیاً رحمۃ والطافہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ امید ہے کہ جناب والا بحمد للہ
بخیر و صحت ہوں اور تمام متعلقات و اہل بخیر ہوں گے۔ عرصہ دراز سے کوئی عریضہ خدمت
بابرکت میں ارسال نہ کر سکا جس کا معافی خواستگار ہوں۔ آپ دعا فرماتے ہوں گے۔ الحمد للہ حضرت علی
میاں کی اور طبیعت کو اطمینان رہا۔ دو ایک روز جو خدمت میں گزرے اس کا خدا کا شکر
ہے بڑا فائدہ محسوس ہوا۔ یہ خیال رہا کہ کتاب کا کوئی مرحلہ طے ہو جائے تو اطلاع
دی جائے لیکن الحمد للہ کافی تاخیر ہوئی۔ کچھ روز ہوئے نمونے کے طور پر ایک کاپی صفحہ
سامنے آیا، لیکن اندازہ ہوا کہ زیادہ تاخیر کا اندیشہ ہے۔ اسلئے رائے یہ
ہوئی کہ دہلی بھیجا جائے۔ وہاں بھی ہم لوگوں کا کام ہوتا ہے اور جلدی ہوتا ہے۔ امید ہے
دیوان کا تصحیح شدہ نسخہ دہلی روانہ ہو سکا۔
کہ انشاء اللہ چند روز کے اندر کسی قدر کتابت ہو جائے تو اسکی تصحیح آپ سے کر کے جناب والا کی خدمت میں ارسال کیا جا سکے۔

خدا کرے جلدی کام ہو اور اچھا ہو۔ اور میں اپنی اخروی نفسی شکل
جناب کی توجہ اور دعاؤں کا سب سے زیادہ محتاج ہوں۔ اپنے کو دیکھتا ہوں اور خوف
کا محروم ایسا ہوں اور الحمد للہ اسکا اثر پاتا ہوں۔

کی شفقتوں اور التفات کو تو اب محسوس کرتا ہے کہ

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

اس عاجز کی ذات عالی سے قوی امید ہے کہ ان توجہات عالیہ کا خاطر خواہ اثر

اور ثمرہ ظاہر ہوگا کہ

مستحق کرامت گناہگارانند

یہاں سب بھائی، بزرگ اور اہل خانہ اور بچے مؤدبانہ سلام عرض

کرتے ہیں اور امیدوار عنایات و دعا ہیں

خادم

محمد حسنی

۱۰ رجب ۹۹ھ

۷ جون ۷۹ء

برادرم سید محمد واضح تو پہلے ہی سے اور خاص طور پر

سلام عرض کر رہے ہیں اور دعاؤں کی درخواست

وہاں سب حضرات بالخصوص مخدومی مولوی شفیق صاحب، کامل

مولانا محمد ارشاد صاحب، عزیز مجید اور مولانا عمار زاہد

مصلح الدین صاحب، برادرم نواز کی خدمت میں سلام

عرض ہے۔

محمد الحسنی

حیات و خدمات ایک نظر میں

۱۹۳۵ء (۱۵ اکتوبر۔ ۷ا رجب ۱۳۵۴ھ)۔ پیدائش

۱۹۴۱ء (اگست)۔ بذریعہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رسم بسم اللہ ادا ہوئی۔

۱۹۵۰ء ——— پہلا عربی مضمون (حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی تقریر کا ترجمہ، بین الصورۃ والحقیقۃ۔

۱۹۵۵ء ——— مولانا سعید الرحمٰن اعظمی اور سید محمد اجتبا ندوی کے ساتھ البعث الاسلامی جاری کیا جسے ۱۹۶۰ء میں ندوہ نے لے لیا۔

۱۹۶۰ء۔ (فروری، شعبان ۱۳۷۹ھ) "جمعیۃ الرابطۃ الاسلامیۃ" قائم کی۔

۱۹۶۳ء۔ (۱۰ نومبر) تعمیر حیات جاری کیا

۱۹۶۴ء ——— مسلم مجلس مشاورت کے وفد کے ساتھ گجرات و احمد آباد وغیرہ کا دورہ کیا۔

۱۹۶۶ء ——— حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کے ساتھ پہلی دفعہ سفر حجاز پر گئے۔

۱۹۷۲ء ——— الندوۃ العالمیۃ للشباب کی دعوت پر دوسری بار حجاز گئے۔

۱۹۷۴ء ——— جامعہ اسلامیہ کے اجلاس شوریٰ کے موقعہ پر تیسری بار حجاز گئے۔

۱۹۷۶ء ——— پہلی عربی تصنیف "الاسلام الممتحن" قاہرہ سے شائع ہوئی۔

۱۹۷۸ء (جولائی)۔ پہلی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لئے پاکستان کا دورہ کیا۔

۱۹۷۹ء (۱۳ جون)۔ سفر آخرت پر روانہ ہوئے اور تکیہ کلاں رائے بریلی کے خاندانی قبرستان میں محوِ خواب ہوئے۔

اہم تصنیفات: (عربی میں): الاسلام الممتحن۔ مصر تتنفس۔ الیٰ القیادۃ العالمیۃ۔

(اردو میں): تذکرہ شاہ علم اللہ۔ سیرت مولانا محمد علی مونگیری۔ روداد چمن

ان کے علاوہ متعدد اردو کتابوں کے ترجمے عربی میں اور عربی کے اردو میں کئے۔

محمد میاں مرحوم

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

جون ۱۹۷۹ء کی ۱۱ یا ۱۲ تاریخ تھی اور میں بمبئی میں تھا، رات کو میں نے خواب دیکھا کہ لکھنؤ میں محمد علی لین والا ہمارا پرانا مکان ہے، بھائی صاحب مرحوم (ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء) کا زمانہ ہے، اور گھر کا وہی نقشہ ہے جو ان کی زندگی میں تھا، وہ خود زندہ سلامت ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا انتقال ہو گیا ہے، میں عالم برزخ سے اپنے اس پرانے مسکن میں جس میں بچپن اور جوانی گزری گھر والوں سے ملنے آیا ہوں، مجھے پھر وہیں واپس جانا ہے، مجھے اس کا رنج بھی ہے کہ میں جلد ان عزیزوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا، اور تھوڑا سا سہم بھی کہ مجھے قبر میں جانا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کا افسوس بھی کر رہا ہوں کہ میری عمر بہت کم ہوئی، خواب ہی میں مجھے اس کا شعور ہے کہ بھائی صاحب نے عمر طبعی پائی[1] اور میں اس عمر کو نہیں پہونچا، اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی، میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں، خاص طور سے معنی خیز جن میں آنے والے واقعات کی طرف اشارہ یا کسی امر کا انکشاف ہو، میں دیر تک سوچتا رہا کہ اس خواب کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے؟

غالباً اگلے ہی دن شب میں ایک دوست کے یہاں سے دیر میں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے ٹیلیفون سے اطلاع دی ہے کہ میرے بھتیجے محمد میاں اچانک علیل ہو گئے، ان کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے، میں جتنی جلد ہو سکے لکھنؤ پہنچ جاؤں، ہونے والی بات، یہ سنتے ہی دل پر غیر معمولی اثر ہوا جو عزیزوں کی علالت کی عام اطلاع سے نہیں ہوا کرتا، وسط مئی میں جب میں "پیام انسانیت" کے کام کے لیے کرناٹک کے دورہ پر روانہ ہوا تھا تو محمد میاں اچھے خاصے اور چاق چوبند تھے، وہ بہت کم بیمار ہوتے تھے، اور کبھی ایسے بیمار بھی نہیں ہوئے تھے جس سے آئندہ کے لیے فکر و تردد پیدا ہو، لیکن سنتے ہی ماتھا ٹھنکا گیا کہ اللہ خیر کرے، ایسے غیر معمولی طریقہ پر اطلاع دینے کا اہتمام کیا گیا ہے،

---

[1] ان کا انتقال ہجری حساب سے ۶۹ سال کی عمر میں ہوا۔

طبیعت پر فکر و تردد سے زیادہ حزن و یاس کی ایک کیفیت طاری ہو گئی، خواب بھی یاد آیا، دنیا میں اگر (اپنی ساری خامیوں اور کمزوریوں کے احساس کے ساتھ) میرا کوئی مثیل بلکہ "صورت مثالی" ہو سکتا ہے، تو محمد میاں ہی ہو سکتے ہیں، وہ جب بچے تھے، تو ان کی والدہ مرحومہ دعا کرتی تھیں کہ وہ اپنے چچا کے بالکل مثیل ہوں، اور اُردو کے زنانہ محاورہ کے مطابق "اپنے چچا کو پڑیں" اور انہی کا نمونہ ہوں، اللہ نے جن کو دو پیدا کیا ہے وہ دو ہی رہتے ہیں، پورے طور پر ایک کبھی نہیں ہو سکتے، لیکن دو میں جو زیادہ سے زیادہ وحدت، مماثلت اور مشابہت ہو سکتی ہے، وہ ہم دونوں چچا بھتیجے میں تھی، اس کا گواہ خاندان کا ایک ایک فرد ہے، اس لیے دل کو اور دھڑکا لگ گیا، کہ دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے؟ کہیں میں نے اپنی شکل میں ان کی مفارقت کو نہ دیکھا ہو۔

واقعہ اسی شب میں پیش آ چکا تھا، لیکن میرے رفیق سفر اور معاون مولوی معین اللہ ندوی (نائب ناظم ندوۃ العلماء) نے ٹیلیفون پر یہ خبر سُن کر بھی مجھ سے چھپایا کہ شاید میں سفر کے قابل بھی نہ رہ سکوں اور تھوڑی سی جو امید ان کا آخری دیدار کر لینے اور ان کی آخری خدمت میں شریک ہونے کی ہے وہ بھی جاتی رہے گی، میرے مزاج و جذبات کے لحاظ سے یہ بات بعید از قیاس بھی نہ تھی، میرے مخلص و محسن میزبان محمد بھائی (مالک بمبئی، آندھرا ٹرانسپورٹ) نے جن کی کوٹھی میں میں ٹھہرا ہوا تھا، اور ان کے تمام گھر والوں نے علم کے باوجود مجھے اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔

ٹیلیفون کا پیغام پہونچنے کے بعد ہی ہم لوگ ہوائی اڈہ روانہ ہو گئے کہ پہلی پرواز سے دہلی اور صبح کی پرواز سے لکھنؤ پہنچ جائیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ محرومی نہ ہوتی جو قسمت میں لکھی تھی، اور جو ان کے والد اور اپنے باپ کی طرح بھائی کے معاملہ میں اس سے پہلے (مئی ۱۹۶۱ء میں) پیش آ چکی تھی اور اس کا داغ زندگی بھر رہے گا، مولوی معین اللہ صاحب نے یہ بھی انتظام کر لیا تھا کہ دہلی میں بھی یہ بات مجھ سے راز رہے، اور لکھنؤ پہنچ کر ہی مجھے اس روح فرسا واقعہ کا علم ہو، پھر اللہ ہی حافظ و ناصر ہے، وہی ڈوبتوں کو سہارا دیتا ہے وہی ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے، قسمت کی نیرنگی کہ بڑی کوشش اور اس کے باوجود کہ ہوائی اڈہ کے عملہ کے بعض لوگوں سے ہمارے میزبان کے تعلقات بھی تھے، نصف شب میں روانہ ہونے والے جہاز میں کسی طرح جگہ نہ مل سکی، اور مجبوراً اگلے دن ۱۴ جون کو دن کے جہاز سے دہلی پہنچنا ہوا، ہوائی اڈہ پر جامعہ ملیہ کے جو عزیز ملنے آئے، ان کے مغموم چہرے غمازی کرتے تھے کہ واقعہ پیش آ چکا ہے، لیکن نہ انھوں نے زبان

سے کچھ کہا، نہ مجھے پوچھنے کی ہمت ہوئی، نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں ۲،۲ گھنٹے ٹھہرنا ہوا، وہاں بھی زبانیں اور لبوں پر مہر لگی رہی، رات کی گاڑی سے لکھنؤ روانگی ہوئی، کانپور کے اسٹیشن پر بھی بعض عزیز ملے لیکن وہاں بھی یہ راز افشا نہ ہوا۔ گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہنچی تو ایک بڑا مجمع پلیٹ فارم پر موجود تھا، سوگوار اور غم میں ڈوبا ہوا، لیکن زبانیں بند، میں اس غیر معمولی مجمع ہی سے سمجھ گیا کہ اتنے سب دوست اسٹیشن پر کیوں آئے، سفر تو میری زندگی کا معمول بن گیا ہے، اور میں ملک کے باہر بھی نہیں گیا تھا، لیکن زبان بے زبانی کہے دیتی تھی کہ واقعہ پیش آچکا ہے، پلیٹ فارم سے باہر آیا تو رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے گلوگیر اور مرتعش آواز میں واقعہ کی خبر دی، اور میں اسی وقت موٹر سے رائے بریلی روانہ ہوگیا، یہ راستہ جس طرح گزرا اور وہاں جاکر جو کچھ پیش آیا، وہ الفاظ میں ادا کرنے کی چیز نہیں، بس اللہ سے دعا ہے کہ پھر کبھی یہ آزمائش پیش نہ آئے۔

ان سطور کے لکھواتے وقت اچانک وہ دن یاد آگیا، جب اکتوبر ۱۹۳۵ء کی کسی تاریخ کو بمبئی سے (جہاں بھائی صاحب مرحوم ہی نے ڈاکٹر امبیڈکر سے ملنے کے لیے بھیجا تھا) واپسی پر اچانک گھر میں محمد میاں کی ولادت کا مژدہ سننے میں آیا[1] جو میرے پہونچنے سے دو چار دن پہلے کا واقعہ تھا، پانچ بیٹیوں کے بعد اللہ نے بھائی صاحب کو فرزند اور گھر کا چراغ عطا فرمایا تھا، اس پر گھر کے بچہ بچہ اور خاندان کے ایک ایک فرد کو جو خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، پھر وہ وقت آیا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھنؤ کے قیام کے دوران اپنی خواہش اور تقاضائے قلبی سے ۱۵ر ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک ہمارے مکان پر تشریف لائے، بھائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ "محمدؐ کو لاؤ" میں دوڑا ہوا گیا اور ان کو گود میں لے کر آیا، مولانا نے ان کے سر پر دست شفقت پھیرا پھر اگست ۱۹۴۱ء میں جب دوبارہ تشریف آوری ہوئی تو ان کی مکتب نشینی کا وقت آگیا تھا، مولانا ہی نے ان کی بسم اللہ کرائی، کیا عجب ہے کہ ان کی وہبی تحریری صلاحیت میں یہ برکت بھی شامل رہی ہو۔

محمد میاں کی تعلیم کا قصہ بھی عجیب ہے، اگر بیان کرنے والوں پر اعتبار نہ ہو تو اس کا یقین کرنا مشکل ہے ؎

حدیث گرچہ غریب است راویاں ثقہ اند

ان کی تعلیم کا قصہ تفصیل کے ساتھ ان کے بڑے بھائی خواہرزادہ عزیز مولوی سید محمد ثانی حسنی سلمہ بیان

---

[1] ان کی ولادت ۱۷ رجب ۱۳۵۴ھ (۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۵ء) کو ہوئی

کریں گے، کہ ان کا ہر وقت کا ساتھ تھا، مختصر یہ کہ خاندانی دستور کے مطابق قرآن شریف ختم کرنے کے بعد انھوں نے پہلے اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی، عربی پڑھنے کے قابل ہوئے تو بھائی صاحب نے خود ہی انکو پڑھانا شروع کیا، بھائی صاحب نے اگرچہ قدیم طرز کے مطابق عربی کی تعلیم حاصل کی تھی اور ماہر اساتذہ سے درسیات کی تکمیل کی تھی اور ہر فن میں ان کی استعداد نہایت پختہ تھی، لیکن میری اور محمد میاں کی تعلیم کے بارے میں انھوں نے بالکل مجتہدانہ طریقہ اختیار کیا، میری تعلیم کے بارے میں کم لیکن محمد میاں کی تعلیم کے بارے میں زیادہ، وہ اس بات کے قائل تھے اور ایک حد تک داعی اور مبلغ تھے کہ ابتدا میں زبان کی تعلیم صرف و نحو کے قواعد کی مدد کے بغیر دی جائے گویا قیاس کے بجائے استقراء کے اصول پر، اور عربی تعلیم قرآن مجید سے شروع کی جائے، عرصہ تک تو ایک گھر میں رہنے کے باوجود مجھے یہ خبر نہیں ہوئی کہ محمد میاں کیا پڑھ رہے ہیں، یہ زمانہ میری بحرانی تدریسی و تبلیغی مصروفیت کا تھا، اور میں طویل طویل عرصہ تک سفر میں رہتا تھا، بھائی صاحب کی باقاعدہ تعلیم کے علاوہ محمد میاں میں اردو اور عربی کی ہر اس کتاب کے مطالعہ کا ذوق تھا جو ان کے ہاتھ لگ جائے، یہ ذوق ہم لوگوں میں موروثی طور پر لت اور مرض کی حد تک پہونچا ہوا ہے، ان کو عربی میں ابھی شد بد ہی ہوئی تھی کہ انھوں نے ہر چیز کو پڑھنا شروع کر دیا، قدرتی طور پر ان کو زیادہ تر میری عربی تحریریں اور مضامین اور رسائل ملے اور انھوں نے اس کو صرف پڑھا ہی نہیں بلکہ جذب کر لیا، اس بارے میں میرے ساتھ ان کا معاملہ وہی تھا جو میرا اپنے والد صاحب مرحوم کی تصنیفات اور تحریروں کے ساتھ تھا، کہ مجھے بچپن میں انہی کی چیزیں پڑھنے کو ملیں، اور میں نے انہی کی طرز تحریر اور انشاء و ادب کو معیاری و مثالی سمجھا، اسی کی تقلید میں فخر محسوس کیا، اور اسی کا چربہ اتارنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ خط سے خط ملانے کی کوشش بھی کی، اور مجھے اس سے بڑا فائدہ پہونچا، محمد میاں کا میری تحریروں کے ساتھ بھی یہی حال تھا کہ وہ ان کو پڑھتے ہی نہیں تھے، بلکہ پی جاتے تھے، اور اسی کے اسلوب کی تقلید کرتے تھے۔

ابھی مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے عربی کتنی پڑھ لی اور ان کی استعداد کیا ہوئی، کہ ایک روز اچانک جب ان کی عمر ۱۳، ۱۴ سال سے زیادہ کی نہ ہو گی، انھوں نے شرماتے ہوئے مجھ سے اپنے عربی کے ایک مضمون کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، میرے لیے یہ ایک انکشاف تھا کہ وہ عربی میں مضمون لکھنے لگے ہیں۔ میں نے بڑے شبہ و استعجاب کے ساتھ ان کا مضمون دیکھنا شروع کیا، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ عربی میں ان کا قلم چل گیا ہے، اور وہ مضمون نگاری کے قابل ہو گئے ہیں، ۴۹ء میں جب ان کی عمر

۱۴،۱۵اسال سے زیادہ نہ تھی، میں نے لکھنؤ کے ایک تبلیغی اجتماع میں "صورت وحقیقت" کے عنوان سے ایک تقریر کی، اس وقت کے حالات وتاثرات کی وجہ سے یہ تقریر بڑی مؤثر وطاقت ور بن گئی تھی، بعض یادداشتوں اور حافظے کی مدد سے میں نے اس کو اُردو میں خود مرتب کرلیا، اور وہ "صورت وحقیقت" ہی کے عنوان سے چھپ گئی، اسی زمانہ میں مجھے حجاز کا دوسرا سفر درپیش تھا، جس میں مجھے وہاں طویل قیام کرنا تھا، اور وہاں کے علمی ادبی حلقوں میں (دینی وذہنی) تحریک پیدا کرنے کا عزم تھا، اس مقصد کے لیے مجھے ایسے دعوتی لٹریچر کی ضرورت تھی جو وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اہل علم کے حلقوں میں ایک جنبش وتموج پیدا کرسکے، میں نے امتحاناً یہ تقریر محمد میاں کے حوالہ کی کہ وہ اس کا ترجمہ کردیں، خیال تھا کہ میں اس پر محنت کرکے اس کو چھپنے کے قابل بنادوں گا، لیکن جب وہ ترجمہ کرکے لائے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں اصل تقریر کا جوش اور طاقت موجود ہے، اور مجھے اس پر کسی خاص محنت کی ضرورت نہیں، یہ ان کے ترجمہ اور انشاء کا پہلا کامیاب تجربہ تھا، "بین الصورۃ والحقیقۃ" کے نام سے یہ رسالہ عربی ٹائپ میں قیمہ پریس بمبئی میں چھپوا کر جون ۱۹۴۷ء میں اپنے ساتھ لے گیا، میں جتنے دعوتی رسائل اپنے ساتھ لے گیا تھا ان میں یہ رسالہ سب سے زیادہ مؤثر ومقبول ہوا، اور بعض بڑے علماء نے اپنی مجلس میں اس کو خود پڑھ کر سنایا، اس کے بعد سے اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، اور وہ بہت سے عرب ممالک میں بڑے ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

کسی خاص محنت، کسی مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم اور صرف ونحو اور مبادی کا ہفت خواں سر کئے بغیر محمد میاں کو عربی تحریر کا جو ملکہ حاصل ہوگیا، اور وہ بے تکلف بڑے بڑے عرب ادباء اور اہل قلم کی کتابیں اور مضامین پڑھنے لگے، اس کو میں بھائی صاحب کی ایک کرامت ہی سمجھتا ہوں، انھوں نے اپنے کم سن یتیم بھائی، (راقم السطور) کو جس خلوص، دلسوزی اور جانکاہی کے ساتھ عربی زبان وادب اور دینیات کی تعلیم دلائی، اور اس بارے میں اپنے والد ماجد کا منشا پورا کیا، جس طرح ہر فن کے ماہر اساتذہ کا انتخاب کیا اور اس دوربینی اور بلند نگاہی کے ساتھ (جس کا ہندوستان کے حالات اور وقت کے دینی وعلمی مشاغل سے کوئی جوڑ نہ تھا) اس کو عربی زبان میں دعوت وتبلیغ کے کام کے لیے تیار کیا، صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا صلہ اور انعام محمد میاں کی شکل میں عطا فرمایا کہ ان کی ساری لیاقت وصلاحیت کا معاملہ محض وہبی اور خداداد تھا، اور "عَمِلَ قَلِيلاً وأُجِرَ كَثِيرًا" کا مصداق،

ان کے میرے قلم سے قلم ملا دینے کی بات جب قلم کی زبان پر آہی گئی ہے تو یہ لطیفہ سناتا چلوں کہ ایک مرتبہ (غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے) جب "تاریخ دعوت و عزیمت" کی پہلی جلد لکھ رہا تھا اور مرکز دعوت و تبلیغ کچہری روڈ لکھنؤ جہاں میرا قیام تھا، امام غزالی کی "احیاء العلوم" کی ایک طویل عبارت کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھا، اسوقت محمد میاں کہیں سے آنکلے، میں دیر سے ترجمہ میں مصروف تھا، اور مجھے اٹھنے کی ضرورت تھی، میں نے ان سے کہا کہ "یہاں سے تم ترجمہ کرو میں ابھی آتا ہوں" انھوں نے قلم برداشتہ ترجمہ لکھنا شروع کر دیا، میں جب فارغ ہو کر آیا تو وہ خاصہ حصہ لکھ چکے تھے، میں نے اس کے آگے سے لکھنا شروع کر دیا، اس حصہ کو مکمل کرنے کے بعد جب میں نے دیکھا تو مجھے قطعاً یہ پتہ نہیں چلا کہ میں نے کہاں سے شروع کیا تھا، اور انھوں نے کہاں سے شروع کر کے ختم کیا، انھوں نے قلم سے قلم اور پیوند سے پیوند ایسا ملا دیا تھا کہ میں نہ ان کے اور اپنے خط میں، نہ زبان و اسلوب میں امتیاز کر سکا، اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ پوری تحریر میرے ہی قلم کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ان کا ذہنی و ادبی ارتقاء تیزی کے ساتھ جاری رہا، عمر و مطالعہ کے ساتھ اور جو حالات مشرق وسطیٰ میں پیش آرہے تھے، ان کے اثر سے ان کے قلم کی روانی اور اس سے بڑھ کر ان کے قلم کی طاقت اور جوش تحریر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ سچی بات ہے کہ وہ اس میں مجھ سے بازی لے گئے، ان میں فطری طور پر (اور کسی حد تک یہ بات موروثی بھی ہے کہ بھائی صاحب مقرر نہ تھے اور ان کی کم سخنی خاندان اور ــــــ حلقہ میں ضرب المثل ہے) خطابت کا مادہ نہ تھا، خطابت کی یہ طاقت بھی زبان سے قلم ہی کی طرف منتقل ہو گئی اور ان کی عربی تحریر میں خطیبانہ جوش، بے ساختگی اور برجستگی اور آمد و روانی ایسی پیدا ہو گئی جو آتش نوا اور شعلہ بار خطیبوں کا شیوہ اور ان کی تقریروں کا خاصہ ہے۔

اسی زمانہ میں انھوں نے میری بعض عربی تصنیفات کا ترجمہ کیا، دونوں زبانوں پر ان کو یکساں قدرت معلوم ہوتی ہے لیکن خطابت اور جوش کا عنصر ان کی عربی تحریروں میں زیادہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو تحریر میں سلاست و حلاوت ان کو اپنے دادا (مولانا سید عبدالحیؒ) سے ورثہ میں ملی، میری کتاب "الطریق الی المدینہ" کا ترجمہ کاروان مدینہ "الارکان الاربعہ" کا ترجمہ ارکان اربعہ "ربانیہ لا رہبانیہ کا ترجمہ تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک، سب کے آخر میں "السیرۃ النبویہ" کا ترجمہ نبی رحمت، جو انھوں نے بڑے ذوق و شوق اور اہتمام و احترام کے ساتھ کیا، اس کے شاہد عادل ہیں۔

اسی زمانہ میں مشہور نومسلم یہودی النسل جرمن فاضل علامہ محمد اسد کی کتاب "Road to Mecca" کا عربی ترجمہ "الطریق الی مکہ" سامنے آیا، میں اس کتاب سے بہت متاثر ہوا، کتاب نہایت فکر انگیز، خیال افروز بلکہ ایمان افروز تھی، لیکن وہ بڑی بلند پایہ، علمی وادبی زبان میں لکھی گئی تھی، اس میں کثرت سے نفسیات، فلسفہ سیاسیات اور علم الاجتماع کی اصطلاحیں استعمال کی گئی تھیں، مغربی بالخصوص امریکی مذاق کی رعایت سے مصنف نے اپنے تاثرات ومشاہدات اور اپنے فکر ومطالعہ کے نچوڑ کو اپنی زندگی کی ایک داستان کی شکل میں پیش کیا تھا، پھر اس داستان کو پڑھنے والوں کی دلچسپی کے خیال سے توڑ کر کتاب میں پھیلا دیا تھا، اور ان کے مختلف ٹکڑوں کو آگے پیچھے کر دیا تھا، اس میں کسی تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا تھا، میں نے پوری کتاب پڑھ کر اور اس پر محنت کر کے اس کے ٹکڑوں کو تاریخی طور پر مرتب کر دیا، میں اس کتاب کے ترجمہ کو ذہین واعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں خصوصیت کے ساتھ غیر مسلم اہل فکر کے لیے (جو مسلمانوں کی کسی تحریر کو خاطر میں نہیں لاتے اور خاص طور پر دعوتی لٹریچر کو سطحی ہونے کا طعنہ دیتے ہیں) بہت مفید سمجھتا تھا، لیکن مجھے اس بارے میں بڑا شک تھا کہ اس کے عربی ترجمے کو جو مصنف کے زیر نگرانی ہوا ہے، اردو میں کوئی منتقل کرنے میں کامیاب ہو سکے گا، ہندستان میں عربی کی ایسی بلند پایہ، عمیق ودقیق کتابیں (درسی، فقہی وکلامی کتابوں کو مستثنیٰ کر کے) کم ہی پہونچتی ہیں، اور ان کے پڑھنے والے تو خال خال ہی ہیں، میں نے بڑے تردّد کے ساتھ یہ کتاب محمد میاں کو دی، میں نے کہا کہ اس کے ترجمہ کی کوشش کرو، انھوں نے انگریزی میں بھی استعداد پیدا کر لی تھی۔ میں نے کہا انگریزی اصل بھی سامنے رکھو اور جہاں وقت پیش آئے، مخدومی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے مدد لو، انھوں نے کام شروع کر دیا، علمی اصطلاحات کے ترجمہ میں جہاں ان کو دقت پیش آئی، انھوں نے مولانا سے رجوع کیا مولانا نے فلسفہ کے مشہور فاضل ومصنف صاحبزادہ ظفر حسین خاں مصنف "مآل ومشیت" کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا، تھوڑے عرصہ میں انھوں نے ترجمہ مکمل کر دیا، جو "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے چھپا، یہ ترجمہ کسی طرح اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ یہ ایک ایسے نوعمر مترجم کے قلم سے نکلا ہے جس نے نہ کسی عربی مدرسہ میں تعلیم پائی نہ کسی کالج میں، مصنف نے ازراہ کرم ہماری مجلس "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ" کو برصغیر ہندوپاکستان کے لیے اس کی اشاعت کی اجازت دے دی اور اس کے یورپین ناشر سے بھی اجازت دلوا دی۔ اس وقت سے اس برصغیر میں یہی ترجمہ چل رہا ہے، ہندی میں بھی اسی سے ترجمہ کیا گیا ہے، کتاب پڑھنے کے بعد کوئی انصاف پسند قاری ترجمہ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، کہیں سے اس میں

ترجمہ پن کی بو نہیں آتی، معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کے قلم سے براہ راست یہ کتاب اردو میں نکلی ہے، خدا کا شکر ہے کہ یہ ترجمہ ان کے والد ماجد کی زندگی ہی میں شائع ہو گیا، اور انھوں نے اپنے لائق اور ہونہار فرزند کی تحریری قابلیت اور ترجمہ کا کمال دیکھ لیا۔

ان کی اردو تحریر و انشاء اور تصنیف و تالیف کا ذکر شروع ہوا ہے تو اس کو مکمل کرتا چلوں کہ ۱۹۶۲ء میں طبیعت پر اس کا شدید تقاضا ہوا کہ بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی شایان شان سیرت و سوانح ندوۃ العلماء کی طرف سے مرتب کی جائے کہ یہ ایک ایسے ادارے اور جماعت کا اخلاقی و علمی فرض ہے جو ان کا لگایا ہوا قلم ہے، اور جس نے بڑی تعداد میں ایسے اہل قلم پیدا کئے، جنھوں نے سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کا میدان اختیار کیا اور اس میں اپنی کامیابی اور برتری کا نقش قائم کر دیا ہے، بہت سی حیثیتوں سے یہ میرا فرض تھا کہ میرے قلم سے متعدد سوانح عمریاں نکل چکی تھیں، لیکن اس زمانہ میں میری نظر بہت کمزور تھی اور نزول الماء کی وجہ سے میں ایسا تصنیفی کام کرنے سے قاصر تھا جس میں کثرت سے باریک تحریروں کو پڑھنا اور مواد اور حوالے تلاش کرنا ضروری ہے، میری نظر ہندوستان کے بعض اچھے اہل قلم پر پڑی جن کو دینی شخصیتوں کی سوانح نگاری سے خاص مذاق اور شغف تھا، میں نے ان سے خط و کتابت بھی کی، لیکن کام شروع نہ ہو سکا، پھر اس غرض سے دارالعلوم کی بالائی عمارت میں اس سوانح کی ترتیب و تحریر کے لیے باقاعدہ دفتر قائم کیا، دارالعلوم کے ایک اہل قلم استاذ کی خدمات بھی اس کے لیے لیں، اور کتاب کا مواد، ماخذ اور ضروری کتابیں جمع کر دیں، لیکن کام میں کچھ پیش رفت نہیں ہوئی، اسی دوران ایک روز اچانک معلوم ہوا کہ محمد میاں (جن کا "البعث الاسلامی" کا دفتر اسی کمرہ میں تھا) بغیر کسی کو بتلائے اپنے شوق سے یہ کام شروع کر چکے ہیں، اور ان کی بڑی تمنا ہے کہ یہ کام ان کے ہاتھوں انجام پائے، یہ غالباً اس تعلق کا نتیجہ تھا جو ان کے دادا مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب اور حضرت مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری کے درمیان رہ چکا ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس کام کو خالص اپنی سعادت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں، اور ان تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں جو اہل اللہ اور برگزیدہ اصحاب کی سوانح اور سیرت کی تصنیف و ترتیب میں ملحوظ رکھنے چاہیئے۔

تھوڑے عرصہ میں انھوں نے سوانح کا مسودہ میرے حوالہ کیا کہ میں اس پر اصلاحی نظر ڈال لوں کتاب میرے تصور و توقع سے بلند نکلی، مجھے آج بھی اس میں بہت شبہ ہے کہ میں اس کو اتنے اچھے طریقہ پر لکھ سکتا

اور اس کے حقوق سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا؟ کتاب میں ان کے قلم کی پختگی کے ساتھ ان کے ذہنی بلوغ اور پختگی کا بھی اظہار ہوتا ہے، اور کسی طرح یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ایک ایسے مصنف کے قلم سے نکلی ہے جس کی عمر صرف ۲۵ سال ہے، اور جس نے کسی تصنیفی ادارہ یا کسی استاذ سے تصنیف وتالیف کی تربیت نہیں حاصل کی، کتاب میں متانت تحریر، توازن اور اسی کے ساتھ ادبیت وتاثیر ہے، اور وہ سیر وسوانح کی ان شرائط کو پورا کرتی ہے جو ایک جامع کمالات ہستی اور ایک عہد آفریں تحریک کے بانی کی سوانح کے لئے ضروری ہیں۔

۳۱؍اکتوبر، ۱، ۲، ۳؍نومبر ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن دار العلوم ندوۃ العلماء کے وسیع احاطہ میں منعقد ہوا، شرکائے اجلاس کے مرتبہ ومقام، موقر عرب وفود کی کثرت، عرب ممالک کی سربرآوردہ علمی ودینی شخصیتوں کی موجودگی، شیخ الازہر علامہ ڈاکٹر عبد الحلیم محمود صدر اجلاس کی دلآویز شخصیت اور ان کی اقتدار میں جمعہ کی نماز کی ادائیگی (جس میں ایک لاکھ سے زائد کے مجمع کا اندازہ کیا جاتا ہے) اجلاس کے دوران سکینت وبرکت کی ایک روحانی فضا کا احساس، جلسوں کا نظم وضبط، حاضرین کا گہرا تاثر، یہ سب وہ خصوصیات تھیں جو ہندوستان کی تاریخ میں اس سرزمین پر مدت دراز سے دیکھنے میں نہیں آئی ہوں گی، لیکن جو لوگ اس جشن میں شریک نہیں تھے ان کو جشن کا صحیح تاثر دینا اور اسکی قلمی تصویر کھینچنا اگر ناممکن نہیں تو نہایت دشوار معلوم ہوتا تھا۔ ؎

گر مصوّر صورت آں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

لیکن اس جشن کی روداد کا مرتب نہ کرنا، اور جو کچھ دیکھا ہے اس کو دوسروں کو دکھانے کی کوشش نہ کرنا بھی سمجھ میں نہ آیا، آخر میں محمد میاں ہی پر نظر پڑی کہ وہ اس میں عملاً شریک بھی تھے، اور اُن احساسات وجذبات میں بھی اُن کا حصّہ تھا، جو اس اجلاس کے پیچھے کام کر رہے تھے، یہ ان کے گھر کی کہانی تھی، اور ان کے دادا اور باپ کے خون اور پسینے سے سینچے ہوئے پودے کی نکھار اور فصل بہار کی داستان، اور بقول شاعر ؏

داستاں فصل گل خوش می سراید عندلیب!

انھوں نے میرے عربی خطبۂ استقبالیہ کا ترجمہ اردو میں اس طرح کیا تھا کہ بعض جگہ وہ عربی سے بھی بڑھ گیا تھا شعر کی جگہ شعر رکھنا اور ہندوستانی ومقامی ماحول کی رعایت سے الفاظ کا انتخاب، بڑی سبک دستی بلکہ چابکدستی

کا کام تھا، انھوں نے روداد مرتب کی اور گویا الفاظ میں ریکارڈنگ کا کام اس طرح کیا کہ پڑھنے والے کو دل کی دھڑکنیں، ذہن کے اندیشے، انبساط کی کیفیت اور سانس کی آواز بھی سنائی دے، جب یہ روداد "روداد چمن" کے نام سے شائع ہوئی تو مخدومی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی علیل اور بڑی حد تک معذور ہو چکے تھے انھوں نے کتابوں پر مختصر تبصرہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا، لیکن "روداد چمن" انھوں نے خود مطالعہ فرمائی اور اس پر ایسا تبصرہ کیا جو عرصے سے انھوں نے کسی کتاب پر نہیں کیا تھا، ان کا یہ جملہ بڑا معنی خیز اور پوری عبارت کا قائم مقام ہے کہ "مصنف نے پروپیگنڈہ کو لٹریچر بنا دیا ہے" آج بھی کتاب موجود ہے اور اس میں مصنف کے قلم کی مصوری کا کمال دیکھا جا سکتا ہے۔

گھر کے ماحول خاندانی اثرات اور فطرت سلیمہ کی بنا پر محمد میاں کو اہل قلوب اور خاصان خدا سے گہری عقیدت تھی اور وہ تزکیۂ نفس اور تعلق مع اللہ کی اہمیت وضرورت سمجھتے تھے، اسی جذبہ نے اس زمانہ میں جب وہ اپنے علمی وادبی مشاغل میں منہمک تھے، ان کے قلم سے اپنے خاندان کے مورث اعلیٰ، حضرت سید احمد شہید کے جدامجد اور گیارھویں صدی ہجری کے ممتاز ترین متبع سنت وحامیٔ شریعت شیخ، حضرت سید شاہ علم اللہؒ کی سیرت لکھوائی، جو جولائی ۱۹۷۰ء میں "تذکرہ حضرت سید شاہ علم اللہؒ" کے نام سے شائع ہوئی، وہ ان کی مؤثر ترین تحریروں میں ہے، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی ان کے گویا خاندانی شیخ تھے اور اُن کے والد والدہ دونوں ان سے بیعت تھے، مولانا لکھنؤ میں بھائی صاحب کے گھر کے علاوہ کہیں قیام نہیں فرماتے تھے، ڈاکٹر صاحب سے جو تعلق خاص تھا، اس کی بنا پر محمد میاں پر بھی بڑی شفقت کی نظر تھی، مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۵۷ء میں بھائی صاحب مولانا کی عیادت کو دیوبند تشریف لے گئے تو میں اور محمد میاں بھی ہم رکاب تھے، ایک دن مولانا نے مجھ سے پوچھا "محمد میاں کیا کرتے ہیں ؟" میں نے کہا کہ عربی کا رسالہ "البعث الاسلامی" کے ایڈیٹر ہیں، فرمایا کہ "آپ ان کو دارالعلوم کا کوئی سبق نہیں دیتے" میں نے بعض مصالح کا ذکر کیا جو اس کے منافی تھے، فرمایا "کیا آپ لوگوں کے کہنے سننے کا خیال کرتے ہیں ؟" پھر عربی کے دو شعر پڑھ کر جن کا مطلب یہ تھا کہ زبان خلق سے تو کوئی بڑی ہستی بھی محفوظ نہیں رہی خیال ان کو دارالعلوم سے جو قلبی لگاؤ اور اس کے کاموں میں دلسوزی و دلچسپی ہوگی، وہ ہر ایک کو تو نہیں ہو سکتی۔

اس عقیدت کا نتیجہ تھا کہ محمد میاں نے مولانا کی سیرت لکھنے کا ارادہ کیا جو مولانا کے حلقۂ عقیدت بلکہ ہندوستان کی ملت اسلامی کے ذمہ قرض ہے، جس کے لیے انھوں نے قربانیاں دیں، انھوں نے یہ کام شروع بھی کر دیا

تھا، لیکن ان کی اچانک وفات کی وجہ سے وہ مکمل نہ ہو سکا۔

اپنے زمانہ کے شیوخ و صلحا میں ان کو حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے بڑی عقیدت تھی، حضرت کی لکھنؤ کی مجلسوں میں تو وہ شریک ہوتے ہی تھے، رائے پور بھی گئے اور وہاں حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت کی آخری علالت میں ان کو لاہور پہونچا دیا، حضرت کا حادثۂ وفات ان کے سامنے ہی پیش آیا، جنازہ کے ساتھ گئے اور حضرت کے وطن ڈھڈیاں جاکر تدفین میں شرکت کی۔

اپنے مرشد کے علاوہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے بھی عقیدت و محبت تھی، متعدد بار وہ رمضان المبارک میں سہارنپور جاکر ان کی صحبت اور ان کی مبارک مجالس میں شرکت سے مستفید ہوئے، حضرت شیخ کی مشہور کتاب "فضائل نماز" کا عربی میں ترجمہ بھی کیا جو "الصلوۃ ومکانتها فی الاسلام" کے نام سے چھپی ہے، جس سے حضرت کی دعائیں ان کو حاصل ہوئیں اور تبلیغی جماعت کے عرب حلقوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، آخری دور میں ان کو حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری سے بڑا تعلق ہو گیا تھا، اور مولانا کی بھی ان پر خصوصی نگاہ شفقت تھی، مولانا کے عارفانہ کلام کو جمع و مرتب کرنے میں خاص طور پر ان کی تحریک شامل تھی، اور انہی کے بار بار کے تقاضے سے "دیوان محبت" کے نام سے مجموعہ مرتب ہوا، جس کے عناوین انہی کے تجویز کئے ہوئے ہیں۔ مولانا کی خدمت میں وہ وقتاً فوقتاً حاضر بھی ہوا کرتے تھے، مولانا کو ان کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا، ان کی مجلسوں میں اب بھی ان کا برابر تذکرہ ہوتا ہے۔

محمد میاں پڑھنے لکھنے میں جتنے پکّے تھے، سفر میں اتنے ہی کچے تھے، یہ وراثت ان کو اپنے والد ماجد سے ملی تھی، جو برسوں سفر نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ والدہ صاحبہ کے اشارہ و ہدایت سے میں ان کو مسلم مجلس مشاورت کے دورۂ گجرات میں ساتھ لے گیا، جو دسمبر ۱۹۶۴ء میں ہوا تھا، اس سلسلہ میں احمد آباد اور اس کے نواح گودھرا، بڑودہ، سورت اور بھڑوچ ان کا جانا ہوا، حجاز کے سفر بھی انھوں نے میرے دوسرے عزیزوں اور رفیقوں کے مقابلہ میں کم کئے تھے، پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء کو انھوں نے حجاز کا سفر کیا تھا، اور وہاں چھ مہینے قیام کرکے واپس ہوئے تھے، دوسرا سفر انھوں نے تنہا ۱۹۷۲ء میں "الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی" کی دعوت پر جس کا مرکز ریاض میں ہے کیا، اور سالانہ کانفرنس میں شرکت اور حج سے فراغت کرکے واپس ہو گئے، تیسرا سفر ۱۹۷۴ء میں میری معیت میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس استشاری کے موقع پر پیش آیا، ہوائی جہاز کے سفر سے ان کے اعصاب پر بڑا اثر پڑتا تھا، اور وہ سفر میں ٹرین کو ترجیح دیتے تھے لیکن بیرونی ممالک کے سفر میں ہوائی جہاز

سے چارہ نہیں تھا، اس لیے وہ حتی الامکان اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے، انتقال سے کچھ ہی دن پہلے ان کو ایک طرف قبرص (سائپرس) کی مسلم صحافت کی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے جو رابطہ عالم اسلامی کے اہتمام میں ہو رہی تھی، دعوت نامہ ملا۔

—— اور دوسری طرف ماسکو سے وہاں کی ایک صحافتی کانفرنس میں شرکت کے لیے دعوت نامہ آیا ہوا رکھا تھا، لیکن انھوں نے ان دونوں سفروں میں سے کسی میں جانا پسند نہیں کیا اور اس کی نوبت آنے سے پہلے وہ دنیا سے سفر کر گئے، قبرص میں بجائے ان کی موجودگی کے ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی اور فاتحہ پڑھ کر ثواب پہنچایا گیا۔

۶ — ۸ جولائی ۱۹۶۸ء کو رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے کراچی میں پہلی اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی، اس وقت میں حجاز میں تھا، مجھے معلوم ہوا کہ محمد میاں کے نام بھی دعوت نامہ گیا ہے، میری بڑی خواہش تھی اور میں نے اس کے لیے حرم شریف میں دعا کی کہ وہ اس کی شرکت کے لیے آمادہ ہو جائیں اور پاکستان کے سفر و قیام میں ان کا ساتھ ہو، اللہ نے یہ دعا قبول کی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی معیت میں وہ عین وقت پر پہنچ گئے۔ اس کانفرنس سے فراغت کے بعد وہ میرے ساتھ پاکستان کے مختصر دورے میں شریک رہے، فیصل آباد، اسلام آباد، راولپنڈی، سرگودھا، اکوڑہ خٹک اور لاہور کے سفر میں ساتھ رہا، اس سفر میں وہ اپنے مرشد حضرت مولانا رائے پوری کے وطن و مدفن ڈھڈیاں بھی گئے، دو دن وہاں قیام رہا، ہندوستان آکر انھوں نے اپنی بہنوں سے کہا کہ یہی سفر کا حاصل تھا، اور جو سکون وہاں نصیب ہوا، پورے سفر میں نصیب نہیں ہوا، اس موقع سے ان کے دور افتادہ عزیزوں نے بھی ان کو دیکھ لیا، جنھوں نے ان کو دیکھا نہیں تھا اور ان کا نام اور قابلیت کی شہرت سنتے تھے، اس سفر میں انھوں نے اس کی ادنیٰ کوشش بھی نہیں کی کہ وہ اپنے کو نمایاں کریں یا کہیں کوئی مضمون پڑھیں اور تقریر کریں، انھوں نے اس پورے سفر میں اپنے کو ایک معمولی رفیق اور شریک قافلہ سے زیادہ نہیں سمجھا اور ہر جگہ چھوٹے بن کر رہے۔

ان کا ذہنی و علمی نشو و نما دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماحول میں ہوا تھا، ان کا رابطہ وہاں کے اساتذہ اور فضلاء سے مسلسل اور مستقل طور پر رہا، آمد و رفت، مجالس کی شرکت اور علمی مذاکرات کے ذریعہ وہ وہاں کے ماحول اور فضا سے قریب رہے، ندوہ سے ان کو دو یا تین پشتوں کا تعلق تھا، وہ اس کے مقاصد اور دعوت سے بچپن سے آشنا اور مانوس تھے، پھر ان کا مطالعہ جتنا بڑھتا گیا اس پر ان کا اذعان اور اس کی صحت و صداقت

پر یقین بھی بڑھتا گیا، جس کا اندازہ اُن کے ان اردو اور عربی مضامین سے ہوتا ہے جو وہ وقتاً فوقتاً ندوۃ العلماء کے ترجمان "تعمیرِ حیات" اور "البعث الاسلامی" میں لکھتے رہے، نیز ان مضامین و رسائل سے جو انھوں نے پچاسی سالہ تعلیمی جشن کے لیے لکھے۔ اس آزاد علمی استفادہ کے علاوہ انھوں نے مولانا شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم شیخ الحدیث دارالعلوم کے درسِ حدیث میں سال بھر باقاعدہ شرکت کی اور ان سے صحاح کا درس لیا۔[1]

محمد میاں کا ذہن شروع سے وسیع تھا، ان میں کہیں سے سید جمال الدین افغانی کے آتش کدہ کی ایک چنگاری اڑ کر آگئی تھی جو اُن کو بے چین بنانے اور وسیع خطوط پر سوچنے پر مجبور کرتی تھی، انھوں نے ہندوستان سے تو کیا، اپنے شہر لکھنؤ سے بھی بہت کم باہر قدم نکالا تھا، ان کے سفروں کی حد بھی دو تین قریبی اضلاع تھے، جن سے ان کو وطنیت یا قرب کا تعلق تھا، لیکن وہ لکھنؤ میں بیٹھے بیٹھے عالمِ اسلام کے اسلام پسند اور حوصلہ مند نوجوانوں کی تنظیم کے خواب دیکھتے تھے، رجب ۱۳۷۹ھ (جنوری ۱۹۶۰ء) میں انھوں نے اپنے رسالہ "البعث الاسلامی" میں سال نو کے تحفہ کے طور پر اس تنظیم کے قیام کی تجویز پیش کی، پھر اگلے شمارہ شعبان ۱۳۷۹ھ (فروری ۱۹۶۰ء) میں "مشروع اسلامی کبیر" کے عنوان سے انھوں نے اس کے قیام کا اعلان کر دیا اور نوجوانوں کو اس کی رکنیت کی دعوت دی، عربی میں اس کا نام "جمعیۃ الرابطۃ الاسلامیہ" تھا، اور انگریزی میں —

"International Cultural Islamic Organization"

یہ نوجوانوں کی بین الاقوامی اسلامی تنظیم تھی جس کا مقصد آپس میں تعارف، ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت، مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے کام میں تعاون، ان کو صحیح مشورہ اور رہنمائی پیش کرنا تھا، اس کی طرف سے عربی انگریزی میں رسائل و مضامین بھی شائع ہوئے، اور وہ دوسرے ملکوں تک پہنچے۔ بہت سے نوجوانوں نے اس کا خیر مقدم کیا، اور رکنیت قبول کی، یاد رہے کہ یہ رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے قیام سے دو سال پہلے کی بات ہے۔

اُردو تحریر و تصنیف اور ان کے سفروں اور بعض دعوتی و تنظیمی کاموں کے اس ضمنی تذکرہ کے بعد جو محمد میاں کی زندگی اور ان کے علمی و ادبی کاموں میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے، ہم ان کی عربی تحریر و انشا کی طرف واپس آتے ہیں کہ یہی ان کا اصل میدان اور ان کے تفوق و امتیاز کا نشان ہے، عربی میں ان کا زورِ قلم بڑھتا رہا،

---

[1] اس درس میں مولوی ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری (حال مستشار علمی رئیس القضاۃ ابوظبی) ان کے رفیق و شریک تھے۔

اوران کو اپنی تحریر و انشاء کے لیے ایک نئے اور مستقل میدان کی ضرورت جلد پیش آگئی، وہ بڑے سے بڑے اہم موضوع پر قلم برداشتہ اور برجستہ لکھ لیتے تھے۔ ان کے مضامین و تحریر میں آمد ہی آمد تھی، مجھے بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ میں نے کچھ لکھنا چاہا لیکن لکھنے کا موڈ نہ تھا، بعض کہنہ مشق اساتذۂ ادب اور عربی لکھنے والوں کے سپرد کیا تو مطلب کی بات ادا نہ ہوئی، مجبور ہو کر میں نے ان کے حوالہ کیا اور وہ تھوڑے وقت میں قلم برداشتہ لکھ کر لے آئے، اور میں اس کو پڑھ کر بالکل مطمئن ہو گیا کہ میری صحیح ترجمانی اور مضمون کا حق ادا ہو گیا، بعض نہایت نازک اور ذمہ دارانہ موقعوں پر مثلاً ۲۲ اپریل ۱۹۴۷ء کو سعودی سفیر ہز اکسیلنسی انس یوسف یاسین کی آمد — اور ۳ فروری ۱۹۵۱ء کو امام حرم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن حسن کی تشریف آوری اور نماز جمعہ کی امامت کے موقع پر ندوۃ العلماء کی طرف سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا وہ انھیں کا لکھا ہوا تھا، حقیقت میں یہ کام میرے کرنے کا تھا لیکن وقت کم تھا اور طبیعت مضمحل، وہ دن گزر چکے تھے جب طبیعت جوش سے بھری ہوئی اور قلم کی کمان چڑھی ہوئی تھی، میں نے کہا کہ "محمد میاں یہ سپاسنامہ تم لکھو" ان میں سعادتمندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور میرے ساتھ معاملہ تو ایک سعید فرزند کا تھا، طبیعت شگفتہ تھی یا افسردہ وہ گئے اور اس طرح مضمون لکھ کر لے آئے کہ جیسے کمپیوٹر میں سے کوئی چیز نکل آئے، دیکھا تو اول سے آخر تک مرصع کہیں قلم رکھنے کی گنجائش نہیں، پھر زور بیان، برجستگی اور دلآویزی مستزاد، پڑھ کر دل خوش ہو گیا، اور دل سے دعا نکلی، مضمون علماء و ادباء کی موجودگی میں جلسہ میں پڑھا گیا اور سب نے داد دی، ان لوگوں کی بہت بڑی تعداد رہی ہوگی جو سمجھتے ہوں گے کہ میں نے لکھا ہے، میں نے ایک فاضل دوست سے سنا ہے کہ جب "البعث الاسلامی" کے آتشیں اور شعلہ بار اداریے ان کے نام سے چھپے ہوئے بعض اہل ذوق نے پڑھے تو کہا کہ "یہ سب مولانا ابوالحسن علی کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں، محمد میاں کا نام ہوتا ہے"۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ مجھے اپنی کتاب "الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ" کے نئے ایڈیشن کے لیے آخری مضمون لکھنا تھا جس میں پوری کتاب کا عطر آجائے اور وہ پڑھنے والے میں ایک نئی روح اور نیا ولولہ پیدا کر دے، کتاب کا اردو اور انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا تھا، ادھر مجھ سے بعض اہل ذوق نے یہ کہا تھا کہ کتاب کا آخری مضمون پوری کتاب کے مقابلہ میں کسی قدر سست اور ڈھیلا ہے، اور ناظرین وہی تاثر لے کر کتاب بند کرتے ہیں جو اس کے آخری باب یا فصل سے ان پر طاری ہوتا ہے، میں نے کچھ دیر تو سوچا کہ میں عربی میں لکھوں یا اردو میں، پھر فیصلہ کیا کہ اردو میں لکھوں

اتفاق سے اسی زمانہ میں پاکستان کے ایک موقر دینی رسالہ کے مدیر[1] کی (جو مجھے بہت عزیز ہیں) فرمائش آئی ہوئی تھی کہ میں ان کے رسالہ کے لیے کوئی مضمون بھیجوں، میں نے سوچا کہ "یک کرشمہ دو کار" میں یہ مضمون بھی ان کو بھیج دوں گا اور اس کو خود عربی میں منتقل کر دوں گا، طبیعت موڈ پر تھی، اور کتاب کو موثر و نتیجہ خیز بنانے کا عزم تھا، اس لیے طبیعت میں آمد ہوئی اور میں نے ایک نشست میں پورا مضمون لکھوا دیا جو "حرف آخر" کے عنوان سے اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں نظر آئے گا، مضمون سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اب عربی میں اس کے لکھنے میں وہ آمد اور زور نہیں رہے گا جو براہ راست مضمون کے لکھنے میں تھا، اتفاق سے محمد میاں رائے بریلی آئے، میں جانتا تھا کہ ماشاء اللہ ان کی کمان چڑھی رہتی ہے اور ان کا اشہب قلم ساز و یراق سے آراستہ رہتا ہے، ـــــــ میں نے کہا کہ محمد میاں اس کے عربی میں ترجمہ کی کوشش کرو، مجھے خود یہ کام مشکل معلوم ہوتا ہے، میرے ایک دو مرتبہ کہنے کے بعد وہ گھر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد مضمون لکھ کر لے آئے، دیکھا تو معلوم ہوا کہ جیسے کسی عمدہ مشین سے ڈھلا ڈھلایا نکلا ہو، جہاں تک یاد ہے کہیں انگلی رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، عربی کتاب "الصراع بين الفكرة الاسلامية والفكرة الغربية" میں یہ مضمون "خاتمة البحث" کے عنوان سے موجود ہے، مترجم کا نام کتاب میں نہیں ہے، جس کا جی چاہے پڑھ لے، اور فیصلہ کرے کہ کیا کتاب میں دو قلم ہیں، یا ایک ہی؟، بلکہ بہت سے اہل ذوق محسوس کریں گے کہ یہ کتاب کا سب سے طاقتور حصہ ہے اور کتاب کی روح سمٹ کر اس میں آگئی ہے۔

اس پر ایک دوسرا واقعہ یاد آیا، انھوں نے "الاسلام بين لا ونعم؟" (جو اب ان کے ایک پورے مجموعہ مضامین کا نام ہے اور مصر میں زیر طبع ہے) کے نام سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس تضاد کا اظہار کیا تھا جس کو مسلمان حکومتیں معاشرے اور افراد اسلام کے بارے میں اختیار کیے ہوئے ہیں، مضمون میں انھوں نے حسب معمول اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا، غالباً ۶۳ یا ۶۴ء تھا میں رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس کے سلسلہ میں مکہ معظمہ میں مقیم تھا، مصر اور تحریک اخوان کے مشہور خطیب و ادیب استاذ عبدالحکیم عابدین جو بانی تحریک "الاخوان المسلمون" الامام الشہید حسن البناء کے بہنوئی اور ایک زمانہ میں جماعت "الاخوان المسلمون" کے سکریٹری جنرل بھی رہے اور مصر سے جلا وطنی کے بعد بیروت میں وکالت کرتے تھے، مجھ سے ملنے عزیزی ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی

---

[1] مولانا سمیع الحق صاحب مدیر رسالہ "الحق" اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

کے مکان پر آئے، میں کسی ضرورت سے کمرہ سے باہر گیا، واپس آیا تو دیکھا کہ وہ "الاسلام بین لا ونعم" پڑھ رہے ہیں، ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر رہے ہیں، میں کمرے میں داخل ہوا تو مجھ سے روتے ہوئے کہا "من ھذا الاخ الذی کتب ھذا المقال؟" (یہ کون صاحب ہیں جنھوں نے یہ مضمون لکھا ہے؟) میں نے کہا کہ میرے بھتیجے ہیں، رو کر کہنے لگے کہ میرا سلام پہنچانا اور مضمون کی داد دینا۔

۱۹۵۲ء میں جب مصر میں انقلاب آیا اور زمام اختیار و قیادت صدر ناصر کے ہاتھ آئی اور قومیت عربیہ کی وہ تیز و تند آندھی اٹھی جو عرب نوجوانوں بلکہ پختہ کار عربوں کی بھی ایک بڑی تعداد کو اڑا لے گئی، بڑے بڑے تناور درخت اور علم و ادب کی کوہ پیکر شخصیتیں اس طوفان میں پتہ کی طرح اڑتی اور اس سیلاب میں تنکے کی طرح بہتی نظر آتی تھیں، اس وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ فکر اسلامی اور دعوت اسلامی کی ترجمانی کے لیے عربی کا ایک رسالہ نکالا جائے، اس وقت اس پورے تحتی براعظم میں عربی کا کوئی رسالہ نہ تھا، ندوۃ العلماء کا ارگن "الضیاء" ۱۹۳۵ء ہی میں بند ہو گیا تھا، عربی صحافت کا مزاج ایسا بگڑا تھا کہ جو لوگ اس فتنۂ عالم آشوب سے متأثر نہیں تھے اور قومیت عربیہ اور مصری قیادت پر تنقید کرنا چاہتے تھے، ان کے مضامین کا کسی اخبار و رسالہ میں چھپنا بھی دشوار تھا، اور اگر وہ کہیں چھپتے تو یہ رسائل ان غضبناک نوجوانوں کے عتاب کا نشانہ بن جاتے جو اس فلسفہ پر ایمان لا چکے تھے اور جن پر قومیت و اشتراکیت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔

۱۹۵۵ء میں جب یہ تحریک اپنے شباب پر تھی اور سارا مشرق وسطیٰ (الا ماشاء اللہ) اس نشہ سے مست اور اپنے جامہ سے باہر ہو رہا تھا، ہم لوگوں نے عربی رسالہ کے اجراء کا ارادہ کیا، اس سے کچھ پیشتر محمد میاں کا ایک مضمون "رسالہ "المسلمون" میں "العالم الاسلامی علی مفترق الطرق" (دنیائے اسلام دوراہے پر) کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ "المسلمون" اپنے عہد کا معیاری اور صف اول کا عربی رسالہ اور فکر و دعوت اسلامی کا بین الاقوامی ترجمان تھا، جس میں عالم عربی اور دنیائے اسلام کے چیدہ و برگزیدہ اہل قلم و ارباب فکر لکھتے تھے اس بلند پایہ رسالہ میں لکھنا ہر ایک کا کام نہ تھا، اس وقت صاحب مقالہ کی عمر ۲۰ سال سے بھی زیادہ نہ تھی، رسالہ کے مدیر ڈاکٹر سعید رمضان اس وقت تک ہندوستان نہیں آئے تھے، وہ بالکل نہیں سمجھ سکے کہ مضمون نگار عربی کا ایک نوعمر لکھنے والا ہے جو جلد اسلامی عربی صحافت کے افق پر ستارہ بن کر چمکنے والا ہے،

۱۹۵۵ء میں "البعث الاسلامی" کے نام سے یہ رسالہ نکلا، اس کے مدیر، مالک سب کچھ محمد میاں ہی تھے، بھائی صاحب مرحوم نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی، محمد میاں کے دوست اور دارالعلوم کے لائق استاذ

مولوی سعید الرحمٰن ندوی ان کے معاون خاص تھے۔

خوش قسمتی سے اس رسالہ کو اسی حسنی گھرانے کے دو اور لائق فرزند محمد میاں کے پھوپھی زاد بھائی مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولوی سید واضح رشید ندوی کا قلمی تعاون بھی حاصل ہوگیا، یہ دونوں بھائی (اللہ ان کی عمر میں برکت دے) عربی صحافت کی ممتاز صلاحیت رکھنے کے ساتھ انھیں جذبات وخیالات سے سرشار تھے جو محمد میاں کے سینہ میں موجزن تھے، ان چاروں نے ایک ٹیم کی طرح کام کیا، اور رسالہ کو تیزی کے ساتھ ترقی دی، جب رسالہ کی افادیت ومقبولیت نمایاں ہوئی تو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی نے (۱۹۶۰ء میں) اس کو ندوۃ العلماء کے ترجمان کی حیثیت سے لینے کا فیصلہ کیا، اور بھائی صاحب مرحوم کی فراخ دلی، اور محمد میاں کے ایثار سے یہ رسالہ ندوۃ العلماء کی طرف سے خوبصورت ٹائپ میں چھپنے لگا، پہلا شمارہ جو ندوۃ العلماء کی جانب سے نکلا اور جس پر "تصدرھا ندوۃ العلماء" لکھا ہوا ہے، وہ رمضان وشوال ۱۳۷۹ھ (مارچ واپریل ۱۹۶۰ء) کا پرچہ ہے۔ اسی کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۵۹ء سے ایک پندرہ روزہ اخبار "الرائد" بھی نکلنا شروع ہوا جس کے مدیر خصوصی مولوی محمد رابع ندوی شریک ادارت مولوی واضح رشید ندوی تھے، اور خصوصی مضمون نگار محمد میاں، اس اخبار نے رسالہ کو کمک پہونچائی اور دونوں نے مل کر صحیح خیالات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔

"البعث" نے ایک ایسی حکومت، دعوت اور تحریک کے خلاف محاذ کھول دیا جو عصر حاضر کی ان تمام طاقتوں سے مسلح تھی جو کسی بڑی حکومت، وسیع ملک اور شاطر قیادت کو حاصل ہوتی ہیں، کہاں مصر کا سحر سامری اور دبدبۂ فرعونی جس کے جلو میں صحافیوں، ادیبوں، خطیبوں، مصنفین، اہل قلم کا لشکر اور ذرائع ابلاغ کے زبردست مرکز تھے، جنھوں نے اچھی اچھی مخالف عرب حکومتوں کے چھکے چھڑا رکھے تھے، کہاں یہ محدود تعداد میں معمولی ٹائپ وکاغذ پر چھپنے والا عربی کا یہ غریب رسالہ، جس کے عملہ کا حال یہ تھا کہ ع

خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ

لیکن اس کے صاحب ایمان نوجوان مدیر کا جوش جنوں، اس کی غیرت ایمانی اور زور قلم کی وجہ سے جس نے سید جمال الدین افغانی کے "العروۃ الوثقیٰ" کے مخصوص مقالات اور مولانا آزاد کے "الہلال" کے آتشیں اداریوں کی یاد تازہ کر دی تھی، بہت جلد اس رسالہ نے اسلام پسند حلقوں میں جو مصر کی اس "خانہ برانداز" تحریک سے بے چینی محسوس کرتے تھے، لیکن کھل کر اپنی بیزاری کا اظہار اور مصر کی قیادت پر تنقید نہیں کرسکتے تھے

مقبولیت حاصل کرلی اور انھوں نے اس کو نہ صرف اپنے خیالات کا ترجمان سمجھا بلکہ اپنے زخموں کا مرہم اور اپنے درد کی دوا سمجھے، اس کا اندازہ ان تعزیتی خطوط اور تعزیتی نوٹس سے ہوگا جو عالم عربی کے بلند پایہ، اسلامی الفکر صحافیوں، عالموں، ادیبوں اور رہنماؤں نے اس جواں سال مسلم صحافی کی وفات پر لکھے اور جن کے متعدد نمونے مرحوم کے تازہ مجموعۂ مضامین "تناقضن تحارفیہ العیون" کے آخر میں شائع ہوئے ہیں۔

البعث کے اداریوں اور مقالات کی گونج صرف اسلامی ہی حلقوں میں نہیں سنی گئی بلکہ مصر و شام کے ادبی صحافی حلقوں اور حکومت کے ایوانوں میں بھی سنی گئی، مجھے ایک باخبر و معتبر مصری دوست نے بتایا کہ صدر ناصر کو جو چند رسائل اور اخباروں کے تراشے مطالعہ کے لئے پیش کئے جاتے تھے ان میں "البعث الاسلامی" بھی ہوتا تھا، ہندوستان کے مصری سفارت خانہ نے حکومت ہند سے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا، اور ایڈیٹر سے جواب طلبی بھی ہوئی، لیکن انھوں نے اپنی روش نہیں چھوڑی اور ان کے زور قلم میں کوئی کمی نہیں آئی۔ راقم السطور سے مشہور عرب رہنما اور مجاہد شیخ محمد محمود الصواف (رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی) نے خود ایک مرتبہ کہا تھا کہ "البعث الاسلامی" نے ناصر کو بے نقاب کرنے کے سلسلہ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ پورے عالم عربی میں کسی رسالہ یا اخبار سے نہیں ہوسکا۔

"البعث الاسلامی" کی مقبولیت اسلامی حلقوں میں برابر بڑھتی گئی، سعودی عرب نے جو ملک فیصل مرحوم کی قیادت میں مصر کی اس تحریک کا خاص طور پر مقابلہ کررہا تھا، خاص طور پر اس کی اہمیت محسوس کی، اور وہاں کے بعض صاحب حمیت عالموں اور شیوخ نے "حسبۃ للہ" اس کی تبلیغ و اشاعت کا کام کیا، مجھے یاد ہے کہ محمد میاں جب پہلی مرتبہ (۱۳۶۸ھ ۱۹۶۷ء میں) میرے ساتھ حجاز گئے اور وہاں کے وزیر تعلیم معالی الشیخ حسن ابن عبداللہ بن حسن سے ملنے کے لئے ہم لوگ شیخ محمد محمود الصواف کی معیت میں طائف گئے تو انھوں نے بڑی گرمجوشی سے "البعث" کے جوان مدیر کا استقبال کیا اور رسالہ سے اپنی گہری دلچسپی و تاثر کا اظہار۔

اسی سفر میں (۱۳ رجب ۱۳۸۷ھ ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو) وہ سنگین حادثہ پیش آیا جس میں اللہ نے ہم دونوں کو بال بال بچایا، ہوا یہ کہ جب ہم طائف سے واپس آرہے تھے تو حدود مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ڈرائیور کی آنکھ جھپک جانے کی وجہ سے گاڑی الٹ گئی، اور ایسی الٹی کہ چھت بالکل زمین پر تھی، اور چاروں پہیے دفتی کے ڈبہ کی طرح اوپر، ڈرائیور کا خیال تھا کہ ہم دونوں اب اس عالم میں نہیں ہیں، اس نے لیٹے لیٹے پوچھا کہ "یا شیخ أأنت حی؟" واقعہ بھی ایسا تھا، گاڑی جب رکی تو پہلے محمد میاں باہر آئے، اور

انھوں نے کہا کہ چچا میاں باہر آجائیے، اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کی مدد فرمائی، اور صاف جان بچالی۔ ایسا کس طرح اور کیسے ممکن ہوا، یہ محض قدرت الٰہی کا کرشمہ ہے، مفتی امین الحسینی صاحب مرحوم نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ آپ گاڑی سے اس طرح نکلے جیسے حضرت یونس شکم ماہی سے نکلے تھے، معلوم ہوتا ہے ابھی اللہ کو محمد میاں سے کام لینا تھا، اور "البعث الاسلامی" کے ذریعہ عالم عربی میں ہندوستان کی ایک بے سروسامان جماعت کی نحیف آواز پہونچانی تھی۔

محمد میاں کے ان زلزلہ انگیز اداریوں کا سلسلہ جاری رہا اور صحیح الفکر عرب نوجوان روز بروز ان کے گرویدہ ہوتے گئے، جس ماحول اور تربیت میں ان کا نشو ونما ہوا تھا، اس کے بالمقابل دنیائے اسلام بالخصوص عالم عربی کی مذہب بیزار اور اسلام گریز قومی، اشتراکی، بعثی، مادی تحریکیں اور دعوتیں اور بہت سے ممالک عربیہ (اور خاص طور پر ان ممالک کی جن کو دعوت اسلامی کا مرکز اور اسلامی دنیا کے لیے نمونہ ہونا چاہیے تھا) مادہ پرستانہ زندگی نے ان کی طبیعت کے اندر ایک شدید کشمکش پیدا کردی اور (جیسا کہ میں نے ان کی معرکۃ الآرا کتاب "الاسلام الممتحن" کے مقدمہ میں لکھا ہے۔)

"ان کے قلم کو ایک ایسے آبشار میں تبدیل کردیا جو چٹانوں سے ٹکرانے کی وجہ سے ابلتا ہے، اور بڑے جوش وشور کے ساتھ گرتا ہے، اس کے نتیجہ میں ایسے مضامین ان کے قلم سے نکلے جن میں آبشار کا شور اور طوفان کا زور ہے۔"

اس کا نمونہ ان کے مجموعہ مضامین "الاسلام الممتحن" اور "تناقض نحاربه العیوب" میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ان کے آخری زندگی کے مضامین میں ایک اہم مضمون وہ تھا جس میں انھوں نے اس تضاد کا نقشہ کھینچا ہے جو اسلامی ممالک میں عمومیت کے ساتھ اور بعض ان عرب ممالک میں (جو اسلام کی نمائندگی، مقامات مقدسہ کی خدمت وحفاظت اور دین صحیح کی دعوت کے دعویدار اور علمبردار ہیں) وہاں کے سربراہوں اور ذمہ داروں کے اقوال وافعال اور اسلام کی تعلیمات اور وہاں کی روزمرہ زندگی میں پایا جاتا ہے، اور جس کو دور کیے بغیر نہ اسلام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے آسکتی ہے نہ یہ ممالک خطرہ سے نکل سکتے ہیں، انھوں نے اس مضمون میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا اور خون کے آنسو روئے تھے، یہ مضمون ان کے رسالہ "البعث" کے رجب ۱۳۹۹ھ (جولائی ۱۹۷۹ء کے) شمارہ میں "سوال حائر یحتاج الی جواب" کے عنوان سے شائع ہوا، میں اہتمام سے

البعث اور الرائد پڑھتا ہوں لیکن ان دنوں میں بعض تحریری کاموں کی تکمیل کے سلسلہ میں ایسا مشغول ہوا کہ میں یہ نمبر نہیں پڑھ سکا، ان کے حادثۂ وفات کے بعد جب مولانا منظور نعمانی صاحب کے منہ سے اس کی تعریف سنی اور انھوں نے یہ بتایا کہ انھوں نے ٹیلیفون پر ان کو اس جرأتمندانہ اور مؤثر مضمون پر دل کھول کر داد دی اور ان سے فرمائش کی کہ وہ اس کا ترجمہ خود کر دیں وہ اس کو اپنے رسالہ "الفرقان" میں شائع کر دیں گے، مرحوم کے انتقال کے بعد جب میں بمبئی سے واپس ہوا تو میں نے وہ مضمون پڑھا، اور پڑھ کر مسرت کے ساتھ یہ حسرت ہوئی کہ میں نے یہ مضمون ان کی زندگی میں کیوں نہ پڑھ لیا تھا، اگر میں ان کی زندگی میں یہ مضمون پڑھ لیتا تو ان کا ہاتھ چومتا اور پیشانی کو بوسہ دیتا، اس کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ یہ بات عجیب معلوم ہوتی اور ان کے لیے آزمائش بن جاتی لیکن اس کے بغیر اس پسندیدگی کا اظہار ممکن نہ تھا جو اس مضمون کے پڑھنے سے ہوتی ہے، افسوس ہے کہ اس کی نوبت نہ آئی اور یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

شاید بہت سے لوگوں پر یہ بات گراں گزرے اور کچھ پڑھنے والے اس کو مبالغہ اور جانبداری پر محمول کریں کہ وہ اپنے اس جوش تحریر و زور قلم میں سید قطب شہید سے آنکھیں ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور تعجب نہیں کہیں (ایک عجمی نژاد نوعمر اور ایک عربی الاصل پختہ کار ادیب کا فرق ذہن میں رکھتے ہوئے) ان سے بڑھ جاتے ہوں کہ فوارہ کی روانی اس کے جوش دروں کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہ "جوش دروں" ان کو اپنے آبائے کرام اور حضرت سید احمد شہید کے تعلق و عقیدت سے ملا تھا، جس کی نظیر مشرق وسطیٰ میں (مغربی تعلیم و تربیت اور مغربی تہذیب و تمدن کے اثر سے) اگر مفقود نہیں تو قلیل الوجود ضرور ہے میں نے اپنے اس مقدمہ میں اس حقیقت نگاری کی معذرت کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"میرا اور صاحب کتاب کا رشتہ ایک طرح سے باپ بیٹے اور استاد و شاگرد کا سا ہے، اس کتاب کا مقدمہ لکھتے وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا میں اپنی کسی تصنیف کا مقدمہ لکھنے جا رہا ہوں،

لے مرحوم کی اچانک وفات نے اس کی مہلت نہ دی، خدا کو منظور تھا کہ یہ کام ان کے ہونہار فرزند سید عبداللہ حسنی ندوی کے قلم سے تکمیل پائے، انھوں نے بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ اس مضمون کو اردو میں منتقل کیا جو الفرقان ماہ شوال ۱۳۹۹ھ میں "ایک تضاد جس کی کوئی توجیہ ممکن نہیں" کے عنوان سے شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا اور اس طرح فارسی کا وہ جملہ صادق آیا، اگر پدر نتواند پسر تمام کند

جس کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ لوگ اس کو "اپنے منہ اپنی تعریف" اظہار کمال اور خود پسندی پر محمول نہ کریں اور یہ ایک ایسی کمزوری ہے جس کو دین و شریعت اور اخلاق و تہذیب نے کبھی پسند نہیں کیا، اور میں خود بھی امکانی حد تک اس سے بچنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

لیکن جب میں نے اپنے اس احساس کا حقیقت پسندانہ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیا اور اس کا تجزیہ کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں در حقیقت لوگوں کے تبصرہ اور قیل وقال سے ڈر رہا ہوں، اس خوف و احساس نے اس مسئلہ کو غیر شعوری طور پر ایک اخلاقی رنگ دے دیا ہے، میں طبیعت کی اس کمزوری کو ایک اخلاقی کمزوری سمجھ رہا ہوں، میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے اس جذبہ و احساس کے سامنے سپر ڈال دی اور اس خوف سے ایک قابل قدر کتاب کا مقدمہ لکھنے سے باز رہا کہ وہ میرے ایک خورد اور عزیز کی کتاب ہے تو میں ایک خیالی اخلاقی کمزوری اور کوتاہی کا ارتکاب کروں گا، اس لیے کہ قرآن کی اخلاقی تعلیمات جہاں اعزہ و اقارب (اگر وہ برسر باطل ہوں) کے خلاف شہادت دینے کو ضروری قرار دیتی ہیں وہیں ان اعزہ و اقارب کے حق میں (اگر وہ برسر حق ہوں) شہادت دینے کو بھی واجب گردانتی ہیں، قرآن مجید میں جہاں یہ فرمایا گیا ہے۔

یا ایها الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شهداء لله ولو علی انفسکم اوالوالدین [1]	اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار بنے رہو، اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو، خواہ یہ گواہی تمھاری اپنی ذات، ماں باپ اور عزیزوں کے خلاف پڑے۔

وہیں اللہ تعالی کا یہ ارشاد بھی ہے۔

ان الله یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اهلها، واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان الله نعما یعظکم به ان الله کان سمیعًا بصیرا [2]	خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالہ کر دیا کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو، خدا تمھیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بے شک خدا سنتا اور دیکھتا ہے۔

---

[1] النساء ۱۳۵ [2] النساء ۵۸

اس نابغۂ جواں سال جس نے اپنی عمر کی صرف ۲۴ بہاریں دیکھیں، اسلام کے اس پرجوش داعی و سپاہی اور اس پر مستزاد اپنے گھر کے اس "گوہر شب چراغ" اور لخت جگر کے انتقال سے دل و دماغ پر جو گزری اور گزر رہی ہے اس کو امیر خسرو کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں جو انھوں نے کسی ایسے ہی حادثہ پر اپنے مالک حقیقی کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ حقیقت حال کی عکاسی اور دل کی ترجمانی اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔

جاں ز تن بُردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

سدِّ ایمانی

اخلاقی پستی کے اس طوفان بلاخیز کے لئے جو پورے ملک اور معاشرے کو اپنے لپیٹ میں لے رہا ہے۔ کسی ڈیم کا خیال ہمارے دماغ میں نہیں آتا۔

نیل و فرات، راوی و جہلم اور گنگا و جمنا کے محدود سیلابوں کے نقصانات اور تباہ کاریاں تسلیم لیکن بداخلاقی، کرپشن، بے حیائی و بدمستی اور دولت کی پوجا کا جو سیلاب آج ہر سوسائٹی میں (مسلم و غیر مسلم کی تفریق کے بغیر) گلے گلے بہہ رہا ہے۔

یہ اینٹ پتھر یا سیسہ اور فولاد کی کوئی سد سکندری نہیں، خدا کے خوف، دوسری زندگی کے یقین، حیاء و غیرت، سچی انسانیت دوستی، ضمیر کے محاسبہ اور سچائی و حق پرستی کی وہ سدِ ایمانی ہے، ان ڈیموں اور پشتوں سے کہیں زیادہ اہم ہے، جو پانی کے بچاؤ یا پانی کی حفاظت یا آبپاشی اور بجلی کے لئے قائم کئے جاتے ہیں اور ان پر کروڑوں اور اربوں روپیہ، دل و دماغ کا سب سے قیمتی سرمایہ، اور انسانی کاوش کا بہترین نچوڑ آسانی سے صرف کر دیا جاتا ہے۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

مولانا محمد الحسنی

مدیر "البعث الاسلامی"

مولانا محمد منظور نعمانی

اکثر ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کے اکلوتے حقیقی بھتیجے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شہرۂ آفاق عربی جریدہ "البعث الاسلامی" کے مدیر مولانا محمد الحسنی جو اپنی بعض خداداد خصوصیات اور وہبی کمالات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی تھے، اور جن کی عمر ابھی صرف ۴۴ سال کی تھی، صرف چند گھنٹے کی علالت کے بعد ہماری اس دنیا سے اٹھا لیے گئے۔ انّ للہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ وکلُّ شئٍ عندہٗ باجلٍ مُسمّی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری، مولانا علی میاں کے بارے میں فرمایا کرتے ہیں کہ "رَجُلٌ مَوھُوب" (یعنی ان کے پاس جو کچھ ہے وہ کسبی نہیں، وہبی ہے، انھوں نے محنت کر کے حاصل نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانۂ کرم سے یوں ہی عطا فرما دیا ہے) ——
واقعہ یہ ہے کہ یہ بات مولانا علی میاں سے کہیں زیادہ ان کے مرحوم بھتیجے مولانا محمد الحسنی پر صادق آتی تھی۔

اب سے ۳۲ سال پہلے ۱۹۴۶ء کی بات ہے جب راقم سطور نے مولانا علی میاں کے مشورہ بلکہ ان ہی کی تحریک پر "الفرقان" کو بریلی سے منتقل کرنے اور خود بھی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت اپنی رہائش اور الفرقان کے دفتر کے لیے جو مکان کرایہ پر ملا تھا وہ گوئن روڈ پر مولانا علی میاں اور ان کے برادر بزرگوار مولانا ڈاکٹر سیّد عبدالعلی (علیہ الرحمہ) کے مکان کے گویا بالکل برابر میں تھا۔ عزیز مرحوم مولانا محمد الحسنی ڈاکٹر صاحب کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ ان کو سب "محمد میاں" کہتے تھے اس وقت وہ دس گیارہ سال کے بچے تھے لیکن میں نے کبھی ان کو بچوں کے ساتھ یا بچوں کی طرح کھیلتے نہیں دیکھا۔ بولتے بھی بہت کم ہی تھے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا تھا کہ یہ پڑھنے کے لیے کسی اسکول یا مکتب مدرسہ میں بھی نہیں جاتے ہیں، والد ماجد ڈاکٹر صاحب خود ہی ان کو قرآن پاک باترجمہ پڑھاتے ہیں اور اسی کے ذریعہ عربی تعلیم بھی ہو رہی ہے اور مصر وغیرہ سے آنے والے عربی اخبارات کا مطالعہ بھی کراتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ صرف و نحو کوئی کتاب اُن کو نہیں پڑھائی گئی ہے اور نہ پڑھانے

کا ارادہ ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد سُنا کہ محمد میاں عربی میں مضمون نگاری کرنے لگے ہیں۔ ہم جیسوں کو بجا طور پر حیرت ہوگی کہ جس شخص نے صرف و نحو بالکل نہیں پڑھی۔ جو ماضی، مضارع، معرّب، مبنی، مرفوع، منصوب، مجرور، منصرف، غیر منصرف کو نہیں جانتا، وہ عربی کا کوئی جملہ بھی کیسے صحیح لکھ سکتا ہے۔ لیکن اللہ کی شان اور اس کی قدرت کی کارفرمائی کہ محمد میاں صرف و نحو سے بالکل ناواقف اور نابلد ہونے کے باوجود بہت اچھی عربی لکھنے لگے اور جلد ہی وہ وقت آگیا کہ عالم عربی کے بعض بلند پایہ رسالوں میں مضامین بھیجنے لگے اور ان رسالوں میں وہ مضامین بڑے اہتمام اور بڑی قدر سے غالباً یہ سمجھ کر شائع کیے گئے کہ یہ ہندوستان کے کسی علامہ کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کا ان کا پہلا مضمون مشہور اخوانی زعیم سعید رمضان کے ماہنامہ "المسلمون" میں شائع ہوا تھا۔ جو اس زمانہ میں دمشق سے نکلتا تھا اور عالم عربی کا بلند پایہ اور بہت ہی موقر مجلّہ تھا۔

پھر اُن کی عمر کا ۲۰واں سال تھا کہ انھوں نے خود اپنا ایک عربی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور "البعث الاسلامی" کے نام سے ایک بلند معیار عربی ماہنامہ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے جاری ہوگیا۔ اس وقت وہ ان کا ذاتی رسالہ تھا، ان کا گھر ہی اس کا دفتر تھا، وہ خود ہی اس کے لیے مضامین لکھتے، خود ہی کتابت کراتے اور چھپواتے اور خود ہی ڈاک سے اس کو روانہ کرنے کا اہتمام کرتے۔ "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ"۔

راقم سطور کی طرح جو لوگ اس لائن سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہی سمجھ سکتے ہیں کہ اپنی ذات کے بل بوتے پر ہندوستان سے عربی رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیسی ہمت مردانہ اور مالی اعتبار سے کتنے خسارے کا سودا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ۲۰ سالہ محمد میاں کو یہ ہمت بخشی۔ جلد ہی "البعث الاسلامی" عربی ممالک میں مقبول اور ساتھ ہی خود کفیل ہونے لگا۔

پھر ۱۹۵۹ء میں جب کہ اس کی عمر کا چوتھا سال تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا عرب ممالک میں اس کو اچھی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں (جس میں راقم سطور بھی بحیثیت رکن انتظامی شریک تھا) اس تجویز پر گفتگو ہوئی کہ "البعث الاسلامی" کو ندوۃ العلماء کی تحویل میں لے لیا جائے، اور اس کی اشاعت کا اہتمام و انتظام ندوۃ العلماء کی طرف سے ہو۔ اور مولانا محمد میاں اسی طرح اس کے مدیر اور ذمہ دار رہیں تو یہ ندوہ اور اس کے دارالعلوم کے لیے خاص کر عرب ممالک میں ان کے تعارف کے لیے بہت مفید ہوگا۔

غور و بحث کے بعد مجلس نے اس تجویز کو منظور کرلیا۔ مولانا محمد میاں صاحب کی طرف سے اُن کے والد ماجد ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ نے (جو خود ندوۃ العلماء کے ناظم تھے) اس کی منظوری دے دی ــــ اور "البعث الاسلامی" کی ملکیت ندوۃ العلماء کی طرف منتقل ہوگئی۔ کسی معاوضہ کا کوئی ذکر ہی نہ آیا، بلکہ مولانا محمد میاں کے لیے ان کی محنت اور کارکردگی کا کوئی الاؤنس بھی مقرر نہیں کیا گیا اور وہ اسی شغف اور عرق ریزی کے ساتھ دن رات ایک کرکے اس کا کام کرتے رہے اور اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔

قریباً دو سال کے بعد جب ان کے والد ماجد ڈاکٹر صاحب وفات پا گئے تو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک جلسہ میں ان کے لیے "البعث الاسلامی" کی ادارت اور تمام تر کارکردگی کے سلسلہ میں صرف سَو روپئے کا الاؤنس منظور کیا گیا، انھوں نے اس کو بھی بخوشی قبول کرلیا، حالانکہ اس وقت بھی ندوۃ العلماء کے دفتر کے بعض محرّروں کی تنخواہ اس سے زیادہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت کو ان چیزوں سے بالکل بے نیاز بنایا تھا لیکن ان کی اس قناعت اور قربانی کا صلہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس کی شان عالی کے مطابق ملا اور "البعث الاسلامی" ہی کے سلسلہ سے ان کے لیے "یَرْزُقُہٗ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ" کی ایک شکل پیدا ہوگئی۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ وہ عربی زبان کی صرف و نحو سے بالکل نا واقف تھے (راقم سطور نے خود مولانا علی میاں سے سُنا ہے کہ غالباً اُن کو ماضی کی پوری گردان بھی یاد نہ ہوگی) لیکن "البعث الاسلامی" میں ان کی جو تحریریں شائع ہوتی تھیں، وہ زبان کے لحاظ سے عالمِ عربی کے مشاہیر اہلِ قلم کی تحریروں کے ہم پلّہ ہوتی تھیں۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "الاسلام الممتحن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس کو دیکھ کر آج بھی ہر وہ شخص جس میں اس کی اہلیت ہو یہ موازنہ کر سکتا ہے۔

وہ زبان و اسلوب میں (عربی میں بھی اور اُردو میں بھی) مولانا علی میاں کا ایسا تتبع کرتے تھے کہ گویا ان کا مثنیٰ اور "دوسری کاپی" بن گئے تھے لیکن ادھر کچھ دنوں سے بعض وہ حضرات جن کا احساس و اندازہ اس باب میں معتبر ہو سکتا ہے، محسوس کرتے تھے کہ ان کے قلم میں خاص کر عربی تحریریں مولانا سے بھی زیادہ طاقت آ گئی ہے۔ خود مولانا علی میاں بھی کبھی کبھی اس کا اظہار فرماتے تھے۔

اُن کا شاہکار اور آخری یادگار:۔

۱۱/ جون دو شنبہ کی شام کو اسی مہینے جون (مطابق رجب) کا "البعث الاسلامی" کا شمارہ میرے

پاس آیا۔ مغرب و عشاء کے درمیان میں نے سب سے پہلے اس کا افتتاحیہ پڑھا۔ جو عزیز مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا تھا، اس کا عنوان تھا "سوال حائر یحتاج الی جواب" یہ، صفحے کا مضمون تھا، اس میں ممالک اسلامیہ عربیہ خاص کر سعودی مملکت کے ذمہ داروں سے وہ باتیں صاف صاف کہی گئی تھیں جن کا اسی طرح صاف صاف کہا جانا ان کی خیر خواہی کا بھی تقاضا تھا اور از روئے دین اب فرض ہوگیا تھا، اور اس فرض کو اب وہی مرد خدا ادا کر سکتا تھا جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی خاص توفیق عطا ہو۔ اس کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے مولانا محمد الحسنی کو یہ سعادت بخشی گئی ہے کہ بہتر سے بہتر اور مؤثر سے مؤثر انداز میں انھوں نے یہ فرض ادا کر دیا۔ میں نے اس افتتاحیہ کو ان کے قلم سے "ندائے غیب" سمجھا، اور طے کر لیا کہ اس کو اُردو میں منتقل کرا کے "الفرقان" میں شائع کرنا ہے۔

اگلے دن (۱۲ جون سہ شنبہ) فجر کی نماز کے بعد ہی میں نے مولانا محمد میاں کو فون کیا۔ ان کے مضمون کے بارے میں اپنا تاثر ان کو بتلایا اور اُن سے فرمائش کی کہ وہ اس کو جلدی زیادہ سے زیادہ بس دو تین دن میں "الفرقان" کے لیے اُردو میں منتقل کر دیں یا کسی سے کرا دیں۔ انھوں نے کہا بہت اچھا! انشاء اللہ ہو جائے گا۔ اللہ کے سوا کسی کو بھی علم نہ ہوگا کہ آج ہی کا دن ان کی زندگی اور اُن کے کام کا آخری دن ہے اور کل ہی اُن کا سفر آخرت ہے۔

عزیز مرحوم مولانا محمد میاں کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے خاص فضل سے غیر عادی طریقہ پر وہ علمی و قلمی کمال عطا فرمایا تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑا فضل و انعام ان پر ان کے رب کریم نے یہ فرمایا تھا کہ جس تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کے لیے طالبین صادقین برسوں اصحاب ارشاد و مشائخ کی تربیت میں رہتے اور ریاضتیں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ بے بہا دولت بھی اُن کو اپنے فضل خاص ہی سے عطا فرما دی تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ کبر، غصہ، حسد، کینہ، بخل جیسے رذائل ان کی فطرت سے نکال دیے گئے ہیں، اور محاسن اخلاق بھرپور عطا فرما دیے گئے ہیں۔ ذالك فضل الله یوتیه من یشاء والله ذوالفضل العظیم ہ

(الفرقان جولائی ۱۹۷۹ء)

جواں مرگ محمد الحسنی

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم

جون کا معارف طباعت کے آخری مرحلہ میں تھا کہ اچانک اطلاع ملی کہ ندوۃ العلماء کے نقیب رسالہ البعث الاسلامی کے مدیر مولوی محمد الحسنی کا انتقال ہوگیا، یہ خبر اتنی خلاف توقع تھی کہ بڑی دیر تک یقین نہیں آیا۔ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی، چالیس سے تین ہی چار سال آگے بڑھے ہوں گے، صحت بھی اچھی تھی کبھی کسی طویل یا شدید بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ جب ملاقات ہوتی ہشاش بشاش نظر آتے۔

یہ سچ ہے کہ جو آیا ہے اسے ایک دن جانا ضرور ہے کل نفس ذائقۃ الموت لیکن کسے معلوم تھا کہ ان کا وقت موعود اتنا قریب ہے، ہم لوگوں کے سامنے تو بچے تھے ان کی پیدائش کل کی بات معلوم ہوتی ہے، ہم کس طرح خیال کرتے کہ وہ ہم سے پہلے رخت سفر باندھ لیں گے، لیکن ان کے دوستوں اور ہم سنوں کو بھی اس تیز روی کا گمان نہیں تھا، ان کی جسمانی ساخت اور صحت کی رفتار دیکھ کر سبھی عمر طویل کی پیشین گوئی کرتے تھے لیکن ظاہر بینوں کے یہ سارے اندازے غلط ثابت ہوئے اور اللہ کی مشیت پوری ہو کر رہی۔ تقدیر کے سامنے تدبیر نے سپر ڈال دی اور انسان کی مجبوری بے بسی ہی نہیں خام خیالی اور غلط اندیشی بھی نمایاں ہوگئی۔

مصلحت ایزدی تھی کہ وہ چھوٹی عمر ہی میں اس دنیا سے کوچ کر جائیں۔

تقدیر الٰہی کے رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی انسان کے بس میں نہیں ہے اس کا علم ناقص، اس کی نظر کوتاہ اور اس کا علم محدود ہے۔ ان حالات میں وہ حکمت الٰہی کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے، عالم غیب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، ہم ظاہر بیں باطن کے حقائق سے ناواقف ہیں، البتہ اللہ کی مصلحت پر ہمارا ایمان ہے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہے

یہ ہماری کم نگاہی ہے کہ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں، اس سے تو حیاتِ نو کا آغاز ہوتا ہے، دنیا مطیۃ الآخرۃ ہے انسان اس جہان فانی سے گزر کر عالم جاودانی میں قدم رکھتا ہے جہاں اسے مادہ کے جامۂ تنگ کو اتار کر خلعت لامحدود عطا ہوتی ہے اور فنا کے گھاٹ سے اتر کر بقائے دوام نصیب ہوتا ہے، اسے انحطاط وزوال کے خوف سے نجات ملتی ہے اور عروج مسلسل اور ارتقائے پیہم کی مسرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔

محمد میاں اب ہمیں نظر نہیں آتے ہیں، لیکن یہ ہماری نظر کی کوتاہی اور نگاہ کی نارسی ہے اگر مادیت کا حجاب حائل نہ ہوتا تو ہم دیکھتے کہ وہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کے عالم میں پہنچ کر فرحین بما اٰتاھم اللہ من فضلہ کے زمرہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ وہاں نزلاً من غفور رحیم کے مزے لے رہے ہیں اور پسماندگان کو خوف و حزن سے نجات کی بشارت سنا رہے ہیں ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم اللہ کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے وہ جسے جو چاہے دے، وہ سمیع وبصیر، علیم وخبیر ہے، وہ دلوں کی آواز سنتا اور نیتوں کے خلوص کو دیکھتا ہے، وہ ماضی سے آگاہ، حال سے باخبر اور مستقبل سے واقف ہے، اس کے یہاں مزدور پابند وقت نہیں بلکہ مزدور کے حسن عمل اور صلاحیت کار پر موقوف ہے۔ کسی کو سارے دن کی جانکاہی کے بعد چند پیسے ملتے ہیں اور کسی کو صرف چند منٹ کی کارگزاری پر اشرفیاں عطا ہوتی ہیں، قلت وکثرت کا فیصلہ مالک کی نظر پر منحصر ہے، اس کو کسی کا کام پسند آجائے تو تھیلیوں کے منہ کھول دیتا ہے۔

محمد میاں نے عمر بہت کم پائی اس زندگی کی چالیس بہاریں بھی پورے طور پر دیکھ نہ پائے کہ ادی آنکھیں بند ہو گئیں اور روح فنا کے مرحلے سے گزر کر بقا کی منزل میں پہنچ گئی، وہ ڈاکٹر عبد العلی مرحوم کی آخری اولاد تھے، پانچ بیٹیوں کے بعد اللہ نے انھیں یہ بیٹا عطا کیا تھا، سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، ڈاکٹر صاحب بھی مسرور ہوئے، انھوں نے اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کیا اور طے کر لیا کہ اس عطیۂ ربانی کو اس کی راہ میں لگائیں گے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی طرح دینی و دنیاوی تعلیم دلا کر اس بچے کو ڈاکٹر بنائیں گے لیکن ڈاکٹر صاحب کے سوچنے کا انداز دوسرا تھا وہ اللہ کے دین اور اس کے بندوں کی خدمت کے قائل ضرور تھے مگر موقع اور محل اور حالات و ضروریات کے پیش نظر وہ خدمت کی

نوعیت اور دائرۂ کار کا یقین کرتے تھے، محض مادی نفع تو کبھی ان کا مطمع نظر نہیں رہا۔ وہ خالص دنیاوی کاموں میں بھی روحانی قدروں کو پیش نظر رکھتے تھے اور رضائے الٰہی کی طلب سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے۔ مگر اس بارہ میں بھی وہ ادنیٰ و اعلیٰ نظر رکھتے تھے، انھوں نے محمد میاں کی تعلیم و تربیت میں بھی یہ نقطۂ نظر پیش نظر رکھا، وہ نصاب و نظام تعلیم کے بارے میں تقلید کے بجائے اجتہاد کے قائل تھے اور خوب سے خوب تر کی فکر میں رہتے تھے، پہلا تجربہ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی (علی میاں) پر کیا پھر اسی روشنی میں محمد میاں کے لئے بھی نصاب و طرز تعلیم کا ایک مؤثر اور تیز رفتار لائحہ عمل مرتب کیا۔ مجھے یاد ہے کہ تجربہ کار مدرسین اس پر سخت تنقید کرتے تھے اور وثوق کے ساتھ اس کی ناکامی کی پیشین گوئی کرتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب اپنی رائے پر جمے رہے، بالآخران کی رائے صحیح ثابت ہوئی اور محمد میاں قواعد وضوابط کے پرپیچ راہوں سے گزرے بغیر ادب و انشا کی ایسی بلند منزل تک پہنچ گئے جس پر لوگ رشک کرتے تھے، ان کی تحریریں فصاحت و بلاغت، زور کلام، قوت استدلال اور انداز بیان کا بہترین نمونہ ہوتی تھیں ان کے مضامین عرب ملکوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے، وہ مقرر نہ تھے مگر جب کبھی مجمع کے سامنے کوئی مضمون پڑھتے تو سامعین ہمہ تن گوش ہوجاتے۔

اللہ نے ان کے دل کو اسلام کی محبت اور ملت کے درد سے سرشار کر دیا تھا، باپ کی تربیت اور صاحبان علم و بصیرت کے فیضان نظر نے اس نشہ کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیا تھا، ابھی شعور کی آنکھیں ٹھیک سے کھلنے بھی نہیں پائی تھیں کہ وہ اسلام کی خدمت اور ملت کی تنظیم کے خواب دیکھنے لگے۔ اس غرض سے ایک سوسائٹی کی تشکیل کی اور اسلام کی بین الاقوامی زبان عربی میں ایک اعلیٰ درجہ کے رسالہ کے اجرا کا منصوبہ بنایا، ان کے حسن نیت نے اس خیال کو مقبولیت عطا فرمائی اور البعث الاسلامی کے نام سے ایک وقیع رسالہ جاری ہوگیا، اور ملل اسلامیہ کے درمیان ربط و نظم کی طرح پڑگئی، جس نے آگے چل کر ایک مؤثر اور مضبوط نظام کی شکل اختیار کی، ندوۃ الشباب العالمیۃ اور رابطۃ العالم الاسلامیہ دونوں ان کے خواب کی تعبیر ہیں ان کے قلم کا اثر روز بروز بڑھ رہا تھا اور مصر و شام، نجد و حجاز اور دوسرے عرب ممالک میں ان کے مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے، ان کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں شائع ہوچکا ہے

مزید کتابیں زیر ترتیب تھیں لیکن ؏

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

عربی کے ساتھ وہ اردو کے بھی بہت اچھے انشاء پرداز تھے، اس کم عمری میں انھوں نے کہن سال مصنفین سے خراج تحسین وصول کیا، مولانا محمد علی مونگیری کی ضخیم سوانح عمری کے علاوہ تصانیف و تراجم کا ایک سلسلہ یادگار ہے، مشہور صاحب علم جرمن مسلمان لیو پولڈ اسد کی کتاب "روڈ ٹو مکہ" (ROAD TO MECCA) کا ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے ایسا رواں اور شستہ کیا کہ اہل زبان عش عش کرنے لگے، مولانا ابوالحسن علی کی تحریروں کے بڑے باکمال مترجم تھے، ان کی بہت سی کتابوں اور رسالوں کو عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں منتقل کیا ہے اور ابھی چند ماہ ہوئے ان کی ضخیم سیرت نبوی کا ترجمہ اس خوبی کے ساتھ اردو میں کیا کہ اصل کا گمان ہوتا ہے، علی میاں ان کی ترجمہ نگاری کے بڑے مداح تھے اور کہا کرتے تھے کہ محمد میاں نقل کو اصل بنا دیتے ہیں۔

علم و ادب میں اس کمال کے ساتھ وہ تہذیب و شائستگی اور شرافت و متانت کا بھی بہترین نمونہ تھے۔ خوردوں کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آتے، دوستوں کی دلداری و دلنوازی کی کوشش کرتے۔ بزرگوں کی تعظیم و توقیر کا ہمہ وقت خیال رکھتے اور ہم نشینوں کی خوشنودی کی فکر کرتے۔ اجنبی آدمی سے بھی ملاقات ہوتی تو مسکراتے ہوئے ملتے۔ ان کے چہرہ کی بشاشت اور خندہ جبینی ان کی لطافت، طبع اور پاکیزگی قلب کی ترجمان تھی۔ ان کی کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ ؏

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

جی چاہتا تھا کہ ابھی کچھ دن اور زندہ رہتے، اپنے بچوں کی بہار دیکھتے۔ گھر والے ان کو دیکھ کر خوش ہوتے، عزیزان کے حسن سلوک سے مستفید اور دوست ان کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی سے محظوظ ہوتے اور ان کے دل ان کی باغ و بہار طبیعت سے باغ باغ ہوتے، ملک و ملت کی خدمت کے نئے نئے میدان تلاش کرتے، ان کا اشہب قلم نئی وادیوں میں قدم رکھتا۔ اس کی جولانیاں نئے معرکے سر کرتیں اور وہ اپنی

سحر آفریں تحریروں سے دلوں کو مسخر کرتے لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مشیت ایزدی کے سامنے کسے مجال دم زدن ہے۔ بندگی تسلیم و رضا کی طالب ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ہ

مکمل اعتماد

مقصد خواہ کتنا ہی رفیع ہو، عقیدہ خواہ کتنا ہی مضبوط ہو، جذبہ چاہے جتنا بھی طاقتور ہو، اگر اس کے راستہ پر (جو اس مقصد کے حصول کے لئے ہم نے اختیار کیا ہے) ہم کو پورا بھروسہ نہیں، ہم پورے اعتماد و یقین کیساتھ اسکی دعوت نہیں دے رہے ہیں، ہمارے لہجہ میں وہ بے خوفی یا وہ استحکام نہیں ہے جو کسی مشاہدہ یا مشاہدہ کے درجہ والے یقین یا اپنے مسلسل تجربہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے تو ہماری یہ دعوت کبھی زیادہ وسعت اختیار نہیں کر سکتی،

لیکن طریقۂ کار، مسلک اور طرز فکر پر یہ یقین تعصب کے ہر شائبہ، انتہاپسندی، مبالغہ آرائی یا سخت گیری کے ہر اثر سے پاک ہونا چاہیئے، اس کا رخ تعمیری ہونا چاہیئے نہ کہ تخریبی، مثبت نہ کہ منفی، مصالحانہ نہ کہ جارحانہ۔ اجتماعیت کی روح کے ساتھ نہ کہ انفرادیت پسندی یا خود پسندی کے جذبہ کے ساتھ۔

اگر چلنے والوں کو اپنے راستہ کی سمت اور صحت کا یقین نہیں ہے تو اس کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ ان لوگوں کے نعروں اور ان تحریکوں اور دعوتوں کا شکار آسانی کے ساتھ ہو جائیں گے جو اپنی راہ و منزل پر نسبتاً زیادہ یقین رکھتی ہیں۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

شاخ ثمرور کی طرح خمیدہ سر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام مکتوب

از: مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل
(رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

گذشتہ سال شعبان میں آپ حضرات سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد بارہا آپ کی خدمت میں عریضہ ارسال کرنے کا ارادہ کرتا رہا۔ مگر میری بدقسمتی کہ مجھے اتنی فرصت نہیں مل سکی کہ حسب خواہش مفصل عریضہ لکھ سکوں۔ مصروفیات زیادہ ہوگئی ہیں اور قویٰ کمزور ہوگئے ہیں اور قوت کار میں کمی آگئی ہے۔ اور ادھر اُدھر کے اسفار کی وجہ سے جسمانی مصروفیت کے علاوہ ذہنی پریشانی بھی ہوتی ہے اور اس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہا کہ آپ سے مکاتبت اور استفادے کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکا۔ اگرچہ آپ کی یاد ہمیشہ رہی اور صحت وعافیت اور درازیٔ عمر کی دعائیں کرتا رہا ہوں۔ اور آپ کی تصانیف کا باربار مطالعہ کرکے حظ بھی اٹھاتا ہوں اور یاد بھی تازہ کرتا ہوں ؎

اے غائب از نظر کہ شدی ہمنشین دل　　　　می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

کل کسی صاحب نے اخبار "جسارت" کراچی کے حوالے سے دفعۃً یہ غم انگیز و روح فرسا خبر سنادی کہ لکھنؤ میں مدیر "البعث الاسلامی" محمد الحسنی کا انتقال ہوگیا ہے۔ خبر سنتے ہی دل کو بے اختیار صدمہ ہوا مگر چونکہ یہ خبر طبیعت کو گوارا نہ تھی اس لئے میں نے تاویل کی، کہ خبر کسی اور کے بارے میں ہوگی یا خبر کی نوعیت کچھ اور ہوگی، اس لئے یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر تحقیق کرنے کا خیال تو پیدا ہوا۔ اخبار جسارت کا وہ شمارہ منگوایا، تو ادارۂ نشریات وتحقیقات اسلام کراچی کے ناظم جناب فضل ربی ندوی کے حوالے سے پوری خبر تھی جس کو پڑھ کر حقیقت معلوم ہوئی اور میری ساری تاویلوں اور امیدوں پر پانی پھر گیا اور دل پر چوٹ لگی اور زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔

طوی الجزیرۃ حتی جاءنی خبرٌ　　　　فزعت فیہ بآمالی الی الکذب

حتی اذا المبدع لما صدقۃ املا شرقت بالدمع حتی کاد یشرق لی

میں کیا عرض کروں۔ اخی المحترم مرحوم کے کن کن کمالات علمی اور اخلاقی کا نقشہ سامنے آیا۔ البعث الاسلامی کا جو بھی تازہ پرچہ آتا۔ میں ضرور ان کی نگارشات قلم کو بڑے ذوق و شوق اور علمی استفادہ کی نیت سے بہ غور مطالعہ کرتا۔ بارہا بعض نکات اور جملوں پر قلبی جذبات تحسین و آفریں کی فراوانی کی بنا پر دعائیں دیتا۔ ان کے محاسن اعمال و اخلاق کا صحیح ادراک تو آپ کو ہے، مجھے آپ کا وہ جملہ اچھی طرح یاد ہے کہ گذشتہ سال کراچی میں ایک صاحب نے جو ناصر کی حمایت کی اور آپ نے پُر جوش انداز میں دلائل کے ساتھ جو اسکی تردید فرمائی تو اس سلسلہ میں آپ نے فرمایا تھا کہ، یہ محمد الحسنی میرے ایسے عزیز بڑے بھائی کا لڑکا ہے جو میرے والد کی طرح میرے مربی اور والد کے قائم مقام تھے۔ اس سے بڑھ کر دوسرا کوئی میرا عزیز نہیں اور یہ مجھے بہت پیارا ہے۔ لیکن اگر یہ بھی ناصر کا حامی بن جائے تو میں اس کو دینی غیرت کی بنا پر چھوڑ دوں گا۔ آپ کے ان جملوں سے مجھے یہ اندازہ ہوا تھا کہ مرحوم کے ساتھ آپ کا کتنا گہرا قلبی تعلق تھا، اس لئے میں نے محسوس کیا کہ جب اُن کی مفارقت کی اس خبر سے میں نے اپنی طبیعت متاثر اور بے حد مغموم پایا اور قلب کو انتہائی صدمہ پہنچا تو آپ کے حساس اور محبّت و مودت سے بھرپور قلب صافی کو اس سانحۂ عظمیٰ سے کس قدر صدمہ پہنچا ہوگا۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ہ للّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ وکل شیئ عندہ بمقدار ـــ یہ صدمہ عزیز برادر زادہ کی جدائی کا بھی ہے لیکن مزید برآں یہ صدمہ ایک ایسے عالم دین کی مفارقت کا بھی ہے جو عربی کا بہترین انشاء پرداز اور بے نظیر اہل قلم تھا۔ عجمی ہوتے ہوئے حجازی لَے سے نغمہ سرائی کر رہا تھا اور حجازی خم ہی کے ذریعہ حجازی مے کی ساقی گری کر رہا تھا۔ درد مند دل کے جذبات و احساسات کو بہترین موثر و دل پذیر انداز بیان کے ساتھ فصیح وسلیس عربی میں عربوں کو پیش کرنے والا حقیقی اسلامی ادیب تھا۔ اکثر اہل کمال و اہل قلم کو دیکھا گیا ہے کہ یہ کمال اُن میں کچھ نہ کچھ غرور و نخوت کا عنصر پیدا کر دیتا ہے (الا ماشاء اللہ) مگر اس وقت تک میری ملاقات صرف دو شخصوں سے ہوئی ہے جو شاخ ثمر دار کی طرح جھکے رہتے تھے اور فضائل و کمالات کی فراوانی نے ان کے تواضع میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ ایک عبد المجید صدیقی مرحوم مقالہ نگار ترجمان القرآن اور دوسرے عزیز مرحوم محمد الحسنی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ گذشتہ سال میں نے بغور مطالعہ کیا، ان کی وضع قطع گفتگو اور طرز تکلّم وغیرہ کسی بات سے یہ مترشح نہیں ہوتا تھا کہ عربی ادب

کے میدان کے شہسوار اور البعث الاسلامی کے مدیر شہیر اور عربی کتب کے نامور مصنف سید محمد الحسنی یہی ہیں، آخری ملاقات جو الو داعی تھی جامعہ اشرفیہ میں عصر کی نماز کے بعد ہوئی تھی۔ آپ کے بعد ان سے مصافحہ کیا تو کشادہ جبینی کے ساتھ نہایت محبت و اخلاص کے انداز میں فرمایا کہ، "پاکستان آکر جن حضرات سے ملاقات و گفتگو ہوئی ہے میں نے تو صرف آپ کو اپنا ہمدم و ہم مشرب پایا اور جی خوش ہوا"۔ ان کے ان معصومانہ اور محبت و خلوص سے بھرے جملوں سے مجھ ناچیز کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اب ان ساری باتوں اور اداؤں کو یاد کرتا ہوں تو طبیعت متاثر ہو جاتی ہے۔ لیکن ارشاد نبوی القلب یحزن والعین تدمع ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا بفراقك یا محمد لمحزونون کے مطابق غم واندوہ کے باوجود صبر و استقامت کا راستہ اختیار کریں گے۔ آپ کی خدمت میں کلمات تعزیت لکھنا تو وہی "پند بہ لقمان" والی بات ہے۔ لیکن من مصاباً فلہ مثل اجرہ کے ارشاد نبوی کے مطابق یہ تعزیت نامہ ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس کی ابدی خوشیاں نصیب فرمائے، قبر مبارک کو انوارِ رحمت و مغفرت سے منور فرمائے۔ اس کی نیکیوں اور دینی خدمات کو شرف قبول عطا فرما کر ان کا بہترین بدلہ عطا فرمائے اور اُن کو کفارۂ زلات بنائے اور مغفرت نصیب فرمائے اور آپ کو اور دوسرے اعزہ واقارب اور متعلقین و متوسلین کو اس صدمۂ جانکاہ پر صبر و استقامت اور اس کو برداشت کرنے کا اجر جزیل عطا فرمائے۔ اور ان کی علمی اور روحانی برکات سے اُن کے پس ماندگان کو نوازے۔ آمین یا رب العالمین۔

فقط والسلام خیر ختام۔

مولانا محمد الحسنی کی تعلیم اور اُن کا مطالعہ

حروف شناسی کی ابتداء سے علم و فضیلت کی انتہا تک

—— مولانا محمد ثانی حسنی ——

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا دست شفقت :

ستمبر ۱۹۳۸ء کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ لکھنؤ بغرض علاج تشریف لائے اور مولوی گنج میں مولانا محمد حسن صاحب کے مکان میں قیام کیا، مولانا کے قیام کی وجہ سے ہندوستان بھر کے علماء و مشائخ حاضر خدمت ہوتے، بعد ظہر مکان پر خواص کی مجلس ہوتی اور بعد عصر مسجد خواص میں عام مجلس منعقد ہوتی خواص کی مجلس میں ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب اور ان کے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی صاحب بھی شرکت کیا کرتے تھے، خدا کے فضل و کرم سے انھیں مجالس میں سے ایک مجلس میں ان ہر دو بزرگوں کے ساتھ راقم الحروف کو بھی شرکت کی سعادت ملی۔ راقم الحروف کی عمر اس وقت ۱۲ سال کی تھی، اتنا یاد ہے کہ جب ہم لوگ بھیڑی منڈی مولوی گنج پہونچے تو زائرین کی بڑی تعداد سڑک پر اور سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور اندر جانے کی اجازت کی منتظر، ڈاکٹر صاحب نے اطلاع کرائی، دروازے پر مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی کھڑے تھے، انھوں نے حضرت تھانویؒ کے پوچھنے پر پوچھا آپ کے ساتھ کون کون ہے؟ جواب دیا میرے بھائی ابوالحسن علی اور میرے بھانجے محمد ثانی، اندر سے اجازت ملی ہم لوگ داخل ہوئے اس وقت حضرت خطوط سن رہے تھے اور جوابات لکھوا رہے تھے۔

۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء مطابق ۱۹ رجب ۱۳۵۷ھ کو خواص کی مجلس میں حضرت مولانا نے ڈاکٹر صاحب سے از خود فرمایا! ڈاکٹر صاحب میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے گھر آؤں انشاء اللہ آج ہی بعد مغرب آؤں گا، پھر حسب ارشاد خواص کی مسجد میں بعد عصر مجلس کرکے اور نماز مغرب پڑھ کر پاپیادہ گوئن روڈ تشریف لے چلے

لوگ سن کر پیچھے پیچھے چلنے لگے، حضرت مولانا، ڈاکٹر صاحب کے مطب میں کچھ دیر بیٹھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بصد شوق و ذوق اپنے بھتیجے محمد میاں کو جن کی عمر تین سال کی تھی گود میں کوٹھے سے لائے حضرت تھانوی نے محمد میاں کو اپنی آغوش میں لیا، سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں، مطب اور مطب کے سامنے شائقین، عوام، خواص کا اچھا خاصہ اجتماع ہوگیا تھا، تھوڑی دیر بعد یہ نورانی مجلس ختم ہوئی اور حضرت اپنی قیام گاہ کو تشریف لے گئے، حضرت تھانوی کی تشریف بری سے اس گھر کو جو شرف اور اس کی وجہ سے اہل خانہ کو جو کیف و سرور حاصل ہوا تھا وہ مدتوں باقی رہا اور آج بھی اس کی لذت اور نورانیت محسوس ہوتی ہے۔

تسمیہ خوانی :

۱۹۳۹ء میں جبکہ محمد میاں کی عمر ۴ سال کی تھی گھر میں تعلیم کے لیے بٹھائے گئے اور اپنی بہنوں کے ساتھ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے مگر قاعدے سے ۱۹۴۱ء میں جبکہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دوبارہ لکھنؤ تشریف لائے اور تقریباً ایک ماہ قیام فرمایا تو کسی تاریخ کو بعد ظہر خواص کی مجلس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی محمد میاں کو لے گئے، حضرت نے پاس بلایا اور بسم اللہ کرائی، محمد میاں کے ساتھ حضرت تھانوی کے ایک مسترشد مولوی عبداللہ صاحب کشمیری کے لڑکے عبیدالرحمٰن بھی تھے۔ ان دونوں نے پڑھا، محمد میاں نے آہستہ آواز میں پڑھا، اور عبیدالرحمٰن نے بلند آواز میں حضرت تھانوی نے محمد میاں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا یہ بچہ نقشبندی ہوگا اور عبیدالرحمٰن کو فرمایا کہ یہ چشتی ہوگا۔ بسم اللہ کی یہ مجلس بڑی بارونق اور نورانی تھی۔ ہر طرف علماء، فضلاء اور اہل اللہ موجود تھے۔ محمد میاں اپنی کم عمری کے دور کے یہ دونوں واقعوں کو اپنی علمی اور دینی زندگی کی ترقیات کا منبع سمجھتے تھے اور اس ابتدا پر بڑا کیف و سرور اور اپنی خوش بختی محسوس کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ ان کو حضرت تھانوی سے بہت زیادہ تعلق تھا اور ان کے دل میں حضرت مولانا کی عظمت اور محبت بلکہ کسی درجہ کا عشق کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور اکثر ان کی تصانیف پڑھا کرتے تھے اور اُن سے بڑا فائدہ اٹھاتے تھے۔

حروف شناسی:

محمد میاں کی تعلیم کو چار دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا دور ان کی عمر کے چوتھے سال سے عمر کے ساتویں سال تک، یہ تین سالہ دور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک کا ہے، اس تین سالہ دور میں انھوں نے اپنے والد ماجد ڈاکٹر صاحب اور محلہ کی مسجد کے امام مولوی محمد سلیم صاحب کشنوی اور کچھ اپنی بہنوں سے تعلیم حاصل کی، بالکل ابتدائی کتابیں، نماز کی تعلیم، قاعدہ بغدادی اور تھوڑی بہت اردو اور پھر قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی اور پھر ان کی بہنوں کو ایک مولوی صاحب پڑھانے آتے تھے جن کا نام مولوی عبداللہ کشمیری تھا جو ڈاکٹر صاحب کو نہ معلوم کیسے دستیاب ہو گئے تھے ممکن ہے حضرت تھانوی کی مجلس میں شرکت کی وجہ سے، کیونکہ ان مولوی صاحب کا بیعت وارادت کا تعلق حضرت تھانویؒ ہی سے تھا، وہ مولوی صاحب بڑے دیندار، ایماندار اور زاہد و عابد خوش اوقات تھے، محمد میاں اپنی ان بہنوں کے ساتھ جو ان سے عمر میں قریب تھیں اور مولوی صاحب موصوف سے پڑھتی تھیں بیٹھ جاتے تھے اور ان سے مانوس ہو گئے اور خود مولوی صاحب کو اس بچے سے اس کی پیاری پیاری باتوں اور ذہانت و ذکاوت کی بنا پر بڑا انس ہو گیا تھا۔

ابتدائی تعلیم:

محمد میاں کی تعلیم کا دوسرا دور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء یا ۱۹۴۷ء تک ہے۔ یہ پورا دور مولوی عبداللہ صاحب کشمیری سے پڑھنے کا ہے، اس دور میں بالکلیہ مولوی صاحب محمد میاں کے استاذ رہے، مکان مسکونہ کے اس کمرے میں جو سڑک کی طرف اوپر ہے یعنی ڈاکٹر صاحب کے مطب کے اوپر والے کمرہ میں اور اکثر اس کمرہ کی طرف جانے والے زینے کے اوپری حصہ پر بیٹھ کر اپنا چھوٹا سا بکس، تختی، رحل، کتابیں اور کاپیاں لئے ہوئے ایک سات سالہ بچہ ایک مولوی صاحب کے پاس بیٹھا ہے بچہ کی آواز تو پڑھنے کی کم آتی ہے، مولوی صاحب موصوف مسلسل بولتے اور تقریر کرتے رہتے ہیں، بزرگوں کے قصے سنا رہے ہیں، صحابہ کی سیرت بتا رہے ہیں اور بڑی میٹھی زبان میں کبھی بیٹے اور نام لے کر کبھی محمد میاں کہتے ہیں، ان کی آواز کبھی کبھی اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ دوسرے کمرے والے لوگ سنتے ہیں، آواز کی شیرینی اور حلاوت ایسی کہ وہ بچہ بڑے شوق

سے سنتا ہے، یہ تھے مولوی عبداللہ، محمد میاں کے استاذ اول، اور وہ تھا وہ بچہ محمد میاں جس نے عمر بھر اپنے ان استاذ کو یاد رکھا ان کے ممنون رہے اور ان کے ساتھ حسن معاملہ کرتے رہے ان کے ادب اور عظمت کو اپنے دل میں بٹھایا، مولوی عبداللہ صاحب نے محمد میاں کو خوش خطی سکھائی، قرآن شریف پڑھایا حساب سکھایا اور اس کی مشق کرائی، فارسی پڑھائی فارسی میں گلستاں بوستاں اور بعض اور دوسری کتابیں پڑھائیں، پڑھانے سے زیادہ وہ تقریر کرتے اور اسباق کو ذہن نشین کراتے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی زیارت و خدمت اور عقیدت و محبت:

مولوی عبداللہ پر مسلم لیگ کے خیالات اور افکار کی پوری چھاپ تھی اس لئے وہ کانگریس اور جمعیۃ علماء کے افکار و خیالات سے ہم آہنگ نہ تھے بلکہ کھل کر مسلم لیگ کی حمایت اور علمائے جمعیۃ کے خیالات کی مخالفت کرتے۔ اگرچہ محمد میاں کو اپنے خیالات کی تعلیم نہیں دیتے تھے مگر ان کے سامنے دوسروں سے بحث کرنے لگتے تھے، یہ صورتحال ایسی صورت میں اور بدنما ہو جاتی تھی کہ یہ گھر جہاں وہ پڑھاتے تھے، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کی آتے جاتے قیام گاہ تھا اور اس گھر والے سب کے سب حضرت مدنی کے ہی عقیدتمند اور ارادت کیش اور ان پر اپنے دل و جان کو چھڑکنے والے تھے، محمد میاں غور سے ان بحثوں کو سنتے ایک طرف استاذ کی عظمت، دوسری طرف والد ماجد کا ادب و لحاظ لیکن ابتدائے عمر سے وہ حضرت مدنی کو دیکھتے ان کی خدمت میں بیٹھتے رہے اور اپنے والد ماجد کو ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے دیکھتے رہے اس لئے استاذ کے سیاسی خیالات کا اثر ان کے دل و دماغ پر نہیں پڑا، بلکہ حضرت مدنی کا احترام دل میں بیٹھا، گھر کے بڑوں خصوصاً والد ماجد کے خیالات و افکار کے نقوش ان کے دل و دماغ کے پردہ پر لاشعوری طور سے ثبت ہوتے رہے۔

ان بحثوں کے باوجود مولوی عبداللہ صاحب مرحوم کا محمد میاں پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے اپنے شاگرد کو اولاد کی طرح پڑھایا اور اپنی محبت کی گرانمایہ متاع ان کو دی، بزرگوں کی عظمت کا سکہ بٹھایا اور ابتدائی تعلیم بڑے اچھے طریقے سے دی، ان کے ذہن کو جلا دی۔

ترجمہ قرآن مجید :

محمد میاں کی تعلیم کا تیسرا دور ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۰ء تک ہے، اس دور کا ابتدائی حصہ مولوی عبداللہ صاحب کی تعلیم دینے کا آخری حصہ بھی ہے یعنی ایک طرف مولوی عبداللہ صاحب محمد میاں کو فارسی اور اُردو کی متوسط کتابیں پڑھاتے تھے اور اس تعلیم کی تکمیل کا وقت قریب تھا تو دوسری طرف ڈاکٹر صاحب محمد میاں کو اپنے خاص انداز اور تجربات کی روشنی میں عربی پڑھاتے تھے، ڈاکٹر صاحب نے محمد میاں کی عربی تعلیم کو قرآن حکیم کی بعض ایسی سورتوں کے ترجمے سے شروع کیا جن میں عموماً قصے ہوتے تھے، جیسے سورۂ یوسف، سورۂ زمر سورہ قصص وغیرہ، قرآن کریم کے ترجمے کو سورہ فاتحہ کے ترجمے سے شروع کیا۔

اسی زمانہ میں ان کے پھوپھی زاد بھائی عزیزی مولوی محمد واضح سلمہٗ (جو بعد میں ان کے بہنوئی بھی ہوئے اور سب سے زیادہ بے تکلف دوست اور ہر وقت کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ساتھی بھی) عربی پڑھنے اسی گھر میں اترے، دونوں کو عربی پڑھنے کا بڑا شوق تھا اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا شوق بھی جس دن محمد میاں نے سورۂ فاتحہ کا ترجمہ پڑھا پڑھ کر فوراً واضح کے پاس آئے اپنے پڑھنے کی خوش خبری سنائی اور واضح کو وہی ترجمہ پڑھایا۔ بعد میں مزاحاً کہتے تھے کہ لو ہم تمھارے استاذ ہو گئے انھیں دنوں واضح سلمہٗ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب دروس الادب لائے جو محمد میاں کے ہاتھوں میں آئی اور انھوں نے اس کو پڑھا اور اس کے الفاظ یاد کیے، اس تعلیم میں ڈاکٹر صاحب نحو و صرف کے قواعد سے صرف نظر کر کے صرف ترجمہ بتاتے تھے اور اگر محمد میاں اٹکتے تو کہتے اس کے معنی تم فلاں لفظ میں پڑھ چکے ہو، یہ لفظ وہی لفظ ہے مگر فرق یہ ہے اس میں الف نون لگا ہے اس کے یہ معنی ہوتے ہیں، اس میں واؤ نون آیا ہے اس کے یہ معنی ہیں، اس میں ت ہے اس کے یہ معنی ہیں، الغرض سمجھا کر ان کے ذہن کو ایسے رُخ پر ڈالتے کہ وہ خود بخود ترجمہ نکال لیتے۔

نیا دینی نصاب تعلیم و درس :

اس کے بعد اس وقت کی رائج مصری کتابوں کو پڑھایا جن میں حکایات للاطفال خاص طور پر قابل ذکر ہے لیکن وہ مصری کتابوں کو ان کی تصویروں اور غیر دینی مضامین کی وجہ سے بچوں کے لیے مفید نہیں

سمجھتے تھے وہ چاہتے تھے کہ بچوں کے لئے ایسا عربی نصاب تیار ہو جو بچوں کے دل و دماغ میں انبیاء کرام صحابہ کرام اور دین اسلام کی عظمت بٹھائے۔

دوسری طرف مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کو لکھا کہ مصر کے مصوّر اور غیر دینی نصاب کا دارالعلوم جیسے مدرسے میں داخل ہونا اور ان کا بچوں کو پڑھانا سمجھ میں نہیں آتا، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے توجہ دلانے اور ڈاکٹر صاحب کی فکرمندی سے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے اپنے خاص انداز اور اسلوب میں قصص النبیین کا سلسلہ لکھنا شروع کیا جس کے تین حصّے لکھے اور اپنے بھتیجے محمد میاں کی طرف ان کو منسوب کیا گویا کہ انھیں کے لیے لکھ رہے ہوں، اس پر جو مقدمہ لکھا اس کا مخاطب محمد میاں کو بنایا۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ بچہ جب دیکھتا ہے کہ اس کا نام اور ذکر کسی کتاب یا مضمون میں لیا جاتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو دکھاتا پھرتا ہے اور دوسرے بچے اس پر رشک کرتے ہیں، یہی حال محمد میاں کا تھا، ان کے چاہنے والے چچا نے ان کے لیے ایک کتاب لکھی دلچسپ اور پراز معلومات پھر ان کا نام چھپا وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے ہم عصروں پر ان کو کسی قدر فخر و ناز ہوا ان کے ہم سبق اور ہمعصر بھائی واضح سلمہٗ کو خیال آیا کہ یہ بھتیجے ہم بھانجے ہمارا تو نام نہیں آیا ان کا آیا ان کو اس احساس پر قلق ہوا۔ محمد میاں کو خدا نے کم عمری کے باوجود ذہن رسا دیا تھا اور تالیف قلب کی دولت عطا کی تھی، ایک لطیفہ کے طور پر بولے تمھارا نام بھی آیا ہے اور واضحۃ سھلۃ کی طرف اشارہ کیا۔

ترجمہ ریاض الصالحین

محمد میاں نے مصری کتابیں پڑھ کر قصص النبیین پڑھی پھر القراءۃ الراشدہ کے حصے پڑھے، ڈاکٹر صاحب نے قرآن شریف کی بعض سورتوں کے ترجمے اور مندرجہ بالا کتابوں کے بعد حدیث کی کتاب ریاض الصالحین پڑھائی۔ اس کتاب کے پڑھانے میں بھی ڈاکٹر صاحب نے بہت سہل طریقہ اختیار کیا، جس وقت محمد میاں ڈاکٹر صاحب سے ریاض الصالحین پڑھتے تھے، اسی زمانے میں واضح سلمہٗ اس کتاب کو دارالعلوم میں پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا قاعدہ تھا کہ خود بھی پڑھاتے تھے اور بعض دفعہ دوسرے سے پڑھواتے تھے ایک دن واضح سلمہٗ پڑھ کر آئے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو بلایا اور کہا کہ ریاض الصالحین کا وہ سبق جو تم پڑھ کر آئے

ہو محمد کو پڑھاؤ، دونوں بچوں کی علمی سطح تقریباً ایک تھی، ایک تو ڈاکٹر صاحب کی موجودگی دوسرا تازہ سبق واضح گھبرائے اور پریشان سے ہوئے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کو جو اس زمانہ میں بعض حوادث کی وجہ سے بہت غمگین اور فکرمند رہتی تھیں اس مبارک کام پر آمادہ کیا کہ وہ ریاض الصالحین کا اردو ترجمہ کریں، بڑے بھائی کے حکم سے انھوں نے دلجمعی کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا اور اس کا نام "زادِ سفر" رکھا، یہ کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی اور بہت سے مدارس میں داخل نصاب کرلی گئی۔ محمد میاں نے اس کتاب کو بھی مطالعہ میں رکھا اور اصل کتاب ریاض الصالحین بھی پڑھتے رہے۔

انشار کا کام:

ان کتابوں کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ انشار کا کام بھی کرنے لگے، شروع میں عموماً اُردو سے عربی اور عربی سے اُردو جملوں اور عبارتوں کے ترجمے کرتے تھے، بالکل شروع میں چند دن انشار کا کام راقم السطور کو دکھایا، اس کے بعد جب اس کا کام اور بڑھا تو دارالعلوم ندوۃ العلمار کے اس وقت کے استاذ ادب مولوی عبداللہ عباس ندوی سے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ وہ محمد میاں کی انشار دیکھ لیا کریں، انھوں نے اس خدمت کو انجام دیا وہ کہتے ہیں۔

> ڈاکٹر صاحبؒ کے حکم سے محمد میاں نے انشار کا کام کئی بار مجھ کو دکھایا، میں نے آٹھ آٹھ صفحے ان کے لکھے ہوئے دیکھے مگر سوائے ایک یا دو جگہ کے کوئی نحوی یا صرفی یا عبارت کی غلطی نظر نہیں آئی، میں نے اس کا ذکر ڈاکٹر صاحب سے کیا تو وہ اتنا خوش ہوئے کہ ان کا چہرہ مارے خوشی کے کھل اٹھا، اور بالکل انار کی طرح روشن اور سُرخ ہو گیا۔

ادب، نحو و صرف اور فقہ:

ادب کی کتابوں میں کلیلہ ودمنہ کا کچھ حصہ راقم السطور سے پڑھا اس زمانہ میں برادرِ عزیز مولوی محمد رابع دارالعلوم سے فارغ ہو چکے تھے اور دیو بند میں کچھ عرصہ رہ کر دارالعلوم دیو بند کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کر چکے تھے ان سے بھی محمد میاں نے گھر ہی پر رہ کر کچھ کتابیں پڑھیں جن میں حماسہ کے بعض ابواب بھی ہیں۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ نحو و صرف سے بالکل بے نیاز ہوں، ان کو بعض دفعہ اپنی اس کمی کا احساس ہوتا تھا، اگرچہ انھوں نے سبقاً سبقاً کوئی نحوی یا صرفی کتاب نہیں پڑھی بلکہ عمومی طور پر اس سے استغنا برتا، لیکن کوئی نہ کوئی کتاب کبھی نہ کبھی مطالعہ میں رکھ لیتے، مثلاً ایک دن راقم السطور سے کہنے لگے۔

"بھلے بھیا! جی چاہتا ہے کہ کوئی نحو و صرف کی ایسی ہلکی کتاب نظر سے گزر جائے جو ذہن و دماغ پر بار بھی نہ بنے اور لکھنے پڑھنے میں کوئی غلطی نہ ہو کوئی ایسی کتاب بتائیے۔"

راقم السطور کو یاد آیا کہ اس نے اپنے شفیق استاذ مولانا شبلی صاحب فقیہ مدرس دار العلوم ندوۃ العلماء کے کہنے پر انھیں سے ایک کتاب ایسی پڑھی تھی جو مختصر بھی ہے اور جامع بھی اس کا نام "ضریری" ہے تو انکو مشورہ دیا کہ تم ضریری پڑھ لو، محمد میاں نے وہ کتاب کتب خانہ سے حاصل کر لی اور اس کے کچھ سبق راقم السطور سے پڑھے وہ کتاب ان کو بھی بہت پسند آئی، انھوں نے مولانا عبدالرحمٰن امرتسری کی کتاب کتاب النحو اور کتاب الصرف بھی مطالعہ میں رکھی، اسی طرح اس وقت کی رائج کتابوں میں النحو الواضح بھی تھی، اور وہ کتاب اکثر گھر میں بھی رہتی تھی اس کو بھی انھوں نے دیکھا تھا مگر سبقاً سبقاً کسی کتاب کا پڑھنا یاد نہیں، فقہ میں کنز الدقائق اور شرح وقایہ کے اکثر اسباق مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب بستوی مظاہری سے پڑھے جو ان دنوں دار العلوم ندوۃ العلماء کے چھوٹے درجوں کو پڑھاتے تھے اور محلہ ہی میں رہتے تھے۔ ادب میں کامل مبرّد مولوی احمد عثمان صاحب ندوی سے پڑھی۔ مجموعۃ من النظم والنثر بھی پڑھی مگر کس سے پڑھی اس کا علم نہیں ہو سکا۔ اور مختارات کا کچھ حصہ اپنے خالہ زاد بھائی مولانا سید ابوبکر صاحب حسنی سے پڑھا جو ان دنوں حلیم مسلم کالج کانپور سے طویل رخصت لے کر ڈاکٹر صاحب کے گھر پر مقیم تھے۔

اُردو انگریزی

مولانا سید ابوبکر صاحب سے ان کے رائے بریلی کے قیام کے دوران روزانہ انگریزی سے اُردو اور اُردو سے انگریزی ترجمہ جملوں میں کرتے تھے، ان کا یہ سبق کسی جگہ بیٹھ کر اور جم کر نہیں ہوتا تھا بلکہ ٹہلتے ٹہلتے اور بات کرتے کرتے نہایت ہلکے پھلکے انداز میں ہوتا تھا، وہ ابتدا تھی جس کے بعد محمد میاں نے انگریزی زبان میں اپنی استعداد بہت بڑھالی تھی اور وہ بے تکلف انگریزی اخبارات

پڑھنے لگے تھے۔ ان کے والد ماجد ڈاکٹر صاحب کا معمول تھا کہ وہ روزانہ ایک انگریزی اخبار اور ایک اردو اخبار منگواتے تھے اور مطالعہ کرتے تھے، اسی وجہ سے محمد میاں نے بھی اپنا یہی معمول بنالیا تھا، اور پابندی سے وہ ان اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے۔

اعلیٰ تعلیم اور حدیث کی تکمیل:

ان کی تعلیم کا چوتھا اور آخری دور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک کہا جاسکتا ہے، جب ان کی علمی استعداد زیادہ ہوئی اور کتابوں کے پڑھنے کا شوق بڑھنے لگا اور ہر علم و فن کی کتابوں کو وہ سمجھنے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے احیاء العلوم پڑھنے کی تاکید کی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابوں میں الخیر الکثیر و الدر المخزون پڑھائی اور اس کا اردو میں ترجمہ کرایا، حدیث کی کتابوں میں مجمع الفوائد پڑھنے کو دی اور اس کی حدیثوں پر نشان لگائے پھر وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی اور تصانیف پڑھنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی کتابوں کو پڑھنے کے لیے دیا، چوں کہ ڈاکٹر صاحب ان ہر دو بزرگوں کے بڑے قائل اور ان سے متاثر تھے اس لیے ان کی کتابوں کو خود رکھتے اور دوسروں کو ان کے پڑھنے کی تاکید کرتے۔

حدیث کی کتابوں میں ریاض الصالحین کے بعد مشکوٰۃ پڑھوائی، اب محمد میاں اس درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ وہ دارالعلوم میں جاکر صحاح کی تعلیم حاصل کریں، اس کام کے لیے ڈاکٹر صاحب کی نظر مولانا شاہ حلیم عطا صاحب سلونی پر پڑی جو اس وقت مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی کے چلے جانے کے بعد حدیث کے استاذ بلکہ شیخ الحدیث ہوئے تھے اور مدتوں سے اس درسگاہ میں حدیث کی خدمت انجام دے رہے تھے محمد میاں نے ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء میں ان کی خدمت میں جاکر حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اس فن کی کتابوں کے پڑھنے کے بعد گویا علوم و فنون کی تعلیم سے فراغت حاصل کرلی۔

مطالعہ:

حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحب سے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ محمد میاں دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ، مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی، مولانا محمد اویس صاحب ندوی سے بھی علمی استفادہ کرتے تھے۔ نیز کتب خانہ میں بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے، خصوصاً سید قطب، شیخ محمد الغزالی، احمد امین

احمد حسن زیات کی تصنیفات سے بہت زیادہ استفادہ کرتے۔ مصطفیٰ لطفی منفلوطی کی کتابوں کو بھی پڑھا جن میں العبرات، النظرات قابل ذکر ہیں، اسی طرح احمد امین کی حیاتی، فجر الاسلام، ضحی الاسلام، امیر شکیب ارسلان کی حاضر العالم الاسلامی مطالعہ میں رکھی۔ طٰہٰ حسین کی علیٰ ہامش السیرہ اور الشعر الجاہلی کا بھی مطالعہ کیا، انکے علاوہ شیخ حسن بنا کی مذکرات الدعوۃ والداعیہ، تحریک اخوان المسلمین کے داعیوں کی تصنیفات خصوصاً سید قطب کی فی ظلال القرآن، العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام، ان کے بھائی محمد قطب اور بہن امینہ قطب کی تصنیفات پڑھیں۔ اور اس جماعت کے اخبارات جیسے، الدعوۃ، منبر الشرق، مصر سے نکلنے والے دوسرے اخبارات، الہلال، الجمہوریہ، الشباب العربی، الازہر برابر مطالعہ میں رکھتے تھے، ریاض سے نکلنے والا رسالہ الدعوہ مدینہ منورہ کا ماہنامہ، الجامعہ روزنامہ المدینہ المنورہ، المنہل مکہ مکرمہ کا، اخبار العالم الاسلامی، التضامن الاسلامی، حضارۃ الاسلام شام کا، لبنان کا الشہاب، کویت کے المجتمع، العربی، البلاغ۔ پھر اسکے بعد تو مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے مسلسل عرب ممالک کے سفروں، مصر و سوڈان، شام و عراق، کویت، شرق اردن کے دوروں نے کتابوں رسالوں کی آمد کا دروازہ کھول دیا، کون سا عربی اخبار تھا جو نہ آتا ہو اور کون سی علمی کتاب تھی جو اس گھر میں موجود نہ ہو یہ سب رسالے، کتابیں محمد میاں نے پڑھیں۔

راقم السطور کو یاد ہے کہ ایک دن وہ اور محمد میاں مولانا محمد اویس صاحب ندوی سے انکے مکان پر جو دار العلوم کے حدود میں واقع تھا ملنے گئے، مولانا نے کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد فرمایا۔

> محمد میاں! ڈاکٹر صاحب اور مولانا علی میاں کا حکم اور مشورہ سر آنکھوں پر مگر میرا حقیر مشورہ یہ ہے کہ آپ سید قطب، غزالی، احمد امین اور عقاد، طٰہٰ حسین، منفلوطی رافعی کی کتابوں کو بہت پڑھتے ہیں، اگر ان کے بجائے امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی تصنیفات کو زیر مطالعہ رکھیں تو آپ کو بہت فائدہ ہوگا، ان کے آگے ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے؟

پھر مولانا نے ان ہر دو بزرگوں کی تصنیفات کی نشاندہی کی اور ان کے پڑھنے پر اصرار کیا، ان کے اصرار پر محمد میاں نے ادھر اور زیادہ توجہ دی، چونکہ ڈاکٹر صاحب اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب بھی ان ہر دو بزرگوں کی تصنیفات کو پسند کرتے تھے اور خود ان کو مطالعہ میں رکھتے تھے، مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے زاد المعاد کا خلاصہ بھی کیا تھا، اس لئے محمد میاں نے زاد المعاد پڑھی، اس کے

علاوہ سیرت ابن ہشام اور دوسری اہم تاریخی اور سیرت کی کتابوں کو مطالعہ میں رکھا۔

غیر مرتب نظام درس اور صرف و نحو سے استغنا کے باوجود علمی فضیلت اور زبان و ادب میں کمال و عبور

پھر وہ زمانہ آیا کہ ان کا محبوب مشغلہ کتابوں کا پڑھنا اور ان کے مضامین کو لکھنا بن گیا اور ان کی میز مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے ہمہ وقت مزین رہتی، ان میں قدیم کتابیں بھی ہوتیں اور جدید مصنفین کی تصانیف بھی، تفسیر، سیرت، حدیث، تاریخ، ادب کی مختلف النوع کتابوں کو وہ پڑھتے ہی رہتے، اس طریقۂ تعلیم اور ڈاکٹر صاحب کی ہمہ وقت توجہ، کتابوں کے مطالعہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ادبی تحریروں اور کتابوں کے پڑھنے، ہر دو برادران عزیزی محمد رابع اور محمد واضح سلمہما جو ہر وقت ساتھ رہتے اور دارالعلوم میں پڑھتے تھے، ان کے ذریعہ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے گھر میں آنے سے محمد میاں کے مطالعہ میں بڑی وسعت پیدا ہوئی اور پھر گھر میں خود ایک مختصر سا کتبخانہ تھا جس میں قدیم و جدید نادر و نایاب مطبوعہ اور قلمی کتابیں تھیں، ان سب کے مطالعہ سے محمد میاں کے ذہن و دماغ، دل اور زبان کو جلا ملی، اور پھر ان کے قلم نے ان کے مضامین کو صفحۂ قرطاس پر ان کے نقوش ثبت کرنے شروع کر دیئے، خدا نے ان کو ذہن رسا دیا تھا اور دماغ روشن بغیر کسی محنت کے اور درسی کتابوں کے سبقاً سبقاً پڑھے بغیر دیکھتے دیکھتے ترقی کے وہ مراحل طے کئے جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

محمد میاں کے صرف و نحو سے استغناء اور ان فنون سے ناواقفیت کا حال اس واقعہ سے بھی معلوم ہو سکتا ہے جو مولانا محمد مرتضیٰ صاحب مظاہری سناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

> ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا جب ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ محمد کو کنز الدقائق پڑھا دیجئے ڈاکٹر صاحب فقہ کی کتابوں میں کنز الدقائق کو بہت پسند کرتے تھے، میں نے ڈاکٹر صاحب کے حکم پر ان کے مکان سے بالکل متصل اس مکان کی اوپری منزل پر جس میں ڈاکٹر صاحب کے بڑے داماد مکرمی سید محمد مسلم صاحب حسنی رہتے ہیں اور جس میں میرا عارضی قیام تھا محمد میاں کو کنز الدقائق پڑھانا شروع کی، ایک دن پڑھاتے پڑھاتے میں نے پوچھ لیا محمد میاں اچھا بتاؤ یہ کون سا صیغہ ہے وہ چپ رہے

میں نے کہا سوچ کر بتاؤ پھر بھی وہ نہ بتا سکے۔ مولوی سید محمد ثانی صاحب بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے کہا کہ انھوں نے نحو وصرف پڑھی کہاں ہے جو آپ صیغہ پوچھ رہے ہیں ان کو تو ماضی کی گردان بھی یاد نہیں ذرا پوچھئے میں نے کہا ماضی کی گردان کرو وہ گردان بھی نہ کر سکے میں نے حیرت و استعجاب سے کہا کہ خدا کی شان اتنی بڑی بڑی کتابیں پڑھتے ہیں اور گردان اور صیغوں تک سے ناواقف ہیں۔"

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ جب انشاء پردازی کے اس بلند مقام تک پہنچ چکے تھے جب مصر و حجاز اور دوسرے عرب ممالک کے علماء، ادباء اور اہل قلم حضرات ان کی تحریروں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے، اور ان کی علمی فضیلت، قلم کی طاقت اور بیان کی لطافت، اور ان کی شگفتہ اور سلیس و بلیغ تحریروں کے قائل ہو چکے تھے جن کا تعارف کراتے ہوئے عراق کے ایک بڑے ادیب، عالم اور صاحب فکر صاحب قلم بزرگ شیخ محمد محمود الصواف نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں طلبہ کے ایک جلسہ میں ان کو اس طرح یاد کیا۔

"عزیز طلبہ تم اس نوجوان (محمد میاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کو جانتے ہو، نہیں بالکل نہیں جانتے، یہ وہ فاتح بے تیغ و شمشیر ہیں جنھوں نے تنہا ایوان ناصری کے کنگرے گرا دیے، علم کدۂ قاہرہ میں ہلچل مچا دی اور ارباب صحافت کی دھجیاں بکھیر دیں، وہ عالم اسلام کے محبوب رسالہ "البعث الاسلامی" کے روح رواں ہیں، میں شدت سے اس کا انتظار کرتا رہتا ہوں، جب تک ہاتھ میں نہیں آجاتا، آنکھیں ڈاک کی طرف لگی رہتی ہیں، میں اداریہ پڑھتا ہی نہیں بلکہ اسے پیتا ہوں، مجھے ان کے سارے اداریئے زبانی یاد ہیں تم سننا چاہو تو آزمالو۔"[1]

وہ محمد میاں جن کے فضل و کمال اور بلاغت و فصاحت سے معمور تحریر کے ایسے بڑے ادیب و مقرر قائل ہیں ان محمد میاں کا حال یہ تھا کہ انھوں نے اپنے انتقال سے صرف ایک ماہ پہلے اپنے موقر رسالہ البعث الاسلامی میں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی پر ایک صفحہ کا مضمون لکھا، صبح کا وقت تھا، وہ اپنی میز کے سامنے بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے کہ راقم السطور اچانک پہنچ گیا، دیکھتے ہی بولے منجھلے بھیا آئیے، ایک

---

[1] تحریر مولوی محمد ایوب صاحب نیپالی ندوی جو اس جلسے میں موجود تھے اور محمد میاں کے میزبان تھے۔

چیز دیکھئے بس ذرا بیٹھئے پورا کرلیں تو دکھاتے ہیں اور وہ تیزی سے اپنا قلم چلانے لگے۔ چند ہی منٹ بعد ایک کاغذ بڑھایا اور بولے۔ ہم نے بھٹو کی پھانسی پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور یہ ابھی کمپوز ہونے جارہا ہے۔ چچا میاں (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) ہیں نہیں وہ سفر پر ہیں۔ چھوٹے بھیا (مولوی محمد رابع ندوی) اور واضح دونوں رائے بریلی میں ہیں، آپ اس پر اپنی نظر ڈال لیں۔

راقم السطور نے حیرت سے کہا۔

"تمھارا مضمون اور میں دیکھوں تم اتنا اچھا مضمون لکھتے ہو کہ میں خود اس سے استفادہ کروں نہ یہ کہ میں دیکھوں یہ کیسی الٹی بات!

وہ مسکرا کر بولے:

ارے دیکھئے بھی اس میں دو چیزیں دیکھنی ہیں (۱) کوئی نحوی یا صرفی غلطی تو نہیں (۲) مضمون کہیں سخت تو نہیں ہوگیا ہے؟ بس اتنا دیکھ لیجئے اور پاس کر دیجئے ہم کو اطمینان ہوجائے گا۔

ان کے اصرار پر میں نے مضمون کو اپنے ہاتھوں میں لیا پڑھا اور کہا۔

"میرے نزدیک کوئی صرفی یا نحوی غلطی نہیں ہے اور اب تو تم کوئی ایسی غلطی بھی نہیں کرتے تمھارا قلم تو بہت رواں، شگفتہ اور پرتاثیر ہوچکا ہے۔

ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

رہا لہجہ کی سختی تو میرا تاثر یہ ہے کہ ذرا سخت ہوگیا ہے مگر کوئی حرج نہیں ماموں جی تو اس معاملہ میں سخت رویہ ہی کے قائل ہیں۔"

محمد میاں بولے۔

"بس بس ٹھیک ہے ہم تو چچا میاں کے خیالات کے ترجمان ہیں، ہمارا قلم ان کے قلم، ہماری زبان ان کی زبان، ہمارے خیالات ان کے خیالات کے تابع ہیں۔

اور یہ کہہ کر مجھ سے مضمون لے لیا، مسکرائے اور بیگ میں رکھ لیا، پھر وہ مضمون چھپا، بعض اہل الرائے کے نزدیک وہ مضمون سخت تھا مگر خال مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اپنے سفر سے واپس ہوئے اور اپنے وطن تکیہ کلاں (دائرہ شاہ علم اللہ) تشریف لائے تو محمد میاں بھی آئے، میں نے ایک صبح کو خال مکرم مدظلہ العالی سے تنہائی میں عرض کیا کہ محمد میاں نے بھٹو پر جو مضمون لکھا وہ آپ نے پڑھا

تو فرمانے لگے! ہاں پڑھا بہت اچھا ہے محمد میاں نے خوب ہی لکھا ہے میں ان کو اس پر مبارکباد دوں گا اتنے میں محمد میاں کمرے میں داخل ہوئے تو خال مکرم مولانا مدظلہ العالی نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور مضمون پر داد دی، محمد میاں اپنے عم مکرم مدظلہٗ کی تحسین اور خوشی پر بڑے متاثر ہوئے اور ان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا میں نے ان کے چہرے کو بغور پڑھا، معلوم ہوتا تھا کہ مارے خوشی کے آنکھوں سے آنسو نکل آئے ہیں، ان کی اس کیفیت سے میرا دل بھی خوشی سے جھوم اٹھا۔

رسائل و جرائد کا مطالعہ اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے بعض رسائل کا ترجمہ

محمد میاں کو ۴۶-۱۹۴۵ء ہی سے جبکہ وہ عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہے تھے ان کے والد ماجد ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب بعض مصری، شامی اور حجازی جرائد و کتب کے مطالعہ پر زور دیتے تھے اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے نام مکہ مکرمہ سے نکلنے والا اخبار "ام القریٰ" آتا تھا۔ اس طرح بعض مصری جرائد اور کتابیں بھی آنے لگی تھیں وہ سب محمد میاں اور برادران عزیزاں مولوی محمد رابع و مولوی محمد واضح کے مطالعہ میں آتی تھیں، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے ۱۹۴۵ء میں ایشیائی کانفرنس دہلی میں عرب نمائندوں اور سفیروں کے سامنے ایک تقریر کی تھی جو الیٰ ممثلی البلاد الاسلامیہ کے نام سے طبع ہوئی تھی، اس کے علاوہ من الجاہلیہ الی الہدایہ طبع ہوئی، پھر ۱۹۴۷ء میں مولانا مدظلہٗ سفر حج پر گئے اور حجاز میں مختلف علماء سے گفتگو کی، تقریریں کیں اور مختلف مکتبوں سے کتابیں خریدیں اور اپنے برادر مکرم ڈاکٹر صاحب کو ارسال کیں، اس سفر میں راقم السطور بھی ساتھ تھا، ایک دن تیونسی علماء سے ملاقات ہوئی، انھوں نے درجنوں اخبار اور جرائد دیئے، یہ ساری کتابیں اور اخبارات ساتھ آئے اور ان کا مطالعہ محمد میاں نے کیا، ۱۹۴۹ء میں راقم السطور حجاز گیا اور تینوں بھائیوں (مولوی محمد رابع ندوی، مولوی محمد واضح ندوی اور مولوی محمد میاں کی ہی نیت سے اہتمام کر کے کتابوں کی دوکانوں سے مختلف کتابیں اور تازہ اخبارات خریدے انمیں عشرۃ ایام فی السوڈان اور انقلابان فی سوریا بالکل تازہ تازہ چھپی تھیں میں بڑے شوق کے ساتھ ان کو لایا اور ان تینوں کو پڑھنے کے لیے دیا۔ ۱۹۵۰ء میں مولانا

سید ابوالحسن علی ندوی اور عزیز مولوی محمد رابع ندوی حجاز گئے، اس سے پہلے مولانا مدظلہ کی ایک اُردو تقریر صورت وحقیقت کا ترجمہ محمد میاں عربی میں کر چکے تھے جس کا نام بین الصورۃ والحقیقۃ رکھا تھا وہ رسالہ عرب حلقوں میں بڑا مقبول ہوا، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب نے اس کتاب کے متعلق مصر سے ۱۹۵۱ء میں اپنے برادر مکرم ڈاکٹر صاحب کو لکھا۔

"محمد میاں کی کتاب بڑی دور دور پہنچ رہی ہے ان کو اپنی عربی تحریر کی مشق خوب کر لینی چاہیئے۔"

دوسرے خط میں لکھتے ہیں :۔

"سب سے زیادہ جو رسالہ مقبول و مؤثر ہوا وہ بین الصورۃ والحقیقۃ ہے پہلے سے اس کا اندازہ نہ تھا، وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی گرفت سخت اور صاف اور مضمون عام فہم اور روزانہ زندگی سے تعلق رکھتا ہے، یہ رسالہ چوں کہ پہلے سے پہنچ چکا تھا اس لئے اس کی اشاعت بھی بہت ہوئی اور اکثر حلقوں میں ہم سے پہلے پہنچ گیا۔"

اسی زمانہ میں محمد میاں نے اپنے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی ایک تقریر (سیرت محمدی کا پیغام) کا ترجمہ عربی میں کیا تھا، اس کا ذکر ڈاکٹر عبدالعلی صاحب نے مولانا موصوف سے خط کے ذریعہ کیا تھا جس کا جواب مولانا نے یہ دیا۔

"آپ نے محمد سلمہ کے ترجمہ سیرت محمدی کا پیغام کا ذکر ہے وہ بھیج دیں تو کسی رسالہ میں شائع ہو جائے گا۔"

پھر جب مولانا موصوف حجاز سے قاہرہ گئے تو ان کو وہ ترجمہ مل گیا وہ اس کی وصولیابی پر لکھتے ہیں۔

"آج کی ڈاک سے محمد سلمہ کا کیا ہوا ترجمہ سیرت محمدی کا پیغام پہنچا، انشاء اللہ یہاں کسی مناسب مجلہ میں شائع ہو جائے گا۔

ابوالحسن علی

(۶ جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۷۰ھ)

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا سفر مصر وسوڈان بڑا کامیاب رہا تھا، اس سفر کی پوری روداد بعد میں چھپی جس کا نام "مذکرات سائح فی الشرق الاوسط ہے۔" وہ کتاب بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے اس سفر کے دوران دونوں بھائیوں کے درمیان خط وکتابت کا ایک سلسلہ قائم رہا، ڈاکٹر صاحب اپنے

قیمتی مشوروں سے مستفید کرتے رہے اور مولانا موصوف وہاں کے حالات وکیفیات اور اپنے سفر کے تاثرات سے آگاہ کرتے رہے، مصر جانے سے پہلے مولانا موصوف حجاز میں ٹھہرے، ان کے ہمراہ عزیزی مولوی محمد رابع سلمہٗ بھی تھے اور مولوی سید محمد طاہر صاحب مولانا معین اللہ صاحب ندوی اور مولوی عبدالرشید ندوی بھی، ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا۔

"رابع سے کہو سید ہاشم علی نحاس کے یہاں سے خریطہ اور با۔ خریطۃ الشرق الاوسط، اور الرابطۃ الاسلامیہ اور الشرق العربی وبعض دیگر جرائد کی ایک ایک کاپی لیتے آئیں"۔

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے مصر سے بہت سی وہ کتابیں اور رسالے جو مصر کے علماء، ادباء اور مصنفین نے ان کو ہدیتًا دی تھیں پارسل کے ذریعہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر صاحب کو بھیجیں تاکہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ محمد میاں ان کا مطالعہ کریں، مولانا نے اپنے خط میں لکھا۔

"ان میں کئی سو کتابیں ہیں جو مصر کے علماء و مصنفین و ادباء نے ملاقات کے وقت ہدیہ دیں، اور بعض کتابیں کتب خانہ ندوۃ العلماء کے لئے اور بعض علماء ہندوستان کے لیے ہیں، سب پر ان کی تصریح ہوگی لیکن زیادہ تر ہماری ذاتی کتابیں ہیں ان میں "العقد الفرید" محمد واضح کو دے دیجائے انھوں نے فرمائش لکھی ہے۔ یہ احمد امین نے ہمیں ہدیہ کی ہے اور وحی الرسالہ ۱، ۲، ۳، اور جو کتاب محمد میاں پسند کریں وہ رکھ لیں، پھر ہم انشاء اللہ آکر جو چیز جہاں کی ہوگی بتلا دیں گے، بدائع المنن بھی اس میں ہوگی اور انشاء اللہ کچھ درسی اور جغرافیائی کتابیں محمد سلمہٗ کی اور بھی کتابیں ہیں جو ہم آکر دیں گے۔ ۲۲ر اپریل ۱۹۵۹ء"

کتابوں کے اس پارسل کے پہونچنے میں بہت زیادہ تاخیر ہوئی جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب اور محمد میاں کو اس کا انتظار بڑا سخت معلوم ہوا اور انھوں نے تقاضہ کا خط لکھا محمد میاں اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

"عم مکرم مدظلہ العالی السلام علیکم

آداب کے بعد گزارش ہے کہ ہم لوگ بعافیت ہیں، امید ہے آپ بھی بعافیت ہوں گے، مکہ معظمہ سے آپ کا گرامی نامہ ملا مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ خیریت وخوشی کے ساتھ واپس لائے، اپنی خاص دعاؤں میں فراموش نہ فرمائیں، پارسل معلوم نہیں کس منزل میں ہے سخت انتظار ہے، ابھی کسی قسم کی کوئی اطلاع یا بلٹی نہیں آئی چھوٹے بھیا (مولانا محمد رابع) کو سلام۔ والسلام محمد ۱۰ر ستمبر ۱۹۵۱ء

اردو تعلیم اور مطالعہ:

اب تک تو محمد میاں کی عربی تعلیم کی سرگزشت بیان کی جارہی تھی، اب ایک نظر ان کی اردو تعلیم پر بھی ڈالتے چلئے، محمد میاں نے اولاً مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی مشہور اور مفید عام کتاب کا سٹ پڑھا اس کے بعد اپنے والد ماجد ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی تصنیف "اسلام کی تعلیم" اور جد امجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی کتابیں، نورالایمان، تعلیم الاسلام پڑھیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کی کتاب "الاصلاح" کو مطالعہ میں رکھا، نیز ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی تصنیف "نماز سمجھ کر پڑھئے" پڑھی جو غالباً خود ڈاکٹر صاحب موصوف نے پڑھائی ممکن ہے یہ کتاب انھوں نے اپنے بیٹے کے لئے ہی لکھی ہو۔ اس کتاب کو محمد میاں بہت زیادہ پسند کرتے تھے اور اس کی اشاعت کرتے تھے اور آخر عمر میں بھی ارادہ تھا کہ وہ اس نایاب کتاب کو دوبارہ چھپوائیں گے سیرت نبوی میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی "رحمت عالم" مولانا سلیمان منصور پوری کی "رحمت للعالمین" اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی "النبی الخاتم" پڑھی، النبی الخاتم کی وہ بہت تعریف کرتے تھے۔ عقائد میں اولاً مولانا خرّم علی صاحب بلہوری کی "نصیحۃ المسلمین" اور بعد میں مولانا اسماعیل شہید کی مشہور و معروف کتاب تقویۃ الایمان اپنے مطالعہ میں رکھی۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں جب کہ ان کی عمر ۸ سال کی تھی، اس وقت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی تصنیف "سیرت سید احمد شہیدؒ" طبع ہو کر گھر پر آئی تھی وہ اتنی خوبصورت تھی کہ ہر ایک اس کو اٹھا کر دیکھتا تھا۔ محمد میاں باوجود اس کے کہ اس کو پڑھ نہ سکتے تھے مگر اس کو دیکھتے اور اس کی خوبصورتی سے خوش ہوتے اور جب ان کی عمر ۹، ۱۰ سال کی ہوئی تو اس کو مطالعہ میں رکھا اور اس سے ان کے معصوم دل و دماغ پر بڑے خوشگوار اثرات پڑے اور جہاد و مجاہدین کی عظمت دل میں بیٹھی۔ اس کتاب کے مطالعہ نے ان کو دینی جذبات سے سرشار کر دیا اور باوجود اپنی کم عمری کے انھوں نے اس سلسلہ کی دوسری کتابیں پڑھنی شروع کر دیں، جن میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کی کتاب "کالا پانی" مولوی عبدالرحیم صادقپوری کی "در منثور" غلام رسول مہر کی سید احمد شہیدؒ، سید صاحب کے حالات پر مشتمل کتاب "وقائع احمدی" مولانا مسعود عالم ندوی کی "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" حضرت سید احمد شہید کی صراط مستقیم اور ان کے قلمی مکاتیب اور اپنے عم مکرم کا عربی رسالہ ترجمۃ الامام احمد ابن عرفان شامل ہیں۔ اس زمانے میں ان کے گھر میں خاندان

کے ایک بزرگ سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی منظوم تصنیف "حسام الاسلام" ترجمہ فتوح الشام پڑھی جاتی تھی تو اس کے جاندار اشعار سنتے اور ان سے اثر لیتے اور بعد میں خود اس کو پڑھا۔

ان کے عم مکرم کے تین رسالے وصیت رسول" "مسلمانوں پر ایک نظر" اور قلب پر تین اثر، تفسیر الیوم اکملت لکم دینکم" چھپ چکے تھے وہ بہت مختصر اور مؤثر تھے وہ محمد میاں نے پڑھے، اسی طرح مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی مشہور کتاب "دعائیں" انھوں نے سبقاً سبقاً پڑھیں اور دعائیں یاد کیں۔

۱۹۴۲ء میں راقم السطور کے بڑے بھائی سید محمود حسن صاحب کا ۲۱ سال کی عمر میں انتقال ہوا، محمد میاں ان سے بہت مانوس تھے، اس حادثہ کا پورے گھر پر بہت اثر تھا، راقم السطور نے ان کے انتقال کے بعد ہی ایک مختصر رسالہ "اسلامی اخلاق" کے نام سے لکھا اور طبع کرایا، اس کی طباعت میں جو کیف وسرور اور نشاط تھا وہ اب تک یاد ہے، سارے بھائی اس کو لئے پھرتے تھے اور تقسیم بھی کرتے تھے محمد میاں مرحوم بھی اس جماعت میں شامل تھے خود بھی پڑھا اور دوسروں کو بھی دیا۔

۱۹۴۳ء میں ادارہ تعلیمات اسلام کا قیام عمل میں آیا اس نے درس قرآن کے ساتھ ساتھ دینی تصنیفات کا ایک ذخیرہ بھی مہیا کیا جو عام فہم تھا، جس میں "رسول اکرم" از مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی، سیرت محمدی کا پیغام از مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی، نیز صحابہ کرام پر الگ الگ رسالے طبع کئے جن کو محمد میاں نے اپنے مطالعہ میں رکھا، انھیں میں راقم السطور کے رسالے امام ربانی مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی تھے جو محمد میاں نے پڑھے۔

۱۹۴۶ء میں محمد میاں کی عمر گیارہ سال کی تھی، اس سال راقم السطور نے ایک مکتبہ کی بنیاد رکھی جس کا نام مکتبۂ اسلام تھا، اس میں حضرت تھانوی کی تصنیفات، ادارہ تعلیمات اسلام کی ساری کتابیں مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی تصنیفات جو استاذ مکرم مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم کے ذریعہ دستیاب ہوئی تھیں جمع کی گئی تھیں، راقم السطور کو اچھی طرح یاد ہے کہ محمد میاں کا اکثر وقت اس دوکان پر گزرتا تھا اور وہ اس مکتبہ کی اکثر کتابیں اٹھا اٹھا کر پڑھتے تھے۔

مکتبۂ اسلام نے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب کی تصنیف "مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" چھاپی وہ طبع ہو کر دہلی سے آئی تو محمد میاں نے اول سے آخر تک اس کو پڑھ ڈالی، اسی زمانہ میں امۃ اللہ تسنیم صاحبہ

(جوان کی پھوپھی تھیں) کی زاد سفر ترجمہ "ریاض الصالحین" چھپی وہ گھر کی چیز تھی اور خاصہ کی، وہ محمد میاں نے پڑھی ان کا شعور بیدار ہوا اور مطالعہ کی قوت بڑھی، علم کا شوق روزافزوں ہونے لگا تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی والدہ ماجدہ کے ہاتھوں میں ایک کتاب رہتی ہے جو ہر وقت وہ پڑھتی رہتی ہیں اس کا نام طریقہ النجاۃ (ترجمہ مشکوٰۃ) ہے وہ کتاب انھوں نے پڑھنی شروع کی اور ختم کر ڈالی اور اس کی کئی حدیثیں زبانی یاد کرلیں، ایک کتاب "میری محسن کتابیں" بھی ہے جسے انھوں نے بغور پڑھا اور اس سے بہت کچھ استفادہ کیا، مولانا شبلی کی سیرۃ النبی، الفاروق، النعمان نیز "دار المصنفین کی مطبوعات خصوصاً سیر الصحابہ نے ان کے ذہن و دماغ پر گہرے اثرات ڈالے۔

رسالے اور ماہنامے:

رسالوں میں سب سے پہلے "پھول" "غنچہ" اور پھر "پیام تعلیم" ان کی نظر سے گزرا، یہ ان کی بہت کم عمری کا زمانہ تھا، اسی زمانہ میں جالندھر سے "مسلمہ" نام کا ایک پاکیزہ ماہنامہ جو مسلم خواتین کے لیے نکلتا تھا ڈاکٹر صاحب اپنی بچیوں کے لیے منگاتے تھے اس میں اکثر محمد میاں کی پھوپھی محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے مضامین شائع ہوتے تھے، وہ رسالہ محمد میاں پڑھتے تھے اور بعد میں خود بھی مضمون لکھا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کا آرگن "الندوہ" قدیم وجدید جو دو مختلف دوروں میں چند سال نکل کر بند ہو چکا تھا اس کے فائل ان کے مطالعہ میں رہے۔

۱۹۴۶ء میں مشہور دینی رسالہ "الفرقان" جو بریلی سے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی ادارت میں نکلتا تھا، لکھنؤ منتقل ہوگیا، اس کا دفتر گویا اس محلے میں لب سڑک کھلا جہاں محمد میاں کا گھر ہے اس رسالہ میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے مستقلاً مضامین شائع ہوتے وہ رسالہ گھر پر آتا تھا، محمد میاں نے اس کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا اور آخر تک مطالعہ کرتے رہے۔

۱۹۴۸ء میں ادارہ تعلیمات اسلام سے "تعمیر" کے نام سے رسالہ نکلنا شروع ہوا، اس میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے بکثرت مضامین شائع ہوتے تھے وہ سارے مضامین محمد میاں کے مطالعہ میں آئے۔ "برہان" دہلی، "معارف" اعظم گڑھ پہلے ہی سے مطالعہ میں رکھے اور آخر زندگی میں "حق" الٰہ آباد اور "الحق" خٹک، "بینات" کراچی برابر مطالعہ کرتے رہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد کا زمانہ محمد میاں کے علم کا روشن زمانہ تھا، وہ اس وقت تک بہت کچھ پڑھ چکے تھے اور ہر وہ رسالہ یا کتاب ان کی نظر سے گزر چکی تھی جو اس گھر میں آتی تھی، ان کا مطالعہ وسیع اور انکی نظر عمیق ہو چکی تھی۔

مختلف علوم کی کتابیں :

علماء و مشاہیر کی آمد اور ان کی تصنیفات کی کثرت نے ہر علم و فن کے مطالعہ کا دروازہ کھول دیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر قرآن ان کی "انشاء ماجد" "حکیم الامت" صدق جدید اور سچ کی فائلوں نے محمد میاں کی زبان وادب کو نکھارنا شروع کر دیا، وہ فکر و ذوق میں اپنے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے متبعؒ اور زبان وادب میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے شاگرد ٹھہرے

محمد میاں کے والد ماجد سے قریبی تعلق رکھنے والے بزرگ مولانا عبدالباری صاحب سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی وہ تصنیفات جو فلسفہ اور معاشیات پر تھیں اور وہ تصنیفات جو حضرت تھانویؒ سے تعلق قائم کرنے کے بعد ان کی تعلیمات پر تھیں جیسے جامع المجددین وغیرہ ان سب کو بغور پڑھا، خصوصاً انکی مذہبی کتابوں کو اپنے پاس رکھا۔

شعر و سخن :

سخن فہمی اور شعر کا ذوق ان کو آبائی ملا تھا، گھر ہی پر کئی شاعر گزرے تھے، ان کے پردادا مولانا فخر الدین صاحب خیالی صاحب مہر جہاں تاب، جد امجد مولانا سید عبدالحی صاحب، صاحب گل رعنا اور دادی محترمہ سیدہ خیر النساء صاحبہ بہتر، پھوپھی امۃ اللہ تسنیم صاحبہ پر مشتمل افراد شاعر بھی تھے اور سخن فہم بھی۔ محمد میاں نے گل رعنا جو شعراء کے حالات اور ان کے کلام کے نمونوں پر مشتمل ہے بار بار پڑھی اسی طریقہ سے دادی صاحبہ کی باب رحمت، پھوپھی صاحبہ کی باب کرم، مولانا فخر الدین صاحب خیالی کا دیوان جو قلمی ہے مطالعہ میں رکھا، گھر کے باہر کے اہل سخن میں، اکبر، اقبال، جگر کے دیوانوں اور کلاموں کے بڑے شائق تھے آب حیات اور علامہ شبلی کی شعر العجم پڑھی، آخر میں زائر حرم حمید صدیقی کا دیوان لغت، گلبانگ حرم بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے اور اس کے اکثر اشعار یاد تھے اور گنگناتے رہتے تھے۔ ان کتابوں کے علاوہ شاید

ہی کسی شاعر کا دیوان خواہ وہ قدیم ہو یا جدید ان کے مطالعہ سے بچا ہو، ان کو اُردو فارسی اور عربی اشعار یاد تھے اور دیوانوں کے کثرت مطالعہ اور خداداد ستھرے ذوق اور سخن فہمی سے ان میں یہ ملکہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ بروقت مناسب حال شعر پڑھتے تھے۔ اور کسی کے نتیجہ میں بے تکلف موزوں مصرعے کہہ دیتے تھے اور اشعار میں اصلاح بھی کر دیتے تھے اس کے باوجود وہ شاعر نہ تھے۔

ان ساری کتابوں کے پڑھنے سے ان کے دل ودماغ میں دین اور اہل دین کی عظمت زبان واَدب کی چاشنی قلم کی روانی علم کی وسعت اور گیرائی گہرائی کے نقوش ثبت ہو گئے۔

اسلوب اور فکر و نظر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مثنیٰ:

انھوں نے اپنے عم مکرم کی چھوٹی بڑی قدیم وجدید ساری کتابوں اور ان کے سارے مضامین کو جو مختلف رسائل اور ماہناموں میں چھپتے رہے تھے پوری توجہ اور انہماک سے پڑھا اور ان کے اسلوب طرز تحریر، فکر و ذوق، احساسات و خیالات کو اپنا کر اپنے قلم میں ان کو سمو دیا اور ان کو اپنا مثل اعلیٰ بنا کر قلمی جہاد شروع کر دیا اور یہ جہاد تا دم مرگ کرتے رہے جس کی انتہا اس مضمون پر ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے انتقال سے صرف ایک دن پہلے ندائے ملت کے لئے لکھا تھا جس کا عنوان تھا "سد سکندری کی نہیں بلکہ سد ایمانی کی ضرورت ہے" جس میں انھوں نے بڑی صاف گوئی اور جسارت و قوت کے ساتھ ایمان کی دعوت دی تھی، محمد میاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۹ء تک تقریباً تیس سال مسلسل پڑھتے رہے اور لکھتے رہے۔ یہ ان کی زندگی کا عزیز ترین مشغلہ تھا، اور اسی طرح جہاد بالقلم کرتے کرتے انھوں نے اپنی جان کو جان آفریں کے سپرد کر دیا، لیکن اس مسلسل جہاد اور تھکا دینے والی مصروفیت کے باوجود ان کا ہر بُن مو کہتا رہا۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ زبان وقلم فکر و ذوق، احساسات وخیالات اور قلب ونظر کی کیفیت اور جسم وجاں کی یگانگت حتیٰ کہ رسم خط طرز ادا میں ان دونوں چچا و بھتیجے میں ایسا حسین، ایسا جمیل اور ایسا دلکش امتزاج پیدا ہو گیا تھا کہ دونوں یک جاں دو قالب

بن کر رہ گئے تھے، اور ان دونوں کی زبان حال گویا ہونے لگی تھی۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(زیر تصنیف کتاب کا ایک اقتباس)

نفاذِ شریعت

ہم نفاذ شریعت میں صرف چور کا ہاتھ کاٹنے اور زانی کو سنگسار کرنے ہی کا مطالبہ نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کے اسباب ومحرکات کے سدباب کا بھی مطالبہ کرتے ہیں۔ . .

. . . . شرعی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ ہم حکمرانوں سے کرتے ہیں، عام راہ پر چلتے ہوئے آدمیوں سے کرتے ہیں، نگہبان اور رعیت کے تمام گوشوں میں نفاذ شریعت کا مطالبہ کرتے ہیں اور زندگی کے تمام میدانوں میں باہم مربوط اور مضبوط کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

وہ فیضانِ حق کا نمونہ تھے

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

محمد میاں، ایک جواں صالح، خدا ترس و خدامست مرد مجاہد تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر غیر معمولی صلاحتیں جمع کر دی تھیں، اللہ کے دین کی حمیت ان کو وراثت میں ملی تھی، اسلام کی خدمت کا جذبہ اور غیرتِ حق ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی، ان کا خمیر تعلق باللہ، تقویٰ اور انابت الی اللہ سے تیار ہوا، بقول مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، اللہ نے ایسی پاک مٹی سے انہیں بنایا ہے جو تیم کے لائق ہو[1] قدرت کی فیض بخشی نے ان کے فکر میں تازگی اور قلم میں جولانی عطا کی تھی، ان کے قلم سے ڈھلے ڈھلائے جملے ایسے نکلتے تھے جن میں فطری آمد تھی، جوش و صدقِ احساس کا ایک ابال تھا جو صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتا۔ انہوں نے کسی عرب ملک میں تعلیم نہیں پائی تھی بلکہ سوائے حج کے کوئی بلاد عربیہ کا سفر بھی نہیں کیا تھا، اور حج کا سفر بھی بہت بعد میں کیا جب کہ عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کی اشاعت کے کئی سال پورے ہو چکے تھے، مگر عربی تحریر پر وہ قدرت تھی کہ عربی کے مسلم صحافی اور اہل قلم ان کے قلم کا لوہا مانتے تھے، ایک فیضانِ حق کا نمونہ تھا، ایک وہبی صلاحیت تھی جس کا سرا محض اللہ کی بخشیدہ صلاحیت سے تھا، زور بازو کو اس میں دخل نہیں تھا، یہ بات ان کے معتقدوں ہی کو نہیں بلکہ معاند کو تسلیم کرنا پڑتی تھی۔ ان کے معاند بھی ان کی ذات کے معاند نہیں تھے، ان سے کسی کو گزند نہیں پہونچا تھا کہ کوئی ان کا حریف ہوتا، ان کا معاند وہی تھا جس کو دین سے عناد تھا، اور اسلام سے جو بغض رکھتا تھا۔ ان کی تحریروں کی قوت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی فکر رکھنے والے عرب نوجوان ان کے مقالات کو اپنے ذاتی خطوط میں نقل کر کے مصر و شام کے دوستوں کو بھیجا کرتے تھے کیونکہ ان ممالک میں "البعث الاسلامی" کا داخلہ بند تھا، اور شام و عراق میں آج بھی بند ہے۔ "البعث الاشتراکی" کے داعی "البعث الاسلامی" کی دعوت کیونکر برداشت کر سکتے ہیں، عربی زبان پر ان کی ماہرانہ دسترس ہمیں مولانا محمد علی جوہر کی یاد دلاتی ہے جنھیں انگریزی زبان

---

[1] حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، کے ذکر میں یہ جملہ مولانا دریابادیؒ نے لکھا ہے۔

میں ایسا انداز تحریر ملتا تھا جس پر انگریز اہل زبان رشک کرتے تھے ،

محمد میاں کے قلم نے کسی کلمہ گو پر کبھی حملہ نہیں کیا ، کسی کی پگڑی اچھالنا ، مذاق اڑانا ، طنز و تعریض کرنا تو دور کی بات ہے اشارۃً کنایۃً بھی کسی کی توہین کا ارتکاب ان سے نہیں ہوا ۔ ہاں جب معرکۂ حق و باطل پیش آیا اور عرب ممالک میں قومیت عربیہ کے نعرہ نے اسلام کے متوازی Parallel جگہ بنانا شروع کی تو وہ اس قومیت کے خرمن پر آگ بن کر برسے اور بجلی بن کر گرے ، اسی طرح بعض عرب " دانش وروں " نے جب مادی فلسفوں کی تبلیغ شروع کی اور جان پول سارٹر کے ادب وجودی کو ایک اعلیٰ فکری نمونہ بنا کر پیش کرنے لگے تو محمد میاںؒ کا قلم غیرتِ حق سے بے تاب ہو گیا اور اس پر مسلسل حملے کئے اور کامیاب حملے کئے ۔

انہوں نے نو عمری میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی تھی ، ان کا پہلا مضمون عربی کے بہت ہی سنجیدہ اور معیاری دینی ماہنامہ " المسلمون " میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا " الاسلام علیٰ مفترق الطرق " اسلام راستوں کے موڑ پر ، اس رسالہ کے اڈیٹر ڈاکٹر سعید رمضان نے یہ مقالہ نمایاں طور پر شائع کیا اور مقالہ نگار کا نام ان القاب کے ساتھ لکھا جو ایک معمّر عالم دین اور کہنہ مشق ادیب کے لئے موزوں ہو سکتا تھا پھر جب وہ لکھنؤ آئے تو انہوں نے محمد میاںؒ کو دیکھا جن کی عمر ۲۱ - ۲۲ سال کی تھی ، چہرے سے بھولاپن اور سادگی نمایاں تھی ، ڈاکٹر سعید رمضان کو یقین دلانے کی ضرورت پڑی کہ واقعی اس مقالہ کے مصنف یہی صاحبزادے ہیں ۔

چہرے بشرے کے بھولے پن کا جہاں تک تعلق ہے وہ ایک متقی ، صالح اور عفیف انسان میں ہمیشہ قائم رہتی ہے ، ان کی عمر اب چالیس سے متجاوز ہو چکی تھی ، مگر ظاہری وجاہت پر صباحت غالب تھی ، ان کی نگاہیں بلند تھیں ، اور آنکھیں حیا و مروت سے ہمیشہ سے نیچی رہتی تھیں ، چالاکی ، فن کاری اور کاروباری انداز کی تہمت ان پر کوئی دشمن بھی نہیں لگا سکتا تھا ، ان کی وفات سے قدرتاً ذہن اُن باکمال انسانوں کی طرف منتقل ہوتا ہے جو عمر کی اسی لپیٹ میں دنیا سے رخصت ہو گئے مگر ان کے کام کی مقدار اور معنویت اتنی ہے کہ اگر کوئی عمر طبعی پا کر بھی اتنا کام کر جائے یا اس سے نصف بھی کرلے تو اس کو ناکام نہیں کہا جا سکتا ، ہاں حسرت یہ ضرور ہوتی ہے کہ اگر کہیں وہ عمر طبعی لے کر اس دنیا میں آئے ہوتے تو امت کے لئے کیا کام کر جاتے ۔ مولانا محمد میاں بلاشبہ انہی باکمال افراد امت میں تھے ، انہوں نے اپنی مختصر عرصۂ حیات میں بڑے کام کئے ، متعدد کتابوں کے ترجمے کئے ، مستقل تصنیفیں کیں ، ان کا آخری ترجمہ سیرۃ النبیؐ کا اردو ترجمہ تھا ، یہ کتاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی

مدظلہ، کی تالیف ہے جو اصلاً عربی میں لکھی گئی اور اس کا ترجمہ محمد میاں نے نبی رحمت کے نام سے کیا ہے۔ اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ آج وہ یہ نذرِ عقیدت اپنے دونوں ہاتھوں سے صاحب سیرتؐ کے حضور میں پیش کر رہے ہوں گے، کہ ان کی زندگی کا یہی آخری کام ہے۔

محمد میاں اپنے عم نامدار حضرت مولانا کے جگر گوشہ اور قرۃ العین تھے، جنھیں دیکھ کر حضرت مولانا کو خود اپنے اندر توانائی محسوس ہوتی ہوگی، ان کی زبان حال محمد میاں کو خواجہ حافظ کی زبان میں مخاطب کرتی ہو تو حیرت کی بات نہیں ہے کہ ؎

ہر چند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم ہر گہ کہ یادِ روئے تو کردم جواں شدم

ان کی طرف سے فرزندانہ سعادت مندی بھی اسی درجہ کی تھی جس کی توقع ایک بامروت، متقی اور شکرگزار دل رکھنے والے سے کی جا سکتی ہے۔ محمد میاں اپنے عم نامدار کے نقش آور آئینہ بن چکے تھے، ان کی تحریر مولانا کی تحریر سے، اور قلم مولانا کے قلم سے مل گیا تھا، خاندانی و موروثی صفات بدرجۂ اتم ان کے اندر موجود تھیں، اپنے آبا، کی مسند کے لئے موزوں ترین فرد تھے۔ اللہ کی طرف سے بخشی ہوئی سکینت جو اہل اللہ کو حاصل ہوتی ہے اور اللہ کا نام پاک ان کے زخمی دلوں کے لئے ٹھنڈے مرہم کا کام کرتا ہے۔ آج اس خانوادہ کا سرمایہ اور یہی ڈھارس ہے۔

شرط اولیں

فتح و کامرانی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ محاذ پر کھڑے لشکر کو قائد اور لیڈر اور جنرل معاصی کے ارتکاب اور محرمات سے دور رکھیں، جس طرح ظہیر الدین بابر نے کیا تھا۔ اپنی تمام تر توجہات و کوششوں کے ذریعے لشکر کے فتح و کامرانی کے منافی چیزوں سے پاک کر دیں چاہے وہ واضح اخلاقی گناہ ہو یا عملی زندگی میں ہو یا عقیدہ و فکر کے میدان میں یا تشکیک و الحاد و گمراہی ہو۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

محمد میاں حسنی

صفات وخصوصیات

از محمد رابع حسنی (ندوی)

عزیز بھائی محمد میاں حسنی جن کو آج بجائے سلمہ کے رحمۃ اللہ علیہ لکھنا پڑ رہا ہے، یہ اندازہ نہ تھا کہ اس قدر جلد داغ مفارقت دے جائیں گے، اور ہمارے خاندان کا یہ عزیز ترین رکن اور ہماری جماعت کا یہ ممتاز فرد دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمد میاں مرحوم ابھی جوان ہی تھے، لیکن انھوں نے اپنی چھوٹی سی عمر میں خاصا تحریری وفکری کام انجام دیا، ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ فکر وادب کا جتنا ذخیرہ اس نوجوان قلم نے اب تک پیش کیا ہے آئندہ متوقع عمر میں کم از کم اتنی ہی مقدار کا ضرور اضافہ کرے گا، لیکن تقدیر الٰہی میں ان کی عمر مختصر تھی۔

محمد میاں نے شمسی تاریخ سے ۴۴ سال اور قمری تاریخ سے ۴۵ سال کی عمر پائی، اس میں سعی وعمل کی ۲۵ سالہ عمر انھوں نے ساری کی ساری خدمت، دعوت فکر اسلامی میں گزاری۔ ان کا قلم اس پوری مدت جوش وجذبہ کے ساتھ رواں دواں رہا، ان کا ذہن رسا، ہمت بلند، ذوق ستھرا اور ادراک قوی تھا، وہ عمر کے آخری دن تک لکھتے اور کام کرتے رہے اور جب چند گھنٹوں کی علالت کے بعد اس دنیا سے اچانک رخصت ہوئے تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ایک انہونی تھی جو پیش آگئی جو سنتا تھا تعجب کرتا تھا، اور رنج سے مغلوب ہو جاتا، لوگ کہتے کہ ابھی کل تک تو صحت ونشاط کے عالم میں ملاقات ہوئی تھی، ابھی کل تک ان کو مرنجاں مرنج دیکھا اور پایا تھا، لیکن واقعہ واقعہ تھا، قضا وقدر کا معاملہ، اللہ تعالیٰ کی مرضی۔ للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شیٔ عندہ باجل مسمّی، اللہ ہی کا ہے جو اس نے لیا اور اس نے دیا اور ہر شے اس کے یہاں ایک مدت کے ساتھ ہے۔

محمد میاں اپنی کئی بہنوں کے درمیان تنہا بھائی تھے اور سب بہنوں سے چھوٹے تھے، لہٰذا ان کی پیدائش نہ صرف ان کے والدین بلکہ ان کی بہنوں اور ان کے اہل تعلق کے لیے بے حد مسرت کا باعث تھی، چنانچہ ان کے

نشأ و نما کا زمانہ والدین کی خصوصی شفقت اور بہنوں کی خصوصی محبت میں گزرا، لیکن اس کے باوجود نشأ و نما کے زمانہ میں بھی ان کے عادات وصفات پسندیدہ رہے۔ ان کے بڑوں کے دل میں ان کی محبت نہ صرف یہ کہ قائم رہی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہا، اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد ہونے کی وجہ سے محمد میاں کو کم عمری ہی میں اپنے والدین کے انتقال کا غم سہنا پڑا۔ والدہ کے انتقال کے وقت وہ صرف ۲۲ سال کے اور والد کے انتقال پر ۲۶ سال کی عمر کے تھے۔ اس طرح پر نوعمری میں، ان پر گھریلو ذمہ داری کا بڑا بوجھ پڑ گیا۔ انھوں نے اس سلسلہ کی ذمہ داری کو خوبی کے ساتھ اٹھایا اور اپنے والدین کے خلف الصدق ثابت ہوئے۔

محمد میاں کی شعوری عمر کا نصف حصّہ ان کے عظیم والد ڈاکٹر مولانا سید عبد العلی حسنی کی سرپرستی اور تربیت میں گزرا۔ یہ ان کے نشأ و نما کا دور تھا، اس میں ان کے علم وادب اور بنیادی اخلاق وافکار کی بنیاد پڑی، ان کی تعلیم وتربیت کا بیشتر کام ان کے فاضل والد نے خود اپنے تجربوں کی روشنی میں اور خصوصی اہتمام سے انجام دیا، انھوں نے عربی تعلیم کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بالکل اچھوتا تھا، انھوں نے صرف ونحو کے بجائے خود زبان ہی کو اصول اور زبان ہی کو اساس بنایا، ان کی نظر میں زبان کو فطری طریقہ سے سکھانے کا یہی صحیح طرز تھا، انھوں نے محمد میاں کو اس طرز کے ذریعہ عربی دانی اور عربی نگاری کی کامیاب منزل تک پہنچا کر اپنے اصول کی کامیابی کا ثبوت فراہم کردیا، محمد میاں کی عربی صلاحیت کی ساری اساس اسی مذکورہ بالا طرز پر ہی قائم تھی جس کی صحت وتاثیر کا خراج ان کو سارے عالم عربی سے ملا۔

محمد میاں کے فاضل والد مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب جنھوں نے علوم دینیہ کی مکمل تعلیم حاصل کرنے کے بعد عصری تعلیم میں بھی نمایاں معیار سے کامیابی حاصل کی تھی، علم وتعلیم کا بہت اچھا تجربہ وذوق رکھتے تھے، انھوں نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ دنیاوی نظام تعلیم مسلمان کے انسانی ودینی کردار وشخصیت کو ایک ضرر پہنچا دیتا ہے جس کا مکمل ازالہ زندگی بھر نہیں ہو پاتا، اور یہ کہتے تھے کہ یہ ضرر مجھ کو بھی ہوا ہے میں باوجود کوشش کے اب تک اس کو دور نہیں کرسکا ہوں، چنانچہ انھوں نے اپنے بیٹے کو جو ان کے اختیار میں تھے، عصری علوم کی درس گاہوں میں نہیں بھیجا اور مادی مستقبل کی فکر سے بے نیازی اختیار کی، تعلیم کے حصول میں ان کا نقطۂ نظر علم کی فکر زیادہ اور سند کی پرواہ نہ کرنے کا تھا، چنانچہ ان نظریات پر عمل انھوں نے خود اپنے بیٹے پر پورے اخلاص سے کیا، حالانکہ ایک کامیاب ایم، بی، بی، ایس ڈاکٹر ہونے کے ناطے وہ بہتر سے بہتر مادی تعلیم دلا سکتے تھے، یہاں یہ تذکرہ مناسب ہوگا کہ مذکورہ بالا طرز عمل کی وجہ سے محمد میاں کی تعلیم

بالکل نئے طریقہ سے ہوئی جس میں کسی تعلیم گاہ میں نام کے اندراج و سند کے حصول سے بالکل بے نیازی تھی اسی طرح محمد میاں کے اخلاق و نیک نفسی ان کے والد کی تربیت و توجہ کا بڑا حصّہ ہے۔ متعدد خوبیاں اپنے والد سے ورثہ میں پائیں اور متعدد صفات ان کے والد کی خصوصی تربیت کا نتیجہ ہیں۔

محمد میاں کی شعوری عمر کا بقیہ نصف حصّہ ان کے فاضل یگانہ چچا مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی سرپرستی اور رہ نمائی میں گزرا، انھوں نے اپنے عم معظم سے بہت سی باتیں اخذ کیں، طرز زندگی میں ان کا نمونہ اختیار کیا، تصنیف وتالیف وادب کی راہ سے دین ودعوت دین کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا۔ محمد میاں کی زندگی کے مادی تکفل کے لیے ڈاکٹری پیشہ اور طبی مشغولیت آبائی ورثہ تھا، خاندان کے بزرگ بھی ان کی معاشی زندگی کے لیے یہی راہ پسند کرتے تھے، اور اسی کو تجویز کرتے تھے، لیکن انھوں نے اس سلسلہ میں کسی کی تجویز واصرار کو منظور نہیں کیا، بعض تعلق والوں کی ناگواری برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن یہ قبول نہیں کیا، کہ وہ کوئی ایسا کام اختیار کریں جس کی مشغولیت ان کو علم وادب کے دعوتی راستہ پر گامزن ہونے سے مانع بنے۔

محمد میاں نے اپنے عم معظم کے طریقہ کو ایسے ذوق وشوق سے اختیار کیا کہ تعبیر وزبان میں ان کے مثنی بن گئے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب حسنی مدظلہ کی تحریر وزبان میں خواہ عربی ہو یا اردو محمد میاں کی تحریر وزبان کا جوڑ بالکل محسوس نہیں ہوتا ـ فکر سے فکر تحریر سے تحریر مل گئی ہے، انھوں نے اپنے عم معظم کی جن عربی کتابوں یا مضامین کا اردو میں اور جن اردو کتابوں یا مضامین کا عربی ترجمہ کیا ہے لوگ یہ بتانے ہی پر مان سکے کہ وہ ترجمہ ہے ورنہ وہ اصل مصنف کی عبارت ہی سمجھی جاتی تھی اس طرح پر وہ اپنے مفکر وداعی عم معظم کے لیے بڑے اچھے معاون اور کامیاب نائب ثابت ہوئے اور ان کے دعوتی ادبی کاموں میں بڑی تقویت کا باعث تھے۔

محمد میاں کی رحلت صرف ایک ایسے بھائی یا دوست یا محب کی رحلت نہیں، جو کم عمری میں اس دنیا سے رخصت ہو کر دلوں کو ملول کر گیا ہو بلکہ یہ رحلت اس داعی کی ہے جو اپنی طاقتور مؤثر تحریروں سے مسلمان ذہنوں کی آبیاری کرتا تھا، وہ مسلمانوں کی ذہنی وعملی بے راہ روی کو چوٹ پہونچاتا اور صحیح ذہن واخلاق کا محل بناتا تھا، وہ ایک طرف غلط ذہنی رجحانات پر حملہ کرتا تھا دوسری طرف نوجوان مسلم نسل کے لیے فکری رہنمائی کی راہیں بناتا تھا، اس کے قلم کی جولانگاہ اُردو اور عربی دونوں تھیں لیکن عالم عربی میں محمد میاں کو جو شہرت

حاصل ہوئی اور وہاں ان کے مضامین کی جو قدر ہوئی وہ اُردو کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عظیم ہے، محمد میاں نے ۱۹۵۶ء میں اپنے بعض دوستوں کی رفاقت میں عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کا اجراء کیا، یہ ہند و پاک میں اپنے معیار کا پہلا عربی رسالہ تھا، پرچہ نکالنے والے کی ہمت تھی کہ عربی صحافت کے بالکل اجنبی ماحول میں اس نے ایسا جرأت مندانہ اور حوصلہ مندانہ اقدام کیا، وسائل کی کمی اور حالات کی ناسازگاری کے باوجود عربی صحافت کے اس پودے نے درخت بننا شروع کیا اور چند سال ہی میں محمد میاں کے مضامین کی گونج عالم عربی میں سنائی دینے لگی اور "البعث الاسلامی" نے شہرت حاصل کرنا شروع کردی۔ اس پرچہ کی ہمت افزائی کرتے ہوئے ندوۃ العلماء نے اس کو اپنا ترجمان بنا لیا اور آج جبکہ اس عربی ماہنامہ کی عمر کے ۲۳ سال گزرے ہیں اس کا روح رواں اس دنیائے فانی سے دارباقی کو رحلت کر گیا۔ البعث الاسلامی کی شہرت و مقبولیت میں ان افتتاحیوں کا بڑا دخل ہے جو محمد میاں نے ۲۳ سالہ مدت میں تحریر کیے۔ البعث میں ان کے قریبی رفیق و شریک کار مولانا سعید الرحمن صاحب ندوی رہے جن پر اب البعث الاسلامی کے کام کا بار بڑھ گیا ہے

محمد میاں کے لکھے ہوئے مذکورہ بالا افتتاحیوں کا جو پہلا مجموعہ "الاسلام الممتحن" کے نام سے سال گزشتہ مصر سے شائع ہوا، اس نے موجودہ عالم اسلام کی مؤثر کتابوں کی صف میں ممتاز جگہ بنائی ہے مضامین کا دوسرا مجموعہ بھی "الاسلام بین لا و نعم" کے نام سے اشاعت کے لیے ناشر کے پاس بھیجا جا چکا ہے، محمد میاں نے البعث الاسلامی کے علاوہ عربی پندرہ روزہ الرائد کے لیے بھی بالتسلسل مضامین لکھے جو عالم عربی میں شائع ہونے والے رسالوں اور اخباروں میں بار بار نقل کیے گئے اور ان کے اثرات و طاقت کو محسوس کیا گیا، اس اخبار کے بھی اجراء کے وقت سے محمد میاں نے اس سے دلچسپی رکھی اور معاونت کی اور اس کی ترقی و تحسین کے سلسلہ میں بڑا تعاون کیا۔ الرائد میں محمد میاں صفحہ اول پر الاضواء کے عنوان سے مستقل کالم لکھتے تھے جو دلچسپ اور مؤثر ہوتا تھا، انھوں نے اس کے لیے آخری بار ایک بہت اچھا اور فکر انگیز کالم تحریر کیا تھا، ان کے انتقال کے بعد بلکہ ان کے انتقال کی خبر کے ساتھ شائع ہوا۔

اُردو میں محمد میاں کے قلم کا اصل میدان ندوۃ العلماء کا پندرہ روزہ "تعمیر حیات" بنا۔ وہ اس کے اجراء کے وقت سے عرصہ تک اس کے فعال مدیر رہے، وہ اس کو اپنے طاقتور مقالوں کے ذریعہ اپنی زندگی کے آخری وقت تک مدد پہنچاتے رہے۔ "تعمیر حیات" کے علاوہ پندرہ روزہ "ندائے ملت" میں بھی محمد میاں کے مضامین شائع ہوتے رہے جن سے ندائے ملت کے قارئین کو فکری و اسلامی غذا ملتی رہی، اس کے لیے بھی محمد میاں نے اپنی زندگی

کے آخری دن تک مضمون لکھا، ان کا آخری مضمون اس میں ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

محمد میاں کی تصنیفات اور ترجموں میں ان کی تصنیفی صلاحیت اور زبان کی خوبی نے پڑھنے والوں سے خوب داد لی، انھوں نے سادات حسنی کے ایک بڑے مورث حضرت شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح لکھی، انھوں نے بانی ندوۃ العلماء کی ایک وسیع سوانح بھی مرتب کی، انھوں نے ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی کی رُوداد "رُوداد چمن" بڑے اثر انگیز انداز میں مرتب کی جو ان کے زورِ قلم اور خوبی کی ایک اچھی مثال ہے ——— ان کی اور بھی کئی تصنیفات ہیں، ان کے ترجمے اُردو سے عربی اور عربی سے اردو دونوں زبانوں میں ہوئے، ان میں سے بعض ترجمے مستقل تصنیف کی حیثیت کے مالک ہیں، تصنیف و ترجمہ ملا کر محمد میاں کی ۱۹ کتابیں ہیں۔

محمد میاں کو نوجوان مسلم نسل میں زندگی کا صحیح شعور پیدا کرنے اور ان کو دعوت اسلامی کے لئے متحد کرنے کا بے حد جذبہ تھا، اس سلسلہ میں ان کا ذہن نئی اسکیمیں سوچتا جن کے بنیادی اشارے وہ اکثر صفحۂ قرطاس پر بھی لے آتے، ان کے ذہن میں ایک ایسی تربیت گاہ کی بھی ضرورت ابھرتی رہتی، جس کے ذریعہ نئی نسل میں صحیح دینی شعور، حقائق زندگی کی صحیح فہم، تجرباتی علوم میں امتیاز و کمال اور دعوت اسلامی کا جذبہ اور حکیمانہ مہارت پیدا کیا جانا آسان ہو۔ اس سلسلہ میں عربی کے پندرہ روزہ الرائد میں، ان کا آخری مضمون جامعۃ البعث الاسلامی ان کے مطمح نظر کی پوری تصویر پیش کرتا ہے، ندوۃ العلماء کی تحریک کو انھوں نے اپنی تحریروں میں بہت سراہا ہے اور اس سے بڑی توقعات قائم کی ہیں، انھوں نے اپنی کئی کتابوں میں اس کے پیغام اور کام کی وکالت اور مؤثر ترجمانی کی ہے، ان کی اس سلسلہ میں یہ تمنا رہی کہ اس کے بانیوں کے تیار کیے ہوئے نقشہ کے وہ پہلو بھی نافذ العمل ہو سکتے جو مختلف موانع اور دشواریوں کے باعث ابھی تک عمل میں نہیں آسکے۔

محمد میاں کے ذوق میں نفاست اور اپج تھی، ان کی نظر تنسیق و ترتیب و حسن و جمال کی طرف بآسانی پہونچتی، نئی اسکیم ترتیب دینے میں ان کا ذہن بہت اچھا چلتا تھا، ان کی یہ خوبی ان کے رفقا اور دوستوں کو معلوم تھی چنانچہ ایسے موقعوں پر ان کے مشوروں سے بہت فائدہ حاصل ہوتا تھا۔

محمد میاں نے آج سے پندرہ بیس سال قبل نوجوانوں کی دعوتی وحدت کی خاطر ایک بین الاقوامی ادارہ کی تشکیل بھی کی تھی جس کا نام انھوں نے "الرابطۃ الاسلامیۃ الدولیۃ" ICIO رکھا تھا، اس ادارہ نے ایک سہ لسانی پندرہ روزہ بھی نکالنا شروع کیا تھا جو صحیح الفکر مسلم نوجوانوں میں جذبۂ یک جہتی پیدا کرنے میں اچھا ذریعہ بنا تھا۔ یہ ادارہ متعدد دشواریوں کی بنا پر زیادہ ترقی نہ کر سکا۔ اور حالات کے تقاضے

نے اس کے کام میں افسردگی پیدا کردی۔

محمد میاں اخلاق و محبت میں اپنے تمام ہم عمروں میں ممتاز اور نمایاں تھے، کسی شخص سے ان کی کشمکش یا لڑائی نہ تھی، وہ اس طرح کے کسی امکان سے بہت دور تھے، اگر کسی وقت ایسی کوئی صورت پیدا ہونے لگتی تو اس سے بہت خوبی کے ساتھ بچنے کی تدبیر اختیار کر لیتے خواہ اس سلسلہ میں ان کو اپنے جائز فائدہ سے دست بردار ہونا پڑتا، بعض وقت ان کو اپنے جائز احساسات وجذبات کا خون کرنا پڑتا، یہ ان کی افتاد طبع تھی دراصل وہ اس کے قائل تھے کہ

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

غریبوں، حاجتمندوں کی مدد وہ اخفاء کے ساتھ کرتے رہتے حتی کہ متعدد ضرورتمندوں کی ان سے غیر محسوس طریقہ پر وابستگی ہوگئی تھی، اعزاء کے ساتھ ان کا معاملہ اسلام کے صلہ رحمی کی تعلیمات کے مطابق تھا اور یہ بات انھوں نے اپنے والد اور دادا سے ورثہ میں پائی تھی اور خود ان کے عم معظم کا طرز عمل ان کے لیے نمونہ تھا، اپنے چھوٹوں کے ساتھ ایسا خاطر و شفقت کا تعلق رکھتے، جس میں بے تکلفی اور خوش طبعی کا رنگ چھایا رہتا، اور اپنے بڑوں کے ساتھ خواہ وہ ان سے دو چار سال ہی بڑے ہوں، محبت واحترام کا رویہ رکھتے تھے، یہ احترام خشک احترام نہ ہوتا، بلکہ اس میں انس وانبساط کی آمیزش ہوتی، چنانچہ خاندان کے چھوٹے و بڑے سب ان سے خصوصی انس ومحبت و لحاظ کا معاملہ رکھتے تھے۔

محمد میاں نے بزرگوں کے واقعات اور دل میں دینی گداز پیدا کرنے والی کتابوں کا مطالعہ کچھ عرصہ سے بڑھا دیا تھا۔ اس مطالعہ سے نیز اہل دل کے پاس وقتاً فوقتاً جانے سے ان کی زندگی میں تقویٰ، مالی معاملات میں احتیاط اور لوگوں کے ساتھ غیر ضروری اختلاط سے پرہیز بڑھ گیا تھا، سخاوت کا مزاج شروع ہی سے تھا، اس نئے رنگ کے بعد مال کی بے وقعتی اور دوسرے کی مدد کا رجحان زیادہ ہو گیا تھا۔

چند سال قبل سے ہی ان پر دنیا سے بے رغبتی کا اثر غالب ہونا شروع ہو گیا تھا، اس سلسلہ میں کئی سال پہلے انھوں نے لکھنؤ قیام کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی اختیار کرکے اپنے بزرگوں کے وطن مالوف تکیہ کلاں، رائے بریلی جا کر یکسوئی کا قیام اختیار کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن جب ان کے عم معظم خال معظم مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے ان کی لکھنؤ ہی میں رہ کر اپنی دعوتی وتحریری کوششوں کو قائم رکھنے کی تاکید

کی تو انھوں نے اطاعت کے جذبہ سے اپنا فیصلہ بدلا۔

محمد میاں میرے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے، وہ مجھ سے عمر میں کچھ چھوٹے تھے لیکن کم عمر ہی سے ان کا میرا ساتھ رہا تھا جس کی وجہ سے نیز ان کے انبساط و محبت کے طرز کی وجہ سے میرا ان سے صرف برادرانہ ہی نہیں، بلکہ ایک طرح سے دوستانہ تعلق بھی پیدا ہو گیا تھا، پھر دینی فکر و نظر اور علمی و ادبی ذوق میں توافق کی وجہ سے مزید ربط و بے تکلفی و انس قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک نہایت مختصر بیماری کے بعد جب انتقال ہوا تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ واقعہ پر کیسے یقین کیا جائے، اور کیسے اس تصور کو حقیقت مانا جائے کہ محمد میاں اب ہمارے درمیان نہیں ہیں اب کیسے ہمارے فکر و ذوق کی دلکش محفلیں آباد رہیں گی۔ اب کیسے ہماری عربی تحریر و ادب کی دلچسپیاں قائم رہیں گی، اب کیسے ذوق و شوق کی تازگی باقی رہے گی، محمد میاں اپنے ہم ذوق رفقار کے لیے شمع انجمن تھے، یہ شمع اب خاموش ہے۔ ۱۲ جون کی صبح سے ان کو پیٹ میں معمولی درد کا احساس ہوا، اس کے لیے انھوں نے دوا استعمال کی، لیکن اس درد میں کوئی کمی نہیں ہوئی، ان کے خالہ زاد بھائی مولانا سید ابو بکر حسنی موجود تھے، انھوں نے مختلف معالجین سے رجوع کیا جن میں ایک ایلوپیتھک ڈاکٹر نیز حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب جب سہ پہر کے وقت آئے تو ان کے اتفاق و تائید سے اسپتال لے جانا طے ہوا، تاکہ بتدریج کم ہوتی ہوئی طاقت کو سنبھالنے کی کوشش کی جا سکے، اسپتال میں کوششیں کی گئیں لیکن تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد شب جمعرات ۱۳ جون سوا نو بجے دل کی حالت بگڑ جانے پر وہ اس دار فانی سے دار بقار کو رحلت کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمد میاں نے اردو عربی میں مضامین اور کتابوں کی شکل میں علمی یادگار چھوڑی ہے، اسی کے ساتھ ان کی سعادت مند اولاد ان کی بڑی یادگار ہے۔ ان کے تین بیٹوں میں سے بڑے بیٹے سید عبداللہ الحسنی تعلیم سے فراغت حاصل کر چکے ہیں، ان کے علمی و ادبی ذوق میں ان کے والد کے اثرات ہیں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی اولاد کو ان کا نعم البدل بنائے اور دینی جد و جہد کے میدان میں ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا، اس کو دور فرمائے (آمین)

وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام تعزیتی مکتوب

مولانا عبدالماجد ندوی
اُردو سکشن، سعودی ریڈیو، جدہ

"حادثۂ فاجعہ" کی اطلاع آج دس بجے صبح کو برادر عزیز مولوی سلمان عابد شمسی نے مدینہ منورہ سے فون پر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، دل دھک سے ہوگیا۔ "خبر" پر کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا، میں نے سوالات کے بوچھار کر دیئے، کب ہوا، کیسے ہوا، کیوں کر ہوا۔ ذریعۂ اطلاع کیا ہے؟ وہ جواب دیئے گئے۔ دو روز پہلے ہارٹ فیل ہوگیا، حضرت شیخ کے پاس ٹیلکس آیا ہے، میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پھر کرید کیا۔ چاہتا تھا کہ ذریعہ اطلاع میں کوئی شبہ کی گنجائش نکل آئے اور اس طرح پھر اپنے دل کو بہلا وا دوں۔ مگر جب انھوں نے مکرر یقین دہانی کی تو ٹیلیفون کا ریسیور رکھ کر اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ بالکل ساکن و ساکت۔ جیسے تیسے دفتر کا ضروری کام کیا اور وقت سے پہلے ہی گھر آگیا کہ آپ کو تار بھجوا دوں اور جب بچوں نے آکر اطلاع دی کہ تار ہوگیا تو قدرے سکون ہوا، لیکن طبیعت کی بے چینی اور رنج و غم بدستور باقی رہے کسی کروٹ چین نہ مل سکا اور عصر سے اس وقت دس بجے رات تک یہی سوچتا رہا کہ آپ کو تعزیت کا خط لکھوں، مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ لکھوں بھی تو کیا لکھوں ؟ تعزیت کا تار تو دے ہی چکا ہوں، اس میں بطور خاص یہ کلمہ بھی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ اب میری تحریر سے کیا آپ کے رنج والم میں کچھ تخفیف ہوسکے گی؟ میں کیا ہوں اور میری حیثیت کیا؟ پھر بھی اس وقت دس بجے رات کو خط لکھنا شروع کر دیا ہے اور اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے ہی دل کے واردات لکھے ہیں۔

استاذی وسیدی! معلوم نہیں حادثہ کے وقت آپ پر کیا گزری، اور اب جبکہ تین یا چار روز گزر چکے ہیں آپ پر کیا بیت رہی ہے، حادثہ بہت عظیم ہے اور آپ کی بہ نسبت عظیم سے عظیم تر۔ سوچتا ہوں کہ اس وقت آپ کی کیا کیفیت رہی ہوگی۔ بیس سال پہلے کے اس حادثہ کو یاد کرتا ہوں جب ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا انتقال ہوا تھا، آپ گھر پر نہیں تھے، جنازہ لکھنؤ سے تکیہ کلاں (رائے بریلی) لے جایا گیا۔ ۱۸ گھنٹے کے انتظار کے بعد گھر میں لوگوں کی رائے یہی ہوئی کہ اب مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔ آپ اس کے چھ گھنٹے کے بعد تکیہ پہونچے۔ میں نے آتنا دیکھا کہ محمد میاں کو آپ نے اپنے سینہ سے لگا لیا اور وہ آپ کے گلے میں چمٹ گئے آپ کے منہ سے رلائی کی ایک آواز نکلی اور پھر سسکنے لگے۔ یہ حالت بھی دو تین منٹ سے زیادہ نہیں رہی۔ پھر دیکھا کہ آپ سراپا صبر و شکر بنے ہوئے ہیں، جی بھر کر رو لیتے تو شاید کچھ طبیعت ہلکی ہو جاتی، یہ اپنے او پر قیاس کر کے کہہ رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ آپ کے لئے سب کچھ تھے عمر کی تفاوت کی وجہ سے آپ انھیں بڑا بھائی نہیں بلکہ باپ سمجھتے تھے اور وہ بھی آپ کے ساتھ کچھ اسی نوعیت کی شفقت فرماتے تھے۔ اس وقت آپ نے اس غم کو سہار لیا۔ اس واقعہ پر قیاس کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اس بات کی توقع کرتا ہوں کہ اس وقت بھی اس نے آپ کے دل کو بے قابو ہونے نہیں دیا ہوگا، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اگرچہ دونوں واقعات میں بہت بڑا فرق ہے، اس وقت ایک باپ کے مانند سن رسیدہ بڑے بھائی کا غم تھا اور اس وقت ایک صلبی بیٹے کے مانند جواں سال بھتیجے کے فراق کا غم ہے۔ اس وقت آپ نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنا چاہا ہوگا تو دل خون خون ہو گیا ہوگا اور جگر زخموں سے چور۔ مجھے اس وقت جگر مرادآبادی مرحوم کا ایک شعر یاد آرہا ہے اور وہ یہ ہے اور آپ کے بالکل حسب حال ہے ؎

نہ جانے آہ کہ اُن آنسوؤں پہ کیا گزری
جو دل سے آنکھ تک آئے مژہ تک آنہ سکے

استاذ محترم! اللہ تعالیٰ نے آپ کو کوئی اپنی صلبی اولاد نہیں دی کہ وہ اپنی حکمت و مصلحت کو خود ہی بہتر جانتا ہے، مگر آپ کے یہ ہونہار بھتیجے جو آہ کہ اب مرحوم ہو چکے۔ اس کمی کو بدرجہ اتم پوری کرتے تھے۔ خاص کر ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی وفات کے بعد تو کلیتہً اسی حیثیت میں آگئے تھے۔ نہ ان کا کوئی اب دوسرا باپ رہا تھا اور نہ آپ کا کوئی دوسرا بیٹا۔ اب آپ ہی ان کے باپ تھے اور وہ

ہی آپ کے بیٹے۔ آپ اُن سے اور وہ آپ سے "انا منه وهو منی" کے بمصداق۔ آپ کو اس جواں سال جواں مرگ بھتیجے کی جدائی کا جتنا بھی غم ہو کم ہے۔ اس حادثہ نے آپ کی کمر توڑ کر رکھ دی ہوگی، ان کی وجہ سے اپنی کبر سنی میں جو رعنائی آپ محسوس کرتے تھے وہ اب اس بقیہ زندگی میں شاید ہی محسوس ہو۔ معلوم نہیں آپ کی نمناک آنکھیں کب خشک ہوں گی اور ہوں گی کہ نہیں۔ کون جانے۔ بس اللہ ہی آپ کے دل کی تشفی کر سکتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آپ کے ساتھ گھر کے سبھی افراد سوگوار ہوں گے۔ محبی مولانا محمد رابع صاحب اور برادر عزیز مولوی واضح صاحب کے ایک ایک بازو کٹ کٹ گئے اور جہاں تک ان کی بہنوں کا تعلق ہے تو پانچوں بہنوں میں وہ تنہا اور منفرد ایک بھائی تھے، اور سب سے چھوٹے۔ سب بہنیں اپنی اپنی جگہ پر حضرت خنساءؓ بنی ہوئی ہوں گی، اور عجب نہیں کہ اُن سب کو حضرت خنساءؓ کے یہ دلدوز اشعار یاد ہوں اور دل ہی دل میں پڑھتی ہوں ؎

أعينيَّ جودا ولا تجمدا　　الاتبكيان لِصخرِ النَّدیٰ
ألاتبكيان الجريَّ الجميلَ　　الاتبكيان الفتى السيّدا
طويل النجاد رفيع العماد　　ساد عشيرته أمردا
إذا القوم مدّوا بايديهم　　الى المجد مد اليه يدا
فنال الذی فوقَ ايديهم　　من المجد ثم مضى مَصعدا
ويحمل للقوم ما عالهم　　وان كانَ اصغرَهم مولِدا

اللہ تعالیٰ آپ کے یہ دونوں خواہر زادوں (محبی مولانا محمد رابع اور برادر عزیز مولوی واضح رشید) کو سلامت رکھے۔ ان دونوں میں آپ تسلی کے بہت سے اسباب پائیں گے، کہ یہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ بہر حال ایک حیثیت رکھتے ہیں اور آپ سے اتنے قریب ہیں جتنا کہ مرحوم قریب تھے۔ برادر زادہ اور خواہر زادہ میں چنداں فرق تو نہیں بلکہ بسا اوقات بوجہ خواہر زادہ زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود مختلف اسباب کی بنا پر ان میں سے کوئی ان کا بدل نہیں ہو سکتا، بقول حالی ؎

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں؟

یہ تو تھی مرحوم کی آپ سے نسبی و قرابت کی بات اور حیثیت۔ دوسری حیثیتوں سے آپ کے لئے وہ کیا کچھ تھے اسے زیادہ بہتر آپ ہی سمجھتے ہوں گے، کسے معلوم کہ وہ کیا تھے اور عمر طبعی کو پہونچتے پہونچتے کیا سے کیا بنتے۔ بس ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ خوش درخشید ولیکن شعلۂ مستعجل بود۔

"البعث الاسلامی" جب انھوں نے نکالا تو شروع شروع میں بلاشک آپ ان کی عربی کی اصلاح فرماتے تھے مگر جلد ہی وہ خود کفیل ہو گئے، اور اس حد تک کہ آپ مکمل طور پر ان پر اعتماد کرنے لگے۔ اس وقت ان کی عمر ہی کیا تھی ؟ مگر ؎

بالائے سرش ز ہوش مندی　　　　می تافت ستارۂ بلندی

جلد ہی ان کے فکر و فن (تحریر) میں پختگی پیدا ہو گئی، اور پھر تو وہ اپنی تحریر میں ایسی سحر آفرینی دکھانے لگے کہ بہتوں کو کوسوں اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔ اس وقت میرے سرہانے ان کی کتاب "الاسلام الممتحن" رکھی ہے، جو ان کی حمیت اسلامی، غیرت ایمانی اور عربی انشاء پردازی کی زندہ دلیل ہے۔ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" آپ نے "تقدیم" کے نام سے جو اس پر مقدمہ لکھ دیا ہے، وہ "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" کے مکمل مصداق ہے۔ انھوں نے کس "دار العلوم" میں تعلیم حاصل کی؛ کس "خانقاہ" میں "تزکیہ" کے لئے گئے۔ کس معلم سے "وجوہ اعراب" سیکھے، کہاں سے اسلامی حمیت اور ایمانی غیرت کے جذبات ان کو حاصل ہوئے۔ نیکی و شرافت کی بات ان کے اندر کہاں سے پیدا ہوئی—؟ آداب مجلس اور فرق مراتب کے اصول کہاں سے سیکھے؟ یہ سارے کمالات ان کے اندر کیوں کر اور کس طرح پیدا ہوئے۔ یہ سب باتیں آپ نے جستہ جستہ اپنی "تقدیم" میں لکھ دی ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان سب باتوں کے ساتھ ان کی اپنی خداداد صلاحیت تھی جس نے انکو اس بلند مقام پر پہنچایا۔

یہ تقدیر الٰہی تھی کہ ان کی وفات سے ڈیڑھ دو سال پہلے ہی آپنے ان کی سیرت و کردار، تعلیم و تربیت اور جوش عمل کے بارے میں چند صفحات لکھ دیئے۔ اب اگر کچھ لکھنا چاہیں تو شاید نہیں لکھ پائیں گے بھلے ہی کوئی اس کا ترجمہ کر دے تو کر دے۔ آپنے ان کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشی ہوئی تھیں۔ ان خوبیوں کے علاوہ ان کے اندر دوسری خوبیاں بھی تھیں جن کو آپ اتنی تفصیل سے نہیں جانتے اور نہ جان سکتے تھے، جتنی تفصیل سے ان کے ہمسر

اور ہم عصر دوست واحباب جانتے ہیں ۔ ہم عصروں اور برابری والوں کے ساتھ نہ بغض وحسد، نہ کینہ و عداوت، نہ رشک ومنافست، نہ برتری کا احساس اور احساس کہتری کا شکار، وہ اپنے دوستوں میں ایک اعجوبہ روزگار تھے، نہ کسی کی غیبت، نہ کسی کی چغلی، نہ افترا پردازی، نہ دشنام طرازی، سب کے ساتھ اخلاص ومحبت سے پیش آنے والے، بڑوں کی توقیر اور چھوٹوں سے شفقت کرنے والے، نہ بحث وتکرار کے عادی تھے، نہ جنگ وجدال کے خوگر، وہ تو سب سے میٹھی باتیں کرتے تھے، ایک پیکر اخلاق اور مجسمہ اخلاص تھے۔ ان کی کن کن خوبیوں کو یاد کرکے رووُں۔ "دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار" اسوقت مجھے ایک واقعہ "بڑوں کی توقیر" کی مناسبت سے یاد آگیا ہے، اس کا ذکر کرتا ہوں۔ یاد نہیں، کسی مضمون کا عربی ترجمہ میں نے کیا اور وہ ان کے رسالہ "البعث الاسلامی" میں چھپا۔ پرچہ مجھے ملا تو دیکھا کہ "لن یرضی" کی اصلاح کرکے "لن یرض" بنا دیا گیا ہے۔ میں نے مجی مولانا محمد رابع صاحب سے دوستانہ انداز میں کہا کہ دیکھئے محمد میاں اپنی عربی تحریر اور انشار پردازی میں اوج کمال پر پہنچے ہوئے ہیں، مگر چونکہ انھوں نے باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی ہے اور نہ صرف ونحو پڑھی ہے۔ اس لئے ایک صحیح کلمہ کو اصلاح دے کر غلط بنا دیا۔ اس پر مجبی مولانا محمد رابع نے ان کو ایک طرح سے ڈانٹا اور کہا کہ خبر دار جو آئندہ سے مولوی عبد الماجد صاحب کے کسی مضمون یا ترجمہ میں تم نے قلم لگایا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ "کام" اُن کا نہ تھا خواہ مخواہ مولانا محمد رابع صاحب کا عتاب اُن پر نازل ہوا جس کا مجھے افسوس بھی ہوا، مگر واہ ری ان کی عالی ظرفی، انھوں نے مجھ سے یہ شکایت بھی نہیں کی کہ آپنے بلا تحقیق مجھے مجرم گردان دیا۔ ایک دوسری مثال ان کی "بحث وتکرار سے پرہیز" کی ہے، اس کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا۔ ۶۷ء کی جنگ سے کوئی چھ ماہ پہلے مولانا یوسف بنوری مرحوم قاہرہ تشریف لے گئے تھے، واپسی پر انھوں نے اپنے رسالہ "البینات" میں مصر کے حالات پر کچھ بے اطمینانی کا اظہار فرمایا۔ اس کے چھ ماہ بعد اکتوبر ۶۷ء کی جنگ پیش آئی اور اسرائیل نے اچانک حملہ کرکے مصری فضائیہ کو بالکل تہس نہس کر دیا۔ جمال عبد الناصر کی ساری ڈینگیں پانی کے بلبلے اور نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ مرحوم مجھ سے کہنے لگے کہ "یہ ہے فراست مومن" مولانا بنوری نے اسی اندیشہ کا اظہار کیا تھا" میں نے انھیں ٹوکا اور کہا کہ "یہ فراست مومن" نہیں ہے، چھ ماہ نہیں بلکہ سال بھر ڈیڑھ سال پہلے سے یہ خطرہ منڈلا رہا تھا اور لوگ بہ چشم سر دیکھ رہے تھے کہ ع نامت نوا لطیر مصر عن

ثعالبھا" آپ کو یاد نہیں کہ دو ڈھائی سال پہلے جب مولانا یوسف بنوری قاہرہ کی یاترا کرکے آئے تھے تو اسی رسالہ البینات میں مصری حکومت اور مصری حکام خاص کر جمال عبدالناصر کی مدح سرائی کرتے نہیں تھکتے تھے، اس وقت اگر یہ بات کہتے تو بے شک اسے مومنانہ فراست کہا جا سکتا تھا بیچارے مرحوم میری اس تقریر کو سن کر دنگ رہ گئے، میرے کسی ایک جملہ کا انھوں نے جواب نہیں دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری اس تقریر سے ان کی رائے بدلی تھی یا نہیں، بظاہر مطمئن ہو گئے تھے یا پھر خاموشی ہی کو انھوں نے تقاضائے ادب سمجھا، وہ محبی مولانا محمد رابع صاحب کے رشتہ سے مجھے بھی اپنا بڑا سمجھتے تھے یہ ان کی شرافت تھی، ایسا نیک طینت انسان کہاں ملے گا۔ "بڑوں" کا پاس ادب، بزرگوں کا احترام، والدین کی اطاعت و فرمانبرداری، ان کی اس طاعت گزاری اور نیک طینتی کو دیکھ کر اگر ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ ان سے کہتے ہوں کہ ؎

اذا کان اولاد الرجال حزازۃ

فانت الحلال الحلو والبارد العذب

تو کوئی تعجب نہیں۔ انھوں نے جو یہ "آداب فرزندی" سیکھے تو وہ کوئی مدرسہ و خانقاہ کی کرامت نہ تھی، بلکہ ان کے اپنے مشفق باپ کی تربیت اور اپنے شفیق "چچا میاں" کی نظر عنایت تھی، کہ وہ کندن بن کر نکلے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔ وہ صحیح معنیٰ میں برًّا بوالدیہ اور غرس طاب غارسہ فطابا کے مصداق تھے۔

سنا ہے اور آپ اس کو زیادہ بہتر جانتے ہوں گے کہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ اپنی اولاد کی تربیت میں خاص اہتمام فرماتے تھے، وہ اپنے گھر میں ناول وغیرہ کی کتابیں آنے نہیں دیتے تھے، فرماتے تھے کہ کسی مخرب اخلاق ناول کی کتاب کا گھر میں آنا ایک بیسوا کے آنے سے زیادہ برا ہے۔

غالباً ۵۰ء کی بات ہے جب میں درجہ تکمیل ادب سے فارغ ہوا تو رمضان کی چھٹیوں میں مولانا ابواللیث کی خواہش پر رام پور چلا گیا، وہاں ڈاکٹر نجات اللہ صاحب صدیقی۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب ڈاکٹر اشفاق وغیرہ علی گڑھ سے آکر دھرنا دیئے بیٹھے تھے کہ تیجئے اب ہمیں پڑھایئے، میں نے وہاں سے محبی مولانا محمد رابع صاحب کو ایک کارڈ لکھا تو آخر میں باب النسیب کا ایک شعر لکھ دیا، شعر یہ تھا۔

صحائف عندی للعتاب طویتھا ستنشر یوما والعتاب طویل

بھلا اس ہیں کون سی بات تھی، مگر ڈاکٹر صاحبؒ اس معاملہ میں "مجھ" سے بھی بہت زیادہ حساس تھے۔ کارڈ ضبط فرمالیا، یہی ان کی تربیت تھی جس کی وجہ سے محمد میاں چاند بن کر طلوع ہوئے مگر افسوس کہ مہ کامل بننے سے پہلے ہی غروب ہو گئے۔ خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود۔

طالب علمی کے زمانے میں تو میں ڈاکٹر صاحبؒ کے قریب بھی نہ پھٹکا، کبھی دوا اور علاج کے لیے بھی ان کے پاس جانے کی نوبت نہیں آئی، جو کچھ تعلق تھا آپ سے تھا، آپ کو پکڑ پکڑ ہوسٹل میں جائے کے بہلنے لے آتا تھا۔ مگر ۵۰ء میں اپنی تقرری کے بعد مجی مولانا محمد رابع صاحب کے رشتہ سے کبھی کبھی آنے جانے لگا۔ ۵۶ء میں ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے مجھے بکار ندوہ کلکتہ بھیجا۔ وہاں سے کامیاب واپس آنے کے بعد مزید کچھ قریب ہوا۔ پھر اہلیہ محترمہ کے انتقال کے بعد اور زیادہ قریب ہو گیا، وہ مجھ سے بڑی شفقت و محبت فرماتے، پہلے میں ان سے رعب کھاتا تھا، لیکن جب قریب ہوا تو انھیں لین العریکہ اور دمث الخلق پایا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ میں ایک خاص بات نظر آتی تھی اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات طیبہ میں جو یہ آتا ہے کہ "مَن رَاٰہُ بدیھۃً (او بداھۃً) ھَابَہٗ ومَن خَالَطَہٗ مَعْرِفَۃً اَحَبَّہٗ" مجھے اس کی کچھ پرتو ان میں نظر آتی تھی "کچھ" اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ ادب کا مقام ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی وفات پر ایک مضمون لکھنا چاہا تھا مگر بعض لوگوں کی مبینہ رخنہ اندازی کے باعث نہیں لکھ سکا۔ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔ ایک مرتبہ ان کی طرف سے عمرہ کیا تھا، اس کے سوا اب تک کچھ نہیں کر سکا۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ ایک مرتبہ میں سخت بیمار پڑا تھا، ملیریا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر دھون نے کونین کی ٹکیاں دیدیں اس سے میری طبیعت اور خراب ہو گئی، آپ ڈاکٹر صاحب کو مجھے دیکھنے کے لئے ندوہ لے آئے تھے پھر انھیں کے علاج سے میں الحمد للہ شفایاب ہوا، اس سے پہلے میں جب بورڈنگ کا نگراں تھا تو ایک طالب علم سخت بیمار پڑا، اس کے پاس علاج کے لئے پیسے بھی نہ تھے مگر میں جب ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے پاس گوئن روڈ گیا تو وہ اسے دیکھنے کے لئے تشریف بھی لے آئے، دوائیں تو وہ ندوہ کے طلبہ کو اپنے پاس سے دیتے ہی تھے، دوائیں دیں اور دار العلوم سے اس کے لئے کچھ روپیوں کی منظوری بھی دے دی۔ اللہ تعالیٰ باپ بیٹے دونوں پر اپنی رحمت کی بارش کرے اور اپنی خاص نعمتوں سے نوازے۔

استاذ محترم! محمد میاں کی جدائی آپ کے لئے بہت ہی شاق ہوگی، پھر ایک ایسے ہونہار

فرزندکی۔ معلوم نہیں آپ کے سینے میں غم کے کتنے طوفان امنڈ رہے ہوں گے، شاید کچھ ایسی ہی نوعیت اس بے چاری عورت کی رہی ہوگی جس نے اپنے ہونہار بیٹے کے مرنے پر اپنے مرثیہ میں یہاں تک کہہ ڈالا کہ ؎

من شاء بعدك فليمت وعليك كنتُ احاذرُ

آپ ایسی بات تو ہرگز نہیں کہیں گے مگر آپ کے دل کی کیفیات کچھ اسی قسم کی ہوں گی، اللہ تعالیٰ آپ کو صبر و سکون بخشے، اور زیادہ نڈھال نہ ہونے دے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

استاذی الجلیل! میں نے یہ تعزیتی خط تار دینے کے بعد رات کو لکھنا شروع کیا تھا مگر زیادہ لکھ نہ سکا، دوسرے روز ۱۷ر جون کو تو قلم بھی نہیں پکڑا، بار بار طبیعت بھر آتی رہی، کل ۱۸ر جون کو لکھا، اور آج ۱۹ر جون کو اسے اتنے ہی پر ختم کر رہا ہوں۔ ان کی نیکی، شرافت، صلاح و تقویٰ، اور علم و استعداد پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے ؎ "سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے" مگر تعزیتی خط لکھ رہا ہوں، ان پر کوئی مضمون نہیں لکھ رہا ہوں، پھر بھی یہ اتنا طویل ہو گیا، حدیث لذیذ بود دراز تر گفتم۔

آہ! محمد میاں! (یہ سطریں لکھتے ہوئے آنکھیں پھر اشک آلود ہو گئیں) الوداع اور رخصت الی رحمۃ اللہ وفسیح جناتہ۔ آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے، اللہ کی ذات سے امید ہے کہ آخرت میں تم اپنے والدین اور چچا میاں کے لئے "فرط" ثابت ہو گے اور جنت الفردوس میں ان سب کا استقبال کرو گے۔

رَحِمَ اللهُ اَعظُمًا دَفَنُوهَا سجستان طلحة الطلحات

تم بلاشبہ "طلحۃ الطلحات" تھے۔ اب ہم تمھیں اسی نام سے یاد کریں گے۔

حزین القلب

ناچیز

عبدالماجد ندوی

محمد میاں مرحوم

حکیم عبدالقوی دریابادی

مولوی محمد الحسنی معروف بہ محمد میاں مدیر عربی ماہنامہ البعث الاسلامی (ندوۃ العلماء لکھنؤ) چند گھنٹوں کی مختصر لیکن شدید علالت کے بعد ۱۳ جون، چہارشنبہ کا دن گزر کر شب کے ابتدائی گھنٹوں میں یکایک سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عمر صرف ۴۴ سال کی تھی۔ یہ مولانا حکیم سید ڈاکٹر عبدالعلی حسنی سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فرزند دلبند اور مبلغ اسلام سید ابوالحسن علی ندوی کے بھتیجے تھے۔ انتہائی سعید و صالح ملت کے ہونہار ترین اہلِ قلم میں ان کا بجا طور سے شمار ہوتا تھا۔ عربی اور اردو دونوں زبانوں پر قادر عربی کی مشق کچھ اور بڑھی ہوئی اہل نظر کی نظر میں ان کی عربی تحریر اثر و گداز اور گہری اسلامیت کے لحاظ سے قطب شہید مصری مرحوم کی ٹکر کی ہوتی تھی۔ خود مولانا علی میاں مدظلہ، کے بیان کے مطابق ان کی بعض عربی تحریریں خود ان کی تحریروں سے بھی بڑھ کر ہونے لگی ہیں۔

عربی، اردو وانگریزی کی ساری تعلیم کسی مدرسہ یا اسکول، کالج یا دارالعلوم میں نہیں متعدد ماہر فن اساتذہ سے نہیں صرف ایک شخص اپنے فاضل والد ماجد ڈاکٹر عبدالعلی صاحب سے انتہائی خاموشی کے ساتھ حاصل کی۔ ان کے گھر والوں حتیٰ کہ خود مولانا علی میاں کو بھی شروع شروع میں ان کی علمی صلاحیتوں و تحریری قابلیتوں کا اتنا اندازہ نہ تھا۔ صرف ایک استاد جو اپنی کم سخنی کے لئے شہرت رکھتا تھا کہ تعلیم و تربیت کا فیض حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی مطالعہ سے ایسی استعداد نوعمری میں حاصل کر لی جو پختہ عمروں کو بھی شاذ و باید نصیب ہوتی ہے۔

آسٹرین نومسلم محمد اسد (سابق نام لیوپولڈ ولس) کے سفرنامہ عرب روڈ ٹو مکہ کا سلیس اردو ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" کے جاذب نظر عنوان سے سلیس و شگفتہ زبان میں کیا، بانیٔ دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری کی سوانح، خوب مفصل و مستند لکھ کر مصنف و سوانح نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ آخر میں جشن ندوۃ العلماء کی تفصیلی روداد کے سمندر کو "روداد چمن" کے کوزہ میں بند کیا۔ ان کی اس

تصنیف پر مرحوم مدیر "صدق جدید" مولانا عبد الماجد دریابادی اپنی علالت کے آخری زمانہ میں تبصرہ کرتے ہوئے مرتب کو جو داد دی تھی وہ ان کے سے تنقید نگار قلم سے بہت کم نوعمر اہل قلم کو ملی ہوگی یہ آخری مکمل تبصرہ تھا جو مولانا مرحوم کے قلم سے "صدق جدید" (اشاعت ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۶ء) میں نکلا تھا جس میں کتاب کو بہت ہی جید و بلیغ اور بہت ہی موثر قرار دینے کے بعد آخری فقرہ یہ بھی لکھا تھا:۔

"لکھنے والے کے قلم کا اعجاز یہ ہے کہ کتاب لٹریچر تو خیر ہے ہی باقی کتاب کے جو اجزا پروپیگنڈے کے ہیں ان پر بھی گمان لٹریچر کا ہوتا ہے"

اردو میں ان کی تحریریں ہفتہ وار ندائے ملت اور پندرہ روزہ "تعمیر حیات" میں کثرت سے نکلتی رہی تھیں۔ آخری اردو مضمون ندائے ملت میں سدّ سکندری کی نہیں سدّ ایمانی کی ضرورت ہے کے بلیغ اور موثر عنوان کے ساتھ عین وفات کے دن طبع ہو رہا تھا اور اس سے دو ہی ایک ہفتہ قبل ماہنامہ البعث الاسلامی میں ان کا اس سے بھی زیادہ موثر مضمون یا مصرا شکری و لا تکفری کے عنوان سے نکلا تھا۔

یہ اپنے والد ڈاکٹر عبد العلی مرحوم کی آخری اولاد تھے۔ پانچ صاحبزادیوں کے بعد ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم جیسا کہ اوپر لکھا گھر ہی میں اپنے والد سے انتہائی خاموشی اور مستعدی سے حاصل کی، جس کی تفصیل سے لوگ عام طور سے ناواقف ہی رہے۔ سن رشد پر پہونچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد جہاں ان کی دینداری نظروں کے سامنے آتی گئی وہیں ان کی قابلیت کے چھپے جوہر بھی کھلتے اور شہرت حاصل کرتے گئے۔ زندگی ہمیشہ انتہائی سادہ گزاری۔ نام و نمود کی کبھی پروانہ کی۔ ۱۹۶۱ء میں ان کے والد کا انتقال ہوا تو پہلے یہی خیال تھا کہ وہ ان کے مطب میں بیٹھ کر ہومیو پیتھک کی پریکٹس کریں گے اس فن میں بھی انہوں نے خاصی دستگاہ حاصل کرلی تھی لیکن جلد ہی نظر آگیا کہ اس پیشہ سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں وہ اس سے کہیں بڑے کاموں کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کی دلچسپی کی چیز تصنیف و تالیف ہے۔ چنانچہ وہ اسی کے ہو کر رہے اور جلد ہی ان کا شمار اردو کے ساتھ بہترین عربی لکھنے والوں میں ہونے لگا۔ بلکہ اہل الرائے حضرات کے نزدیک ان کی عربی ان کی اردو سے بہتر اور پُر اثر ہونے لگی تھی۔ مولانا علی میاں کی متعدد اردو کتب ارکان اربعہ وغیرہ اور مقالات کے عربی ترجمے ایسے کیے کہ ان کی اور علی میاں کی تحریریں سرمو فرق نہیں رہ گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد خود علی میاں سے اس کا علم ہوا کہ ان کی بعض اہم کتابوں کے تکملے اور اضافے ان کے اسی نوجوان عزیز نے

ان کی فرمائش وہدایت پر کہنا چاہیے کہ برجستہ لکھے تھے اور ایسے لکھے تھے کہ ان پر مولانا مدظلہ کو قلم اصلاح پھیرنے کی ضرورت ذرا بھی محسوس نہیں ہوئی۔

خود ان کی عربی تصنیفات میں الاسلام الممتحن کو سب سے زیادہ شہرت ہندوستان سے بھی زیادہ عرب ممالک کے اسلام پسندوں میں حاصل ہوئی تھی۔ اس کتاب کے اب تک تین اڈیشن مصر وغیرہ سے شائع ہو چکے ہیں اور ماہنامہ البعث الاسلامی میں ان کے قلم سے نکلے ہوئے مضامین بھی اس کے حلقہ خریداراں میں بڑے ذوق وشوق سے ملک کے اندر اور باہر پڑھے جاتے تھے۔

یہ والد ہی کی طرح خلوت نشین اور کم سخن تھے لیکن جن ہم مذاق لوگوں سے ان کے روابط تھے۔ اُن سے وہ بڑی ہی دلچسپ گفتگو کرتے تھے مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ خصوصًا اسلامیات وسیاسیات حاضرہ کا۔ انگریزی کی استعداد بھی کثرت مطالعہ سے اچھی خاصی حاصل کر لی تھی۔ ان کی تحریریں خواہ مذہبی ہوں یا سیاسی ادب و انشاء کی خوبیوں کے ساتھ انتہائی پُر معلومات بھی ہوتی تھی۔

افسوس کہ وہ اس قدر جلد دنیا سے اٹھ گئے اور جو جگہ وہ خالی کر گئے اس کا پُر ہونا بہت دشوار نظر آتا ہے۔ !!

ایک دوست جس کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا!

(مولانا سعید الاعظمی الندوی)

ایک ایسے رفیق، دوست اور زندگی کی تمام سرگرمیوں میں پورے ۲۶ سال تک ہم آہنگ رہنے والے مخلص ساتھی کی اچانک جدائی کا غم کوئی ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے جو آسانی سے بھلایا جاسکتا ہو، جس کی محبت و اخلاص کے نہ مٹنے والے نقوش ذرہ ذرہ میں پتہ پتہ اور بوٹہ بوٹہ پر ہر جگہ نمایاں ہوں جسکی پاکیزہ سیرت، اعلیٰ ترین کردار، اور کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی، صاف و شفاف زندگی، آنکھوں میں بسی ہوئی اور دل میں جاگزیں ہو، جسکی حوصلہ مندی، عالی ہمتی، سچی دینداری، عالی ظرفی، فہم سلیم، غیر معمولی ذہانت اور وسیع النظری کی شہادت ہر شخص کی زبان پر ہو، اور جو وسعت فکر و نظر کے ساتھ اقلیم قلم پر بھی حکمرانی کرتا رہا ہو، اور اپنی مسیحا نفسی سے اس نے مشرق و مغرب کے ویران دلوں کو آباد کیا ہو اور مردہ جسموں میں روح ڈالی ہو، ایک ایسے جامع صفات شخص کے اچانک اٹھ جانے سے جو مستقبل کا مرد کامل اور تاریخ کا جوہر شب تاب تھا، اہل تعلق کے دلوں پر کیا کچھ نہ گذری ہوگی، اس کا صحیح اندازہ صرف وہی کرسکتا ہے جو جانے والے سے صحیح طور سے واقف ہو اور جس نے قریب سے ان کو اچھی طرح دیکھا اور برتا ہو۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سنہ ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحب کے درس حدیث میں ایک ایسے طالب علم بھی شریک ہوتے تھے جن کی صورت و سیرت فرشتوں جیسی تھی، نیکی اور بھولا پن ہر چیز سے نمایاں تھا اور عام طلبہ سے وہ بالکل الگ ایک حیثیت رکھتے تھے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید عبدالعلی حسنی (رحمۃ اللہ علیہ) کے صاحبزادے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کے بھتیجے جناب محمد میاں صاحب ہیں، میں دارالعلوم میں برابر ان کو دیکھتا تھا اور کچھ دنوں کے بعد کچہری روڈ پر واقع اصلاح و تبلیغ کے مرکز میں جہاں ہر اتوار کو حضرت مولانا کا درس قرآن ہوا کرتا تھا وہاں وہ دکھائی دینے لگے، ہمارے بعض ساتھیوں نے ان سے راہ و رسم پیدا کرلی تھی اور حقیقت ہے کہ انھیں کی وساطت سے ہمارا ان کا تعارف بھی ہوا، اور کبھی کبھار ملاقاتیں بھی ہونے لگیں، اتوار

کے درس میں خاص طور سے ہم لوگ ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کرتے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے ایک عربی مجلس قائم کی جس کا نام "المنتدی الادبی"[1] رکھا، از راہ کرم انہوں نے مجھے بھی اس کا ممبر بنایا اور ہر جمعہ کو اس کے عربی جلسہ میں شرکت کے لئے ان کا خصوصی دعوت نامہ بھی آنے لگا۔

"المنتدی الادبی" ہی دراصل ہماری علمی اور ادبی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی، اسی کے ذریعہ تعلقات میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی، اور اسی کی وجہ سے عموماً عربی اخبارات و رسائل اور ادبی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، اس کے ہفتہ وار جلسوں کے لئے مضامین لکھنے کے سلسلہ میں آپس میں تبادلۂ خیال بھی ہونے لگا، اور اسی بہانے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی وسیع ہوا اور ہر ایک کو دوسرے سے مختلف مشوروں اور کاموں میں مدد ملنے لگی۔

المنتدی الادبی کے ہفتہ وار جلسوں میں شرکت کرنے اور ان کے لئے مضامین لکھ کر سنانے کا حوصلہ تمام ممبران میں بڑھنے لگا، جب بہت سے مضامین پڑھے جا چکے تو خیال ہوا کہ اگر یہ سارے مضامین کسی ایک مجموعہ میں جمع کر کے طبع کرا دیے جائیں تو ایک یادگار اور دلچسپ کتاب بن جائے گی۔ اس خیال نے کسی اور کو متاثر کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن صدیق مرحوم کے دل میں تو یہ بات راسخ ہوگئی اور ہم دونوں نے اس سلسلہ میں مزید مشورہ کیا، اور طے یہی پایا کہ جس طرح بھی ہو یہ کام کرنا ہے۔ ابھی اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کی تدبیریں سوچ ہی رہے تھے کہ ایک یہ خیال بھی سامنے آیا کہ کیوں نہ ایک عربی میگزین کے طرز کی چیز نکالنے کے امکان کا جائزہ لیا جائے، اکثر ممبران مجلس نے اس خیال کی تائید کرنے سے گریز کیا، ہمارے ایک ممبر دوست نے تو اسے شیخ چلی کے محل سے تعبیر کیا اور فرمایا کہ: خیال است و محال است و جنوں، تاہم اس خیال میں کوئی تزلزل نہیں پیدا ہوا، ادھر مولانا محمد میاں صاحب مرحوم نے اپنے والد ماجد ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ کیا، انہوں نے پرزور تائید فرمائی اور ہر قسم کی مدد کا وعدہ بھی فرمایا، ادھر مربی معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم نے اس خیال کی ترحیب فرمائی اور اس کا نام بھی "البعث الاسلامی" تجویز فرما کر گویا اس تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا۔

لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ کسی ماہنامہ کے نکالنے کا کام اور اس کے ابتدائی انتظامات کو پایۂ تکمیل تک پہونچانا کوئی آسان کام نہیں، چنانچہ کئی مہینے اس کی تیاری اور سرکاری منظوری وغیرہ حاصل کرنے

---

[1] اس کے صدر مولانا سید محمد طاہر حسینی تھے جو اب مددگار ناظم ندوۃ العلماء ہیں۔

میں لگ گئے، پھر سب سے بڑا مرحلہ اس کی کتابت و طباعت کا تھا، مواد کی طرف سے ایک حد تک اطمینان تھا، لیکن سردست ہاتھ سے کتابت کر کے لیتھو پر چھپوانے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا، بہت غور وخوض کے بعد عربی کے ایک کہنہ مشق کاتب جناب قاری عبدالحلیم صاحب سے معاملہ طے پایا اور انہوں نے بخوشی اس ذمہ داری کو قبول بھی کر لیا۔ شروع میں صرف ۳۲ صفحے کی ضخامت کا پرچہ نکالنے پر سب کا اتفاق ہوا، اور اگست ۱۹۵۵ء میں پرچہ مرتب کر کے کاتب صاحب کے حوالہ بھی کر دیا گیا، کتابت عربی رسم الخط میں ٹائپ کے انداز پر ہوئی، طباعت کے لئے تنویر پریس تجویز ہوا اور اسی کا نام پرچہ کے لئے ڈیکلریشن (DECLARATION) حاصل کرنے کی تفصیلات میں دیا گیا، رئیس التحریر کے لئے مولانا محمد میاں صاحب کے نام پر سب نے اتفاق کیا، ادارۃ التحریر میں راقم سطور اور جناب راشد صاحب ندوی (جواب ڈاکٹر راشد ندوی صاحب ہیں) اور جناب اجتبا صاحب ندوی حسینی کا نام طے ہوا، مگر عجیب اتفاق کہ ڈاکٹر راشد صاحب پرچہ شائع ہونے سے پہلے ہی دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ میں بغرض تعلیم دمشق چلے گئے، اور ادارہ میں ان کا نام نہ آسکا، صرف میرا اور ڈاکٹر اجتبا صاحب ندوی کا نام باقی رہا، لیکن کچھ ہی مدت کے بعد ڈاکٹر اجتبا صاحب بھی دمشق چلے گئے، اور تنہا میرا ہی نام نائب رئیس التحریر کی حیثیت سے باقی رہا اور بعد میں مدیر التحریر کی حیثیت سے آنے لگا،

ستمبر ۱۹۵۵ء کے آخری ہفتہ میں البعث الاسلامی کا پہلا شمارہ تیار ہو کر یکم اکتوبر کو منظر عام پر آیا، اس وقت تک صرف اشتہار و اعلان کی مدد سے ۵۰ سے زائد خریدار بن چکے تھے، دراصل ہندوستان کے اس وقت کے حالات میں کسی معیاری عربی مجلہ کا نکالنا ایک جرأتمندانہ قدم تھا، اس عالی ہمتی کا سہرا سب سے پہلے ہمارے مرحوم دوست مولانا سید محمد الحسنی صاحب کے سر ہے، انہیں کی ہمت اور عزم کو دیکھ کر دوسروں نے بھی عزم وہمت سے کام لیا، مجھے یاد ہے کہ پرچہ کی تیاری اور تحریر و طباعت کے کسی مرحلہ میں بھی مجھے کوئی ادنیٰ بھی مایوسی نہیں ہوئی، بلکہ شانہ بشانہ میں ہر لمحہ ان کے ساتھ رہا اور بھرپور تعاون میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، یہی وجہ تھی ان کو مجھ سے بہت زیادہ مناسبت ہوئی اور ابتداءً ایک رفیق کار کی حیثیت سے پھر ایک مخلص دوست کی حیثیت سے آخر تک ہمارا ان کا ساتھ رہا اور باوجود اتنی طویل رفاقت کے کبھی کوئی معمولی اختلاف یا کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آسکا جو کسی کی گرانی یا ناگواری یا اذیت کا باعث بنتا اور تعلقات پر اثر انداز ہوتا۔

یکم اکتوبر ۵۵ء کی صبح کو پرچہ نکلتے ہی پہلے سے طے شدہ پروگرام کے ماتحت ہم دونوں پرچہ کی

توسیع اشاعت کے سلسلہ میں ایک تجرباتی سفر پر نکلے، یہ سفر کے سلسلہ میں ہمارا پہلا تجربہ تھا، دونوں ہی سفروں کے نشیب و فراز سے ناآشنا تھے۔ اور ہمارے لئے یہ سفر ایک مہم جوئی کی حیثیت رکھتا تھا، سفر لکھنؤ سے شروع ہوا اور کانپور پہلی منزل قرار پایا۔ وہاں رات گذار کر ہم دوسرے دن صبح کو آگرہ کے لئے روانہ ہوئے، وہاں ہماری کسی سے آشنائی نہیں تھی لیکن آگرہ پہنچ کر ہم نے امام صاحب جامع مسجد سے ملاقات کی اور ان کے ذریعہ کچھ لوگوں سے تعارف ہوا، میکش اکبرآبادی سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پرچہ کو دیکھا اور اسے پسند کیا، کچھ اور دوستوں سے بھی ملاقات ہوئی اور دو ایک خریدار فراہم ہو سکے، ہم نے آگرہ پہونچ کر تاج محل اور قلعہ کی بھی زیارت کی اور بچپن سے جو کچھ تاج محل کے بارے میں سنتے آئے تھے وہ آج آنکھوں سے دیکھ بھی لیا مولانا محمد میاں صاحب نے وہاں پہونچکر یہ شعر پڑھا اور بار بار پڑھاے

اے تماشاگاہ عالم روئے تو　　　تو کجا بہر تماشا می روی

جو وقت اور مناسبت کے لحاظ سے بہت برمحل معلوم ہوا،

آگرہ میں مختصر وقت گذارنے کے بعد ہم لوگ پہلی بار مسلم یونیورسٹی دیکھنے اور وہاں اپنے پرچہ کا تعارف کرانے کی غرض سے علی گڑھ پہونچے، وہاں طبیہ کالج میں ہمارے ایک ندوی دوست جناب ظل الرحمٰن صاحب بھوپالی ملے جواب حکیم ظل الرحمٰن صاحب ہیں، انہوں نے باصرار ہم کو اپنا مہمان بنایا اور اپنے کمرہ ہی میں ازراہ کرم ٹھہرایا بھی، ان کے ذریعہ علی گڑھ میں اسلامک اسٹڈیز کے اس وقت کے سربراہ جناب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب سے ملاقات ہوئی، جو بعد میں وائس چانسلر ہو گئے تھے، انہوں نے البعث کو بڑے تعجب اور غور سے دیکھا اور بیک وقت کئی سوال کر ڈالے، کیا آپ ہی لوگ اسے نکال رہے ہیں؟ کیا یہ جاری رہ سکے گا؟ اگر جاری رہنے کی امید ہو تو ایک سال کے لئے مجھے خریدار بنا لیجئے، اور ان کا نام خریداروں کی فہرست میں شامل کر لیا گیا، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ خریدار بنے، کچھ طلبا نے بھی خریداری قبول کی، اور عربک ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ اور شیخ مامون دمشقی جو اسلامک اسٹڈیز میں باقاعدہ استاذ کی حیثیت سے وہاں مقیم تھے خریدار بنے، اور اس اقدام پر بہت ہی مسرت کا اظہار کیا،

علی گڑھ میں دو تین دن رہ کر ہم لوگ دہلی چلے گئے وہاں مولانا سید محمد واضح رشید صاحب ندوی کے مہمان کی حیثیت سے انہیں کے مکان فراش خانہ میں قیام ہوا، مولانا واضح صاحب ندوی اس زمانہ میں

آل انڈیا ریڈیو کے عربی شعبہ میں اناؤنسر اور مترجم تھے، یہ زمانہ ان کے وہاں کے ابتدائی قیام کا تھا، دہلی میں البعث کافی پھیلا، وہاں کے عربی مدارس کے ساتھ جامعہ ملیہ میں بھی لوگ خریدار بنے، اور انفرادی طور پر بھی خاصی اشاعت ہوئی، دہلی کے بعد دیوبند جانا ہوا، دیوبند میں شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر قیام ہوا، اور حضرت مدنی ؒ کے مہمان کی حیثیت سے ہم لوگ وہاں کئی دن ٹھہرے۔ طلبہ اور اساتذہ سے ملاقاتیں ہوئیں، اس زمانہ میں وہاں عربی ادب اور صحافت کا اتنا چرچا نہیں تھا جتنا آج ہے، ایک بہت ہی نشیط طالب علم اسماعیل افریقی صاحب تھے، جنھوں نے النهضة الادبية کے نام سے اپنے طور پر افریقی اور بیرونی ممالک کے طلبہ کی انجمن بنا رکھی تھی، وہ مع اپنے رفقاء کے دارالعلوم کے احاطہ سے باہر شہر کے ایک مکان میں رہتے تھے اور رہیں سے وہ لوگ اپنی ادبی سرگرمیاں جاری رکھتے تھے ایک قلمی دیواری اخبار عربی میں الیقظۃ کے نام سے نکالتے تھے، انہوں نے ہمارے پرچہ کا بہت شاندار استقبال کیا اور خود بھی خریدار بنے اور بہت سے دوسرے طلبہ بھی ان کی وجہ سے خریدار بن سکے، اسی زمانے میں مولانا عبداللہ سورتی صاحب بھی دارالعلوم میں تھے جو جامعہ فلاح دارین ترکیسر گجرات کے اب مہتمم اعلیٰ ہیں، انہوں نے بھی ہماری بڑی مدد کی اور ساتھ دیا۔

اسی زمانے میں مولانا محمد میاں صاحب کے عزیز مولانا محمد سالم صاحب ہنسوی بھی دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے، وہ ہمارے پہونچتے ہی ہمارے رفیق و کرم فرما بن کر ساتھ ہو گئے، ان کی وجہ سے بھی بڑی سہولت ہوئی اور نئے نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہو سکیں، پھر وہ رام پور تک ہمارے ساتھ رہے۔

دیوبند کے بعد سہارنپور جانا ہوا، وہاں سے رڑکی، مراد آباد، رام پور تک اس سفر کا سلسلہ دراز ہوا اور ہم لوگ اپنے مشن میں بڑی حد تک کامیاب رہے، ہر جگہ ہمارا استقبال ہوا، اس زمانہ میں عربی زبان میں کوئی ماہنامہ نکالنا ایک بالکل نئی بات تھی۔ "الضیاء" کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان میں ایک عربی، معیاری ماہنامہ نکلا اور ہر حیثیت سے اس نے خراج تحسین حاصل کیا،

یہ سفر ہم دونوں کے لئے مزید ہم آہنگی اور تعلقات میں استواری کا باعث ہوا، اس میں بے تکلف زندگی گذارنے اور ہر ایک کے لئے دوسرے کو آزمانے اور اس کے عیب و ہنر کو جانچنے کا موقع ملا، لمبے سفروں میں لوگ عموماً اختلاف کا شکار ہو جاتے ہیں، ہمارا یہ سفر بھی بہت طویل اور ایک طرح کا طوفانی دورہ

تھا، لیکن مقصدیت کی روح شروع سے آخر تک اس طرح کارفرما رہی کہ کسی اختلاف اور باہمی آویزش کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوسکا، سفر شروع ہونے سے پہلے اور دوران سفر ہمیں سب سے زیادہ جن مشوروں سے فائدہ پہونچا وہ استاد مکرم مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی کے مشورے تھے، جن کو اصابت رائے کی دولت سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے نوازا ہے،

اس سفر سے واپسی کے بعد ہماری ملاقاتیں بہت وسیع ہوئیں، البعث کے سلسلہ میں خاص طور سے مشورے اور اس کی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے بارے میں روزانہ شام کو ایک ملاقات تقریباً فرض کے درجہ تک پہونچ گئی تھی، اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ البعث الاسلامی کا پہلے ندوۃ العلماء سے صرف اخلاقی تعلق تھا، اور اصلاً وہ محمد میاں صاحب ہی کی تحویل میں تھا، ندوۃ العلماء سے باقاعدہ تعلق ۱۹۶۱ء میں ہوا اور اس کا دفتر جو پہلے گوئن روڈ پر مولانا مرحوم کے مکان میں تھا اب دارالعلوم کی عمارت میں منتقل ہوگیا، لیکن البعث ندوۃ العلماء کی تحویل میں جانے سے پہلے گوئن روڈ سے لیتھو کی طباعت پر ڈیڑھ سال تک نکلا، اسکے بعد ندوۃ العلماء نے ایک معمولی عربی پریس قائم کرنے کی اجازت دیدی تھی جس کے ابتدائی سارے انتظامات ہم لوگوں نے مولانا جمیل احمد ندوی دوسرے مددگار ناظم ندوۃ العلماء کے تعاون سے کئے تھے اور ندوۃ العلماء کے دفتر نظامت میں جو گوئن روڈ ہی پر تھا اس کی ابتداء ہوگئی تھی۔ پریس قائم تو ہوگیا لیکن عربی کمپوزنگ کے لئے کوئی کمپوزیٹر دستیاب نہیں تھا، بہت کوشش کے بعد ایک اردو کمپوزیٹر عبداللطیف خاں صاحب سے اس سلسلہ میں ملاقات کی گئی۔ انہوں نے تعاون کیا اور خود ہی خارج وقت میں عربی کمپوزنگ کا کام شروع کیا، مگر وہ عربی سے ناواقف ہونے کے باعث ہم لوگوں کے لئے اتنے مفید نہ ہوسکے جتنے کی ضرورت تھی، ہوتا یہ تھا کہ مولانا محمد میاں صاحب اور کبھی میں گھنٹوں ان کے پاس کھڑے رہ کر ان سے کمپوز کراتے تھے، ایک ایک لفظ پڑھ پڑھ کر ان کو بتاتے تھے اور اسی کے مطابق وہ حروف اٹھا اٹھا کر جوڑتے تھے، پھر بھی صحیح کمپوزنگ بہت ہی دشوار بات تھی، یہ سلسلہ ایک عرصۂ دراز تک قائم رہا، اسی اثناء میں کچھ لوگوں کو عربی کمپوزنگ سکھانے کی بھی کوشش کی گئی، اس میں ایک صاحب نے کافی حد تک اس کی مشق کر لی اور وہ ہمارے لئے معاون ثابت ہوئے، لیکن جلد ہی وہ بھی الگ ہوگئے، پھر جب پریس دارالعلوم کی عمارت میں ۱۹۶۵ء میں منتقل ہوا تو ایک کوشش بعض طالب علموں کو سکھانے کے

سلسلہ میں کی گئی اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی، اور بدقت تمام خاں صاحب ہی سے کمپوز کرا کے کسی طرح ۳۲ صفحے کا پرچہ نکالنے کا سلسلہ جاری رہا، مگر چونکہ اس میں کافی وقت لگتا تھا اور پورے مہینہ بھر میں ۳۲ صفحے کی کمپوزنگ انتہائی محنت صرف کرنے کے بعد بھی نہیں ہو پاتی تھی اس لئے پرچہ ماہ بماہ نکلنے کی پابندی پر قائم نہ رہ سکا اور موخر ہونا شروع ہوا، یہاں تک کہ جلد پنجم تک پہونچتے پہونچتے دس مہینے موخر ہوگیا، اس کی تلافی کی صورت یہی رہ گئی تھی کہ پورے ایک سال کا ناغہ مان کر از سر نو تاریخ کے مطابق ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو پرچہ شائع کرنے کے انتظامات کرکے عزم کے ساتھ اس پر قائم رہنے کی کوشش کی جائے، خدا کا شکر ہے کہ اس میں کامیابی ہوئی اور اس کے بعد سے پھر آج تک پرچہ وقت پر نکل رہا ہے۔ فرق اتنا ضرور ہوا کہ ایک سال کا نقصان ہونے کی وجہ سے ایک جلد ہم پیچھے رہ گئے اور اب جب کہ اکتوبر ۸۵ء کے لحاظ سے جلد ۲۵ ہونی چاہیئے جلد ۲۴ ہی چل رہی ہے۔

۱۹۶۲ء میں جب پریس بھی دارالعلوم میں تھا اور البعث کا دفتر بھی یہیں تھا باہر کے کچھ لوگوں کو کمپوزنگ سکھانے کی طرف توجہ ہوئی اور تجربہ کامیاب رہا، مئو ضلع اعظم کے انوار احمد صاحب نے بہت اچھی مشق حاصل کرلی اور وہ مستقل کمپوزیٹر کی حیثیت سے ہمارے پریس میں آگئے، ان کی وجہ سے البعث کے صفحات بھی بڑھانے کی طرف توجہ ہوئی اور پریس کو وسیع کرنے کا خیال بھی پیدا ہوا اور اس میں خاصی کامیابی ہوئی، البعث ۴۰ صفحے کا کیا گیا، پھر جلد ہی ۶۰ صفحات پر نکلا اور اس کے بعد ۸۰ صفحے کا پرچہ شائع ہوا ہوا پھر ۱۰۰ صفحے تک اس کی ضخامت پہونچی جو آج بھی بحمد اللہ قائم ہے۔

ان تمام کاموں میں اصل مشورہ اور صحیح رہنمائی مولانا مرحوم ہی کی تھی، انہوں نے اپنی محبت کی بنا، پر مجھ پر مکمل اعتماد کرکے پوری طرح مجھ کو ذمہ دار سمجھا، میں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید سے اپنا پورا وقت لگایا اور البعث کی تحریر و طباعت کی ذمہ داری کے ساتھ مربی مخدوم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم کے بعض رسائل و پمفلٹ کی طباعت میں بھی حصہ لینا شروع کیا، اور ۱۹۶۳ء میں حضرت مولانا دامت برکاتہم کی ایک اہم ترین تصنیف "موقف العالم الاسلامی تجاہ الحضارۃ الغربیۃ"، کے نام سے اس پریس میں طبع ہوئی، اس کتاب کی طباعت دراصل پریس کی بڑی کامیابی سمجھی گئی اس لئے کہ کتاب اتنی اچھی چھپی کہ باہر کے پریس میں چھپی ہوئی کتابوں سے کسی طرح کم

نہیں تھی۔ یہی کتاب بعد میں کافی ترمیم و اضافہ کے بعد "الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ" کے نام سے بیروت سے شائع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی، اس کتاب کی تصنیف کا اصل محرک یہ تھا کہ راقم السطور نے حضرت مولانا دامت برکاتہم سے البعث الاسلامی کے لئے کسی نئے اور تازہ مضمون کی درخواست کی تھی، حضرت مولانا نے از راہ شفقت درخواست منظور فرمالی اور مضمون شروع فرمایا لیکن موضوع بہت اہم تھا اس لئے وہ بجائے مختصر مضمون پر منتہی ہونے کے پوری ایک کتاب کی شکل اختیار کر گیا اور پھر اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کی فوری طباعت بھی ضروری سمجھی گئی جو اسی پریس میں اُس وقت ممکن ہو سکی۔

البعث کی ترقی اور تنوع کے ساتھ پریس بھی وسیع ہوتا رہا، اور پہلے کے مقابل میں اب وہ کافی پھیل چکا ہے، اس میں بہت سی کتابیں (اور بعض بہت اہم کتابیں) چھپ کر منظر عام پر آئیں، خاص طور سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی کئی اہم کتابیں طبع ہوئیں، مثلاً مقدمہ اوجز المسالک، تراجم البخاری، لامع الدراری، اور بذل المجہود کی ۶ جلدیں، نیز مختصر کتابیں جیسے فضائل الصلاۃ، فضائل التبلیغ والدعوۃ، فضائل القرآن، اسباب سعادۃ المسلمین وشقائہم، اور اس وقت الکوکب الدری زیر طبع ہے، اس کی تین جلدیں چھپ چکی ہیں، آخری جلد بھی انشاء اللہ مستقبل قریب میں شائع ہو جائے گی۔

البعث الاسلامی کی برکت سے ہمارا تعلق اتنا وسیع اور مستحکم ہوا کہ ہر ایک کو دوسرے سے ملنے اور گفتگو و مشورہ کرنے کا ہر وقت انتظار رہا کرتا تھا۔ اس ملاقات میں اس قدر پابندی ہوئی کہ اگر کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے ملاقات نہ ہو سکی تو ایک خلا محسوس ہوتا تھا، لوگوں میں ہمارے اس مخلصانہ تعلق کا چرچا ہوا اور آخر میں ہماری دوستی ضرب المثل بن گئی، جو لوگ شروع میں تنقید کرتے تھے بعد میں وہ بھی قائل ہو گئے، اس مخلصانہ محبت اور تعلق کا اثر یہ ہوا کہ نہ صرف علمی امور میں ہم لوگ آپس میں تبادلۂ خیال کرتے تھے بلکہ زندگی کے سارے معاملات میں مشورہ ضروری سمجھتے تھے، ہر ایک کو دوسرے کے مشوروں سے بہت تقویت حاصل ہوئی اور متعدد مواقع پر بڑی قیمتی رہنمائی ملی۔

۱۹۵۶ء کے شروع میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم کے حکم سے

مجھے عراق کا ایک خالص علمی اور تعلیمی سفر کرنا پڑا، حضرت مولانا نے میرے لئے عربی ادب اور نحو و بلاغت کے موضوع پر مزید مطالعہ اور استفادہ کے لئے استاد جلیل ڈاکٹر تقی الدین الہلالی کی خدمت میں بھیجا تھا، اس وقت ان کا قیام بغداد میں تھا وہ بغداد یونیورسٹی کے ٹیچر ٹریننگ کالج میں پروفیسر تھے، میں نے ایک سال سے کچھ کم مدت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں رہکر استفادہ کرنے میں پوری مشغولیت کے ساتھ گذاری، اس زمانہ میں اخوان کی تنظیم وہاں بھی ممنوع قرار پاچکی تھی اس لئے وہ لوگ جمعیۃ انقاذ فلسطین کے نام سے مرکز قائم کر کے دعوتی سرگرمیاں انجام دیتے تھے، میرا قیام اسی مرکز میں ہوا، جمعیۃ کے رئیس شیخ محمد محمود الصواف تھے، مگر وہاں اسی زمانہ میں ایک خونیں انقلاب برپا ہوا اور شاہی نظام حکومت کے خاتمہ کے ساتھ انقلابیوں نے پورے شاہی خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اس زمانہ میں نوری سعید وزیر اعظم اور عبد الالٰہ ولی عہد تھے۔ ان دونوں کی لاشیں سڑکوں پر گھسیٹی گئیں اور ان کے ساتھ نہایت بُرا سلوک کیا گیا، پوری قوم اس انقلاب سے خوش تھی، قائد انقلاب عبد الکریم قاسم اور عبد السلام عارف تھے، مگر افسوس کہ اول الذکر نے کمیونزم کو پورے ملک پر مسلط کرنے میں بڑا رول ادا کیا، اور پھر اپنے کمیونسٹ دوستوں ہی کے ہاتھوں مارا بھی گیا۔

اس سفر کی وجہ سے ہم دونوں کے لئے ایک دوسرے سے دوری بہت شاق ہوئی، لیکن اسکے دینی، اور دعوتی پہلوؤں اور علمی ترقی کی توقع میں اسے گوارا کرنا پڑا، سفر کے موقع پر ہم لوگوں نے کئی بار اس کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے اور کم وقت میں زیادہ فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں آپس میں مشورہ کیا، البعث کی توسیع اشاعت بھی سفر کا ایک اہم مقصد بنایا گیا، اس کی ایجنسی وہاں پہلے سے قائم بھی تھی، اور ہمارے کرم فرما اور دینی دوست ڈاکٹر صالح مہدی سامرائی وہاں اس کے پوری طرح وکیل تھے اور جمعیۃ انقاذ فلسطین کے مرکز ہی میں رہتے تھے، جب ہم وہاں پہونچے تو ان کے ساتھ ہی رہنا ہوا، اگرچہ ہم الگ کمرہ میں مقیم تھے لیکن دن رات کا ساتھ تھا اور عموماً دعوتی اجتماعات میں انھیں کے ساتھ جانا ہوتا تھا، سفر کے دوران مولانا محمد میاں صاحبؒ کے خطوط میرے لئے بڑا سہارا تھے وہ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا کرتے تھے اور ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے، سفر شروع ہونے سے پہلے انہوں نے اس ملک کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ سو فیصد صحیح نکلا، اس سے جہاں ان کی فراست کا پتہ چلتا ہے وہیں ان کے وسیع مطالعہ اور عالم اسلام سے گہرے تعلق اور محبت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

مولانا کی شادی کم عمری ہی میں ہو گئی تھی، البعث کے نکلنے کے ایک مہینے کے بعد عقد ہوا، شاید ۲ر نومبر ۱۹۵۵ء کی تاریخ تھی، میں اس زمانے میں اپنے وطن مئو ضلع اعظم گڑھ چلا گیا تھا اس لئے شرکت نہ کر سکا تھا، اتنی کم عمری میں ان کی شادی اس وقت لوگوں کے لئے ذرا تعجب کا باعث تھی، اس لئے کہ خاندان کے عام رواج سے ہٹ کر ایسا ہوا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو جلد ہی اولاد کی دولت سے بھی نوازا، اور ۲۹ر جنوری ۱۹۵۷ء کو ان کے پہلے صاحبزادے عبد اللہ[1] پیدا ہوئے، سب نے یہ خبر خوشی اور مسرت کے ساتھ سنی، اہل تعلق نے مبارکباد دی، دوستوں نے اظہار مسرت کیا اور بزرگوں نے دعائیں دیں، اور وقت پر عقیقہ کیا گیا، اہل تعلق دعوت عقیقہ میں شریک ہوئے، ڈاکٹر صاحب (مولانا کے والد معظم ؒ) نے اس کا اہتمام فرمایا۔ اس موقع پر سب سے زیادہ خوشی (اہل خاندان کے بعد) جس کو ہو سکتی ہے وہ راقم سطور تھا، دوسرے صاحبزادے عمار سلمہ، ۲ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کو پیدا ہوئے۔ اللہ کا شکر ہے اب وہ بھی حافظ ہیں، تیسرے صاحبزادے بلال سلمہ، کی تاریخ پیدائش یاد نہیں، وہ بھی ماشاء اللہ دینی تعلیم کے میدان میں ہیں۔

بغداد سے میری واپسی تقریباً گیارہ ماہ کے بعد ہوئی، مولانا سراپا شوق و انتظار تھے۔ ایک طویل عرصہ کی غیر حاضری کے بعد ملاقات ہوئی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا، اس عرصہ میں البعث کا دعوت اسلامی نمبر تیار ہو کر شائع ہو چکا تھا، اور وہ مضامین کے تنوع اور معلومات کی کثرت نیز طباعت و ترتیب کے لحاظ سے بہت معیاری تھا، حیرت ہوئی کہ مولانا نے تنہا اتنا بڑا کام کیسے کر لیا جب کہ اس وقت ٹائپ پر طباعت کی سہولت بھی بہت کم میسر تھی، یہ خاص نمبر بہت مقبول ہوا اور اس کی اشاعت بھی خوب ہوئی۔

مولانا مرحوم کا ذہن عالم اسلام کے مسائل و حالات سے کبھی فارغ نہیں رہتا تھا، وہ ہر وقت وہاں کی دینی اور دعوتی تحریکوں، اور سرگرمیوں کا بغور مطالعہ کرتے رہتے اور نت نئے حالات کا جائزہ لیتے رہتے تھے، وہاں سے جو لٹریچر اور جرائد و مجلات اور نئی کتابیں آتیں ان کو غائر نظر سے پڑھنے اور

---

[1] مولوی عبد اللہ حسنی صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء سے کئی سال پہلے فارغ ہو کر اب مدرس کی حیثیت سے یہاں کام کر رہے ہیں اور الرائد کے سکریٹر التحریر بھی ہیں، ان کو اردو اور عربی میں مضامین لکھنے کی اچھی مشق ہے، اپنے والد مرحوم اور بزرگوں کے نقش قدم پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اور سب بھائیوں کی عمر اور علم و عمل میں برکت عطا فرمائیں۔

نتائج اخذ کرنے میں خاص ملکہ رکھتے تھے، فکری حیثیت سے وہ اتنے بلند تھے کہ بڑے سے بڑے اہل فکر بھی ان کی بلند پروازی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، وہ فکری حیثیت میں اپنے عم مخدوم حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی دامت برکاتہم سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے، اس سلسلہ میں بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ کسی مسئلہ کے بارے میں جو خیال انہوں نے ظاہر کیا بعینہٖ وہی خیال حضرت مولانا دامت برکاتہم کی زبان سے سننے میں آیا بعض دفعہ تو الفاظ اور اسلوب بیان میں بھی سو فیصد یکسانیت دیکھنے میں آئی،

نہ صرف عالم اسلام بلکہ دنیا کی تہذیبوں اور مختلف تحریکوں اور مادی وغیر مادی دعوتوں اور سرگرمیوں سے خاص طور سے مغربی تہذیب و ثقافت سے اس حد تک واقفیت رکھتے تھے جیسے وہ ان چیزوں کا مشاہدہ کر چکے ہوں، اور ان کے تمام عیب و ہنر ان کی نظروں کے سامنے ہوں، وہ انگریزی زبان سے بھی واقف تھے اس لئے انگریزی اخبارات و رسائل اور کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔ نومسلم خاتون مریم جمیلہ نے جب ۱۹۶۳ء میں اسلامی موضوع پر لکھی ہوئی اپنی پہلی کتاب (ISLAM VERSUS THE WEST) حضرت مولانا دامت برکاتہم کی خدمت میں بھیجی تو مولانا محمد میاں صاحبؒ نے اس کو پڑھکر اس کے مختلف حصّوں کا عربی میں ترجمہ کیا، جو البعث کے متعدد شماروں میں چھپا تھا، اس سے پہلے وہ محمد اسد صاحب کی کتاب (ROAD TO MECCA) کا ترجمہ اور اس کی تلخیص بھی کر چکے تھے جو "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام سے اسی زمانہ میں چھپ گئی تھی۔

جنوری ۵۹ء کے اواخر میں، میں اپنے عراق کے سفر سے واپس آیا، تو دوران گفتگو ہم لوگوں نے ایک ایسی انجمن بنانے کے بارے میں سوچا جو عالم اسلام کے حالات و واقعات سے تعلق رکھے اور اسکے ذریعہ ایک دعوتی اور ثقافتی رابطہ قائم کیا جا سکے، کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ سر دست اسکو باہر ہی کے کام کے لئے خاص رکھا جائے اور ممبران بھی سب باہر کے ہوں، چنانچہ اس کا نام عربی میں "الرابطة الاسلامية الدولية" اور اردو میں انجمن رابطہ اسلامی رکھا گیا، اس کے لئے ایک مضمون تیار کرنا پڑا جس میں سارے مقاصد اور انجمن قائم کرنیکے دواعی و محرکات کی تفصیل آگئی، وہ مضمون عربی ٹائپ میں چھپوا کر بطور خط بہت سے منتخب لوگوں کے پاس بھیجا گیا، اور کچھ دنوں کے بعد جوابات آنے کا سلسلہ شروع ہوا، لوگوں نے اس کی بڑھ چڑھ کر ترحیب کی اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ایک خلا ہو جسے پُر کرنے

کے لئے لوگ بے چین ہوں، ان جوابات سے ہم لوگوں کی زبردست ہمت افزائی ہوئی اور اللہ کا نام لیکر یہ انجمن قائم کردی گئی، اس کا دفتر گوئن روڈ ہی پر دفتر نظامت ندوۃ العلماء والی عمارت میں اوپر کے حصہ میں قائم ہوگیا، اور الحمدللہ انجمن کی سرگرمیاں بھی شروع ہوگئیں، ہم دو ہی آدمی اس کے بھی سارے کاموں کو انجام دیتے تھے، ایک خبرنامہ شائع کرنا شروع کیا گیا جو عربی، انگریزی میں ہوتا تھا، اس کا نام بھی "الرابطة الاسلامية الدولية" رکھا گیا۔ بعد میں جب لوگوں نے انجمن کی افادیت محسوس کی تو مقامی طور پر بھی اس کی ایک شاخ قائم کردی گئی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب اس کے صدر منتخب ہوئے، اس کے اجتماعات بھی ہوتے رہے، اس میں زیادہ تر طلبہ نے حصہ لیا، میڈیکل کالج کے طلبہ ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے کافی مانوس ہوئے۔ اسی زمانے کے ایک طالب علم جناب محسن شمسی صاحب بہت سرگرم رکن تھے، اب وہ ڈاکٹر محسن شمسی صاحب ہیں اور لکھنؤ کنٹونمنٹ کے علاقہ میں ایک سرکاری فوجی اسپتال میں اپنی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

انجمن رابطہ اسلامی کی سرگرمیاں عرصہ تک قائم رہیں، لیکن کام کے آدمیوں کی کمی اور سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے افسوس کے ساتھ اس کے کام کو موقوف کرنا پڑا، اس کے فوراً بعد مکہ مکرمہ میں رابطہ العالم الاسلامی کا قیام بھی عمل میں آیا، اس کے مقاصد اور کاموں، اور ہماری انجمن کے مقاصد میں بہت حد تک یکسانیت تھی، یہ صحیح ہے کہ یہ بہت بڑے پیمانے پر شروع ہوا اور ایک ایسے اسلامی ادارہ کے طور پر معرض وجود میں آیا جس کی پشت پناہی دنیا کی ایک عظیم الشان حکومت کر رہی ہے۔

مولانا ایک خالص علمی اور دعوتی عالی گھرانے سے تعلق رکھنے کی بناء پر تصنیف و تالیف کا بھی بہت اونچا اور معیاری ذوق رکھتے تھے، ان کی سب سے پہلی تصنیف "سیرت مولانا محمد علی مونگیری" ہے جو انہوں نے ۱۹۶۳ء میں لکھی تھی، اگرچہ اس سے پہلے ہی ان کا ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" چھپ کر مقبول بھی ہوچکا تھا، اس کے بعد انہوں نے اپنے خاندانی بزرگ شیخ علم اللہ جو ایک زبردست عالم ربانی تھے کی سیرت پر اپنی کتاب "تذکرہ شاہ علم اللہ" کے نام سے تصنیف کی، ۱۹۵۹ء ہی کی بات ہے کہ ایک بار ہم لوگوں نے عربی میں ایک ایسی کتاب لکھنے کا خاکہ تیار کیا جو مکمل طور پر اسلام کی صحیح نمائندگی کرسکے، اور جو موجودہ دور کی ذہنی اور تہذیبی تبدیلیوں کو پیش نظر رکھ کر ایسے انداز میں لکھی جائے کہ وہ نئے تعلیم یافتہ طبقہ اور خاص طور سے

نوجوانوں کے لئے اسلام کا صحیح تعارف پیش کر سکے اور ان کے ذہنوں کو اپیل کر سکے، کتاب کا ابتدائی خاکہ تیار کر لیا گیا تھا مگر افسوس کہ دوسرے مشاغل کی وجہ سے اس کے لئے وقت میں گنجائش نہیں نکل سکی اور وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے سے رہ گیا۔

مولانا کے قلم میں ایسی طاقت و تاثیر تھی جو مردہ دلوں میں زندگی پیدا کر دیتی تھی، ان کے عربی اور اردو کے مضامین، زبان و بیان اور اسلوبِ نگارش کے لحاظ سے اعلیٰ ترین معیار پر پورے اترتے تھے، البعث الاسلامی کے ہر شمارہ میں ان کا افتتاحیہ ہی دراصل پرچہ کی جان ہوتا تھا، مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ عرب نوجوانوں اور اہل قلم کی ایک بڑی تعداد ان کے اداریوں کے لئے بے چین رہتی تھی، جب ان کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ تحریر ایک ایسے نوجوان عالم و ادیب اور صاحب قلم کی ہے جس نے عرب ممالک میں کوئی تربیت نہیں حاصل کی ہے اور نہ کسی عرب ملک میں وقت گذارا ہے تو ان کے تعجب کی انتہا نہیں رہتی تھی، مصر و شام اور اردن و حجاز کی دینی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے عرب علماء، و ادباء اور اخوانی نوجوانوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب دنیا کے کسی حصہ میں جمال عبدالناصر کے غلط تصرفات اور اسکی اسلام کشی کے خلاف کوئی آواز اٹھانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی تو تنہا محمد الحسنی مرحوم نے عبدالناصر کی حقیقت کو آشکارا کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور باوجود خطرات و موانع کے وہ اس مقدس فریضہ سے باز نہیں آئے، جس کا جی چاہے البعث کے وہ مضامین اور افتتاحیے پڑھ لے جس میں انہوں نے قومیت کے بت تراش آزر کے ساتھ پنجہ آزمائی کی ہے اور اسے آخری انجام تک پہونچا کر دم لیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ جب بھی عالم اسلام کے کسی گوشے میں کوئی آزر و مانی، کوئی فرعون و نمرود، کوئی مسیلمہ کذاب، کوئی چنگیز و ہلاکو، کوئی ہٹلر و مسولینی، کوئی لینن و اسٹالن نمودار ہوا، یا کوئی غلط تحریک و دعوت ظاہر ہوئی تو بلا تاخیر مولانا کے قلم کا سیل رواں جوش میں آیا اور پوری قوت کے ساتھ اس کو کچلنے اور حقیقت آشکارا کرنے کی کوشش کی ــ وہ قلم کو ایک مقدس امانت سمجھتے تھے اور اس کو بہت ہی احتیاط کے ساتھ دعوت حق اور فکر اسلامی کی ترویج و اشاعت میں اور باطل کی سرکوبی اور اس کو پسپا کرنے میں صرف کرتے تھے، ان کا قلم عربی اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں مہارت رکھتا تھا اور وہ اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لانے میں کوئی پس و پیش کبھی نہیں کرتے تھے، اسی بناء پر جب ۱۳۷۶ھ میں دارالعلوم کے

شعبۂ تعمیر و ترقی کی طرف سے ایک پندرہ روزہ پرچہ "تعمیر حیات" نکالنے کا فیصلہ ہوا تو اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے لئے اپنی تمام مشغولیتوں کے باوجود تیار ہو گئے، یہاں بھی انہوں نے مجھ کو اپنی رفاقت سے محروم نہیں رکھا، اور باصرار میرا نام بھی معاون اڈیٹر کی حیثیت سے سرورق پر طبع کرایا، اور البعث کے ساتھ ساتھ تعمیر حیات کی تحریر و طباعت کی ذمہ داری بھی عرصہ تک ہم دونوں کے سر رہی۔

۱۹۶۷ء میں وہ پہلی بار حضرت مولانا دامت برکاتہم کی معیت میں حجاز گئے اور مدینہ منورہ میں چھ ماہ سے زائد عرصہ تک قیام کیا، اس دوران انہوں نے فریضۂ حج بھی ادا کیا، دوسری بار وہ ندوۃ الشباب العالمیۃ کی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے اس کی دعوت پر ۱۹۷۲ء میں ریاض گئے اور حرمین شریفین میں بھی وقت گذارا اور عمرہ کی سعادت حاصل کی تیسری اور آخری بار پھر وہ حضرت مولانا دامت برکاتہم کے رفیق سفر کی حیثیت سے حجاز گئے، یہ مئی ۱۹۷۴ء کا واقعہ ہے، اور کم و بیش ایک ماہ کے بعد واپس آئے،

مولانا مرحوم کو اپنے اس ساتھی کے باہر کے سفروں کا بھی بڑا اہتمام ہوا کرتا تھا، وہ اسے ہر حیثیت سے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے بارے میں سوچتے تھے اور اس سلسلہ میں وہ پورا تعاون کرتے تھے، انہوں نے ہر بار سفر کے موقع پر بہت ہی خوشی کا اظہار کیا، اگرچہ سفر شروع ہونے کے وقت ساتھ چھوڑنے کا ایک عارضی غم ضرور ہوتا تھا، لیکن وہ اسے ہر قیمت پر برداشت کرتے تھے، مہرجان تعلیمی کے موقع پر اگست ۱۹۷۵ء کے شروع میں جب ہمارے باہر کے سفر کا پروگرام بنا اور عالم اسلام کی بڑی شخصیتوں کو دعوت دینے اور مہرجان کے سلسلہ میں ذہن تیار کرنے اور زمین ہموار کرنے کے لئے ہمارا انتخاب ہوا تو انہوں نے اس پر بہت زیادہ مسرت کا اظہار کیا اور اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا، یوں تو مہرجان کے سلسلہ میں تقریباً ۱۰ ماہ پہلے ہی سے ہم لوگ اس کی تیاریوں میں مصروف تھے، مولانا علمی اور فکری حیثیت سے اس کو کامیاب بنانے کی راہ ہموار کر رہے تھے، اسی ضمن میں البعث الاسلامی کا ندوۃ العلماء نمبر نکالنے کا فیصلہ بھی کیا گیا جو مہرجان سے پہلے ہی بحمد اللہ نہایت کامیابی اور خوبصورتی کے ساتھ ایک وقیع دستاویز کی شکل میں منظر عام پر آ گیا دوسرا نمبر مہرجان کی تفصیلی کارروائیوں اور مقالات پر مشتمل تھا جو ضخامت میں پہلے نمبر سے کم نہ تھا یہ بعد میں نکلا، ان دونوں خاص نمبروں کی ترتیب و تحریر میں اصلاً مولانا ہی کا ذہن کام کرتا رہا اور انھیں کی توجہ سے یہ نکل سکا، مہرجان کے بعد انہوں نے حضرت مولانا دامت برکاتہم کے حکم سے "روداد چمن" لکھ کر اپنی

عظیم الشان صلاحیت اور فنی خصوصیات کا سکہ جما دیا، یہ کتاب بھی ان کی ایک عظیم یادگار رہے گی،

باہر کے سفروں کے دوران مجھے ایک دفعہ کسی عرب دوست نے البعث کے افتتاحیوں کا مجموعہ تیار کرکے اسے الگ سے کتابی شکل میں چھپوانے کی طرف توجہ دلائی۔ اس کا ذکر میں نے مولانا مرحوم سے کیا انہوں نے اسے پسند کیا اور اس کی طرف توجہ کی، چنانچہ پہلا مجموعہ "الاسلام الممتحن" کے نام سے کئی سال پہلے قاہرہ میں چھپا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے بہت سے اڈیشن نکل گئے، اس کتاب کو عرب نوجوانوں نے بہت ہی شوق سے ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ کافی پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی، اس کے علاوہ "الیٰ القیادۃ الحالمیۃ" اور "الاسلام بین لا ونعم" کے مسودے بھی تیار ہیں جو انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب قاہرہ سے شائع ہونگے، مولانا نے مجھے بھی کئی بار مشورہ دیا کہ میں اپنے "البعث" میں شائع شدہ مضامین کو موضوع کے لحاظ سے مختلف مجموعوں میں جمع کردوں۔ ایک دفعہ انہوں نے خود ہی فہرست بنادی اور کہا کہ تمہارے اتنے مجموعے تیار ہوسکتے ہیں، پھر باصرار ان سب کو اکٹھا کرنے کی ترغیب دلاتے رہے مگر سوائے ایک مجموعہ کے جو "فی رحاب العارفین" کے نام سے قاہرہ سے شائع ہوا، کسی اور مجموعے کے تیار کرنے کی توفیق اب تک نہ ہوسکی، افسوس کہ یہ کتاب بھی ان کے سانحۂ ارتحال کے بعد چھپ کر آئی اور وہ دیکھ بھی نہ سکے، ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ موسیقی اور گانے کے بارے میں ایک تحقیقی مضمون لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ البعث میں شائع کیا جاسکے، ادھر عرب نوجوانوں میں رقص وسرود اور نغمہ وموسیقی پر فریفتگی کا رجحان کافی بڑھ گیا ہے اور مرض کی حد تک وہ اس میں مبتلا ہو رہے ہیں، انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم اس موضوع پر کتاب وسنت کی روشنی میں ایک مضمون لکھو، چنانچہ میں نے "الغناء والموسیقی فی الاسلام" کے عنوان سے یہ مضمون لکھا اور وہ البعث میں کئی قسطوں میں شائع ہوا، اسی طرح وہ ہمیشہ اس بات کے متمنی ہوتے تھے کہ میں فقہی اور علمی موضوعات پر ضرور لکھا کروں، ان کے علمی مشورے میرے لئے ہمیشہ مشعل راہ رہیں گے، کبھی ایسا بھی نہیں ہوا کہ انہوں نے افتتاحیہ یا کوئی مضمون لکھا ہو اور نہایت اہتمام سے اس پر تبادلۂ خیال نہ کیا ہو، اکثر وہ اس کام کے لئے جائے کی مجلس کا اہتمام کرتے اور مضمون پر پوری آزادی سے میری رائے معلوم کرتے تھے۔

مہرجان کے موقع پر پیام ندوۃ العلماء کے نام سے ایک مختصر کتاب ترتیب دی اور وہ چھپ کر مقبول ہوئی، اس کتاب میں ندوۃ العلماء کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کھل کر سامنے آگیا ہے، وہ اس عظیم الشان

اسلامی ادارہ کو کس شکل میں دیکھنا چاہتے تھے اور کس انداز کے علماء کی جماعت کے وہ متمنی تھے اور اس سلسلہ میں ان کے کیا مشورے تھے، یہ سب باتیں اس کتاب کے مطالعہ سے اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہیں، دراصل وہ ابتدا ہی میں بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح اور حالات لکھ کر ندوۃ العلماء کے قیام کے صحیح مقاصد اور اس کی روح سے خوب واقف ہو گئے تھے،

حضرت مولانا دامت برکاتہم کی سیرت کے موضوع پر عظیم الشان کتاب "السیرۃ النبویۃ" عربی میں شائع ہوئی تو اس کا نہایت سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ مولانائے مرحوم نے کیا اور یہ کتاب اردو میں "نبی رحمتؐ" کے نام سے شائع ہوئی، اس کی زبان سے کسی حال میں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کوئی ترجمہ ہے، یہی حال ان کے سارے تراجم کا ہے جیسے "ارکان اربعہ" "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش"، "جب ایمان کی بہار آئی"، "ربانیہ لا رہبانیہ"، اسکے علاوہ اور بہت سے رسائل و پمفلٹ کا ترجمہ انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ پڑھنے والے کو جب تک بتایا نہ جائے کہ یہ ترجمہ ہے، وہ کبھی از خود نہیں سمجھ سکتا،

وہ اپنے علمی، ادبی اور فکری کمالات کے ساتھ انسانی عظمت کے تمام پہلوؤں میں یکتائے روزگار تھے، اخلاق کی بلندی، کردار کی پاکیزگی، گفتار و رفتار کی سنجیدگی اور نرمی ان کا خاص وصف تھا، ان کو کسی نے کبھی کسی سے لڑتے ہوئے یا سخت کلامی کرتے ہوئے نہیں دیکھا، پاکبازی، خاموشی، حسن سلوک اور بڑی حد تک گوشہ نشینی اور خلوت پسندی میں وہ بے مثال تھے، بغض و حسد، کینہ و عداوت، نفرت و حقارت اور دوسرے تمام مذموم اوصاف سے وہ کوسوں دور تھے، وہ نہ کسی کو اپنے عمل یا کلام سے ایذا پہونچاتے تھے اور نہ کسی کی عیب جوئی اور غیبت کرنا اور سننا پسند کرتے تھے، ہمارا ان کا تعلق بہت بے تکلفانہ اور مخلصانہ تھا مگر کبھی انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے تعلقات پر کوئی اثر پڑ سکے، وہ کام کرنے والوں اور ذمہ داری کا احساس رکھنے والوں سے بہت خوش اور مطمئن رہتے تھے، کبھی کسی اپنے چھوٹے سے بھی حکم دیکر یا بڑا بن کر کوئی کام نہ لیتے، اور جو شخص بھی ان کا کوئی کام کر دیتا اس کے وہ ہمیشہ ممنون رہتے، وہ پرہیزگاری اور پاکبازی کا نمونہ تھے، کمزوروں کی مدد کرنا، غریبوں کے دکھ درد میں شریک ہونا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے اور بہت سے لوگوں کی وہ خفیہ طور پر مستقل مدد کیا کرتے تھے، کم سے کم کام زیادہ سے زیادہ حق المحنت دئے جانے کے داعی اور مبلغ تھے،

مئی کے آخری ہفتہ میں ریاض کی جامعۃ الامام محمد بن سعود کی طرف سے استاذ زائر (visiting
Professor) کی حیثیت سے شام کے مشہور محدث وعالم جو جامعۃ الامام میں استاذ حدیث ہیں دارالعلوم
میں دو ہفتے کے لئے اسلامی موضوعات پر لکچر دینے کے لئے تشریف لائے تو مولانا ئے مرحوم نے اپنا پورا وقت
ان کے لکچروں سے استفادہ کرنے میں ایک طالب علم کی طرح گذارا اور وہ صبح سے شام تک دارالعلوم میں رہا
کرتے تھے، میں کسی وقت البعث کے پروف وغیرہ کی اصلاح میں مشغولیت کے باعث درس میں نہ پہونچ سکا تو
وہ گرفت کرتے تھے کہ تم کہاں رہ گئے۔ شیخ ۵ر جون ۱۹۸۰ء کو واپس تشریف لے گئے تو ہم سب لوگ ساتھ
ہی ہوائی اڈہ ان کو رخصت کرنے گئے، واپسی کے بعد وہ دارالعلوم تشریف لائے اور دیر تک ہمارا ان کا ساتھ
رہا، پھر میں ان کو رخصت کرنے کے لئے اس دن ڈالی گنج تک گیا، اس زمانے میں حضرت مولانا دامت برکاتہم
اور مولانا معین اللہ صاحب نائب ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم پیام انسانیت کے سلسلہ میں کرناٹک
کا دورہ فرما کر بمبئی تشریف لے گئے تھے ــــ ان حضرات کو سفر کے وقت رخصت کرنے کے لئے ہم لوگ لکھنؤ
کے چار باغ اسٹیشن گئے تھے، مگر افسوس کہ راستہ میں اس قدر بھیڑ بھاڑ تھی کہ ہمارا رکشہ کافی دیر میں اسٹیشن
پہونچا اور مولانا اپنے عم معظم دامت برکاتہم کے آخری دیدار سے بھی محروم رہ گئے، اور حضرت مولانا کی
واپسی سے پہلے ہی ۱۳ر جون کی صبح کو ناشتہ کے بعد اچانک پیٹ میں درد اٹھا اور آناً فاناً شام تک سب
کچھ ہو گیا جس کی کسی کو توقع نہ تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مولانا کو اطلاع کی گئی، بمبئی تشریف
لا چکے تھے مگر لکھنؤ پہنچے تو سب کچھ ہو چکا تھا اور مولانا محمد میاں صاحب مرحوم اپنی آخری آرام گاہ تک پہونچ
چکے تھے، ان للہ ما أخذ ولہ ما أعطی، وکل شئ عندہ الی أجل مسمی،

مارچ ۱۹۸۰ء کے اخیر میں ہمارا بھی خلیج، کویت اور سعودیہ کا سفر ہوا تھا[1] اور واپسی نصف مئی میں ہوئی
تھی، اس کے بعد ہی سے برابر مجھے اپنی والدہ صاحبہ سے ملنے کی غرض سے وطن جانے کا تقاضا تھا، مگر یہ سفر
ٹلتے ٹلتے ۱۲ر جون تک ٹلا۔ ۱۲ر جون کو ہماری ان سے حسب معمول ملاقات ہوئی دیر تک باتیں ہوئیں پھر
ہم نے ان کو اپنے سفر کے ارادہ سے مطلع کیا اور خیال تھا کہ ایک ہفتہ میں واپسی ہو جائے گی، ان سے اچھی
طرح مل کر رخصت ہوئے، کون جانتا تھا کہ یہی ہماری ان کی آخری ملاقات تھی، ابھی گھر پہونچ کر کپڑے بھی
نہ بدل سکے تھے کہ فون کے ذریعہ حادثہ کی اطلاع ہوئی اور دل پر جو کچھ گذر گئی اس کا اندازہ کس کو ہو سکتا

---

[1] اس سے پہلے ۱۹۷۷ء میں ہمارے سفر مصر کے موقع پر بھی مولانا مرحوم نے بڑے اہتمام سے رخصت کیا تھا اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا تھا، اس سفر میں میں، مولانا سید محمد واضح صاحب ندوی ساتھ تھے، دوران سفر انہوں نے دلچسپ خطوط لکھے اور اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

ہے۔ اسی وقت الٹے پاؤں لکھنؤ بذریعہ ٹیکسی واپس آیا، جنازہ رائے بریلی جا چکا تھا، سیدھا وہاں گیا تو میرے عزیز و معزز دوست ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو چکے تھے اور اپنی آخری آرام گاہ تک پہونچ چکے تھے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اتفاق سے مولانا مرحوم کے گھر کے لوگ (اہل خانہ) بھی اس زمانے میں لکھنؤ سے رائے بریلی کئی ہفتے پہلے جا چکے تھے، مرحوم نے بارہا مجھ سے کہا تھا کہ میں رائے بریلی جانا چاہتا ہوں مگر برابر کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آجاتی ہے، ان کا خیال تھا کہ حضرت مولانا کی باہر کے سفر سے واپسی پر وہ ساتھ ہی رائے بریلی جائیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا، کون جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے وہاں چلے جائیں گے اور کسی سے بھی ملاقات اب نہ ہو سکے گی، یہانتک کہ اہل خانہ کو اچانک اس حادثہ کا علم جنازہ کے رائے بریلی پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہی ہوا، ان سب لوگوں کے دلوں پر کیا کچھ گذر گئی ہوگی اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت پر یقین نہ ہوتا اور اللہ کی طرف سے صبر میسر نہ آتا تو ایسے حادثہ پر کون صبر کر سکتا تھا، وہ کون سا وقت ہو سکتا ہے جس میں ان کی یاد نہ آئے، ان کی بہترین یادوں کے نقوش لوح قلب پر اس طرح نقش ہیں کہ کسی طرح مٹانے سے بھی وہ نہیں مٹ سکتے۔

يذكرني طلوع الشمس صخرا　　واذكره لكل غروب شمس

فلولا كثرة الباكين حولي　　على اخوانهم لقتلت نفسي

خنساء نے تو یہ شعر اپنے بھائی کے متعلق کہا تھا، مگر میں اسکو اپنے دوست کے لئے پڑھ رہا ہوں جس میں بڑی حد تک میرے سوگوار جذبات کی ترجمانی ہے۔

یہ ایک مختصر حکایت ہے اس مرد مومن کی ورنہ ۲۶ سال کی مسلسل رفاقت کا حق چند صفحات میں ادا ہونا بہت مشکل ہے[1]۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا بہترین معاملہ فرمایا ہوگا اور وہ ان کی رحمتوں کے سایے میں راضی و مسرور ہوں گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح اسلام پر زندہ رکھے اور ایمان و عمل صالح پر خاتمہ نصیب فرمائے۔ (آمین)

---

[1] انکی سوانح حیات پر مفصل کتاب مولانا محمد ثانی صاحب ندوی تصنیف فرمارہے ہیں جس کے عنقریب شائع ہونے کی امید ہے۔ مرحوم کی زندگی کے حالات و واقعات کے بہت سے اہم پہلو اس مختصر سے مضمون میں آنے سے رہ گئے، جس کا افسوس ہے۔

محمد الحسنی

لوح و قلم[1] جن کے لئے نوحہ کناں ہیں

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی

انتقال سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل ایک شام کو ہم اور محمد میاں مرحوم حسب معمول گفتگو کر رہے تھے دن کی علمی اور تعلیمی مصروفیات، ملاقاتیں، عربی اخبارات کے تبصرے اور عالم اسلامی کے مسائل زیر بحث تھے۔ اسی شام کو جب ہم دونوں بے تکلف گفتگو میں مشغول تھے۔ محمد میاں مرحوم نے متمم بن نویرہ کے مشہور مرثیہ کے اشعار کے بارے میں کچھ استفسار کیا جو اس نے اپنے بھائی کے انتقال پر کہا تھا۔ وہ اشعار یہ ہیں۔

وکنا کندمانی جذیمة حقبة — من الدهر حتی قیل لن یتصدعا
فلما تفرقنا کانی ومالکا — لطول اجتماع لم نبت لیلة معا
فتی کان أحیی من فتاة حیية — وأشجع من لیث اذا ما تمنعا

(مدتوں ہم لوگ جذیمہ کے ندیموں کی طرح ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ یہ کہا گیا کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے اور جب ہم بچھڑ گئے تو طول مصاحبت کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اور مالک نے ایک رات بھی ساتھ بسر نہیں کی۔ میرا بھائی دوشیزہ سے زیادہ باحیا، اور شیر سے زیادہ بہادر اور خوددار تھا)۔

آج مجھے یاد آتا ہے کہ اس رات یہی اشعار موضوع گفتگو تھے، پھر گفتگو کا رُخ ام المومنین حضرت عائشہؓ کا ان کے بھائی کے انتقال پر ان اشعار سے تسکین حاصل کرنے اور امیر المومنین حضرت عمرؓ کا اپنے بھائی زید بن خطاب کے مرثیہ کے لئے متمم بن نویرہ سے فرمائش کرنے اور ابن نویرہ کے مرثیہ کہنے (جس سے حضرت عمرؓ کا غم دور ہوا) کی طرف مڑ گیا۔ پھر یہ سلسلۂ کلام دراز ہو کر جذیمہ کے ندیم اور ان کے بارے میں عربی ادب کے تاریخ نویسوں کے اختلاف تک پہنچا۔ محمد میاں کو ابن نویرہ کے ان اشعار کی اپنے

---

[1] اس سے مراد قلم و قرطاس ہے جن سے انہوں نے بہت کام لیا۔

ایک مضمون میں ضرورت تھی، اور میرے حاشیہ خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ عنقریب ہم لوگ ہی ان اشعار کا مصداق بنیں گے اور میں اپنے اس عزیز ترین بھائی کی جدائی پر غم واندوہ کے اظہار کے لئے انہی اشعار کا سہارا لوں گا۔ اور ان کے انتقال پُر ملال پر آنسو بہاؤں گا اور کون ہے جو اس حادثہ کے بعد آنسو روک سکے۔ عربی شاعر کہتا ہے۔

ولیس لعین لم یفض ماءھا عذر

(جس آنکھ سے آنسو نہ ٹپکے ہوں اس کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہے

جن لوگوں نے برادر عزیز محمد میاں کو قریب سے دیکھا ہے یا ان کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے، ان سب کے لئے ان کی وفات ایک المناک حادثہ ہے۔ ان کی تحریر کی تاثیر سے سب واقف ہیں لیکن انکی گفتگو میں جو کشش اور تاثیر تھی اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کو ان سے ملنے اور بے تکلف گفتگو اور مشورہ کرنے کا موقع ملا ہو اور جو ان کی ساحرانہ شخصیت اور دلنواز مسکراہٹ سے واقف ہو، پھر وہ شخص جو ان کے ساتھ مستقل رہا ہو اور تا حین حیات ان کا رفیق کار رہا ہو اس کا ان کے فراق پر حسرت اور حزن و ملال کا کیا عالم ہوگا۔

محمد میاں کا ۴۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا لیکن اصابت فکر، استقامت، سخاوت اور روز مرّہ کی زندگی میں لغویات سے بعد و اجتناب میں وہ اس مقام تک پہنچے ہوئے تھے جس کی اکثر سن رسیدہ اور تجربہ کار لوگ تمنا ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔ اپنی ان خصوصیات و کمالات میں جو انمیں بچپن سے پائے جاتے تھے وہ اپنے معاصرین سے بہت فائق تھے۔ اللہ والوں کے سے ان کے اخلاق تھے۔ اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کی فروگذاشتوں کو انگیز کر لینا ان کا شیوہ تھا جس کے سبب وہ سب کے محبوب و ہر دلعزیز تھے۔ جو شخص ان سے ملتا اس کے اکرام واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، اس کے قیمتی وقت کی پوری رعایت کرتے۔ وہ خوددار و غیور تھے بڑوں کی تعظیم کرتے اور چھوٹوں سے محبت کا معاملہ کرتے۔ ان کے احساسات کو ٹھیس پہنچانے سے گریز کرتے، کیونکہ یہ ان کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا، گھر کے چھوٹے بڑے سبھی افراد ان کے ساتھ محبت اور احترام سے پیش آتے۔ اسی طرح وہ چھوٹے بڑے، طلبہ و اساتذہ دوست واحباب سب کو محبوب اور اس کے ہمراز و دمساز تھے۔

محمد میاں اپنے اہل وعیال اور ہر تعلق رکھنے والے کے ساتھ بڑے خلوص و محبت سے پیش آتے ان کی ہمت افزائی کرتے، خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار اور ان کی آبیاری کرتے۔ ہر ایک کے مسائل سے دلچسپی لیتے اور صبر و دلچسپی سے اس کی گفتگو سنتے اور مشورہ دیتے اور اگر کسی تعاون کی ضرورت ہوتی تو پورا تعاون کرتے ان کے حوصلے بلند کرتے، اس میں اس کی رہنمائی کرتے، صلاحیتوں کو ابھارتے، اور کام کرنے کے میدان اس کے لئے تلاش کرتے۔ یہی سبب ہے کہ سب کے نزدیک وہ قول و عمل کی جامعیت دل کی نورانیت، عقل و دانش کی روشنی اور بصیرت کی تابانی کی جیتی جاگتی مثال بن گئے، اس کے ساتھ ساتھ اپنے کام میں پورا انہماک و استغراق تھا، اور لایعنی باتوں سے احتراز و اجتناب۔ مشورہ اور مسائل کو حل کرتے وقت ان کا رویہ ہمیشہ مثبت ہوتا، سلبی تصور اور مداخلت سے ان کو مناسبت نہیں تھی۔

ہم دونوں کی پرورش ایک ہی گھر میں ہوئی۔ ان کے والد ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحب حسنیؒ میرے ماموں تھے، ہم دونوں نے عربی زبان ایک ساتھ سیکھنا شروع کیا اس فرق کے ساتھ کہ میں ندوۃ العلماء کا طالب علم تھا اور وہ اپنے والد کے مثالی مدرسہ کے، قلیل مدت میں انہوں نے تعلیم مکمل کر لی۔ اپنے والد کی مثالی علمی و فکری رہنمائی میں وہ آگے بڑھتے رہے۔ اس پوری مدت میں وہ باوقار، خوددار، اور اپنے والد کے حد درجہ اطاعت شعار رہے۔ سولہ سال کی عمر میں عربی انشاء پردازی شروع کی پھر ندوۃ العلماء کے کبار اساتذہ اور مشائخ سے ایک سال تک علم حدیث اور دوسرے اسلامی علوم میں استفادہ کیا۔ اس اثناء میں وہ عربی میں مضامین لکھتے رہے یہاں تک کہ اسلامی رنگ کے انشاء پردازوں اور ادباء کی صف میں خاص امتیاز کے مالک بن گئے۔ ان کے مقالات توجہ سے پڑھے جانے لگے[1] وہ جو کچھ لکھتے وہ ان کے دل کی آواز ہوتی شہرت اور ناموری سے ان کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ ان کے مقالات پڑھنے والے اور ان کی شخصیت اور فکر سے متاثر ہونے والے ان سے ملاقات کے شائق ہوتے مگر وہ اکثر ملاقاتوں سے گریز کرتے۔ تواضع اور انابت الی اللہ کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتے۔ ہمیشہ اپنی نیت کا محاسبہ کرتے رہتے اور

---

[1] ان مقالات کا پہلا مجموعہ "الاسلام الممتحن" کے نام سے مصر سے شائع ہوا اور دوسرا ایڈیشن ہندوستان سے شائع ہوا۔ دونوں ایڈیشن جلد ختم ہو گئے اور اس نے نوجوانوں کی فکر اور زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

ہر طرح کی آلودگی سے اس کی حفاظت کرتے۔ چند سال پہلے صالحین اور مجاہدین کی سیرت کے مطالعہ سے ان پر اس احتساب کا ایسا غلبہ ہوا کہ انہوں نے تزکیۂ و تربیت نفس کے لئے لوگوں کے ساتھ زیادہ اختلاط سے اجتناب کا ارادہ کر لیا تھا۔ ان کے ذہن میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا اور مجھ سے اکثر تذکرہ کرتے، ایک دن مجھ سے کہنے لگے تاریخ میں صرف انہی حق پرستوں کی اصلاحی خدمات کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک عرصہ اپنے نفس کی تربیت و اصلاح میں گذارا۔ دعوت کا مرکز داعی کا قلب ہے اس لئے اس کے دل کو آئینہ کی مانند صاف و شفاف ہونا چاہیئے۔ ان کو اہل حق اور اہل قلوب سے بہت تعلق اور قلبی مناسبت تھی ان کی خدمت میں وقت گزارنے اور استفادہ کرنے کی جستجو رہتی، خاص اوقات میں خاص طور سے بعد مغرب اکثر گھنٹوں تدبّر و تفکر میں گزارتے۔ اصلاح نفس، اخلاص عمل اور حسن نیت کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے تھے اور اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کو بھی اس رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے لغویات سے اجتناب کرتے، باہم طنز و مزاح خواہ وہ صرف تفریح ہی کے لئے کیوں نہ ہو اور عیب جوئی سے احتراز کرتے اور اپنے رفقاء کو اس کی طرف متوجہ کرتے۔ اگر وہ کسی مجلس میں ہوتے اور لوگ ایسی گفتگو شروع کرتے جو ان کے ذوق و وجدان پر گراں ہوتی تو وہ خود ہی اس مجلس سے خاموشی یا کوئی عذر پیش کر کے اٹھ جاتے یا خاموشی اختیار کر لیتے اس طرح اکثر گفتگو کا رخ بدل جاتا اور کسی کی دل شکنی بھی نہ ہوتی۔ لوگوں کے محاسن تلاش کرنا اور کمالات کی بنیاد پر ان سے تعلقات استوار کرنا ان کی طبیعت ثانیہ تھی اسی لئے مختلف اور جدا جدا افکار و خیالات رکھنے والے اختلاف رائے و فکر کے باوجود ان کے شناسا اور ان سے متعارف تھے۔ ان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے معاملات میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔

محمد میاں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ۲۵ سال قبل ۱۹۵۵ء میں خال معظم حضرت مولانا مدظلہٗ کے ایک کتابچہ "صورت و حقیقت" کے عربی ترجمہ سے کیا۔ اس ترجمہ نے علمی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی کیونکہ ان کا اسلوب اصل روح سے ہم آہنگ تھا۔ بحیثیت انشا پرداز عربی زبان میں یہ ان کی ابتدا تھی پھر انہوں نے مولانا مدظلہٗ کے بہت سے مقالات کا اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کیا، اسی کے ساتھ ساتھ خود بھی چند مقالے تحریر کئے جو سلامت فکر اور اصابت رائے کے آئینہ دار ہیں۔ بیسویں سال میں قدم رکھتے رکھتے وہ علم و ادب کے حلقوں میں مشہور و معروف ہو چکے تھے۔ انشا پردازی میں

ان کا اسلوب دوسرے ادباء کے اسالیب کے مقابلہ میں لفظ و معنی کے جمال کی جامعیت، عقل و قلب پر اسکی قوت تاثیر، ضمیر کی بیداری اور اصابت فکر و صحت مقصد کے سبب، اور ترجمہ میں باریک بینی اور امانت داری کے سبب ممتاز و جداگانہ ہے۔ ان کو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں درجۂ امتیاز حاصل تھا کہ ان کی تحریر لفظی روانی اور معنوی چاشنی کی غماز تھی۔ ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ بیک وقت ترجمہ و تالیف اور سنجیدہ و دقیق علمی تحریر اور جذباتی اور قلب و دماغ کو اچک لینے والی تحریر دونوں کے جامع تھے ان کے اسلوب کا کمال یہ تھا کہ وہ دل پر احساس ہوئے بغیر اثر کر جاتا تھا پھر فکر و خیال پر اثر ڈالتا، اس پر تابندہ نقوش چھوڑتا اور اس کو عمل پر ابھارتا تھا۔

ایک روز میں نے ان سے سوال کیا، تمہاری تحریر ماموں جی مدظلہ کی تحریر و فکر سے بہت مشابہ ہے اس کا کیا راز ہے ایک دوسرے کا کلام مشابہ ہوتا ہے لیکن اتنا مطابق ہونا کہ امتیاز مشکل ہو جائے اسالیب کی تاریخ میں کم ملتا ہے۔

انہوں نے جواب دیا کہ میں نے بچپن ہی سے چچا میاں کی اہم تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا، اس حال میں ایک مثالی شخصیت کی حیثیت سے ان کی محبت میرے دل میں گھر چکی تھی۔ ان کے لکھے ہوئے لفظ پر میں غور کرتا اور اس کی ادبیت سے لطف اندوز ہوتا اور اس کو ادا کرنے کی فکر کرتا، اس لئے ان کا طرز تحریر اور اسلوب میرے ذہن و دماغ میں رچ بس گیا میرے خام و ناپختہ ذہن میں ان کی پختہ اور صحیح فکر نے گھر کر لیا، اس کے بعد انہوں نے عربی کا یہ شعر پڑھا ؎

أتاني هواها قبل أن أعرف الهوىٰ　　　فصادف قلبا خاليا فتمكنا

(محبت کے عرفان سے پہلے اس کی محبت نے مجھے تاکا تو اسے ایک خالی دل ملا جو اسکا نشیمن بن گیا)

انہوں نے بالکل سچ کہا۔ مولانا مدظلہ، اور محمد میاں کی تحریریں پڑھنے والا ہر شخص اس کا اعتراف کریگا سب سے زیادہ جس بات نے محمد میاں کو اس صفت سے متصف کیا وہ مولانا ندوی مدظلہ کی ہر تحریر پر ان کا بھرپور اعتماد اور اس کا صحیح استعمال ہے۔ اسلوب کی روانی، اس کی سحر انگیزی، نوجوانوں کے ایمانی جذبات کی برانگیختگی، ان کی نفسیات کی رعایت دعوتی طریقۂ کار سے واقفیت، اور عالم اسلام کے حالات پر گہری نظر غرض ہر چیز میں انھوں نے مولانا ندوی کے مکتبۂ فکر سے خوشہ چینی کی اور ان کی فکر اور اسلوب کے آئینہ دار

بن گئے بلکہ ان کے عزم و قوت اور جولانی طبع نے ان میں مزید گرمی اور قوت پیدا کردی۔

محمد میاں نے ۱۹۵۵ء میں مجلہ البعث الاسلامی کا اجرا کیا وہ زمانہ اشتراکیت کے طوفان اور عرب قومیت کے فتنہ کے عروج کا زمانہ تھا اور ان نظریاتی اور فکری طوفانوں کا شکار زیادہ تر نوجوان تھے۔ انہوں نے اپنے اداریوں میں نوجوانوں کو مخاطب کیا۔ البعث الاسلامی کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جس سے نوجوانوں کو متوجہ کرنے کی ضرورت اور اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

"موجودہ زمانہ میں مسلمان نوجوانوں کو اللہ پر ایمان، اس کے پیغام پر ناز و افتخار اور مستقبل پر اعتماد کی ضرورت ہے۔ ان کو سب سے زیادہ اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے اس طرح کہ باطل کے سامنے سب کے سب ایک اکائی بن جائیں۔ مسلمان نوجوانوں کو علم و ادب کے خوشگوار آمیزہ کی ضرورت ہے ان کے ذہن و دماغ میں دنیا کی سب سے قیمتی متاع ان کا دین و ایمان ہونا چاہیئے۔

عرب نوجوانوں کو خاص طور سے عربی صحافت پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے ترقی پذیر ادب کو صحیح علمی، ادبی، ثقافتی اور دینی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ موجودہ نسل، دینی مدارس کے طلبہ اور مسلمان نوجوانوں کی یہ سب سے اہم ضرورت ہے۔ ایک ایسے وقت میں جس میں اسلام کو ہزاروں اہل قلم اور زبان شناس ادبا ر کی ضرورت ہے مسلمان نوجوان خواب غفلت میں مدہوش ہیں۔ دینی مدارس کے طلبہ جن کو زمام کار سنبھالنا چاہیئے تھا اور رامت کی قیادت کرنی چاہیئے تھی وہ اسلامی قافلہ کی سب سے آخری صف میں نظر آتے ہیں۔ یہ دور ظلمت اب ختم ہونا چاہیئے اور ہم کو نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہیئے۔"

البعث الاسلامی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے انہوں نے اسی افتتاحیہ میں لکھا کہ "یہ رسالہ قاہرہ اور بیروت کے رسالوں کی طرح نہیں ہے جو ادب سے کھیلے اور مغربی آقاؤں کے گیت گایا کرے اور جس کو سوائے مدح و ثنا کے اور بادشاہ و امرا کا کلمہ پڑھنے کے اور کچھ نہ آتا ہو۔ البعث الاسلامی ایک دعوتی رسالہ ہے جس کا اپنا مقصد ہے اور اپنے اصول ہیں۔"

محمد میاں نے اپنے رسالے کو اسی نہج پر جاری رکھا اور البعث کا خصوصی نمبر "نحو التکوین الاسلامی الجدید" (نئی اسلامی تعمیر کی طرف) تک جو ان کے ہاتھ سے نکلا ہوا البعث کا آخری نمبر ہے اسی نہج کی نمائندگی کرتا ہے۔

انقلابی دور میں البعث الاسلامی نوجوانوں کا صحیح رہنما اور قائد تھا وہ ان کی ہمت افزائی کرتا، نئے بتوں کو توڑتا اور بھرپور عزم و حوصلہ اور بلندی کے ساتھ اسلام کی دعوت دیتا۔ اس طرح البعث عہد استبداد وجور میں زخموں سے چور اسلام پسندوں کے لئے مرہم کا کام کرتا تھا۔ اسلامی صحافت اس عظیم الشان خدمت کو فراموش نہیں کرسکتی جو الحاد و تشکیک بھرے زمانہ میں اس نوجوان ادیب نے اپنی قدرتی صلاحیتوں، پرسوز دل، جوش و جذبہ اور رواں دواں قلم کے ذریعہ انجام دی ہے، اس نے عرب قومیت کے علمبرداروں کی آنکھوں کی نیند حرام کر دی۔ بلاشبہ ان کی تحریریں اس باضمیر اسلامی صحافت کے لئے بہترین ثابت ہوئیں جو گذشتہ سالوں میں وجود میں آئی۔ جب استعماری طاقتوں نے اسلامی صحافت کی بیخ کنی شروع کی تو تنہا محمد الحسنیؒ کے قلم نے ان کی خبر لی۔ اس جدوجہد اور قلمی جہاد میں ان کے رفیق کار اور ان کے دوست مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی تھے۔ دونوں کے درمیان گہرا تعلق تھا جو تاحیات باقی رہا۔

محمد میاں نے البعث کے اجراء ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے آل اسلامک ورلڈ لیگ (رابطہ اسلامیہ) کے قیام کی دعوت دی اور اندرون و بیرون ہند تمام جامعات اور مدارس کے نوجوانوں کی توجہ اس کی طرف مبذول کی اس لئے کہ انھیں یقین تھا کہ اسلامی ثقافت سے آراستہ مسلمان نوجوان ہی اسلامی انقلاب کا علم بلند کریں گے جیسا کہ انہوں نے البعث کے پہلے اداریہ میں لکھا ہے یہ فکر انہوں نے اس دور میں پیش کی جب کہ مسلمان نوجوان حیران و سرگرداں تھے۔

البعث کے اجراء کے سلسلہ میں پیش آمدہ رکاوٹیں ان کے عزم و حوصلہ کو کمزور نہ کرسکیں نہ ہی انھوں نے اپنی راہ بدلی بلکہ وہ ایک جانباز بہادر کی طرح ڈٹے رہے جو اپنی تلوار کو تیز کر کے میدان جنگ میں بے خوف و خطر کود پڑتا ہے۔ انھیں کامل اعتماد تھا کہ حق سربلند رہتا ہے سرنگوں نہیں۔ ان کا یہ اعتماد مشاہدہ اور چشم دید چیزوں پر اعتماد سے کم نہ تھا۔ عرب ممالک میں پائی جانے والی مغرب سے مسحور زندگی کی وہ ایسی تصویر کشی کرتے کہ مصر اور دوسرے عربی ممالک کے نوجوان جو اس تہذیب کے مضر اثرات کو اپنی آنکھوں

سے دیکھتے تھے انگشت بدنداں رہ جاتے انھیں ایسا لگتا تھا گویا اس زندگی کا عرصہ تک وہ تجربہ کر چکے ہوں۔ یہ تصویر کشی بغیر مشاہدہ کے ممکن نہ تھی، مگر ان کی بصیرت اور قوت ادراک دوسروں کی نگاہ اور مشاہدہ پر غالب تھی، ان کی تحریر عرب شاعر کے اس قول کی مصداق تھی :۔

"ہم اپنی بصیرت سے وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جو نگاہیں نہیں دیکھتیں۔"

مولانا محمد الحسنیؒ کا قلم شمشیر کے مثل تھا۔ انہوں نے دنیا پر یہ ثابت کر دکھایا کہ کبھی قلم تیر و تفنگ کا کام کرجاتا ہے حضرت حسان کا مشہور مصرعہ ہے ؎

ویبلغ ما لا یبلغ السیف مذودی

(میری زبان وہ کام کرجاتی ہے جو تیر و تفنگ سے ممکن نہیں)

دوسرے ادباء اور انشا پردازوں کی طرح محمد میاں کا قلم محض بے باک و نا قد نہ تھا بلکہ وہ باوقار اور متین و سنجیدہ بھی تھا۔ چنانچہ اپنے ہر مضمون میں وہ تنقید و تبصرہ کے ساتھ مسئلہ کا حل اور اس کا علاج بھی پیش کرتے تھے اور ایک ذمہ دار ادیب کا یہی فرض ہے کہ وہ حالات و نتائج کا صحیح اندازہ لگائے اور اپنے قارئین کو دوراہے پر نہ چھوڑے، نہ ہی ان کے فرائض و ذمہ داریوں کی صراحت کیے بغیر ان کے جذبات و احساسات کو سرد ہونے دے۔ مولانا محمد میاںؒ کی پختہ فکر وسیع اور متوازن ذمہ دارانہ تحریر کا سب سے عمدہ نمونہ ان کا آخری مضمون ہے جو انہوں نے "جامعۃ البعث الاسلامی" کے عنوان سے تحریر کیا۔ اس مضمون میں انہوں نے تعلیم و تربیت اور مستقبل کے باشعور و ذمہ دار افراد ڈھالنے کا ایک وسیع خاکہ پیش کیا ہے کیونکہ وہ سمجھ چکے تھے کہ وہ دور بہت قریب ہے اور جلد ہی ظہور پذیر ہونے والا ہے۔

محمد میاں دعوت، جہاد اور تربیت کی کوششوں کے بارے میں بڑے پُرامید تھے دوسری طرف اللہ سے غایت درجہ ڈرنے والے اور پرہیزگار تھے۔ اپنے والد اور عم مکرم مولانا ندوی کی رہنمائی اور صحیح اسلامی دینی تربیت نے انھیں کندن بنا دیا تھا وہ دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے خواہ جوان ہوں یا بوڑھے نمونۂ عمل تھے۔ اسلامی دعوت کے کاز کے لئے انہوں نے صحافت اور نشر و اشاعت کو اپنا میدان عمل بنایا اور اس پر ساری توجہ مرکوز کردی۔ بغیر کسی کی ملامت کی پرواہ کئے ہوئے وہ آزادانہ اپنا رول ادا کرتے رہے۔ مصائب نے ان کا منھ نہ موڑا نہ ہی کسی لالچ یا خوف نے انھیں اپنے مشن سے باز رکھا۔ انہوں نے

جب مصر میں بیداری کی لہر محسوس کی تو مصر کو اس کے نئے دور کے آغاز پر سب سے پہلے مبارکباد پیش کی اسی طرح ممالک خلیج اور سعودی عرب میں جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ خوشحالی اور عیش کوشی میں غرق ہیں تو ان کے اخلاص اور ذمہ دارانہ احساس کو گوارا نہ ہوا اور انہوں نے ایک نہایت دردمندانہ مضمون "سؤال حائر یحتاج الی جواب"، کے عنوان سے سپرد قلم کیا، اس پر خاص نمبر نکالا جو ان کی حیات کا آخری نمبر ہے۔

نشر و اشاعت کے ذریعہ اسلامی دعوت کے سلسلہ میں ان کے جوش و خروش اور لگن کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بیک وقت چار رسالوں (دو اردو اور دو عربی) میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں طاقتور مضامین لکھنے شروع کئے اور یہ مضامین وہ اکثر بغیر فرمائش کے لکھتے اس لیے کہ دعوت کے لیے فرمائش کی ضرورت نہیں، وہ تو قلب کا تقاضا اور دل کی تڑپ تھی جو ان کو مضامین لکھنے پر آمادہ کرتی۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اکثر قارئین محض ان کے مقالات کے سبب ان رسالوں کے خریدار تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ مولانا ندوی کی کتابوں کا اردو ترجمہ اور ذاتی تصنیف و تالیف بھی کیا کرتے تھے بیس سے زائد عربی کتابوں کا انہوں نے اردو یا عربی میں ترجمہ کیا۔

جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت سے محمد میاں کو زیادہ مناسبت نہ تھی وہ اکثر گریز کرتے اس لئے کہ وہ اس کو اپنے لیے رکاوٹ سمجھتے تھے، وہ اپنے آپ کو اس میدان کا آدمی ہی نہیں سمجھتے تھے، اس لئے عموماً وہ کانفرنسوں میں شرکت سے معذرت کر دیتے تھے۔ آخری دنوں میں انھیں قبرص کی اسلامی صحافتی کانفرنس اور ماسکو کی اسلامی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا مگر انہوں نے معذرت کر دی دراصل وہ سکون کے ساتھ کام کرنے کے قائل تھے۔ پس پردہ وہ بڑی سے بڑی کانفرنس کی تنظیم کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، ندوۃ العلماء کے تعلیمی جشن کا خاکہ بنانے اور دوسری کارروائیوں کی تکمیل میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے، یہی حال ان کا دوسری تنظیموں کے ساتھ تھا وہ ہر ممکن شکل میں اسلامی مسائل کو حل کرنے میں لگے رہتے تھے بہت سی مسلم رفاہی تنظیموں کے قیام اور غیر سودی بنکوں کے وجود میں ان کا عملی حصہ تھا لیکن یہ ساری جدوجہد پردہ کے پیچھے سے تھی۔ بہت سے دینی اور علمی اور دعوتی کاموں میں ان کی شرکت کو سوائے ان کے اور مالک حقیقی کے جو سمیع و علیم ہے کوئی نہیں جانتا، بعض خدمات کو صرف صاحب تعلق ہی جانتے ہیں جن کا ان سے براہ راست واسطہ پڑا تھا۔

محمد میاں اگرچہ علمی حلقوں میں ایک متحمس و فعال نوجوان اور صاحب اسلوب و قلم مدیر البعث الاسلامی کی حیثیت سے مشہور ہوئے لیکن ان کی ان وسیع خدمات کی وجہ سے جب چند گھنٹے کے اچانک مرض کے بعد ان کی وفات کی خبر پھیلی تو اس حادثہ کا اثر متعدد اسلامی تحریکوں اور دینی و ملی سرگرمیوں پر پڑا اور ان کی وفات کو امت کا بڑا خسارہ تصور کیا گیا۔

قول و عمل میں اعتدال و ہم آہنگی، فکر میں گہرائی و گیرائی، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت و حفاظت، ہر مسلمان کا اکرام، اور اس کے ساتھ معاملہ کی پاکیزگی اور تعلقات میں ترقی و سنجیدگی مرحوم کی بنیادی خصوصیات تھیں اور آج انہی خصوصیات کا موجودہ ادبا اور انشا پردازوں میں خصوصاً نوجوانوں میں فقدان ہے۔

اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نازل فرمائے اور ان کو بہتر سے بہتر بدلہ نصیب فرمائے۔ آمین

(عربی سے ترجمہ، از سید محمد ظفر ندوی)

ایمان کا کرشمہ

اسی ایمان کے ذریعہ ربعی بن عامر رستم کے دربار میں گئے جعفر بن ابی طالب نجاشی کے دربار میں گئے دحیہ کلبی رومی سلطنت میں داخل ہوئے محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا اور مجدد سرہندی اکبر کے دربار میں پہونچے، مثالیں بہت اور لاتعداد ہیں تاریخ قدیم و جدید دونوں اس سے مزین ہے۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

محمد الحسنی — میرا بھائی

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی

کسی ایسی شخصیت کا تذکرہ چند سطروں میں سمیٹنا جس کے ساتھ بیس سال گزرے ہوں بہت مشکل کام ہے نہ اس کے ساتھ انصاف اور نہ قارئین کے ساتھ۔ پھر ایسا ہمدم اور رفیق جو عزیزوں سے زیادہ محبوب ہو اور جس کے ساتھ شب و روز گزرے ہوں، سفر حضر ہر جگہ ساتھ رہا ہو، مکہ مکرمہ، منیٰ عرفات مسجد نبوی سے لے کر خدا معلوم کتنے مواقع ایسے آئے جب ہم صرف دونوں ہوئے صرف ایک قدر مشترک "اسلام کی سربلندی" پیار محبت دلسوزی اور دردمندی کے ان لمحات کا خیال آتا ہے تو بس ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔

انھیں لوگ مولانا علی میاں کے بھتیجے ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کے صاحبزادے، تعمیر حیات، اور البعث الاسلامی کے ایڈیٹر ایک ادیب اور صحافی کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن وہ کچھ اور ہی تھے۔ ساری زندگی ان کی شخصیت پر معصومیت، دلنوازی، سادگی اور تصنیف و تالیف کے پردے پڑے رہے عام طور پر یہ دستور ہے کہ جب کبھی ایسی شخصیت کا تذکرہ لکھا جاتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ کوئی مافوق الفطرت شخصیت ہے یا اس کی کمزوریاں اتنی نمایاں کی جاتی ہیں کہ خوبیوں کو شرم آنے لگتی ہے۔ اگر ان میں دو کمزوریاں نہ ہوتیں تو وہ اپنی اس کم عمری میں دنیائے اسلام کی سحر انگیز ممتاز ترین اور طاقتور ترین شخصیت کی حیثیت سے ابھرتے۔ اور پورے عالم اسلام پر چھا جاتے، ایک سفر کرنے سے وحشت دوسرے تقریر کرنے سے عدم مناسبت۔

ان کی عبقریت میں دراصل اسلام کے احیا و تجدید کی وہ روح کارفرما تھی جو کسی ملک تک محدود نہیں رہنا چاہتی، ان میں اپنے اسلاف کا وہ جوہر سمٹ آیا تھا جو دعوت و جہاد کا مرکب تھا۔ وہ پوری زندگی سرحد اسلام کے محافظ اور نگراں کا رول ادا کرتے رہے، تلوار کا کام قلم کی نوک سے لیا اور خون جگر کی

روشنائی پوری بے جگری اور دل سوزی سے اس راہ میں صرف کرتے رہے "خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر" کا وہ حقیقتاً مصداق تھے۔

ناصری فتنہ جس نے آندھی طوفان کی طرح پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا دانشوروں کے قلم، پریس وصحافت سب خس وخاشاک کی طرح اس طوفان میں بے بسی کا شکار تھے بڑے بڑے سورماؤں نے گوشۂ عافیت ہی کو غنیمت سمجھا تھا، شیر دل جیلوں میں تھے یا تختہ دار پر جا چکے تھے، لیکن خدا کے اس بندے نے اس طوفان کا رُخ پھیرنے میں اہم رول ادا کیا، اپنے چچا محترم مولانا علی میاں کے نقش قدم پر بلکہ بقول حکیم عبدالقوی قلم بہ قلم اس جہاد کی پہلی صف میں تھے، ہندوستان کے صرف واقف حضرات ہی صحیح اندازہ رکھتے ہیں کہ یہ کیسا مشکل اور عزیمت کا کام تھا اور عالم اسلام کی کتنی عظیم خدمت ہوگی، یہ قلم پوری طرح بیدار رہا اور کسی وقت آنکھ نہیں جھپکائی، پوری بے سروسامانی اور محدود ترین وسائل کے ساتھ وہ پورے عالم اسلام کے صاحب ضمیر، صاحب ایمان علماء اور دانشوروں کی طرف سے یہ فرض کفایہ انجام دیتے رہے، لیکن اس نوجوان نے اپنی اس خدمت کا کوئی صلہ طلب نہیں کیا۔ کیسی ممبری، کیسا اعزاز اس کے دل میں اس کا خیال تک نہیں گزرا۔ باہر کے ملکوں سے دعوت نامے بھی آتے رہے اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی لیکن وہ دوسروں کی ہمت افزائی کرتے اور خود صرف ایک مرتبہ ہی گئے۔

ان کے وہاں بڑے سے بڑے سفر میں سفر کے لوازمات کا بالکل اہتمام نہیں تھا، خود ہی کوئی فکر کرے ورنہ وہ بالکل بے نیاز اپنی دھن میں مست۔

ہندو پاکستان اور پورے عالم عربی میں جو دعوتی وفکری اور تخریبی کام ہوتے رہے تھے اس پر پوری نظر رکھتے اور باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے اور جب ضرورت ہوتی خود لکھتے اور دوسروں سے لکھواتے، ان کی تحریروں کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مولانا علی میاں اور ان کی تحریروں میں فرق کرنا مشکل ہوتا، ان کا کمال یہ تھا کہ زبان کے ساتھ خط بھی بالکل مولانا علی میاں کی طرح تھا ان کے دستخط اور مولانا کے دستخط میں بڑے سے بڑا ماہر بھی فرق محسوس نہیں کرسکتا تھا۔

صبح چائے کے بعد لکھنے کا معمول تھا، گیارہ بجے تک، اس کے بعد عام طور پر وہ لکھنے کا کام نہیں کرتے۔ اکثر مولانا نے اشارات دے دیئے اور انھوں نے پورا مضمون مولانا کے انداز میں تیار

کر دیا۔

شہر میں آمدورفت بہت ہی کم تھی، ہم خیال لوگوں کی مجلس ہوتی تو وہ پورے انبساط کے ساتھ شریک ہوتے، ان کے الفاظ اب بھی کانوں میں گونجتے ہیں "بھئی حد کردی" "سچ کہیے گا" "واقعی اچھا یہ بات تھی" "ہم بھی کہیں آخر قصہ کیا ہے"۔ مسکراتے ہنستے لیکن کبھی آواز کے ساتھ نہیں۔ لیکن مولانا ابوبکر حسنی اور تخلص بھوپالی مرحوم کی آمد پر انبساط بہت بڑھ جاتا، مجلسوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوجاتا گویا متقیوں کا موسم بہار ہوتا۔ تخلص صاحب مرحوم غفور میاں اور خالہ کی زبان میں ہر ایک کو اس کا حصہ رسدی تقسیم کرتے ان میں مانے ہوئے اہل قلم، صحافی، مقرر، لیڈر ملازم، نو وارد بچے، بوڑھے سب ہوتے اور ہر ایک اپنا حصہ خوشی سے قبول کرتا اور محظوظ ہوتا۔ ادب، صحافت، سیاست، معاشرت، ملکی وغیر ملکی حالات سب موضوع پر باتیں ہوتیں اور تبادلۂ خیال ہوتا۔ ایک مرتبہ محمد میاں مرحوم نے چائے منگوائی تخلص صاحب نے کہا خلوص نہیں ہے محمد میاں نے کہا پورے خلوص سے منگوائی ہے، تخلص صاحب نے پھر کہا کہیں خلوص نظر نہیں آتا اب ذرا محمد میاں پریشان ہوئے کہنے لگے آخر آپ کا مطلب کیا ہے، تخلص صاحب نے کہا کہ یہی کیک پیسٹری محمد میاں نے کہا کہ لاؤ بھی جلدی لاؤ خلوص ۔!

محمد میاں کا ذہن اپنے ماحول سے الگ تھا، مولانا علی میاں کی طرح جدید لیکن بعض چیزوں میں ان سے بڑھے ہوئے۔ ندوہ میں ہر سطح پر ترقی و تبدیلی اور جدید چیزوں سے پورے استفادہ کا رجحان رکھتے تھے وہ چاہتے تھے کہ ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے معیار بلند ہو، کتابت ہو تو اچھی ہو، رسالہ اور کتاب کا گٹ اپ بہت اچھا اور دیدہ زیب ہو۔ ندوہ میں چمن بندی اور جدید تعمیرات سے انھیں بے حد خوشی ہوتی تھی۔ اسی طرح طلباء سے ربط اور تعلق پیدا کرکے ان میں اُمنگ اور حوصلہ پیدا کرتے۔ ہر اچھے کام کی ہمت افزائی گویا ان کا دن رات کا مشغلہ تھا۔

کبھی اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی ہمیشہ بیک گراؤنڈ میں رہتے۔ ندائے ملت ہو یا تعمیر حیات، پیام انسانیت کا کام ہو یا مشاورت کا۔ مسلم مجلس ہو یا دینی تعلیمی کونسل، ندوہ کا ۸۵ سالہ جشن ہو یا عرب مہمانوں کی آمد۔ ہر موقع پر پوری طرح شریک لیکن اس طرح جیسے خود انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ بے نفسی، ایثار، سخاوت، حسن سلوک اور للّٰہیت کا ایسا نمونہ تھے کہ اس کی مثال کم سے کم

نوجوانوں میں میری نظر میں نہیں ہے۔

کسے معلوم تھا کہ یہ گلاب بن کھلے مرجھا جائے گا اور یہ چاند بدر کامل بننے سے پہلے ہی چھپ جائے گا، اسپتال کے بے رحم عملہ کو کیا معلوم انھوں نے ایک پاک نفس کی محض اپنی غفلت سے وہ فکر بھی نہیں کی جو اس سے ہزار درجہ کم لوگوں کو دولت کے سہارے مل جایا کرتی ہے بیشک سب کی سانسوں کا حساب متعین ہے اور ہر آنے والا جانے ہی کے لئے آیا ہے لیکن کچھ جانے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ذکر سے مدتوں آنکھیں پرآب رہتی ہیں اور بھلانے سے غم بڑھتا ہے۔

خدا کرے ان کے تینوں بیٹے عبداللہ عمار اور بلال ان کے صحیح جانشین اور ان کے اہل خاندان کی تسکین کا ذریعہ ہوں۔

مجاہدات کا میدان

انسان کے مجاہدات کا اصل میدان مسجد کا گوشہ یا خانقاہ کا حجرہ یا تسبیح و سجادہ نہیں، گھر اور بازار، سوسائٹی اور معاشرہ ہے اور اس میں سنت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے تو چلتے پھرتے سارے مجاہدے اور ساری منزلیں طے ہو سکتی ہیں، دشمن کے ساتھ کیا برتاؤ ہو، دوست کے ساتھ کیا رویہ رکھا جائے۔ گھر والوں کے ساتھ کس طرح پیش آئیں، پڑوسی کے کیا حقوق ہیں، معاشرہ میں ہماری اخلاقی ذمہ داریاں کیا ہیں، ناگوار باتوں کو کیسے برداشت کرنا چاہیئے، خدمت و ہمدردی کیا چیز ہے، یہ وہ اسباق ہیں جو مدرسہ و مکتب اور کسی یونیورسٹی و درسگاہ میں نہیں بلکہ گھروں میں، سڑکوں پر، راستوں میں چلتے پھرتے اور بات کرتے پڑھائے جاتے ہیں، نیند سے بیدار ہوتے ہی آدمی کا سبق شروع ہو جاتا ہے اور یہ سبق اس کی تمام مشغولیتوں کے ساتھ خود بخود چلتا ہے، اس کو کسی نئے عمل کا اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اعمال کی نیت درست کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

مضرابِ عجم سے عربی میں دینِ حنیف کا ساز چھیڑنے والا چل بسا

مولانا عبد الکریم صاحب پاریکھ

مضراب عجم سے عربی میں دین حنیف کا ساز چھیڑنے والا چل بسا مولانا محمد الحسنی اڈیٹر البعث الاسلامی کا اس دار فانی سے کوچ ہو گیا۔ نام ونمود سے دور رہنے والا اپنی تعریف دکھاوا اور ریا سے پاک ایک نفس مطمئنہ اپنے رب کے حضور جا پہنچا یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربك راضية مرضية۔

عالم اسلام کے مفکر اعظم حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی کے بھتیجے ڈاکٹر مولوی سید عبد العلی صاحب کے بیٹے اور مولانا سید عبد الحئی جیسے بلند پایہ عالمی سطح کے ممتاز عالم دین کے پوتے مولانا محمد الحسنی کا ۱۳ ؍جون ۷۹ء کو ۴۴ سال کی عمر میں انتقال ہو چکا۔

ہندوستانی مسلمانوں اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کے مشترکہ عالمی مسائل پر لکھنے والا قلم خاموش ہو گیا۔

اس ناچیز سے مولانا محمد الحسنی جو محمو میاں کے نام سے لکھنؤ کے حلقوں میں معروف تھے بارہا ملاقات، مشورے ہوتے رہتے تھے۔ نہایت ہی متین سنجیدہ گہری سوجھ بوجھ اور عمیق فکری سانچے میں ڈھلا ہوا یہ نورانی چہرہ اب حشر کے میدان میں ہی دیکھنے کو ملے گا۔

اللہ نے موصوف کو فن تحریر میں غیبی امداد سے نوازا تھا۔ ناصر کے طلسم کا پردہ چاک کرنے والا عربی مجلہ البعث الاسلامی کے اوراق پر عرب دنیا کو نہر سلسبیل کی طرح رواں دواں پیغام ربانی دیتے جا رہا تھا۔ مولانا علی میاں مدظلہ کے مضامین کی اردو سے عربی میں اور عربی سے اردو میں صرف ترجمہ یا ترجمانی ہی نہیں بلکہ فکر خیالات اسلوب قلم کی حلاوت مٹھاس حتی کہ مولانا محترم کے قلب کی آواز کو جوں کی توں صفحۂ قرطاس پر لانے میں مرحوم ایک منفرد شخصیت تھے۔ مولانا علی میاں کا ترجمان علمی دنیا سے رخصت ہوا۔

ادھ کھلی شیروانی آدھے بٹن لگے ہوئے آدھے کھلے، ہاتھ میں بستہ، کبھی کبھی بغل میں دبائے رکھتے، سر پر ٹوپی ہمیشہ مسکراتا چہرا انار کے دانے کی طرح دانت اس وقت لولؤ منثورا کا منظر پیش کرتے۔ جب مرحوم ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کوئی خوش ہونے کی بات کہتے تھے لیکن اپنے آپ کو کبھی نمایاں نہیں کرتے۔ ہر کام پردہ کے پیچھے محض رضائے الٰہی کی خاطر کرتے۔ اس صفت میں کسی نوجوان کو ان کے ہم پلہ ہم نے نہیں دیکھا۔

کوئی جلسہ ہو مشورہ ہو، اصابت رائے اور سنجیدہ گفتگو میں حصہ لیتے تقریر کرتے کبھی نہیں دیکھا البتہ قلم پر ایسا

قابو کر عربی صرف و نحو کے نہ جاننے کے باوجود عجمی قلم عربی میں ایسا چلا کہ عرب دنیا سر دھنتی اور عالمی سطح کے عرب مفکرین یہ سوال کرتے کہ یہ کون شخص ہے؟ عربی اخبارات میں محمد میاں مرحوم کے مضامین خوب خوب نقل ہوتے لیکن اپنی اس کامیابی کا ذکر محمد میاں کبھی کسی سے نہ کرتے موجودہ دور میں مخلصین له الدین کا ممتاز مقام انھیں کے حصہ میں آیا۔ سادات کا یہ خاندان جس کے چشم و چراغ مولانا محمد میاں مرحوم تھے۔ صبر و استقلال سے اس صدمہ کو برداشت کر گیا۔ ایک نورانی بستی دائرہ شاہ علم اللہ میں غم کے چادر میں یہ خاندان صبر و سکون سے اللہ کا نام لیے جا رہا ہے۔ دن بھر ملک کے ممتاز لوگ آتے جاتے ہیں۔ مولانا محترم علی میاں مدظلہ کو دو ایک بار غم کا بند سنبھالتے دیکھا معلوم ہو رہا تھا لاوا ابھر جائے گا بند ٹوٹ پڑے گا لیکن اس صدمہ کو برداشت کر گئے۔ انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ اور صبر جمیل کا زندہ نمونہ کسی کو دیکھنا ہو دیکھ لے کہ چند آنسو موتیوں کی طرح ٹپک گئے لیکن کوئی ہائے واویلا نہیں خدائی کا خواہی جانے اس خاندان میں ہمیشہ دین حنیف کے چراغ روشن رہے۔ مرحوم کے بڑے صاحبزادے مولوی عبد اللہ کی آنکھوں میں اس عاجز نے وہ روشنی دیکھی جو مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی (صاحب تبلیغ) آنکھوں میں دیکھی تھی۔ وما ذلك على الله بعزيز کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کا قلم پھر جاری کر دے۔

بہرحال اس وقت تو کان امر اللہ قدرا مقدورا کے تحت ایک ہونے والی بات ہو گئی۔ اس غم میں سب سے بڑا جھٹکا تو حضرت مولانا علی میاں مدظلہ ناظم ندوۃ العلماء کو لگا کہ ان کے اسلوب اور فکر کا ترجمان اس دنیا سے رخصت ہو گیا مولانا محترم کے قلب میں جھانک کر کوئی دیکھے تو معلوم ہو کہ کیا کرب اور درد ہے اپنے بھتیجے کی اس جدائی کا لیکن صبر و استقامت کا یہ عالمی نمونہ ایسے غم کو صبر و رضا کا نمونہ بنا کر بتا چکا کہ کسی بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی مومن اپنے رب کی رضا اور قضا و قدر اور فیصلے پر راضی ہے البتہ بشریت کے تقاضوں کے تحت آنکھیں اشک بار اور دل بیقرار ہونا تو ام موسیٰ کے لیے بھی قرآن میں یہ بتایا گیا کہ فاصبح فؤاد ام موسى فارغا لیکن جب اللہ اور انسان کے قلب میں رابطہ پیدا ہو جائے تو بات ہی کچھ اور ہو گی۔ یہ انسانیت کا وہ اعلیٰ نمونہ ہے کہ فرشتے بھی اس کی مثال میں عاجز ہیں کہ غم اور فکر تکلیف و رحمت دکھ اور درد کا ذائقہ انھوں نے کبھی چکھا نہ ہو تو اس کی مثال بھلا وہ بھی کیسے پیش کر سکتے ہیں۔

محمد میاں مرحوم کے انتقال کے وقت مولانا علی میاں مدظلہ سفر میں تھے۔ بڑی کوشش کے بعد بھی موصوف مرحوم کی تدفین میں شریک نہ ہو سکے۔ آہ مولانا علی میاں مدظلہ کو حضرت اور مرشد کہنے والے لاکھوں ہیں مصلح اور مولانا کہنے والوں کی بھی کمی نہیں لیکن بڑے پیار اور مٹھاس سے چچا میاں کہنے والی زبان اب خاموش ہو چکی۔ دائرہ علم اللہ کو چھوٹی سی بستی میں تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ تینوں وقت دستر خوان پر مسلمانوں کو کھانا کھلانے میں

سادات کا یہ ایک خاندان معروف ہے چہرے غم زدہ ہیں لیکن آنے والوں کی خدمت میں ذرہ برابر کمی نہیں۔ اللہ اللہ ایسا نمونہ پہلی بار دیکھا خواتین کم سن بچے جوان بوڑھے سب کے سب صابر اور ذاکر شاکر شکوہ شکایت کا نام نہیں مگر آنے والا بستی پر غم کی تنی ہوئی چادر کو دل کی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے تو پھوٹ پڑتا ہے لیکن کیا ہی صابر لوگ ہیں اس خاندان کے گویا آنے والوں کو ان کی آنکھیں اور ہونٹ جو خاموش ہیں خود دلاسا دے رہے ہیں کہ فکر نہ کرو' یہ خاندان پہلے کی طرح برابر روشنی کے چراغ دیتا رہے گا۔ ہندوستان کا ہی نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں کا نقصان ہوا۔ گویا خاندان والے ہر آنے والے جو تعزیت کے لیے آرہے ہیں انھیں یقین دلاتے ہیں کہ انتظار کرو عجمی مضراب سے دین عربی کا ساز برابر سنائی دے گا۔ گو ساز کے تار چھیڑنے والا کوئی اور ہوگا جو محمد میاں مرحوم کی جگہ لے گا لیکن داعیانِ حق کا یہ قافلہ خاموش نہیں رہے گا۔ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو برابر ہم ادا کرنے کے لیے مستعد ہیں امت نہ گھبرائے کہ مجاہدین فی سبیل اللہ مسند بیعت و ارشاد اور قلم و قرطاس سے رب کی حمد و ثنا کے ترانے سنانے میں جو رول ادا کرتے آرہے ہیں انشاء اللہ اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

پیام انسانیت مولانا علی میاں مدظلہ کی دعوت ہے جو ملک میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی سبھی سے خطاب کرتی ہے۔ اس دعوت سے لاکھوں لوگ روشناس ہیں لیکن کیا کوئی یہ بھی جانتا ہے کہ اس دعوت کے نقش نگارش حسن و آرائش میں مولانا محمد میاں مرحوم کا کتنا حصّہ تھا میں آپ کو بتاؤں کہ وہ اس قافلے کی پوری رہنمائی کرتے تھے لیکن اپنے آپ کو کبھی نمایاں نہیں کیا۔ ہم جیسے آگے بڑھتے اور داد حاصل کرتے لیکن محمد میاں مرحوم پردہ کے پیچھے آخر وقت تک پیامِ انسانیت کی دعوت کی خبرگیری کرتے، مشورہ دیتے خاکے بناتے نشیب و فراز خطرات اور مشکلات کی نشاندہی کرتے لیکن اخباروں میں نام ان کا کبھی نہ آنے پاتا۔

واقعی یہ جوان صالح نئی پود کے لیے ایک اہم نمونہ تھا۔ اب ہمارے درمیان نہیں ہے لیکن اس کا قلم' کتابیں، دعوت لاکھوں سطور میں اب بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے اور حشر کے دن یَوْمَ یَدْعُوْکُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّکُمْ کہتے ہوئے اپنی قبر سے جب اپنی خدمات کا پرچہ اپنے سیدھے ہاتھ میں لیے حشر کے میدان میں انشاء اللہ ملیں گے اسی وقت دل کھول کر باتیں ہوں گی۔

مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم

مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

(زیرِ نظر مضمون "تعمیرِ حیات" (۲۵ جون و ۱۰ جولائی) کا اداریہ ہے جو اسحاق جلیس مرحوم نے مولانا محمد الحسنی کے سانحہ انتقال پر قلم برداشتہ لکھا تھا، اس کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا اور دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے اور اس سے اس صدمہ اور رنج و الم کا اندازہ ہوتا ہے جس نے مضمون نگار کے ذہن و دماغ بلکہ ان کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اور تعمیرِ حیات کے اسی شمارہ میں انہوں نے نمبر نکالنے کا اعلان کیا تھا لیکن ،

سامان سو برس کے ہیں پل کی خبر نہیں

کسے خبر تھی کہ اپنا مرتب کیا ہوا یہ آخری شمارہ دیکھ بھی نہ سکیں گے اور اپنے عزیز و محبوب دوست سے جا ملیں گے، اگر ان کو موقع ملتا تو نہ جانے کیا کچھ اور کس طرح لکھتے، کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ ان کے باہمی تعلقات، افکار و خیالات میں بڑی حد تک یکسانیت اور بہت سی سرگرمیوں اور پروگراموں میں شرکت کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے اداشناس اور طبیعتوں اور صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے، اگر قدرت کو منظور ہوتا اسحاق جلیس مرتب کرتے تو اپنے محترم رفیق اور محبوب دوست کا حق ادا کرتے، لیکن نمبر کے اعلان کے ساتھ ہی دست قدر نے انھیں سمیٹ لیا، "وکان امر اللہ قدرًا مقدورًا" ان کا یہ مضمون ایک تاریخی یادگار کے طور پر شامل اشاعت ہے۔ (مرتب)

تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا ما یرضیٰ ربنا وانا لفراقک لمحزونون۔

۱۳ جون ۱۹۷۹ء، ۱۷ رجب المرجب ۱۳۹۹ھ کی شب میں صرف چند گھنٹوں کی موت و حیات کے کش مکش کے بعد مولانا محمد الحسنی ندوی اس دار فانی سے رخصت ہو گئے، مرحوم نے حیات مستعار سے ابدی زندگی کا سفر

ایسی سرعت سے طے کیا کہ جس نے یہ خبر سنی اسے یقین کرنا دشوار ہوگیا، مختلف ذرائع سے تصدیق کی دل تھام کر اس حادثہ کی خبر کو قبول کیا تو اندر سے طبیعت یقین کرنے پر آمادہ نظر نہ آئی، انسانی زندگی میں غیر متوقع حادثے پیش آتے رہتے ہیں، لیکن وقت کا مرہم ان زخموں کو مندمل کرتا جاتا ہے، یہ نہ ہو تو زیست دشوار ہو جائے، لیکن بعض حادثے اپنی کیفیت کے اعتبار سے دائمی درد و الم چھوڑ جاتے ہیں، جو بھلائے نہیں بھولتے، جن کی یاد ہر گام، ہر موڑ اور ہر لمحہ تازہ ہوتی رہتی ہے، مولانا محمد الحسنی ندوی کا سانحۂ رحلت بھی دل کا وہ زخم ہے جسے بھرنے میں وقت کا مرہم شاید ناکام رہے، یادوں کی پُروائی دل کے اس زخم کو ہرا کرتی رہے گی، ان کی جُدائی کا غم ناقابلِ فراموش ہے، ان کی کمی کا احساس کسی لمحہ کم نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ مرحوم اس عصر کی ضرورت تھے، اس دور کا تقاضا تھے، اس عہد میں دین کی دعوت و خدمت کی ایک ایسی علامت SYMBOL تھے جس کا خلا پُر ہونا مشکل، جس کا بدل بظاہر نا ممکن، جس محرومی کی تلافی دشوار۔ وہ عمل ابھی جاری ہے جسے مرحوم نے شروع کیا تھا، اس مشن کی ہنوز تکمیل نہیں ہوئی جسے مرحوم نے جاری کیا تھا، وہ خواب ابھی شرمندۂ تعبیر ہے جس کی جھلک مرحوم نے اپنی تحریروں میں پیش کی تھی، پھر **محمد الحسنی** یاد کیسے نہ آئیں؟

مرحوم کی پیدائش اس صدی کے چوتھے دہے میں ہوئی، وہ ایسے خاندان میں پروان چڑھے جس سے ایمان و اسلام، علم و ادب، تبلیغ و جہاد، اصلاح معاشرہ اور تربیت فرد کی نہ جانے کیسی کیسی عظیم الشان خدمات وابستہ ہیں، انکی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں خاندانی روایات اور ان کے والد بزرگوار مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی ندویؒ اور عم محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی (اطال اللہ بقاءہ) کی سیرت، شخصیت اور تربیت نے چار چاند لگا دیے تھے، ایک طرف ان کی ذہنی تعمیر کا عمل جاری تھا، تو دوسری طرف عالم اسلام ایک نئے موڑ سے گذر رہا تھا، دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد استعمار سے آزادی کا دور شروع ہوا لیکن ملت اسلامیہ ایک نئی غلامی کا شکار ہونے لگی، یہ تھی ذہنی غلامی، مغربی تہذیب، قومیت، وطنیت اور اشتراکیت کا سحر جس نے عالم اسلام خاص طور پر ممالک عربیہ کو مسحور کر دیا تھا، کامل و اکمل دین اور ابد تک نوع انسانی کی رہنمائی کرنے والے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے اسلام پر بے یقینی کے عمومی سیلاب نے عالم اسلام اور دنیائے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اس دور میں ایسے پُر زور قلم کی ضرورت تھی جو شک و ارتیاب میں مبتلا اذہان میں از سر نو ایمان و یقین کی مشعل روشن کرے جو غیر اسلامی نظریات کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کرے، جو امت مسلمہ کو اس کے اصل منصب و مقام سے آشنا کرے، جس میں لذت کردار

اور جرأت اندیشہ ہو جو زبان وادب کو ایک نیا دعوتی اسلوب بخشے، اللہ تعالیٰ کی توفیق، ماحول کی تربیت اور وقت کی ضرورت نے مرحوم کو صرف بیس سال کی عمر میں ایک عربی ماہنامہ کے اجراء پر آمادہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے "البعث الاسلامی" کے نام سے جلائی ہوئی اس جوت نے نہ جانے کتنے تاریک دل و دماغ کو ایمان ویقین کی روشنی سے منور کیا، اس صور اسرافیل نے نجانے کتنے غفلت کے متوالوں اور نیند کے مدہوشوں کو بیدار کیا اور ان میں نئی روح پھونک دی، اس ضرب کلیمی سے الحاد و دہریت، قومیت واشتراکیت کے کتنے ہی بُت پاش پاش ہوئے، "البعث الاسلامی" کے سرورق کا یہ جملہ "شعارنا الوحید الی الاسلام من جدید" عالم اسلام کی نوجوان نسل کے دلوں کی دھڑکن بن گیا، نوجوانوں کی حد تک مرحوم کے سلسلے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ؎

شورشِ عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ کلی کلی یہاں مست تھی خواب ناز میں

محمد الحسنی بُھلائے نہیں جا سکتے کیونکہ وہ معرکہ ابھی برپا اور وہ محاذ ابھی گرم ہے، جس کے ہراول دستے کے وہ سپاہی بلکہ صفِ اول کے رہنما تھے، دین و لادینیت اور حق و باطل کی کشمکش اب فیصلہ کُن موڑ پر پہونچ چکی ہے، ایسے نازک موقع پر محمد الحسنی کیونکر یاد نہ آئیں؟ پچیس سال تک انہوں نے اپنے قلم کے ذریعہ جو جہاد کیا تھا، جو دعوت دی تھی، جو صدا لگائی تھی، اس پر عالم اسلام کے لاکھوں نوجوان لبیک کہہ کر پیش قدمی کر رہے ہیں، مراکش سے انڈونیشیا تک ملت اسلامیہ کی نئی نسل میں دینی بیداری کے آثار، مسلم ممالک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے مطالبات اور دیارِ غرب میں اسلام کی طرف بازگشت کی علامتوں کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں دیکھ سُن کر مرحوم بہت مسرور ہوتے تھے، سال گذشتہ انہی دنوں میں پاکستان میں اسلامی ایشیائی کانفرنس میں رفاقت رہی، مختلف شہروں میں جانا ہوا، ہر سطح کے عوام و خواص سے ملاقاتیں رہیں، مرحوم کو ہر موقع پر دین کے غلبہ اور دینداروں کے ہاتھ ملکوں کی زمام قیادت کا متمنی اور دعا گو پایا۔

مرحوم نے زندگی کی صرف ۴۴ بہاریں دیکھیں، لیکن اس مختصر مہلت عمر میں انہوں نے جو دینی، علمی اور ادبی ورثہ چھوڑا وہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے بڑا گراں قیمت، اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے بہت دور رس اور اپنے اسلوب و حسن بیان کے اعتبار سے بڑا ممتاز اور طاقتور ہے، عربی اور اردو کے اس اسلوب کو برتنے میں سب سے کامیاب انہی کا قلم تھا جسے ایک قدیم ندوی بزرگ نے "حسنی ندوی اسلوب" کہا ہے، اپنے عم محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا انہوں نے بڑا کامیاب تتبع کیا، اسلوب اور طرز تحریر میں ایسی یکسانیت کہ قریبی ساتھیوں

کو فرق و تمیز کرنا دشوار ہو جاتا۔

۲۳ سال کی عمر میں انہوں نے مشہور نو مسلم محمد اسد صاحب کی کتاب Road to Mecca کا اردو ترجمہ کیا جو "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہوا۔ ۲۵ سال کی عمر میں بانی ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری کی ضخیم سیرت لکھی، اسی زمانہ میں اپنے خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت شاہ علم اللہؒ کی سیرت ان کے قلم سے نکلی، اس کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بیشتر کتابوں کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا اور بعض کا اردو سے عربی میں، ان کی وہ کتاب جس نے عالم عربی میں ان کی شہرت کو بام عروج پر پہونچا دیا "الاسلام الممتحن" ہے جس کے چار ایڈیشن مصر سے شائع ہوئے، اس کتاب کی عرب نوجوانوں میں ایسی پذیرائی ہوئی جو بہت کم کتابوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ اس کتاب نے مشرق وسطیٰ سے مشرق بعید تک دینی اور دعوتی حلقوں کو متاثر کیا، انڈونیشیا کی ممتاز شخصیتوں نے اس کی خوب خوب تعریف کی اور وہاں کے بڑے بڑے اجتماعات میں اسکے مضامین سنائے گئے۔

۷ مرحوم کی علمی، ادبی صلاحیتوں کا ان سب کو اعتراف ہے جنھوں نے ان کی تحریریں پڑھی ہیں، لیکن انکی زندگی کا وہ نمایاں پہلو جسے دیکھنے کا ہر شخص کو موقع نہیں ملا، وہ تھی ان کی شرافت و مروّت، اخلاق و تواضع، خندہ جبینی اور شیریں گفتاری اور خود نمائی و نام و نمود سے پرہیز، آج کی دنیا میں انسانی اور اخلاقی قدروں کے زوال کا عمل جس تیزی سے جاری ہے اس میں کسی مرد بزرگ کا چراغ لیے "انسانم آرزوست" کی صدا لگانا تعجب خیز نہیں ہو سکتا، ایسے دور میں حیات اجتماعی کے تلاطم خیز دھارے میں ان کا دامن کسی کے شکوہ و شکایت کسی کی اذیت و حق تلفی، کسی کی گرانی اور انقباض سے آلودہ نہیں ہوا، وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے، ہر شخص کے بہی خواہ اور خیر خواہ بن جاتے، ہر ایک کی ترقی اور اس کی صلاحیت کو مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش کرتے، انہوں نے ہماری مختصر سی جماعت میں اپنے رکھ رکھاؤ، متانت و سنجیدگی اور خلوص و محبت سے ایسا اعتماد حاصل کر لیا تھا کہ کسی کو ان کے سامنے اپنے دل کی بات کہنے اور ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے میں تکلف نہ ہوتا۔ ——

محمد الحسنی بھلائے نہیں جا سکتے اس لیے کہ وہ بحیثیت انسان اتنے عظیم اور بلند تھے کہ ان کی بلندی تک جھانکنا ہم جیسوں کو دشوار تھا۔ محمد الحسنی بار بار یاد آئیں گے، کیونکہ ان کا میدان عمل قرطاس و قلم اور

گوشۂ علم و ادب تک محدود نہیں تھا، وہ ملی جد وجہد کے ہر میدان سے آشنا، اس کے مفید و مضر پہلوؤں سے باخبر تھے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے میں عملی دلچسپی لیا کرتے تھے، وہ اپنے عم محترم کے تنہا فکر و فن اور اسلوب نگارش کے امین و وارث نہیں تھے بلکہ ملت کے مسائل میں ان کی تڑپ اور دل سوزی، ان کی دعوتی سرگرمیوں اور اجتماعی کاموں سے بھی قلبی تعلق رکھتے تھے، شاید یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہو کہ تحریک پیام انسانیت کے سلسلے میں ہر مشورہ میں وہ شریک ہوتے اور اپنی اصابت رائے سے ہم سب کو متاثر کرتے، وہ اسٹیج سے ہمیشہ گریزاں رہے، خود نمائی سے کوسوں دور رہے، لیکن نہ جانے کتنے اجتماعات اور جلسوں کی کامیابی ان کا وہ خاموش عمل ہوتا جو پس پردہ وہ انجام دیتے۔ ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

مرحوم کی فکری، ذہنی، علمی، ادبی اور دینی خدمات کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت اور ان کی دل آویز شخصیت کو جو محبوبیت عطا فرمائی ہے اس کا اندازہ ان تعزیتی خطوط سے ہوتا ہے جو ان کے انتقال کے بعد ملک اور بیرون ملک کے گوشہ گوشہ سے آرہے ہیں، ان میں سے اکثر خطوط میں ان کی ناگہانی موت اور اچانک پیش آنے والے اس حادثہ کی تفصیلات دریافت کی گئی ہیں، یہ سانحہ ایسا اچانک پیش آیا کہ اس کی تفصیل بھی کس طرح بیاں ہوں؟

ع۔ بس اتنی سی حقیقت تھی فریب خواب ہستی کی

چہارشنبہ ۱۳؍جون کی صبح سب کے ساتھ گھر پر ناشتہ کیا، استاذی مولانا محمد رابع صاحب ندوی نے دارالعلوم چلنے کو دریافت فرمایا تو آمادگی ظاہر کی، یہ حضرات (مولانا رابع صاحب ندوی اور مولانا واضح رشید ندوی) دارالعلوم تشریف لائے، مرحوم نے ان کے بعد دارالعلوم پہنچنے کا ارادہ کیا، مولانا ابوبکر صاحب حسنی سے اجازت لینے پہونچے، اسی دوران پیٹ میں ہلکا سا درد محسوس ہوا تو ارادہ فسخ کر کے گھر پر ہی کام میں مشغول ہو گئے، اس عرصہ میں گھریلو دوائیاں استعمال کرتے رہے، دوپہر میں تکلیف بڑھی تو ڈاکٹر اشتیاق صاحب کو فون کر کے کیفیت بتلائی اور ان کی ہدایت پر دوا کا استعمال جاری رکھا، تکلیف میں افاقہ نہیں ہوا تو سہ پہر کو ڈاکٹر باشو اور پھر حکیم عبدالقوی صاحب بلوائے گئے، عصر بعد تکلیف بڑھ گئی، ڈاکٹر اشتیاق صاحب کے مشورہ سے اسپتال لے جانا طے ہوا، مغرب بعد بلرام پور اسپتال میں داخل کئے گئے۔

ابھی مرض کی تشخیص جاری تھی، آکسیجن اور گلوکوز دیا جا رہا تھا کہ وقت موعود آگیا اور عشاء کی اذان کے وقت جان جاں آفریں کے سپرد کردی، یہ ایسا ناگہانی حادثہ تھا کہ نعش سامنے رکھی تھی اور دل اس واقعہ کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا، دارالعلوم میں خبر ہوئی تمام اساتذہ اور طلبہ اسپتال پہونچے، نعش اسی وقت اسپتال سے مکان گوئن روڈ لائی گئی، اہل تعلق کا جم غفیر مکان کے ارد گرد رات بھر رہا، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اپنی معذوری اور پیرانہ سالی کے باوجود رات دیر تک تلقین صبر کرتے رہے، غسل اور تجہیز و تکفین انہی کی نگرانی میں ہوئی، صبح پہلی نماز جنازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی پھر بس کے ذریعہ نعش رائے بریلی لے جائی گئی، وہاں مولانا محمد ثانی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور دوپہر کو اپنے والد بزرگوار ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی ندوی ؒ اور دادا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی ؒ کے پہلو میں دفن کئے گئے ؎

چپہ چپہ پہ وہاں گوہر یکتا تہہ خاک ‏ ‏ ‏ ‏ دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ مرحوم کی سب سے محترم و محبوب شخصیت جنھیں بڑی محبت سے وہ "چچا میاں" کہا کرتے تھے، جن کی آغوش تربیت میں وہ پروان چڑھے، جن کے فکر و اسلوب کی زندگی بھر انہوں نے سو فی صد تقلید کی اور جن کے وہ متوقع جانشین تھے، یعنی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، اس اندوہناک موقع اور دم واپسیں پر موجود نہیں تھے، مرحوم جنہیں دیکھ دیکھ کر نشاط و حرارت، نیک عزائم میں پختگی اور اپنے مقصد و مشن میں برکت و نورانیت پاتے تھے جن کی دید سے آنکھیں روشن ہوتی تھیں اور دل و دماغ فرحت و انبساط محسوس کرتے تھے، عجب نہیں کہ آخری لمحہ ان کی دید کی تمنا سمٹ کر آنکھوں میں آگئی ہو،

۲۶ مئی ۱۹۷۰ء سے لے کر ۴ جون تک تحریک پیام انسانیت کے سلسلے میں ریاست کرناٹک کا دورہ شروع ہوا، ۴ جون کو بنگلور سے بمبئی واپسی ہوئی، پروگرام یہ طے ہوا کہ ۲۰ جون تک بغرض آرام و علاج نیز تاریخ دعوت و عزیمت کے حصہ چہارم کی تالیف کے سلسلے میں (جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے حالات و کمالات پر مشتمل ہوگی) حضرت مولانا بمبئی میں قیام فرمائیں گے۔ مخدومی مولانا معین اللہ صاحب ندوی، جناب عبدالکریم صاحب پاریکھ اور راقم سطور ہمراہ تھے، تحریری کاموں میں معاونت کے لئے لکھنؤ سے مولوی نثار الحق صاحب ندوی بمبئی پہونچ گئے، بمبئی کے میزبان محمد بھائی (مالک بمبئی آندھرا ٹرانسپورٹ کمپنی) اور اہل تعلق اسماعیل بھائی منصوری، صوفی عبدالرحمن صاحب وغیرہ نے تمام سہولتوں کا خیال رکھا، ۱۰ جون کو راقم سطور بمبئی سے پونا

اور احمد نگر ہوتے ہوئے ۱۵ر جون کو لکھنؤ پہونچا، ابھی رکشے سے سامان بھی نہ اترا تھا کہ اپنے پڑوسی مولوی غیاث صاحب ندوی کی زبانی حادثہ کی خبر سُن کر دماغ مفلوج سا ہو گیا، بمبئی تشویشناک حالت، پھر انتقال کی خبر دی گئی جسے مصلحتاً حضرت مدظلہ سے پوشیدہ رکھا گیا کہ سفر بخیریت گذر جائے، ہوائی جہاز میں بروقت سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے ۱۵ر جون کی صبح مولانا اپنے رفقاء کے ہمراہ لکھنؤ پہونچے، اسٹیشن پر مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے کلمات تسلی کے ساتھ اس حادثہ جانکاہ کی خبر دی، حضرت مولانا پر جو گذری ہوگی وہ تصور سے بالاتر ہے، تدفین کو ۲۴ گھنٹے ہو چکے تھے، مولانا اسی وقت رائے بریلی روانہ ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کی مصلحت کہ آخری وقت حضرت مولانا بھی نہیں تھے، مرحوم ان کے لئے بمنزلۂ اولاد کے تھے، مولانا سید الرحمٰن الاعظمی بھی ایک روز پہلے اپنے وطن جا چکے تھے، جن کا ۲۶ سالہ رات دن کا ساتھ تھا، وہ سفر آخرت کے وقت دور تھے، مولانا معین اللہ صاحب ندوی جو مرحوم کی صلاح اور صلاحیت کے بڑے معترف اور قدرداں تھے اور مرحوم بھی جن کی محنت، محبت اور خلوص کے بڑے قائل اور مداح تھے اس موقع پر موجود نہیں تھے۔ راقم سطور بھی آخری لمحات کی زیارت وخدمت سے محروم رہا جس کے بارے میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "آپ سے بڑی مناسبت ہے، ہم جب مشورہ کرتے ہیں اور کسی کام کا خاکہ بناتے ہیں تو بہت روشن امکان اور وسیع میدان سامنے آتا ہے۔"

۱۶ر جون کو عبدالکریم صاحب پاریکھ کی معیت میں رائے بریلی حاضری ہوئی، حضرت اور خاندان کے لوگوں سے مل کر دل بھر آیا، قبر پر پہونچے، بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ایصال ثواب کیا اور دعائے مغفرت کے پھول چڑھائے۔

عجیب اتفاق کہ عربی زبان کے ایک ممتاز ندوی انشاء پرداز اور ادیب مولانا مسعود عالم صاحب ندویؒ کا انتقال بھی ۴۴ سال کی عمر میں ہوا، ان کی وفات پر ان کے دیرینہ رفیق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو پُر اثر مضمون لکھا ہے اس کے آخری پیراگراف میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان کی عمر ۴۴ سال سے زیادہ نہیں ہوئی، اس عمر میں انہوں نے بڑے بڑے کام کئے اور ایسی تصانیف یادگار چھوڑیں جو ایک شخص کو کامیاب مصنف اور نامور صاحب علم وصاحب قلم بنانے کے لئے کافی ہیں، کسی شخص کے افتخار کے لئے وہ سرمایہ کافی ہے جو

انہوں نے چھوڑا، مگر جو لوگ ان کی ذہنی اور علمی صلاحیت سے واقف تھے اور جو ان کے علم وفکر کا ارتقا دیکھ رہے تھے اور جن کو اس کی آرزو تھی کہ بہت دن زندہ رہیں اور کام کریں، ان کی زبان پر بصد حسرت و یاس یہ مصرعہ ہے ؎

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود "

ٹھیک ۴۴ سال کی عمر میں ندوہ کے ایک دوسرے فرزند جن کی عربی زبان و ادب کا عالم عرب قائل تھا جن کی علمی و فکری صلاحیت کا زمانہ معترف تھا، جن سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، دنیا سے منھ موڑ گئے۔

كل من عليها فان ويبقى وجه ربك ذو الجلال والاكرام۔

(تعمیر حیات ۲۵ جون و ۱۰ جولائی ۱۹۷۹ء)

تصحیح نیت

مسلمانو! نیت سرِ فہرست ہے نہ کہ فہرست کے آخر میں اور جب صحیح نیت کی جائے تو اس کے پھل بھی صحیح ملتے ہیں اگرچہ وہ مادہ پرستوں کی نگاہوں میں ناکام اور اسباب و وسائل پر اعتماد کرنے والوں کی نظروں میں شکست خوردہ ہو، قدامت پرست اور رجعیت پسند اور سائنس اور علم و ادب کے مبلغوں کی نظروں سے اوجھل ہو۔

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

مولانا محمد الحسنی

شخصیت اور اس کی تکمیل کے عناصر

محسن عثمانی ندوی

یادش بخیر: شام کے ممتاز ادیب اور حضارۃ الاسلام کے ایڈیٹر مصطفیٰ سباعی کا جب انتقال ہوا تو عرب ملکوں میں ان کی شخصیت، اسلامیت اور کمال انشار پردازی پر بہت سے لوگوں نے مضامین لکھے تھے یہ تمام مضامین حضارۃ الاسلام کے خاص نمبر میں شائع کئے گئے تھے، ان میں زیادہ نمایاں اور پر اثر تحریر ندوۃ العلماء کے آرگن البعث الاسلامی کے ایڈیٹر سید محمد الحسنی کی تھی جس کا عنوان تھا۔

نجم تألق ثم هوى

محمد حسنی صاحب کے انتقال کے سانحہ پر کچھ لکھا جائے تو شاید یہی عنوان اس کے لئے موزوں ہوگا اور اس کا مفہوم فارسی کے اس مصرعہ "خوش درخشید ولے دولتے مستعجل بود" سے بہتر طور پر ادا ہوتا ہے۔ "خوش درخشید" اور "دولتے مستعجل بود" یہ دونوں ترکیبیں اس غیر متوقع حادثہ کی الم انگیزی اور جاں گدازی کو نمایاں کرتی ہیں۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد حسنی صاحب ندوۃ العلماء اور اس کے ماحول کے ان تربیت یافتہ لوگوں میں تھے جو فیاض ازل سے مختصر عمر لیکن قابل قدر اور قابل فخر صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔ علی احمد کیانی، عبدالرحمٰن نگرامی اور مولانا مسعود عالم ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ وہ اشخاص تھے جن کی عمر نے وفا کی ہوتی اور وہ سن طبعی تک پہونچتے تو اسلام اور مسلمانوں کو ان کی خدا داد صلاحیتوں سے زیادہ فائدہ پہونچتا۔ مولانا محمد حسنی کا سن بھی چالیس کے آس پاس تھا اور اس عمر میں ان کے پر زور اور طاقتور قلم کا، جس کا سرچشمہ ان کی ایمانی روح تھی، عرب دنیا کے اہل قلم اعتراف کر چکے تھے، انکی ہر تحریر عربوں کے لئے بانگ رحیل اور غفلت کی سرشاریوں سے بیدار کرنے کے لئے صور اسرافیل کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ آواز جو ہندوستان کے "جزیرۃ العرب" اور عربی زبان وادب کے مرکز ندوۃ العلماء کے آرگن

البعث الاسلامی کے ذریعہ بلند ہوتی تھی۔ صدا بہ صحرا نہیں ہوتی تھی بلکہ از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق ہوتی تھی۔ چنانچہ جس زمانہ میں مصر میں البعث الاسلامی کا داخلہ ممنوع تھا اس کی کاپیاں وہاں سمگل ہوتی تھیں اور دینی حلقوں میں اور خاص طور پر اخوان کے گھروں میں شوق و ذوق کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں، جب مصر کی سرزمین پر جمال عبدالناصر کی فرعون سامانیاں حد سے تجاوز کر گئیں اور دین کے علمبرداروں کے لئے دار و رسن کی آزمائش کا مرحلہ آگیا اور جب فرعون کے مجسموں کی تنصیب اور اس کی تہذیب پر فخر کا دور شروع ہوا تو مولانا محمد حسنی کی زبان گوہر بار، تیغ جوہر دار بن گئی اور اس زمانہ میں ان کے قلم سے ایسے زور دار مضامین نکلے کہ مشہور عربی اخبار الاہرام کو یہ لکھنا پڑا کہ ہندوستان کے ساتھ مصر کے تعلقات بہت مستحکم ہیں لیکن آئندہ اگر اس استحکام میں کوئی رخنہ پڑا تو اس کا سبب یہ عربی رسالہ ہوگا جو ہندوستان سے شائع ہوتا ہے۔

دنیائے عرب کی ہر تحریک ہر آواز اور ہر رستخیز پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ جو کوتاہی عربوں میں انہیں نظر آتی اس پر ان کا قلم ضرور تنقید کرتا تھا اور ہر افتاد جو کسی اسلامی ملک پر پڑتی اس کا درد ان کے دل میں ہوتا تھا، غموں کے آنسو روشنائی بن کر صفحہ قرطاس پر پھیل جاتے تھے، اسباب و عوامل کی فکر انگیز تحلیل کے ساتھ ان کا قلم بہتر اور روشن تر مستقبل کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا تھا، عالم عربی کے ساتھ گہرے رشتہ اور ان کے ہم سفر اور ہم رکاب ہونے کا احساس و اظہار ان کی سطر سطر سے ہوتا تھا۔

جس طرح حسن کی جنس ہمیشہ اپنے قدرداں اور خریدار رکھتی ہے، مولانا محمد حسنی کی تحریر کے پرستار بھی عرب دنیا میں بہت تھے۔ ان کی کتاب الاسلام الممتحن (اسلام دور آزمائش میں) ابھی ایک سال پہلے شائع ہوئی اور اب اس کا چوتھا ایڈیشن نکلنے والا ہے، یہ بے مثال مقبولیت جہاں اس بات کا ثبوت ہے کہ عربوں کے نزدیک اس ہندی نژاد مصنف کی تحریریں مقام اعتبار اور انشاء کے لحاظ سے زر کامل عیار کے درجہ تک پہونچ چکی ہیں وہاں اس بات کا بھی اظہار ہے کہ عربوں میں دینی جذبہ اور طاقتور اسلامی لٹریچر کے مطالعہ کا شوق نہ صرف یہ کہ موجود ہے بلکہ روز افزوں ہے۔ مغرب سے درآمد کئے ہوئے نظریات کا طلسم اگرچہ ٹوٹا نہیں ہے، لیکن اس کی جاذبیت اور کشش روز بروز کم ہوتی جارہی ہے، مولانا محمد الحسنیؒ کی دوسری کتاب "مصر تتنفس" جلد زیور طبع سے آراستہ ہونے والی ہے اور

امید ہے کہ اس کا مصر میں پہلی کتاب سے زیادہ پرجوش استقبال ہوگا کیونکہ یہ وہ موضوع جس پر ان کا قلم ہمیشہ ادب وانشار کے پھول کھلاتا اور ادب عالیہ کا نمونہ پیش کرتا رہا ہے۔

مولانا محمد الحسنی کے اوصاف وکمالات و ہنر کو اجاگر کرنے اور لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا اصل حق ان کے رفقار کار اور احباب ومخلصین کو حاصل ہے، راقم السطور کا بس ان سے وہ تعلق تھا جو ایک قاری کا اپنے محبوب مصنف اور فنکار سے ہوتا ہے۔ اس نے ان کو اصلًا ان کی تحریروں کے آئینہ میں دیکھا تھا۔ لیکن محمد الحسنی صاحب کے ماحول اور خاندانی پس منظر سے واقف کار قاری کے لئے ان کے سرچشمہ فکروفن اور شخصیت کے تخلیقی عناصر کا سراغ لگانا زیادہ دشوار نہیں ہے، ان کے فکروفن کا اصل سرچشمہ اور سب سے پہلا تخلیقی عنصر خود ان کے گھر کا ماحول ہے جس کی قابل فخر روایات رہی ہیں وہ اس خاندان کے چشم وچراغ تھے جس کا نسبی اور معنوی رشتہ سید احمد شہید سے ہے اور جو علمار اور مصنفین کا خانوادہ ہے اور "ہمہ آفتاب است" کا مصداق ہے۔ یقینًا محمد الحسنی صاحب نے جب عقل وشعور کی آنکھیں کھولی ہوں گی تو گھر میں ہر طرف دین کا چرچا رہا ہوگا، صحابہ کرام کے تذکرے ہوں گے۔ انھوں نے اسلامی تاریخ اور غزوات کے قصے سنے ہوں گے، سید احمد شہید کے جہاد کی داستان ان کے کانوں میں پڑی ہوگی۔ اسلام کی عظمت رفتہ کی کہانیاں ان کی یادداشت کا سرمایہ بن رہی ہوں گی۔ عمر کی یہ پہلی منزل سادہ ورق کے مانند ہوتی ہے، اس پر جو نقش بنایا جاتا ہے وہ نقش کالحجر ہوجاتا ہے، بچہ کے پیدا ہوتے ہی اس کے کان میں اذان دینے کی حکمت یہی ہے۔ مولانا محمد الحسنی کے دل میں بھی گھر کے ماحول کی وجہ سے اسلام سے والہانہ محبت اور اس پر یقین دل میں پیدا ہو چکا ہوگا۔ اور انھیں بھی خوش نصیب عاشقوں کی طرح یہ شعر پڑھنے کا حق ہوگا ؎

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھوی

فصادف قلبا فارغا فتمکنا

ان کی شخصیت کی تشکیل کا دوسرا عنصر ان کے والد ڈاکٹر حکیم مولانا عبدالعلی حسنیؒ کی تعلیم وتربیت ہے۔ مولانا عبدالعلی ندوۃ العلمار کے ناظم تھے، ان کی شخصیت میں جدید وقدیم کا خوشگوار امتزاج تھا۔ انھوں نے ندوۃ العلمار میں بھی تعلیم پائی تھی اور یونیورسٹی میں بھی۔ وہ میڈیکل کالج کے سند یافتہ اور شہر کے مقبول معالج تھے۔ جسمانی امراض کے طبیب ہونے کے ساتھ امراض باطنی وروحانی کے بھی معالج

اور حکیم تھے، ایسے عالم با عمل باخبر اور ہوش مند والد کی صحیح تربیت وتعلیم نے صحیح مزاج اور صحیح ذوق بنایا تھا "صلاحیت" یقیناً قابل قدر چیز ہے لیکن "صالحیت" کا مرتبہ زیادہ بڑا ہے۔ ہر شخص جو ذرا ذہین ہو اور اسے کتابوں کے مطالعہ کا موقع مل جائے، وہ ایک اسکالر بن سکتا ہے لیکن صالحیت کا تعلق طبیعت کے اعتدال اور مزاج کے توازن سے ہے اور یہ دولت صحیح تربیت اور نگرانی اور بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

تیسرا عنصر ہندوستان کی نامور شخصیت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی صحبت اور رفاقت ہے، مولانا کو دنیا اسلام کے دردمند داعی، مفکر، بلند پایہ مصنف اور اردو اور عربی زبان کے انشاپرداز کی حیثیت سے جانتی ہے۔ محمد الحسنی صاحب ان کے حقیقی برادرزادہ فرزند معنوی دست راست اور معین و مددگار تھے۔ انھوں نے اپنے چچا کی بیشتر کتابوں کا اُردو میں اور کچھ اردو تحریروں کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، تصنیفی کاموں میں چچا کے ساتھ معاونت اور ان کی صحبت نے فکر و ذوق کے اشتراک کے ساتھ انداز تحریر میں بھی یکسانیت پیدا کر دی تھی، اسلامی ذوق کے ساتھ عربی زبان میں انکی انشاپردازی کو جلا بخشنے میں مولانا کی تربیت کا بڑا حصہ ہے، افسوس ہے کہ مولانا کو اس عمر میں یہ صدمہ اٹھانا پڑا جو اب ان کے لئے دل کا داغ اور سینہ کا چراغ بن چکا ہے ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

چوتھا عنصر عرب کے مسلم ادبا و مفکرین جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ اور اخوان المسلمون کے رہنماؤں حسن البناء اور سید قطب وغیرہ کی تحریروں کا مطالعہ اور ان سے اکتساب ہے۔ اسلامی ذوق قرآن کے مطالعہ اور عربی زبان کے اسلامی ادیبوں سے کسب فیض کے نتیجہ میں ان کا ایک منفرد اسلوب بن گیا تھا جس میں خیال و فکر کی روشنی بھی تھی اور ایمان کی حرارت بھی۔ ان کی نثر میں قرآن کی آیات خوبصورت اور فنکارانہ طریقہ سے نگینہ کی طرح مرصع نظر آتی ہیں۔

پانچواں اور غالباً سب سے طاقتور عنصر وہ حساس دل اور اثر پذیر طبیعت ہے جس کے بغیر کوئی ادیب ادیب اور کوئی فن کار، فن کار نہیں بنتا ہے۔ دل بے تاب اور شب بے خواب کی جراحتیں اگر میسر نہ ہوں تو قلم سے کوئی اثرانگیز تحریر نہیں نکلتی ہے، محمد حسنی صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور ماحول نے اسلامی افکار و اقدار کا عشق ان کے دل میں پیدا کر دیا تھا، لیکن جب بعد میں انھیں عربی زبان

میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کے مطالعہ کا موقع ملا تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ اسلامی تہذیب کے مرکزوں میں اسلامی افکار و اقدار پر حملے ہو رہے ہیں اور ان پر تیشہ زنی اور ان کی بیخ کنی ہو رہی ہے، جنھیں مسلمانوں کا رہبر ہونا چاہئے تھا وہ رہزنوں کا کردار ادا کر رہے ہیں، زندگی کی حقیقتیں جب فنکار کے عقائد اور ایمان سے ٹکراتی ہیں تو اس ٹکراؤ سے شدید کرب اور کشمکش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی کیفیت ادب کے بہترین شہ پاروں کی خالق اور ان کا سرچشمہ ہوتی ہے، اس کشمکش اور کرب نے محمد حسنی صاحب کی تحریروں میں وہ کیفیت پیدا کر دی تھی جس میں آبشاروں کا سا جوش اور پہاڑی ندی کی سی روانی پائی جاتی تھی۔ جس میں خطابت بھی تھی۔ جذبات کی گرم آنچ بھی تھی اور شکستہ دل کی فریاد بھی۔

اگرچہ عربی زبان ان کے قلم کی جولانگاہ اور ان کا اصل میدان تھی، لیکن انھوں نے اُردو میں بھی تصنیف اور ترجمہ کا بڑا کام کیا ہے۔ ان کے ترجمہ میں بڑی سلاست اور روانی تھی۔ اصل متن کی خوبی اور اس کے اسلوب کو منتقل کرنے میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کا شمار ان باکمال مترجمین میں کیا جا سکتا ہے جن کا ترجمہ اکثر تخلیق کا حریف بن جاتا ہے۔ ندوۃ العلماء میں جب تحقیقات و نشریات اسلام کا شعبہ قائم ہوا تو اس شعبہ کی طرف سے اُردو داں طبقہ کو سب سے پہلے ایک سیرت کی کتاب کا تحفہ ملا۔ ڈاکٹر آصف قدوائی کی کتاب "مقالات سیرت" پر مولانا اکبرآبادی نے تبصرہ کیا تھا کہ یہ بعض اعتبار سے "خطبات مدراس" پر فوقیت رکھتی ہے، اس کے بعد اس شعبہ کی جانب سے مشہور جرمن نومسلم محمد اسد صاحب کی کتاب The Road to Mecca کا اُردو ترجمہ "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے شائع ہوا۔ کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی زبان اور خوبصورت پیشکش کی وجہ سے اس کتاب کی کافی پذیرائی ہوئی۔ یہ ترجمہ محمد الحسنی کے قلم سے تھا۔ اُردو میں ان کی دوسری کتاب سوانح مولانا محمد علی مونگیری شائع ہوئی۔ یہ سوانح بھی ہے اور ندوۃ العلماء کی تاریخ بھی۔ اور پھر مولانا علی میاں صاحب کی بہت سی کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے۔ کچھ دنوں تک انھوں نے انگریزی اور عربی دونوں زبانوں میں ایک پندرہ[1] روزہ یا ماہنامہ جریدہ نکالا تھا جو اصلاً دنیائے اسلام کے اتحاد کا داعی اور نقیب تھا۔

---

[1] مولانا محمد میاں مرحوم نے رابطہ اسلامی International Cultural Islamic organization

بقیہ اگلے صفحہ پر

انھوں نے اس کے لئے عملی اقدامات بھی شروع کئے تھے لیکن یہ کام غالباً وسائل کی کمی کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ لیکن آگے چل کر رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کی شکل میں یہ تحریک زیادہ بہتر اور طاقت ور طور پر سامنے آئی اور اس طرح سے ان کا خواب پورا ہوا۔

مولانا محمد الحسنی کی مرگ ناگہانی صرف ندوۃ العلماء کا نہیں بلکہ عالم اسلام کا نقصان ہے، آج مسلم ممالک اسلامی نظام اور غیر اسلامی نظام کے دوراہے پر کھڑے ہیں، عالم عربی نئی کروٹ لے رہا ہے۔ بین الاقوامی سیاست کا مرکز ثقل بدل رہا ہے۔ اس نازک وقت میں عرب ممالک کے اسلام پسند حلقوں کو تازہ کمک کی ضرورت تھی اور اس قلم کی ضرورت تھی جو ہمیشہ عربوں کو لذت کردار اور جرأت اندیشہ پیدا کرنے کی پرزور تلقین کرتا رہا ہے، لیکن مشیت الٰہی کے فیصلے ضروری نہیں کہ سمجھ میں آجائیں۔ ہمیں بہرحال صبر و تسلیم و رضا کا حکم ملا ہے اور مقام شکر مقام صبر سے بہتر برتر اور بلند تر ہے۔

کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی اور اس کا خبرنامہ بہ یک وقت عربی اور انگریزی میں شائع ہوتا تھا۔ اشاعت تاریخ نہیں مقرر تھی۔ اس کے چند ہی شمارے نکل سکے تھے۔

"ہمہ گریاں"... "تو خنداں"

از: محمد برہان الدین سنبھلی (ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ)

ادھر چند مہینوں کی مختصر سی مدّت کے اندر جس سرعت کے ساتھ جتنی اور جیسی ممتاز شخصیتوں کے وجود سے، خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں کا محروم ہونا مقدر ہوا ماضی میں اس کی مثال ڈھونڈھے سے بھی ملنا شاید مشکل ہو، یوں تو ان جانے والوں میں سے ہر ایک اپنی مخصوص صلاحیتوں اور بعض خصوصیتوں کے لحاظ سے منفرد تھا کہ اس کے چلے جانے سے ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کا جلد پُر ہونا دشوار، بلکہ بعض کا جانشین ملنا عجب نہیں کہ اس قحط الرجال کے دور میں ناممکن ہی ہو، لیکن ان سب میں مولانا محمد الحسنی (ایڈیٹر البعث الاسلامی، جن کے لئے چند مہینے پہلے "سلمہ" اور "مدظلہ" جیسے دعائیہ کلمات استعمال کئے جاتے تھے اور مستقبل کی نہ جانے کتنی امیدیں ان کی ذات سے وابستہ تھیں! افسوس! کہ آج انہیں "رحمہ اللہ" اور "تغمدہ اللہ بغفرانہ" کے ساتھ یاد کرنا اور مرحوم لکھنا پڑ رہا ہے۔ ان) کا حادثۂ وفات مختلف حیثیتوں سے سب سے بڑھ کر اندوہ گیں ہی نہیں، عظیم علمی و فکری خسارہ بھی ہے۔ مرحوم، عالم اسلام کے مشہور مفکر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی میاں ندوی مدظلہ العالی کے نہ صرف قوتِ بازو اور ان کے افکار و نظریات کے مستند ترجمان تھے بلکہ خود بھی اپنے پہلو کے اندر ملّت کے غم میں گھلنے والا دل اور اس کی صلاح و فلاح کی فکر کرنے والا دماغ رکھتے تھے، مبدأ فیاض سے موصوف کو دلِ دردمند اور فکرِ ارجمند کے ساتھ زبان ہوشمند بھی عطا ہوئی تھی کہ اپنے ہی نہیں غیر بھی اس کی قوت تاثیر، حقائق کی سچی تصویر کھینچنے نیز ملّی بیماریوں کی تشخیص اور ان کے ازالہ کے لئے بے خطا نسخے تجویز کرنے میں مرحوم کا امتیاز تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ ان پہلوؤں پر زیرِ نظر خصوصی شمارہ میں ایک سے بڑھ کر ایک آپ مضامین ملاحظہ کریں گے اور میرا اس بارے میں لکھنا شاید تکرار کے سوا کچھ نہ ہوگا، مجھے تو بس اصلاً یہاں اپنے اس تأثر بلکہ مشاہدہ کا اظہار کرنا ہے جو اس مسافرِ آخرت کا چہرہ، آخری وقت دیکھ کر ہوا۔ واقعہ یہ ہے (جس کا اظہار میں نے موصوف کی وفات کے دوسرے دن ہونے والے جلسۂ تعزیت کے اندر "الاصلاح"، کے جمالیہ ہال میں اپنی مختصر تقریر کے دوران بھی کیا تھا) کہ مرحوم کا چہرہ بہت پُر انوار تھا اور اس پر صاف مسکراہٹ کھیل رہی تھی، گویا "وجوہٌ

یومئذٍ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ" (آخری دن کچھ چہرے کھلے ہوئے اور تبسّم ریز ہوں گے) کی عملی اور واقعاتی تفسیر بنا ہوا تھا۔

سیرت طیبہ کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اللہ کے آخری سچے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاقِ عظیمہ کی فہرست میں یہ اوصاف حمیدہ بھی ملتے ہیں "کان یتفقّد اصحابہ" (ساتھیوں کے احوال سے آگہی رکھتے تاکہ ان کی ضرورتیں پورا کرنے کا اہتمام فرمائیں)۔ "یحسّن الحسن ویقویہ" (اچھائیوں پر تحسین اور حوصلہ افزائی فرماتے)۔ "لایحسب جلیسہ أن احدًا اکرم علیہ منہ" (ہر ایک ہم نشیں یہی سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ بہتر ان کے کسی سے تعلقات نہیں)۔ "لم یکن فاحشًا ولا متفحشًا" (بدگوئی و بدتمیزی کبھی نہ کرتے)۔ "ما رأیتہ منتصرًا لنفسہ" (راوی کہتے ہیں کہ اپنی ذات کے لئے کسی سے بھی آپ کو انتقام لیتے میں نے کبھی نہیں دیکھا) مولانا محمد میاں مرحوم سے تعلق رکھنے والے شہادت دیں گے کہ موصوف نے اپنے نانا جان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ان اوصاف کریمانہ کو خاص طور پر اپنی زندگی کا جزو بنا لیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ ان کے مقبول اور ہر دل عزیز بن جانے کی شکل میں ظاہر ہونا ہی چاہئے تھا، جو ہوا۔ چنانچہ ان کی جدائی پر ہر واقف کی آنکھ اشکبار اور دل سوگوار تھا اور گویا عارف رومی کی نصیحت ؎

یاد داری کہ وقت زادنِ تو — ہمہ خنداں بدند تو گریاں
ہم چناں زی کہ وقت مردنِ تو — ہمہ گریاں شوند تو خنداں

پر عمل پیرا ہونے کے نتیجہ میں ان کی ہی تعبیر کے مطابق پورا مجمع "ہمہ گریاں" کا نمونہ تھا اور مرحوم "تو خنداں" کا مصداق۔ (فاعلی اللہ درجتہ واکرم منزلہ) اس گریہ وزاری میں موصوف کی خوبیوں کا اعتراف تو پنہاں تھا ہی اسی کے ساتھ جواں مرگی (صرف ۴۴ سال) کی وجہ سے ان کی ذات سے وابستہ مستقبل کی غیر معمولی توقعات کے شکست و ریخت ہو جانے کا احساس بھی کچھ کم نہ تھا۔ لیکن امت مسلمہ اس طرح کے غیر معمولی اور جواں مرگی کے حادثہ سے پہلی بار دوچار نہیں ہو رہی تھی بلکہ اس سے قبل بھی سینکڑوں نہیں شاید ہزاروں اپنے اپنے زمانہ کے عبقری اور علم کی روشنی سے عالم کو منور کر دینے والی عظیم ترین شخصیتوں کا صدمہ اسے برداشت کر لینے اور اس پر صبر کرنے کی اللہ نے بار بار نہ صرف توفیق بخشی ہے بلکہ بسا اوقات انکا بہتر بدل بھی عطا کیا ہے جس سے امّت کا غم ہی ہلکا نہیں ہو گیا وہ خلا بھی پُر ہو گیا ہے جو جانے والے نے چھوڑا

تھا۔ اور شاید ایک غیبی آواز میں اسی بات کی خوش خبری سنا کر ڈھارس بندھائی گئی تھی (جو اس وقت سنی گئی جب امت کے بہترین افراد خیر البشر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حادثۂ وفات سے نڈھال ہو رہے تھے) جس کے سننے والوں میں خلیفۂ رابع حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی شامل تھے، کہنے والا کہہ رہا تھا" ان فی اللہ عزاءً من کل مصیبۃ وخلفاً من کل ھالک ودرکاً من کل فائت فباللہ فاتقوا وایاہ فارجوا فانما المصاب من حُرِمَ الثواب"۔ (اللہ کی بتائی ہوئی راہ اختیار کرنے سے ہی ہر مصیبت ہلکی ہو سکتی ہے اور ہر جانے والے کا بدل مل سکتا اور ہر نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے اس لئے (اس موقع پر بھی) خدائے تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو اور اسی سے تمام امیدیں وابستہ رکھو کہ دراصل مصیبت زدہ وہ شخص ہے جو کہ (صبر نہ کرنے کی وجہ سے) ثواب سے محروم رہ جائے) کون کہہ سکتا ہے کہ ایسا عظیم صدمہ برداشت کر لے جانے اور صحابہؓ جیسے جاں نثاروں کی ڈھارس بندھانے میں یہ کلمات بے اثر رہے ہوں گے ؟ آج بھی یقیناً یہی کلمات وجہ تسکین اور موجب تسلی ہو سکتے ہیں جیسا کہ پہلے ہو چکے ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے امت مرحومہ کی صف کے ہمیں سینکڑوں، کم سنی میں وفات پا جانے والے عباقرہ نظر آتے ہیں ان میں سے بس چند کا تذکرہ یہاں کیا جا رہا ہے۔

۱۔ مکہ مکرمہ کے سب سے پہلے مسلمان گورنر (جنہیں یہ عظیم منصب خود اکرم الخلائق وافضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا کیا تھا) جو دیگر کمالات کے حامل ہونے کے علاوہ بہادری کے وصف کے اندر عجم ہی میں نہیں، عرب میں بھی ممتاز سمجھے جاتے تھے اور جن کی اصابت رائے پر بھی اعتماد کیا جاتا تھا یعنی حضرت عتّاب بن اسیدؓ متوفی ۱۳ھ وہ صرف ۲۶ سال کی عمر میں عالم بالا کی طرف روانہ ہو گئے۔

۲۔ دین حنیف کا سب سے پہلا مجدّد اور پانچویں خلیفۂ راشد جنہوں نے عدل وانصاف سے دنیا کو بھر دیا تھا، یعنی عمر بن عبد العزیز (متوفی ۱۰۱ھ) صرف ۳۶ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنے پیچھے ساری اسلامی دنیا کو غم زدہ چھوڑ گئے۔

۳۔ جلیل القدر محدث اور نادرۂ روزگار فقیہ اور شارح حدیث علامہ محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی (متوفی ۶۷۶ھ) صرف ۴۵ سال کی عمر پا کر جہانِ فانی سے اس حال میں رخصت ہوئے کہ حدیث کی جلیل القدر خدمات انجام دے کر ایک عالم کو اپنا گرویدہ، اور فن شریف میں بیش بہا اضافہ کر کے رہتی دنیا تک بقائے دوام کا سامان اور آخرت کے لیے زادِ راہ فراہم کر چکے تھے۔ (فرحمہ اللہ

وارضاہ)۔

۴۔ مشہور شافعی محقق وفقیہ اور مورخ علامہ عبدالوہاب بن علی عرف تاج الدین السبکی (متوفی ۷۷۱ھ) صرف ۴۴ سال دنیا میں رہ کر عالم بقا کو سدھارے۔ اس مختصر سی مہلت میں علامہ موصوف نے علمی کارناموں کی وجہ سے دنیا سے اپنا لوہا منوالیا تھا، اور شاید اسی امتیاز کی وجہ سے شام کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ انہیں سونپا گیا۔

۵۔ اسی ہندوستان (بلکہ اسی شہر لکھنؤ) کے ممتاز محقق، محدث وفقیہ (جن کی جلالت شان کا اعتراف ان سے علمی وفکری اختلاف رکھنے والوں نے بھی کیا) حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی (متوفی ۱۳۰۴ھ) صرف ۳۸۔۳۹ سال کی عمر میں علمی دنیا کو اپنی بیش قیمت کتابوں سے مالامال کر کے روانہ ہو گئے اور اپنے پیچھے درجنوں موضوعات پر تصنیفات کا (جن میں حدیث وفقہ کا حصہ سب سے بڑھا ہوا ہے) پورا ایک کتب خانہ چھوڑ گئے، جس کی قدر دانی آج عرب سے عجم تک سارے عالم میں کی جارہی ہے اور اس کی اہمیت کا اعتراف عرب علماء کی تعلیقات وحواشی کے ساتھ پے درپے اشاعتوں سے ہورہا ہے۔

۶۔ ہندوستان میں اسلامی اقتدار کے خاتمہ اور دشمنان اسلام، انگریزوں کے تسلط کے بعد دین کی بقا کے جب لالے پڑ گئے اور بظاہر حالات اس کے ختم یا کمزور ہو جانے (لا قدر اللہ) کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا اس وقت خدا تعالیٰ نے دین قیم کی حفاظت کا سامان جس کے مبارک ہاتھوں کرایا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس عظیم شخصیت نے صرف ۴۸۔۴۹ سال دنیا میں گذارے یعنی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (متوفی ۱۲۹۷ھ) جنھوں نے مستقل اسلامی قلعے تعمیر کرنے کے علاوہ اپنی خداداد ذہنی صلاحیتوں سے اسلام دشمن علمی حملوں کا ایسی جرأت اور کلامی قوت سے مقابلہ کیا کہ دینی وعلمی حلقوں نے انہیں "حجۃ الاسلام" کا خطاب دے کر ان کی اہمیت کا اعتراف کیا۔ (فبرّد اللہ مضجعہ وقدس سرہ)

۷۔ وہ شخصیت جسے "گوہر شب چراغ"، وقت کے سب سے بڑے عالم ندوی نے قرار دیا اس نے تو عالم فانی میں پوری تین دہائیاں بھی نہیں گذاریں مگر اس مختصر سی مدت میں اپنے علم وادب اور زہد وتقویٰ کا وہ نقش قائم کیا کہ جاننے والوں کو اس کی جدائی کے وقت کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے پوری علمی دنیا سوگوار بن گئی ہو اور اپنے پرائوں نے گویا خون کے آنسوؤں سے، اس کی جدائی پر ماتم کیا ہو، ہماری مراد، مولانا

عبدالرحمٰن نگرامی ندویؒ سے ہے (متوفی ۱۹۲۶ء) رحمہ اللہ وطاب ثراہ۔

۸۔ اور وہ عبقری جس نے سب سے پہلے یونانی علوم سے (عربی میں ترجمے کر کر کے) مسلمانوں کو روشناس کرایا، اور منصوری خلافت کے سکریٹریٹ میں چیف سکریٹری جیسے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوا، جسے علمی دنیا "کلیلہ ودمنہ" جیسی شہرۂ آفاق ادبی کتاب کے مترجم کی حیثیت سے جانتی ہے یعنی عبداللہ بن المقفع (متوفی ۱۴۲ھ) وہ صرف ۳۶ سال کی عمر میں یہ سارے کارنامے انجام دے کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔

۹۔ عجم ہی نہیں عرب بھی جس کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتے کیونکہ اس نے عجمیوں کے لیے قرآن وحدیث کی زبان سیکھنے کا راستہ بنایا (بلکہ ایجاد کیا) جس پر چل کر لاکھوں نہیں کروڑوں انسان (بلکہ شاید اربوں) اللہ اور اس کے رسول کے کلام کو براہ راست سمجھنے لگ گئے، یعنی عمرو بن عثمان ابن قنبر الحارثی عرف سیبویہ (متوفی ۱۸۰ھ) نے زندگی کی کل ۳۲ بہاریں دیکھیں اور اسی تھوڑی سی مہلت میں وہ ایسی کتاب دنیا کو دے گیا جس کے بارے میں سارے عالم کے اہل فن یک زبان ہو کر کہتے ہیں "لَمْ یُصنَعْ قبلَہٗ ولا بعدَہٗ مثلُہٗ"۔ (نہ اس سے پہلے ایسی کوئی کتاب وجود میں آئی اور نہ اس کے بعد) یہ وہ سند ہے جو غالباً کسی اور انسانی تصنیف اور اس کے مصنف کو نہیں دی گئی۔

۱۰۔ جس کی ذکاوت و لیاقت کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیلا اور وزارت جیسے عالی منصب پر فائز ہو کر جس نے عہدہ کو زینت بخشی اور جسے ادبی دنیا "ابن العمید" (پورا نام علی بن محمد بن الحسین (متوفی ۳۶۶ھ) کے نام سے جانتی ہے اس نے صرف ۲۹ سال اس عالم آب و گل میں گذارے اور اسی مختصر مدت میں وہ پلا بڑھا، اور پڑھا بھی اور دنیا کو اپنی نہ صرف شاعرانہ صلاحیتوں سے مسحور کیا بلکہ تصنیفی سلیقہ اور ذکاوت فہم کا بھی لوہا منوالیا۔

علوم نبوت کے پھوٹنے والے چشمے اور نکلنے والے سوتے سے جاری ہونے والے بحر زخار کے یہ چند قطرے۔ یا دس بوندیں ہیں، جن کا مختصر تعارف کرانے اور ان کی ہلکی سی جھلک دکھانے پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ تاریخی داستان مولانا محمد میاں مرحوم کے غمِ وفات کو ہلکا کرنے اور قادرِ مطلق کی طرف سے ان کا بدل (بلکہ نعم البدل) عطا ہونے کی امید بندھانے کا سبب بن جائے۔ (وما ذٰلک علی اللہ بعزیز)

مراد در دیست اندر دل...

نذر الحفیظ ندوی مقیم قاہرہ

یہ غالباً ۲۲ جون کی بات ہے حسب معمول ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے مقالہ سے متعلق عربی ادب کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا، اس میں یہ بحث تھی کہ مرثیہ کے موضوع پر کس شاعر نے اچھا شعر کہا ہے، کسی نے وما کان قیس هلکه هلك واحد، ولکنه بنیان قوم تهدما کو بہتر شعر قرار دیا ہے تو کسی نے أعلا فليجل الخطب وليفدح الامر کو۔ اسی موازنہ کو پڑھ رہا تھا کہ ایک ندوی عزیز کا ریاض (سعودی عربیہ) سے خط آیا جس میں یہ روح فرسا اطلاع تھی کہ مولانا محمد میاں صاحب کا ۱۲ جون کو اچانک انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یقین نہ آیا۔ دیر تک ہم اور برادرم عبد النور اسی سے متعلق گفتگو کرتے رہے، کئی ہفتہ تک حیرت اور ذہول کی کیفیت سے دوچار رہا۔ لیکن متعدد خطوط اور پھر آخر میں حضرت مولانا مدظلہ کے ایک غم نامہ سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ مولانا محمد میاں کے انتقال سے ہزاروں میل دور بیٹھے ہم لوگوں پر جو اثر ہوا وہ بیان سے باہر ہے، اس لئے کہ ان کی وفات سے صرف ایک خاندان ہی نہیں پوری اسلامی برادری متاثر و غمگین ہے۔ اس اعتبار سے صدمہ غیر معمولی ہے۔

مولانا محمد الحسنی کی سیرت، اخلاق اور ان کے علمی و ادبی پہلوؤں پر لوگ لکھیں گے، ہم کچھ ذکر ان کے خطوط کا کرنا چاہتے ہیں، ان چند خطوط سے ان کی جو تصویر بنتی ہے وہ بڑی دل آویز، پاکیزہ و دلنواز شخصیت کی تصویر ہے، ایسی بولتی اور مسکراتی تصویر جس میں سارے جہاں کا درد ہے، مسلمانوں کے حالات کی فکر ہے، اسلامی دنیا کے سارے غموں اور مصائب کا اس پر عکس ہے۔ چلتے، پھرتے، سوتے جاگتے، خلوت و جلوت، گفتگو اور مضامین و مقالات اور ساری تگ و دو صرف دین کی سربلندی کے لئے! انہوں نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس میں اسلام کی فکر مندی اور مسلمانوں کے حالات سے دردمندی طبیعت ثانیہ اور پورے نظام زندگی کی روح رواں بن گئی تھی، اس کا عکس البعث کے طاقتور اداریوں، الرائد میں حالات حاضرہ پر دردمندانہ تبصروں اور اردو میں ان کے سیاسی و ملی مضامین میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی اضطراب و

بے چینی ان خطوط میں بھی ملتی ہے جو انہوں نے راقم الحروف اور برادرم نورعظیم ندوی کے نام لکھے تھے۔
اگرچہ یہ مکاتیب تعداد میں صرف چھ ہیں مگر تمام خطوط میں جو بات مشترک ملتی ہے وہ ان کا تواضع، اخلاق کی بلندی، اخلاص، عالم اسلام سے تعلق و فکر، اس کے حالات سے تشویش و اضطراب کا اظہار ہے۔

مولانا محمد میاں کے خطوط میں ان کی بے تکلف اور سادہ و دلنواز شخصیت کی جھلک ملتی ہے انکی ان مختصر تحریروں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ ہنستے مسکراتے مختصر اور دلچسپ جملوں سے مخاطب کو گرویدہ بنا رہے ہیں۔ وہ صحیح معنی میں ایک اچھے اور باخبر صحافی اور دانشور تھے، مگر صحافیوں کے برعکس کثرت سے لکھتے نہیں تھے۔ ہم لوگ "ندائے ملت" سے تعلق کے زمانہ میں خاص نمبر نکالتے تو ان سے مشورہ کرتے اور کم از کم دو مضمون کی فرمائش کر دیتے، وہ حسب معمول مسکرا دیتے، انکار بھی نہ کرتے، لیکن روزانہ بعد مغرب حسنی فارمیسی میں ندائے ملت کے دفتر سے واپسی پر جب ندائے ملت کے خاص نمبر کا ذکر ہوتا تو ہم لوگ کہتے کہ سارے مضامین آچکے ہیں صرف آپ کا مضمون ابھی تک نہیں ملا۔ لکھنے کا وعدہ کرتے اور کہتے کہ ابھی تک موڈ نہیں بنا ہے۔ پھر جب وہ لکھتے تو اندرونی تقاضے سے لکھتے، کسی کی فرمائش پر نہیں، اسی لئے ان کے سارے مضامین اچھوتے اور منفرد ہوتے، ان میں ایک خاص پیغام ہوتا اور حالات حاضرہ کے بارے میں ایک نیا موقف پیش کیا جاتا۔

ہم اور برادرم عبد النور جب سے قاہرہ آئے دار العلوم سے خطوط کے ذریعہ برابر ربط قائم رہا، صرف خیروعافیت ہی پر یہ خطوط مشتمل نہ ہوتے، بلکہ ہم دونوں میں سے جو بھی خط لکھتا وہ اس کی کوشش کرتا کہ یہاں کے سیاسی حالات اور تبدیلیوں کے بارے میں مفصل خط لکھے، اس طرح کے خطوط پہلے استاذ گرامی مولانا محمد رابع صاحب کے نام جاتے، پھر آخر میں مولانا محمد میاں صاحب کے نام جانے لگے۔

مولانا محمد الحسنی کے نام متعدد خطوط مفصل لکھے گئے، اگرچہ آغاز میں انہوں نے جواب نہیں دیا مگر البعث والرائد کے صفحات پر ان کا عکس ضرور مل جاتا تھا پھر بعد میں انہوں نے خطوط کے جوابات دینے شروع کر دیے، عموماً سیاسی معلومات کا تبادلہ ہوتا، وہ مصر سے متعلق سوالات کرتے، ایک ایک چیز دریافت کرتے، فلاں مسئلہ پر تمام لوگوں کی کیا رائے ہے، فلاں نے ایسا بیان دیا ہے، اس پر وہاں کے دینی حلقوں کا کیا ردعمل ہے۔ فلاں مسئلہ میں ہم لوگوں کا کیا موقف ہونا چاہیے صحیح صورت حال سے مطلع کرو۔

ہمارے نام مولانا محمد میاں کے جو خطوط ہیں ان کی تعداد چھ ہے، اگرچہ ان سب کا تعلق ان کی مقبول عام کتاب "الاسلام الممتحن" اور دوسری دو تصنیفوں سے ہے مگر ان سے بھی عالم اسلام کے نبض کی دھڑکن کا احساس ہوتا ہے، اسلامی دنیا میں مصر سے ان کو بڑا تعلق تھا، اس لئے کہ مصر کو قیادت کا مقام حاصل ہونے کی وجہ سے اس کی ہر بات کو نگاہ میں رکھتے، قابل گرفت بات پر سخت گرفت کرتے، تنقید کرتے اور اچھی باتوں کو سراہتے ۱۹۶۷ء کے بعد سے مصری نوجوانوں میں جو خوشگوار تبدیلی آئی تھی اس سے بڑے مسرور تھے، اور اسلامی دنیا اور خود مصر کے لئے اس کو فال نیک سے تعبیر کرتے تھے، اگرچہ مولانا محمد میاں صاحب نے مصر کا دورہ نہیں کیا لیکن یہاں کے حالات پر جتنی گہری اور مبصرانہ نظر ان کی تھی اس سے ان کی ذہانت، تونشیا ہدہ ومطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا سعید الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد واضح صاحب جب گذشتہ سال مصر دورہ پر آئے تو ان لوگوں نے اس کا اعتراف کیا کہ مصر کو سمجھنا مشکل ہے جب تک کہ اس کا دورہ نہ کر لیا جائے اور یہاں کے ہر حلقہ سے ملا نہ جائے، لیکن مولانا محمد الحسنی صاحب کے بارے میں مولانا واضح رشید صاحب کا کہنا تھا کہ محمد میاں نے جو رائے مصر کے بارے میں قائم کر لی ہے اگر وہ مصر کو دیکھ لیں جب بھی ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

مولانا محمد میاں صاحب کا پہلا مکتوب ۱۵ر مارچ ۱۹۷۰ء کا ہے جس میں انہوں نے اپنی پہلی عربی تصنیف کے نام کے سلسلہ میں لکھا ہے۔ کتاب کا پہلا نام "منہج الفکر الاسلامی السلیم" تھا جو ناشر کو پسند نہیں آیا، ہم نے نام کی تبدیلی کے بارے میں لکھا تو حسب ذیل جواب آیا۔

برادران مکرمان، مولانا نذر الحفیظ و نورعظیم صاحبان!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آج پہلی بار آپ لوگوں کو خط لکھنے کی نوبت آرہی ہے، آپ حضرات کے دو تین خطوط اس پوری مدت میں ملے لیکن جواب میں بڑی کوتاہی ہوئی، اس کی مجھے ندامت ہے یہ خط ان خطوں کا جواب تو نہیں ہے اس لئے کہ اس کے لئے زیادہ تفصیل درکار ہے، یہ عجلت میں چند سطریں کتاب کے سلسلے میں لکھ رہے ہیں۔

آپ کے خط میں تھا کہ کتاب کا نام ان کو (ناشر) کچھ سوٹ نہیں کر رہا ہے، وہ کچھ

گرم چاہتے ہیں چنانچہ ہم غور کرتے رہے، کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آیا، لیکن ایک اچھا نام چچا میاں مدظلہ، نے تجویز کر دیا ہے۔ دو روز ہوئے رائے بریلی آ انہوں نے یہ نام بتایا اور کہا کہ فوراً ان کو لکھ دو۔

نام ہے "الاسلام الممتحن" کتاب کی جو اسپرٹ ہے وہ اس کے مطابق معلوم ہوتا ہے، لیکن آپ لوگوں کی رائے افضل ہے، بہرحال یہ نام ان کو بتلایئے اور دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں بہت اچھا ہے، جلدی اس لئے کر رہے ہیں کہ وقت کے بعد علم نہ ہو۔ بہرحال کتاب کا بہت اشتیاق ہے، ہمارے تحیات واشواق حسین عاشور (ناشر) تک پہونچا دیجئے گا اور کتاب کا تقاضا۔ اس کا اشتہار بھی " الدعوۃ " میں دیدیں تو اچھا ہے۔ بہت خوشی ہوئی کہ روداد چمن آپ لوگوں کو پسند آئی۔ آپ لوگ اجلاس میں شریک نہ تھے اس لئے اس میں ہر چیز نئی معلوم ہوتی ہوگی اور زیادہ لطف آیا ہوگا۔ کوشش کریں کہ " الدعوۃ " میں چچا میاں مدظلہ، کی تقریریں اور مضامین چھپتے رہیں تاکہ وہ حلقہ مانوس ہو۔ پاکستان کے نتائج کا علم ہوا ہوگا[1] یہاں کا نتیجہ باقی ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ اچھا ہوگا۔

محمد الحسنی

یہ پہلا خط تھا اس کے بعد خطوط کا سلسلہ شروع ہوگیا، دوسرا مکتوب یکم دسمبر ۷۰ء کا لکھا ہوا مجھے تاخیر سے ۲۲ دسمبر کو ملا، یہ قدرے مفصل خط ہمارے اس خط کے جواب میں ہے جو ہم نے ان کی کتاب الاسلام الممتحن کی اشاعت ومقبولیت کے بارے میں لکھا تھا، کتاب کے متعلق یہاں کے نوجوانوں کے تاثرات اور اظہار پسندیدگی کے بارے میں تفصیلات لکھی تھی۔ اس کے جواب میں انتہائی تواضع اور خاکساری سے خط لکھا جو یہ ہے،

برادر محب ومکرم نذر الحفیظ صاحب ندوی   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا عنایت نامہ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں بشارت نامہ بہت سی خوش کن

---

[1] پاکستان وہند کے عام انتخابات کی طرف اشارہ ہے۔

نمبر لئے ہوئے ملا تھا، افسوس ہے اور ندامت کہ پھر تاخیر کے ساتھ جواب دے رہا ہوں حالاں کہ یہ موقع تاخیر کا نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

کتاب کا جو استقبال ہوا وہ ظاہر ہے کہ مصنف اور کتاب دونوں کی حیثیت سے زیادہ تھا، اس میں خدا کے فضل خاص اور شان ستّاری کے سوا کتاب کی تقدیم[1] اور آپ حضرات کے خلوص ومحبّت اور محنت وتگ ودو کو بھی بہت دخل ہے، اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا وآخرت میں بہترین عطا فرمائے۔

خوشی ہوئی کہ کتاب اچھی اور دلنواز چھپی۔ چچا میاں مدظلہ، تو اس کو دیکھ کر اس قدر مسرور ہوئے کہ بیان کرنا مشکل ہے، پہلا نسخہ ان ہی کے ہاتھ میں پہونچا تھا، فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک حمدًا کثیرًا طیبًا مبارکًا فیہ۔

اس سے مزید مسرّت ہوئی کہ آپ دونوں بھی اسی زمانہ میں دائرۃ المصنفین[2] میں داخل ہوئے۔ برادر معظم مولانا محمد رابع صاحب کے خط سے اور چچا میاں مدظلہ، کے خط سے اس کی تفصیلات معلوم ہوئیں اب اس کو دیکھنے کا اشتیاق ہے۔

کل ہوائی ڈاک سے رجسٹرڈ الاسلام الممتحن کا ایک نسخہ تصحیح شدہ آپ کو ارسال کیا ہے، خدا کرے بحفاظت اور جلد مل جائے اور دوسرے ایڈیشن کی جلد اشاعت کی نوبت آسکے۔ تصحیحات ایک نظر آپ دیکھ لیں، اس کے علاوہ کسی جگہ آپ کو نظر پڑے تو ضرور اصلاح کر دیں۔ آپ نے خط میں لکھا ہے کہ اس طرز طباعت میں ایک اصلاح کرو تو اور غلطیوں کا خطرہ ہو جاتا ہے، اس لحاظ سے ڈر ہے کہ کہیں اور گڑبڑ نہ ہو، آپ ذرا تکلیف کر کے مسئلہ کو سمجھ لیجئے گا، اور ان کو تاکید کر دیجئے گا۔ خدا کرے دوسرا ایڈیشن اس سے بہتر ہو، اور جاذب ہو۔

---

[1] کتاب کا مقدمہ حضرت مدظلہ، نے تحریر فرمایا ہے، جو اپنی نوعیت کا منفرد، اچھوتا اور طاقتور مقدمہ ہے۔

[2] ہم دونوں کے ایم۔ اے کے رسالہ کی طرف اشارہ ہے، اسی زمانہ میں ہم دونوں نے عربی تنقید وادب سے متعلق موضوعات کا انتخاب کر کے ازہر کے کلیۃ اللغۃ العربیۃ میں رجسٹرڈ کرایا تھا کہ تھیسس لکھ سکیں۔

الی القیادة العالمیة تیار ہے، چچا میاں مدظلہ، ملاحظہ فرمائیں تو فوراً بھیجی جاسکتی ہے، "مصر تتنفس" نور عالم صاحب کے پاس صاف کرنے کے لئے ہے، امید ہے کہ وہ بھی جلد ہو جائے گی۔ یوں اس کے مضامین البعث سے ہم نے نکال لئے تھے، اور مرتب کر لیا تھا، لیکن مناسب معلوم ہوا کہ اس کی تبییض ہو جائے، اس طرح اغلاط کا خطرہ کم ہو جائے گا اور ترتیب وغیرہ واضح اور صاف ہو جائے گی۔ آپ ہمارے تحیات اور شکریہ کے بعد کہیں کہ کتاب کے اس ایڈیشن میں زیادہ تاخیر نہ کریں۔ ورنہ وہ بات نہ رہے گی، دوسرے یہ کہ حجاز وغیرہ میں کہیں کتاب کا وجود نہیں ہے، اس کی کوئی سبیل ہونی چاہیئے۔ دوسرا ایڈیشن وہاں جلد بھیجنے کا اہتمام کریں، اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہاں بھی اس کی نکاسی ہوگی۔ اس کے متعدد مضامین تو خالص اسی معاشرہ اور زندگی سے متعلق ہیں بلا تصریح و تلمیح کے!

وہاں کے ندوی (ریاض و مدینہ منورہ میں زیر تعلیم ندوی طلبہ) اس کے بڑے مشتاق ہیں اور اس کو پھیلانے کے لئے تیار ہیں خاص طور پر عزیزان سلمان، سجاد اور وقار نے کتاب پڑھی ہے اور اس کے داعی بن گئے ہیں، ان لوگوں کے خطوط برابر آرہے ہیں کہ ہم کیا کریں یہاں کتاب ہی سرے سے نہیں پہونچی، غالباً کویت اور خلیج میں بھی نہ گئی ہوگی[1] کتاب پر کوئی تبصرہ نکلے تو اس کے تراشے ضرور ارسال کریں۔ الدعوۃ اور الاعتصام طویل عرصہ سے نہیں آرہا ہے، معلوم نہیں کیا بات ہے ـــــ جہاں تک الاعتصام کے لئے مقالات کا تعلق ہے بہتر یہ ہوگا کہ وہ یا الدعوۃ والے مصر تتنفس کے کچھ مضامین حلقہ وار شائع کریں، انتخاب آپ لوگ کر دیں گے، اس سے کتاب کے تعارف کی راہ بھی ہموار ہوگی اور وہ مضامین بھی انشاء اللہ پسند کئے جائیں گے اس لئے کہ اس موضوع سے ان سب کا جذباتی تعلق ہے[2]

---

[1] ناشر نے پہلے اڈیشن میں سے ڈھائی ڈھائی ہزار ریاض، کویت اور خلیج کے مکتبوں کو بھیجی تھی جو ناکافی ثابت ہوئی۔

[2] الاعتصام کے ایڈیٹر کے بار بار مطالبہ پر راقم الحروف نے مولانا محمد میاں صاحب سے درخواست کی تھی کہ الاعتصام کیلئے کوئی مضمون لکھدیا کریں، اسی کے جواب میں یہ سطریں ہیں۔

السیرۃ النبویہ[1] امید ہے کہ اب مارکیٹ میں آگئی ہوگی چچا میاں مدظلہ نے اپنے ہاتھ سے پہلی بار (بارہ سال بعد) ایک مکتوب آپ کو بھیجا ہے، یہ سعادت کسی اور کو حاصل نہ ہوسکی۔ دو سطریں عجلت کے ساتھ پشت پر ہم نے بھی لکھ دی تھیں کہ اس تاریخی مکتوب میں ہماری بھی شرکت ہوجائے۔[2]

نور صاحب کے والد کے انتقال سے بڑا رنج ہوا، اور خیال ہوا کہ ان پر کیا اثر پڑا ہوگا، یہ حادثہ بجائے خود بڑا ہوتا ہے لیکن دوری میں اس کا تاثر بڑھ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو صبر و ہمت و عزیمت سے کام لینے کی توفیق دے۔ ہماری طرف سے تعزیت پہنچا دیں، یوں ان کو علیحدہ خط انشاء اللہ لکھیں گے۔ ان کا مفصل خط لیبیا سے آیا تھا، اور جس کو ایک انڈونیشی طالب علم کتاب کے دس نسخوں کے ساتھ لائے تھے اس پیکیٹ کے ساتھ دارالعلوم میں کسی جگہ ضائع ہوگیا، ایک نظر ڈال لی تھی اور سوچا تھا کہ اطمینان سے گھر جا کر دوپہر کی استراحت میں مزہ لے کر پڑھیں گے اور قذانی کا کچا چٹھا معلوم ہوگا۔ باتیں بہت رہ گئیں اور کاغذ ختم۔ اب انشاء اللہ آپ کے جواب کے بعد (جو خدا کرے جلد آئے) پھر لکھیں گے۔ البحث کے افتتاحیہ صلیبیۃ و لاصلاح الدین لھا[3] کے بارے میں کچھ بات آگے بڑھی؟ یہاں الحمد للہ سب خیریت ہے (الامور علیٰ ما یرام) نئے تطورات سیاسیہ پر ضرور لکھیں، ہم لوگوں کا کیا موقف ہونا چاہیئے؟ ردعمل مصر میں کیا رہا؟[4] اخوان کی رائے کیا ہے؟ والسلام محمد الحسنی۔

تیسرا مکتوب ۱۶ر دسمبر ۷۷ء کا لکھا ہوا ہے جو دوسرے خط کے لکھنے کے دوسرے ہی ہفتہ لکھا گیا تھا، وجہ یہ تھی کہ خط کے جواب میں تاخیر ہوئی تو ہم نے مولانا سعید الرحمٰن صاحب کے خط میں اس کی شکایت کی،

---

[1] حضرت مولانا مدظلہ کی نئی تصنیف جو قاہرہ سے چھپ رہی تھی۔
[2] افسوس ہے کہ یہ تاریخی مکتوب ڈاک ہی میں کہیں ضائع ہوگیا اور مکتوب الیہ اس سعادت سے محروم رہ گیا۔
[3] یہ طاقتور اداریہ تھا، خیال تھا کہ اس کو الگ سے پمفلٹ کی شکل میں شائع کردیا جائے وہ صورت تو نہ بن سکی البتہ الدعوۃ نے اس کا اقتباس اور الاعتصام نے پورا افتتاحیہ شائع کردیا۔
[4] مصری صدر کے دورہ اسرائیل کی طرف اشارہ ہے۔

جب انھیں شکایت پہنچی اس وقت تک وہ خط اور الاسلام الممتحن رجسٹرڈ ڈاک سے بھیج چکے تھے لیکن میرے شکایتی خط کے بعد پھر دوسرا مکتوب تحریر فرمایا جس میں پہلے خط کے مضمون کو مختصر کرکے لکھا (جس کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں) اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں،

"آپ کی کوششیں کامیاب اور بارآور ہوئیں اور کل الاخبار اور اخبار الیوم کے دو شمارے پہنچے۔ یہاں سے شکریہ کا خط اور البعث والرائد تبادلہ میں ہوائی ڈاک سے برابر انشاء اللہ پہنچتا رہے گا، کل جو پرچہ آیا ہے وہ ۱۲ر دسمبر کا ہے، امید ہے کہ جلد اس سے رائے قائم کرنے اور وہاں کی صورت حال صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملے گی۔ لیکن آپ لکھیں کہ وہاں کے لوگوں کا کیا نقطۂ نظر ہے، المدعوۃ طویل عرصہ سے نہیں آرہا ہے نہ الاعتصام۔ ہم لوگ صرف المجتمع اور البلاغ پر گذارہ کر رہے ہیں۔ البعث کا تازہ شمارہ امید ہے کہ ملا ہوگا۔ دونوں مضمون دیکھ کر اپنی رائے دیجئے گا۔ خاص طور پر الی الشباب الجامعی فی مصر (اگر وہاں کے حالات کے مطابق اور مفید ہو) تو علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا جا سکتا ہے، اگر آپ لوگ متفق ہوں تو حسین عاشور کو رائے دیں، آخری دو صفحہ کے اندر جہاں نئے حالات کی طرف اشارہ ہے معمولی تغیر اگر ضروری ہو تو کیا جا سکتا ہے۔ یہ لکھئے کہ کتاب بالکل ختم ہو گئی یا ابھی باقی ہے۔ کچھ پتے اس خط کے ہمراہ بھیجتے ہیں ان کو کتاب ضرور بھجوا دیں ہوائی ڈاک سے۔ اس پر ہدیہ من المؤلف ضرور ہو۔ اس کے بعد کچھ پتے اور بھیجنا ہے لیکن اس سے پہلے آپ کے خط کا انتظار رہے گا تاکہ صحیح صورت حال سامنے آجائے۔ کوشش کریں کہ دوسرے ایڈیشن میں بہت تاخیر نہ ہو۔

خدا کا شکر ہے کہ السیرۃ النبویۃ منظر عام پر آگئی۔ چچا میاں مدظلہ خوش ہوئے اور آپ کے خط کے محتویات سنائے۔ المدینۃ اور البلاغ میں اس کا خلاصہ اور تبصرہ بھی نکلا ہے۔ چچا میاں انشاء اللہ ۲۸ر دسمبر کو لکھنؤ سے حجاز کے لئے روانہ ہوں گے اس وقت رائے بریلی میں ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں ہمارے مصر میں دو دوست تھے، ایک احمد انس

الحجاجی جنھوں نے حسن البنا، پر کتابیں بھی لکھی تھیں، دوسرے فتحی العسال انہوں نے بھی حسن البنا، پر ایک کتاب غالباً الرجل الذی اشعل الثورۃ کے نام سے لکھی تھی۔ انس الحجاجی کا تو انتقال ہوچکا ہے اور فتحی العسال کا کچھ پتہ نہیں، کسی اخوانی سے کچھ پتہ لگ سکے تو ضرور لکھیے گا۔ نئے تطورات پر کیا لائن اختیار کی جائے، اس سلسلہ میں کچھ ارشادات ضرور لکھیں، نور صاحب کو بہت بہت سلام، اور مضمون واحد۔ آپ کو بہت سے کام لکھ دیے جو ہمارا مقام نہیں تھا، لیکن اس سے چارہ کار بھی نہیں تھا، امید ہے کہ معاف کر دیں گے۔ کوئی تبصرہ کتاب پر نکلے یا کسی کا اہم رائے ہو تو ضرور مطلع کریں،

محمد الحسنی

عالم اسلام کے حالات اور اس کے مد و جزر سے ہم ندوی (خاص ماحول میں نشو و نما پانے کی وجہ سے) غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے ہیں اور اس کو ذاتی مسئلہ بنا لیتے ہیں، مسلمانوں کے معاملات کی فکر، عالم اسلام کے حالات پر اضطراب و بے چینی اس کے مصائب و مشکلات سے پریشانی، اس کی خوش کن خبروں سے مسرت، ان سب کا اظہار نجی مجلسوں، خط و کتابت کرتے ہیں، پھر آگے چل کر یہ خیالات و افکار مضامین کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں اور بارہا یہ مضامین بین الاسلامی کانفرنسوں کے مناقشوں اور تجاویز پر اثر انداز ہوئے ہیں، اسلامی دنیا کے کتنے مسائل ہیں جنھیں البعث و الرائد نے مقامی حیثیت سے اٹھا کر بین الاقوامی کانفرنسوں میں پہنچا دیا، البعث کے طاقتور اور موثر اداریوں اور فکر انگیز مقالات نے اسلامی دنیا میں جو روح پھونکی ہے اور جن سخت اور مشکل حالات میں اس نے یہ کام انجام دیا ہے عرب ادیبوں اور دانشوروں نے اس کا اعتراف کھلے الفاظ میں کیا ہے، حالات و واقعات نے بھی اس کی شہادت دی ہے کہ ملوک و امرا اور سربراہ مملکت سے براہ راست ملاقات کی ضرورت سمجھی گئی تو جرات و صراحت کے ساتھ ان سے بھی خطاب کرنے اور اپنا پیغام پہونچانے سے گریز نہیں کیا گیا۔

مولانا محمد میاں کے خطوط جو انہوں نے راقم سطور اور برادرم نور کے نام لکھے ان سب میں ایک ہی نغمہ ملتا ہے اور وہ ہے اسلام اور مسلمانوں کی فکر۔ عالم اسلام کے حکمرانوں کا انداز فکر کیا ہے، ان ملکوں کے اخبارات حاکم کے حق میں کیسے کیسے دلائل فراہم کرتے ہیں، مختلف گروہوں اور جماعتوں کا نقطۂ نظر موجودہ

مسائل کے بارے میں کیا ہے۔ عوام اور حاکم کے درمیان طرز فکر میں جتنا غیر معمولی اختلاف عرب دنیا میں پایا جاتا ہے (خصوصاً مصر میں) وہ شاید ہی کہیں ہو، اس لئے مولانا محمد میاں ہمیشہ اس تگ ودو میں رہے کہ دینی حلقوں کا موجودہ حالات وواقعات کے سلسلہ میں ردعمل معلوم کریں، چنانچہ ہم لوگ مصر کے دینی حلقوں سے ملاقات اور مناقشوں کے بعد جو صورت حال ہوتی اس سے مطلع کرتے رہتے۔ ایک مکتوب سے جو انہوں نے ۱۵ جنوری ۸۰ء کو لکھا ہے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں کے ہر معمولی سے واقعہ سے مکتوب نگار کتنا پریشان ہو جاتا ہے، یہ خط ملاحظہ کیجئے اور لکھنے والے کے دلی اضطراب کا اندازہ کیجئے۔

برادر عزیز ومکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

یہ تیسرا یا چوتھا خط بطور یاد دہانی کے لکھ رہے ہیں، چونکہ طویل عرصے کسی خط کی کوئی رسید نہیں ملی، نہ کتاب ملنے کی کوئی اطلاع، اس لئے تشویش ہے کہ آیا کوئی چیز پہونچی یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے،

وہاں (مصر) کے حالات تو روز بروز بدلتے رہتے ہیں، کہیں سنسر اور دوسری پالیسی شروع ہوگئی تو سارا معاملہ ختم، سب کچھ چھپنا ہی دشوار ہو جائے گا، آج ریڈیو پر خبر تھی کہ سادات نے کسی مصری ہفتہ وار کو انٹرویو دیا ہے اور اسرائیل کو وارننگ دی ہے کہ اگر اس نے سمجھ سے کام نہ لیا تو پچھتانا پڑے گا، بیگن نے اس بیان کو افسوسناک قرار دیا ہے، آپ لوگوں کے خطوط کا یوں بھی انتظار رہتا ہے کہ اس سے صورت حال کو سمجھنے اور اس کی روشنی میں لکھنے میں مدد ملتی ہے، بہرحال جواب کا شدید انتظار ہے۔ یہ خط اپنے نام اور پتہ کی ہلکی تبدیلی کے ساتھ لکھتے ہیں احتیاطاً۔

یہ خط اسی لئے اختصار کے ساتھ لکھتے ہیں کہ پہونچنے کا یقین نہیں ہے، یہ اگر پہنچے تو فوراً جواب دیں تاکہ اطمینان ہو، مصر تتنفس جو صاف اور مکمل حالت میں ہے اس لئے نہیں بھیجتے کہ کہیں ضائع نہ ہو۔ برادرم عبدالنور صاحب کو بھی خط مفصل لکھ چکے ہیں، ان کو سلام کہیں، ہاں الدعوۃ اور الاعتصام تو کسے سے بند ہے، سمجھ میں نہیں آتا قصہ کیا ہے؟ بہرحال، الاسلام الممتحن اور الی القیادۃ العالمیۃ کے بارے میں

مطلع کریں ؟ چچا میاں مدظلہ، الحمد للہ بخیریت ہیں۔ اس ماہ کے آخر تک انشاء اللہ واپسی کی امید ہے۔

البعث و الرائد مل رہے ہیں یا نہیں، جواب ۲۷۔ گوئن روڈ کے پتہ پر دیں۔
سارے خطوط اور کتابیں دسمبر کے شروع میں بھیجے ہیں اس لئے تاخیر بہت ہو چکی اور تشویش ہے۔

محمد الحسنی

اگلا مکتوب ۵ ارمارچ ۸۰ء کا ہے جو قدرے تفصیل سے ہے اور ہم دونوں کے نام مشترک ہے، اس سے مکتوب نگار کی بے تکلفی و سادگی اور تواضع کے ساتھ اسلامی دنیا اور مسلمانوں کے متعلق فکر و اضطراب اور صحیح حالات سے واقفیت کی شدید خواہش کا اندازہ ہوتا ہے۔ عالم اسلام کی فلاح و بہبودی کی فکر، مسلمانوں کے مسائل و مشکلات اور ان کے مصائب سے دردمندی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، یہ درد ان کے جسم اور قوائے فکریہ میں اس طرح جذب ہو گیا تھا۔ شاخ گل میں جس طرح باد سحرگاہی کا نم،

اسی لئے اپنے تمام خطوط میں اس پہلو پر زیادہ توجہ دیتے، ان کے مضامین و مقالات کا ایک ایک حرف اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ؎

مرا دردیست اندر دل چو می گویم زباں سوزد ؛؛ اگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

یہی درد ان کے خطوط میں ظاہر ہوتا ہے جو آگے چل کر آہ و فغاں میں تبدیل ہو جاتا اور پھر شدید اندرونی تقاضوں سے مجبور ہو کر قلم اٹھاتے تو خون جگر سے لکھتے اور مردہ دلوں کے لئے مسیحائی کا کام کر جاتے۔ آئیے پانچواں مکتوب پڑھتے ہیں:۔

برادران محبان و مکرمان۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

خدا کرے آپ دونوں حضرات بہمہ وجوہ بعافیت ہوں، ہمارے لئے شاید کتاب لکھ دینا یا مضمون لکھ دینا آسان ہے لیکن خط لکھنا مشکل ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کر رہے ہیں۔ یہ سوچ کر علیحدہ لکھنے کی فکر میں کہیں خط ہی نہ رہ جائے۔ برادرم نور صاحب کا خط تو اشاعت کے لئے تعمیر حیات میں دے چکے ہیں۔ آپ کا خط فی الحال سامنے ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کا خط شیخ الازہر کے دعوت نامہ

کے ساتھ مل گیا[1] لیکن ان حالات میں ملاکر مولانا سعید الرحمٰن صاحب کی طبیعت بہت خراب تھی کہ بروقت خط اور دعوت نامہ سے ان کو آگاہ بھی نہیں کیا گیا، ایک ہفتہ سے زائد بہت تکلیف میں گذرے، سر کا شدید درد مسلسل ایک ہفتہ رہا۔ اس کے علاوہ ریاحی تکلیفات پیٹ اور سینہ کا درد وغیرہ کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ آپ کا خط اور دعوت نامہ ان کو مل چکا ہے، ذرا ٹھیک ہوں تو پر پرواز کھولے جائیں، امید ہے کہ ان حضرات کا یہ دورہ آپ دونوں کی موجودگی کی وجہ سے دلچسپ بھی ثابت ہوگا اور متعدد حیثیتوں سے بارآور اور مفید بھی۔ وہ ظاہر ہے کہ پہلی فرصت میں آپ کو جواب لکھیں گے یا ہو سکتا ہے لکھ چکے ہوں، ابھی ملاقات ہوگی تو دریافت کریں گے یہ خط ندوہ کے مہمان خانہ سے لکھ رہے ہیں ادھر دو ایک روز سے پھر ٹھنڈک ہوگئی تھی، اولے بھی گرے اس لئے دھوپ کی لالچ میں یہاں بیٹھے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ دونوں کتابیں بحفاظت پہنچ گئیں، بڑا سخت انتظار تھا، واقعی اندازہ ہوا کہ خط نہیں آتا تو کیا گذرتی ہے، اب دوسرا انتظار یہ شروع ہو گیا کہ دیکھئے دونوں چیزوں کی طباعت کی باری کب آتی ہے، جس عجلت سے آپ نے کتاب طلب کی تھی اس سے ہم بڑے خوش ہوئے تھے کہ شاید بہت جلد چھپے گی[2] کم از کم الاسلام الممتحن کا دوسرا

---

[1] شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود نے ازہر کی طرف سے دار العلوم کے دو استاذوں مولانا سعید الاعظمی ندوی اور مولانا محمد واضح رشید ندوی کو مصر کے ثقافتی دورے کی دعوت دی تھی۔ [2] ہم نے ناشر کے کہنے اور تقاضے سے مولانا محمد میاں صاحب کو خط لکھ کر "الاسلام الممتحن" کا تصحیح شدہ نسخہ منگوا لیا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ مزید کتابیں تیار ہوں تو ارسال فرمائیں تاکہ آپ کی تصانیف مسلسل شائع ہوتی رہیں، ہمیں تقاضے پر انہوں نے مطلوبہ چیزیں ارسال کر دیں مگر ناشر نے ناسازگار حالات کا بہانہ بنا کر کتاب کی اشاعت ملتوی کر دی، البتہ "الاسلام الممتحن" کا دوسرا ایڈیشن شدید تقاضوں اور مکتبوں کی مانگ سے مجبور ہو کر من وعن غلطیوں کے ساتھ آفسیٹ پر شائع کر دی۔ جب تک دوسرا ایڈیشن شائع ہوتا اس وقت تک حجاز سے تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا تھا۔ مکتوب نگار کا مطالبہ کتابوں کی اشاعت کا بڑھتا ہی گیا، میں ان سے سخت شرمندہ تھا کہ کتاب ابھی تک شائع نہ ہو سکی۔ اس لئے یہ کام ہم نے برادرم نور کے سپرد کر دیا کہ وہی ناشر سے تقاضہ کریں اور وہ جو جواب دیں اس سے مولانا محمد میاں کو مطلع کریں۔ مصریوں کی طبیعت یہ ہے کہ وہ وعدہ تو جلد کر لیتے ہیں مگر پورا نہیں کرتے۔ اس کا مجھے تلخ تجربہ ہوا۔ اور حضرت مولانا اور محمد میاں کے سامنے بارہا شرمندہ ہونا پڑا۔

ایڈیشن۔ بہرحال آپ تقاضہ ضرور کریں، ورنہ خطرہ ہے کہ زیادہ تاخیر ہوجائے گی۔ مصر تنفس پر نظر ثانی کر رہے تھے، مکمل ہوتے ہی وہ بھی ارسال کردیں گے۔

عزیزی سلمان سلمہ کا خط آیا کہ کتاب مکتبۃ المہیمن (ریاض) میں مل گئی۔ کچھ نسخے خرید کر دوستوں اور اہم اشخاص کو دیئے، لیکن برادر مکرم طارق حسن عسکری سے معلوم ہوا کہ دوبارہ کتاب کو پوچھنے گئے تو معلوم ہوا کہ ختم ہوچکی ہے۔ اب پھر تعطل اور انتظار کی کیفیت ہے، وہ چاہتے تھے کہ حجاز کے لئے آفسیٹ پر چھپوالیں لیکن ایک تو المختار الاسلامی والے اس کی اجازت نہ دینگے، دوسرے غلطیاں بھی بہت ہیں اور اس حالت میں چھاپنا بھی ٹھیک نہیں۔

آپ حضرات کے خط سے وہاں کے حالات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے، خاص طور پر عبدالنور صاحب کا مفصل خط اس سلسلہ میں بہت مفید ثابت ہوا۔ آپ کے تازہ خط سے معلوم ہوا کہ مش معقول مش ممکن والا شمارہ ضبط کرلیا گیا۔ اس سلسلہ میں آپ کا خیال مناسب ہے[1] یوں بھی وہ بالکل شروع میں لکھا گیا تھا اور اخوان کو سامنے رکھ کر خاص طور پر کویت اخوانی اس لئے کچھ تیزی جان بوجھ کر برتی گئی تھی۔ الدعوۃ اور الاعتصام کے تراشے اور تمام چیزیں مل گئی تھیں۔ غالباً اس میں الرجل القرآنی کے کئی نسخے تھے، اس کو پورا تازہ البعث میں شائع کیا گیا ہے۔ چچا میاں مدظلہ کو بھی یہ رسالہ بیحد پسند آیا۔ اس کا اور مذکرات کے اوپر چچا میاں کے مقدمہ کا اردو ترجمہ یہاں غالباً ایک ساتھ شائع ہوگا۔ اس سے بڑی مسرت ہوئی کہ الی الشباب الجامعی فی مصر، اور صلیبیۃ ولا اصلاح الدین لھا الاعتصام میں شائع ہونگے لیکن الدعوۃ تو مطلقاً بند ہے۔ الاعتصام بحری ڈاک سے کبھی کبھی آتا ہے اس لئے شائع ہوتے ہی تکلیف کرکے اس کو بھیجدیں تو اچھا ہے۔ اس سے مزید اطمینان ہوا کہ الی القیادۃ العالمیۃ آپ دونوں نے پسند کی اور حسین عاشور نے بھی۔ مقدمہ کسی قدر تشنہ اور ہلکا ہے، ہمارا احساس یہی تھا لیکن اس سے زیادہ اس وقت ممکن نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو بھی قبولیت و مقبولیت سے نوازے اور اچھے معیار پر شائع ہوں۔ بہرحال، آپ ان کو ہمارا سلام

---

[1] صدر سادات کے دورۂ اسرائیل پر شدید لب ولہجہ میں یہ نوٹ لکھا گیا تھا۔ میں نے توجہ دلائی تھی کہ پرچہ اگر مصر میں چلانا ہے تو ذرا لہجہ نرم کرنا ہوگا، تاکہ یہ رسالے داخل ہوسکیں اور اپنی بات پہنچا سکیں۔

اور اشتیاق و انتظار ضرور پہنچا دیں۔ یہ کہنے کی آپ سے ضرورت نہیں کہ ایک مصنف کو اپنی کتاب کا انتظار کتنا ہوتا ہے، خاص طور پر وہ جو تازہ وار دان بساط ہوائے دل" میں شامل ہو اور چونکہ قلم ہماری زبان کا قائم مقام ہو چکا ہے اس لئے انتظار بھی اسی لحاظ سے اشق و اشد ہے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ الدعوۃ میں اس کا خصوصی استقبال ہوگا لیکن معلوم ہوا کہ ابھی تک تبصرہ بھی نہیں آیا۔ بہرحال حسین عاشور صاحب اشتہار دونوں کتابوں کا اس میں بھی دیدیں۔ ایک انٹرویو سے پتہ لگا ہے کہ الدعوۃ کی اشاعت ایک لاکھ سے اوپر ہے۔

اخبارات پہونچتے ہیں، دخان فی الھواء وغیرہ پہلے بھی ہم دیکھ لیتے تھے۔ بہ نسبت اور چیزوں کے اس میں کسی قدر جان ہوتی ہے[۱] خوشی ہوئی کہ البعث و الرائد کے سب پیکیٹ مل گئے۔ باتیں بہت ہیں لیکن جگہ ختم ہو چکی ہے اب آپ کے خط کا انتظار رہے گا جو خدا کرے اخبار سارۃ پر مشتمل ہو، اب سیاسی فضا بھی بارد نظر آرہی ہے۔ آج اخبار میں تھا کہ امریکہ اور اسرائیل میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ سب در پردہ کھیل نظر آتا ہے۔ یوسف السباعی کا تو مصریوں نے حسب معمول بہت سوگ منایا[۲] کیا اخوان وفد کی طرح اپنی حزب خاص نہیں بنا رہے ہیں؟ ڈاکٹر اشتیاق صاحب کو آپ کا سلام پہنچا دیا ہے انہوں نے آپ دونوں کو سلام لکھنے کے لئے کہا ہے۔ آپ لوگوں کو علم ہوگا کہ کرناٹک اور آندھرا میں اندرا کانگریس کی حکومت بن گئی ہے، مہاراشٹر میں آج ریڈی کانگریس اور اندرا کانگریس کی مشترکہ گورنمنٹ بن رہی ہے تاہم جنتا پارٹی کا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔

محمد الحسنی

ہم لوگوں نے مولانا محمد میاں صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ الی القیادۃ العالمیۃ کا مقدمہ مختصر ہے ذرا تفصیلی ہونا چاہیئے، دوسرے یہ کہ مضامین کے آغاز میں ایک تشریحی نوٹ ہونا چاہیئے یا تاریخ جس سے مقالہ کے پس منظر کو سمجھنے اور واقعات کی کڑی ملانے میں قاری کو سہولت ہو، انہوں نے ازراہ کرم اس کے مطابق ایک مفصل مقدمہ اور توضیحی حاشیے لکھ کر ارسال کر دیے اس کی طرف اپنے آخری مکتوب مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۸ء میں اشارہ کرتے

۱ـ الاخبار کا ایک مستقل کالم جو ایک مشہور مصری صحافی لکھتے تھے۔
۲ـ روزنامہ الاھرام کے چیف ایڈیٹر جنھیں قبرص میں قتل کر دیا گیا تھا۔

ہوئے لکھتے ہیں۔

برادر عزیز و مکرم!   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

خدا کرے آپ بہمہ وجوہ بخیر و عافیت ہوں، معلوم نہیں عبدالنور صاحب حج سے واپس آگئے یا نہیں، آگئے ہوں تو حج کی مبارکباد قبول کریں۔

اس سے پہلے عرصہ ہوا ایک خط بذریعہ رجسٹری ہوائی ڈاک سے ارسال کیا تھا اس میں مقدمہ اور اضافات و تشریحات بھی تھیں جو آپ لوگوں کے مشورہ اور حسین عاشور کی خواہش پر لکھی گئی تھیں اور ان کی ضرورت بھی تھی مقدمہ بھی بہت اہتمام سے ہم نے لکھا ہے اور صاف کرد کے ارسال کیا ہے ایک آدھ جگہ خط کشیدہ عبارت ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ محل نظر ہیں کہ وہاں کے حالات میں کہاں تک مناسب رہیں گی۔ جواب آنے سے فکر و تشویش ہے۔ خدا کرے پہنچ گیا ہو۔

آج ہی ایک مفصل خط حسین عاشور کے نام لکھا ہے اور دونوں خط ایک ساتھ ڈال رہے ہیں عرصہ سے آپ لوگوں کا خط نہیں آیا، حسین عاشور کے خط میں ہم نے سائز کے بارہ میں خاص طور پر لکھا ہے، خدا کرے ان کی سمجھ میں آجائے اور بھی بہت سی باتیں لکھی ہیں، الی القیادۃ العالمیۃ اور مصر تتنفس کا شدید انتظار ہے۔ پتہ نہ چلا کہ دوسرے ایڈیشن کا کیا ہوا، کتاب بازار میں نظر آئی؟ اس لئے کہ انہوں نے لکھا تھا کہ پانچ ہزار سعودی عرب اور دو ہزار کویت بھیج رہے ہیں، آپ کو شاید علم ہوگا کہ طارق حسن عسکری صاحب نے کتاب کا ایک ایڈیشن اور شائع کیا ہے، غالباً عبدالنور صاحب نے اسے حجاز میں دیکھا ہوگا، قاہرہ میں جب چھپنے میں تاخیر ہوئی تو انہوں نے چچا میاں سے اجازت لے کر چھاپا، اس کا سائز بھی ویسا ہی ہے اور بہت خوبصورت بھی ہے۔ شروع میں اس کا ذکر یوں نہیں کیا کہ معلوم نہیں حسین عاشور اس کو کیا محسوس کریں، ان کو ابھی اپنے نام سے چھاپنے کی اجازت نہ تھی، اس لئے دار عرفات کے نام سے شائع کیا ہے۔ الدعوۃ اور الاعتصام نہیں پہونچتا، کبھی کبھار، معلوم نہیں کیا بات ہے، اب تو آپ لوگوں کی واپسی کا زمانہ بھی قریب آگیا ہے۔ کیا پروگرام ہے۔

مصر کی خبریں تو ایسی آتی ہیں جیسے ہنوز روز اول ہو، دیکھیں سفینہ کب ساحل مراد کو پہونچتا ہے، یہاں کی دلچسپ خبریں تو ملتی ہوں گی کیا تبصرہ ہے[1] . . . . پر ایک مضمون الدعوۃ میں نکلا تھا وہ دیکھا ہے، کیا اب وہاں لوگ عام طور پر ایسا سوچ رہے ہیں؟ الی القیادۃ کی خوش خبری کب ملے گی؟

یہ خط ایک جانے کی جلدی تھی اس لئے بہت عجلت میں لکھا ہے، اس کی معذرت قبول کریں۔ تازہ البعث میں عبد الحلیم عویس کا ایک خط یا مضمون قوم وتعوانی غرامر کے اوپر دیکھئے گا۔

محمد الحسنی

یہ میرے نام آخری مکتوب تھا ورنہ برادرم نور کے نام خطوط کا سلسلہ وفات تک جاری رہا۔ آخری خط انہوں نے مئی کے دوسرے یا تیسرے ہفتہ میں لکھا تھا جس کا جواب یہاں سے ۱۲ر جون کو لکھا گیا لیکن وہ ان سب چیزوں سے بے نیاز اپنے خالق کے حضور حاضر ہو چکے تھے۔

یہ چند مکاتیب تھے جو راقم الحروف کے نام مولانا محمد میاں صاحب نے لکھے تھے، ان خطوط سے مکتوب نگار کی جو تصویر بنتی ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ ایک ایک لفظ لکھنے والے کے قلبی احساس و اضطراب اور بے چینی کا پتہ دیتا ہے، یہ قلق اور پریشانی اپنی ذات وخاندان کے لئے نہیں بلکہ وسیع تر اسلامی برادری اور پوری اسلامی دنیا کے لئے تھی۔ دنیا کے کسی حصہ میں کسی مسلمان کے کانٹا چبھ جائے، اس پر کوئی مصیبت آجائے، مولانا محمد میاں اس کے لئے بے چین ومضطرب، الحاد وبے دینی کی ہوا کسی مسلم ملک میں چل رہی ہے اور نشر واشاعت کے سارے ذرائع اس کی پشت پر ہیں، مگر مولانا محمد میاں کا قلم اس طوفان سے ٹکر لینے سے ذرا بھی نہیں جھجکتا، عرب قومیت اور ناصریت، عالم اسلام کے دو بڑے فتنے تھے جن کا ڈٹ کر مقابلہ اس طرح مولانا محمد میاں نے کیا کہ بڑے بڑے ادیبوں اور دانشوروں نے اس کا اعتراف کیا۔ لکھنے والے مولانا محمد میاں کی ان دینی خدمات پر تفصیل سے لکھیں گے مگر ان مندرجہ بالا مکاتیب سے مکتوب نگار کی سادگی وبے تکلفی اور تواضع وانکساری کا اظہار تو ہوتا ہی ہے، ان کی شرافت کا جوہر، بلند نظری، شخصیت کی دلنوازی، اسلام اور مسلمانوں کے لئے قلبی سوزش و درد

---

[1] ایک "نئے ہندوستانی مفکر" کا نام۔

کا بھی احساس ہوتا ہے، ہم خوردوں اور طالب علموں کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا کس طرح اپنی تحریروں کے بارے میں تأثرات معلوم کرتے اور مختلف مسائل میں رائے معلوم کرتے، حالاں کہ عربی و اردو دونوں کے وہ ادا شناس ادیب اور ایک منفرد اور اچھوتے اسلوب کے مالک، مانے ہوئے صحافی تھے۔ وہ سب سے زیادہ باخبر صحافی اور دانشور مبصر تھے، حالات حاضرہ کے بارہ میں ان کی ایک خاص رائے تھی، وہ ایک منجھے ہوئے ادیب اور کہنہ مشق صحافی تھے ان کا وجود کسی بھی وقیع اردو عربی پرچہ کے لئے باعث رشک ہوسکتا تھا اور خاصی مادی سہولت حاصل کرسکتے تھے مگر ارزانی اور قلم فروشی کے اس دور میں انہوں نے دین کی خدمت کو فرض سمجھا اور قلم کی آبرو کی حفاظت کی، انہوں نے بڑی کم عمری میں وفات پائی مگر کمیت اور کیفیت ہر لحاظ سے دین کی خاصی خدمت کر گئے۔ جب انہوں نے اپنے عم نامدار کی نگرانی میں "البعث الاسلامی" نکالا اس وقت پوری اسلامی دنیا صحیح اسلامی صحافت سے ناآشنا تھی، مولانا محمد میاں نے اخلاص واستقامت، اور عزم وہمت سے اسلامی صحافت کو نشان راہ دکھلائے، مسلم صحافت کو حالات حاضرہ پر بے لاگ تنقید اور سیاسی ومعاشرتی مسائل کے بارے میں نئے زاویہ نظر اختیار کرنے کا ڈھنگ بتایا۔ میرے خیال میں موجودہ اسلام پسند ادیبوں اور صحافیوں میں مولانا محمد میاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے استعمار کی ہر شکل وصورت کو خواہ وہ کتنے ہی پردوں میں ہو خوب بے نقاب کیا، مسلم ملکوں میں چلنے والی لادینی تحریکوں اور ان کے سرپرستوں نیز مسلم حکمرانوں پر جتنی سخت اور بے لاگ تعمیری تنقید مولانا محمد میاں نے کی اس کی مثال مشکل ہے۔

مولانا محمد میاں نے اپنی تحریروں سے مایوس دلوں کو امید کی روشنی عطا کی۔ دین کی طرف سے مدافعت کرنے والے کمزور ہو رہے تھے، مگر ان کی خون جگر سے لکھی تحریروں نے دین کے داعیوں میں نئی طاقت اور نئی روح پیدا کردی اور واعظوں اور خطیبوں نے ان کی تحریروں کو اپنے خطبات وتقریروں کا موضوع بنایا، ان کی پختہ اور ادیبانہ تحریر اور ان کی نوعمری نے اچھے اچھے لکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیا، حق کی مدافعت میں مولانا محمد میاں نے کسی قیمت پر بھی باطل سے صلح گوارہ نہیں کی، انہوں نے جو کبھی لڑائی لڑی، البعث کے طاقتور اور موثر اداریے، الرائد کے تیکھے تبصرے اور تعمیر حیات کے سنجیدہ وشگفتہ مقالات، سب لکھنے والے کے دینی غیرت، حمیت اخلاص وللہیت کی شہادت دیتے ہیں اور جب اپنے آقا ومولی کے حضور وہ حاضر ہوں گے تو سفارش کریں گے کہ ؎

یہ بندہ دو عالم سے خفا تیرے لئے ہے

مولانا محمد میاں کی وفات ایک خاندان کا حادثہ نہیں عالم اسلام کے لئے سانحہ ہے۔ ہم سب اچانک وفات پر سوگوار اور مغموم ہیں۔ راقم الحروف نے ایک تعزیتی عریضہ حضرت مدظلہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا مگر اصحاب دعوت وعزیمت کا یہ نامور مؤرخ اور مجاہد کبیر سید احمد شہید کا سیرت نگار اپنے باکمال طرۂ نازش وافتخار بھتیجہ کی وفات کی اطلاع خود اپنے قلم سے کس طرح دیتا ہے۔ دل پر اس نے کتنا جبر کیا ہوگا، اس کوہ گراں کو کس طرح ہم خوردوں کی تسکین وتسلی کی خاطر برداشت کیا ہوگا اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ اس نادر مکتوب سے وہ واقعہ یاد آجاتا ہے جو مولانا محمد میاں نے اپنے جد امجد حضرت سید شاہ علم اللہ کی سیرت میں لکھا ہے جب ان کے جواں وصالح صاحبزادہ سید محمد ابو حنیفہ کا انتقال ہوا تو کتنے اطمینان اور عزم وہمت سے انہوں نے تجہیز وتکفین کی تھی۔

الشیٔ من معدنہٖ لا یستغرب

گرامی نامہ ملاحظہ کیجئے۔

برادران عزیزان مولوی عبد النور ونذر الحفیظ سلمہما اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

معلوم نہیں آپ لوگوں کو کسی ذریعہ سے ہمارے خاندان ہی نہیں عالم اسلام کے عظیم حادثہ کی خبر ملی یا نہیں؟ شاید یہ ناشاد چچا ہی کے لئے مقدر ہے کہ وہ اپنے قوت بازو، قرۃ عین، اور سرمایۂ نازش وافتخار، باکمال بھتیجہ کی خبر وفات دے۔ بہر حال، خلاصہ یہ ہے کہ ۱۳ رجون کو چند گھنٹوں کی علالت کے بعد محمد میاں ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے، میں ان سے تقریباً ایک ہزار میل دور بمبئی میں تھا، ما اشبہ اللیلۃ بالبارحۃ۔ میں بھائی صاحب مرحوم کی طرح سارے مراحل طے ہو جانے کے بعد رائے بریلی پہونچا۔ بمبئی و دہلی ہر جگہ خبر تھی، لیکن مجھ سے چھپایا گیا۔ آپ دونوں کو خوب اندازہ ہے کہ یہ حادثہ کیسا تھا؟ ؏

آنچہ من گم کردہ ام گر از سلیماں شدے؟

اب یہ خط اس تعلق خاص کی بنا پر میں خود لکھ رہا ہوں جو آپ دونوں کو ہم

دونوں سے ہے، اور اس درخواست کے ساتھ کہ دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کے ساتھ ساتھ ان کی کتابوں کی طباعت واشاعت میں پورا پورا زور صرف کردیں گے۔ الاسلام الممتحن کی توزیع اور اس کو مناسب جگہوں تک پہونچانے کی پوری پوری کوشش کریں گے کہ یہی ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ مصر تتنفس اور الاسلام بین لا ونعم کی طباعت کی بھی کوشش کریں گے۔ اب زخم دل کے لئے یہی مرہم ہے۔

والسلام

دعاگو

ابوالحسن علی

۲۰ر جون ۱۹۷۹ء

ایمان اور دعوت

۔۔۔ ایمان نہ بیچا جاسکتا ہے نہ خریدا جاسکتا ہے، نہ مول تول کیا جاسکتا ہے اور نہ تلوار اور پستول کے ذریعہ زیر کیا جاسکتا ہے نہ فلسفہ وسائنس کے ذریعہ اور نہ نام نہاد کلچر کے ذریعہ اور نہ اس کنگال، زوال پذیر تاریک تہذیب کے ذریعہ اور نہ خیر سے مفقود اور ایمانی نعمت سے محروم معلومات کے ذریعہ جو انسانیت کے لئے وبال بنی ہوئی ہے اور نہ علم وادب کے پروپیگنڈوں میں اور نہ ان انقلابوں و ترقیوں میں جس میں اپنا ضمیر اور اپنی جان فروخت کردی گئی اور اپنے قلم وزبان کو مادی چیزوں اور چند درہموں کے بدلہ میں فروخت کردیا گیا اور خود بھی اس سے غیر راغب تھے۔

(مولانا سید محمد الحسنی ندوی مرحوم)

محمد الحسنیؒ — چند یادیں، چند ملاقاتیں

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

شمالی ہند سے دور رہنے کے باعث اُدھر کی خبریں ادھر ذرا دیر سے پہونچتی ہیں چنانچہ مولانا محمد الحسنی کے انتقال کی خبر مجھے اخبار العالم الاسلامی مکہ سے ملی، دل دھک سے ہو گیا۔ ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں ان سے میرے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ چونکہ وہ شاہ حلیم عطاؒ کے کلاس میں شرکت کے لئے روز آتے تھے لہذا روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں خط و کتابت بھی رہی۔ چند خطوط ان کے میرے پاس محفوظ ہیں۔

میں ندوہ کے دورِ طالب علمی میں اکثر مولانا عبد الغفار ندوی کے پاس دفتر جماعت اسلامی بارود خانہ میں ٹھہر جاتا تھا، تعطیلات کا کچھ حصہ وہاں صرف کرتا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا میں وہیں ٹھہرا ہوا تھا محمد الحسنی (جن کو ہم لوگ عرف عام میں محمد میاں کہتے تھے) سے ملاقات ہوئی گھنٹوں باتیں ہوئیں، پھر میں نے ان کو ناشتہ پر مدعو کیا۔ ویسے ان کی سوشل لائف زیادہ وسیع نہ تھی مگر ازراہ کرم و خلوص انھوں نے میری دعوت قبول کی اور صبح کو دفتر جماعت تشریف لائے، ناشتہ ہوا، گفتگو ہوئی، چلتے وقت میں نے ان کو ایک اردو شاعری کا انتخاب پیش کیا جو مجھے بہت عزیز تھا اور میں نے ندوہ کے ایک ساتھی طفیل احمد صاحب پرتابگڈھی سے لیا تھا۔ اس کتاب میں پہلا شعر یہ تھا:

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے، رونق وہی باقی ہے محفل کی

اس کتاب پر چند سطریں محبت و خلوص کی لکھ کر میں نے ان کو ہدیہ کر دی اور دور تک بھیجنے گیا۔ اس خوشگوار ملاقات کو تقریباً ۲۷ برس ہو گئے مگر اس کی یاد آج تک ذہن میں تازہ ہے۔

میں فضیلت ادب کا طالب علم تھا اور جماعت اسلامی سے متاثر تھا میں مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کا انداز جماعت اسلامی کے بارے میں پسند نہ کرتا تھا لہذا ان کو ۱۵۔۱۶ صفحات کا ایک طویل خط لکھا جس میں اور باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ آپ نے کسی عربی مدرسہ میں عربی نہیں پڑھی ہے اسی بنا پر آپ کے خیالات

میں بھی ہے مگر نام نہیں لکھا۔ مولانا محمد میاں نے ایک بار مجھ سے بتایا کہ مولانا ماجد صاحب نے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ، سے فرمایا کہ اس طالب علم کا پتہ لگائیں۔ جس وقت محمد میاں نے مجھ سے یہ بات بتائی اس وقت میں جامعہ جا چکا تھا۔

لکھنؤ میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا میں بھی اس میں شریک ہوا۔ دوسرے روز محمد میاں سے ملاقات ہوئی تو ذکر مشاعرہ کا چھڑا۔ میں نے غلطی سے ایک بہت قدیم اور معروف شعر کو کسی جدید شاعر کی طرف منسوب کر کے ان کو سنایا جس پر انہوں نے فوراً ٹوک دیا اور بولے کہ یہ تو بڑا مشہور شعر ہے اس کو اس مشاعرہ میں سنانے کا کوئی سوال نہیں۔ شعر غالباً یہ تھا ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہونچی تری جوانی تک

محمد میاں طبعاً بہت خاموش تھے خود کبھی کوئی موضوع نہ چھیڑتے شاید یہ کم سخنی موروثی ہے کہ ڈاکٹر عبد العلی بھی کم سخن لوگوں میں سے تھے۔

میں جس زمانہ میں ادارہ تعلیمات اسلام میں پڑھتا تھا اس وقت محمد میاں کی پہلی عربی کتاب "بین الصورۃ والحقیقۃ" شائع ہوئی تھی حالاں کہ ان کی عمر بہت کم تھی یہ مولانا علی میاں مدظلہ، کے ایک اردو مقالے کا ترجمہ تھا۔ پھر ان کی عربیت بڑھتی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ طبعی طور پر ادیب تھے اور ہندوستان کے عربی لکھنے والوں میں ان کے اسلوب کی فطری روانی، دل کشی، جملوں کی ساخت، الفاظ کا انتخاب اور دروبست، شعور کی پختگی اور زبان پر قدرت ان کے اسلوب کو افتخار و امتیاز عطا کرتی ہے۔ اگرچہ انہوں نے ۲۳ برس تک "البعث الاسلامی" نکالا مگر عربی زبان کے بجائے انہوں نے اردو میں زیادہ لکھا۔ برسہا برس وہ "تعمیر حیات" کے بھی ایڈیٹر رہے۔

اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ۲۰۔ ۲۵ برس بعد مولانا محمد میاں سے ملاقات ہوئی اور خوب کھل کر ملے۔ شام کو ندوہ کے کتب خانہ میں عصرانہ تھا دونوں آدمی ساتھ ہی بیٹھے۔ اس مجلس میں انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ آپ نے ادب کے میدان کا انتخاب صحیح نہیں کیا آپ کو اسلامیات پر اور خاص طور سے کسی ایسے مسئلہ پر اختصاص نظر پیدا کرنی چاہیئے جس سے خدمت اور شہرت دونوں حاصل ہو سکے۔ میں نے

کہا کہ واقعی یہ بات صحیح ہے کہ ادب کا موضوع اتنا وسیع اور اسلامی ذوق کو تسکین دینے والا نہیں جتنا کہ اسلامیات کا میدان ہے، اگر کوئی شخص فطری ادیب ہے تو جس موضوع کو چھوئے گا وہ ادب بن جائے گا۔ چلتے وقت کہنے لگے کہ میرے اس مشورہ کا خیال رکھئے گا۔ میں نے کہا کہ اتفاق دیکھئے کہ میں نے اس بار حدیث پر اسلامک اسٹڈیز میں مقالہ پڑھا ہے۔ اب یہ رجحان انشاء اللہ باقی رہے گا۔ بولے کوئی عصری تقاضوں سے متعلق موضوع اختیار کیجئے۔

یہ آخری ملاقات تھی جو محمد الحسنی سے ہوئی۔ اسی دن میں رات میں مہمان خانہ گیا مجھ کو دیکھتے ہی بولے ٹھہرئے۔ میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گفتگو کرتا رہا وہ اندر کمرہ میں گئے اور وہاں سے ایک دلکش کتاب لاکر دی اور بولے کہ یہ ہدیہ ہے مگر میں نے کہا کہ کتاب کا نام تو البعث سے مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ اس کتاب پر انہوں نے یہ سطریں بطور خلوص و تعلق کے لکھیں:

"هدية الى الأخ الكريم الدكتور احتشام احمد الندوى اعزه الله مع أزكى التحيات و الاشواق۔

محمد الحسنى

۲ ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ

ندوہ کی طالب علمی سے اب تک گوئن روڈ پر جس گھر میں ڈاکٹر عبد العلی رحمہ رہتے تھے اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ، کی لکھنؤ میں قیام گاہ بھی وہی ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ندوہ کی عمارت کا ایک ٹکڑا ہے اس کو دیکھ کر پورا ندوہ مولانا عبد الحی رحمہ سے مولانا محمد الحسنی تک سامنے آجاتا ہے۔

جس زمانہ میں انہوں نے "البعث الاسلامی" نکالا تو اس سلسلہ میں دلی وغیرہ کا سفر بھی کیا میں جامعہ میں طالب علم تھا۔ ایک دن مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی اور مولانا محمد الحسنی صاحب دونوں جامعہ تشریف لائے۔ بڑا لطف آیا میں بھی اس نئے رسالہ کا خریدار بن گیا۔ ہم لوگ جمنا کے خوبصورت پل کو دیکھنے بھی گئے۔

مولانا محمد میاں نے مولانا محمد علی مونگیری کی ایک نہایت عمدہ سوانح عمری لکھی جسے قبول عام حاصل ہوا۔ اگرچہ مولانا شبلی کے بارے میں ان کی تمام آراء سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا مگر جس محنت، خلوص اور

وسعت نظر سے انہوں نے یہ کام کیا ہے وہ اردو کے سوانح نگاروں میں ان کو ایک مقام عطا کرتا ہے۔ میں ایک بار مولانا علی میاں سے ملنے رائے بریلی تکیہ حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ شام کو سیرت مولانا محمد علی مونگیری سنائی جائے گی، سن کر خوشی ہوئی اور خیال ہوا کہ وہ دراصل حضرت مولانا کی جانشینی کے لئے تیار ہو رہے ہیں خود ان کی عربیت کا یہ بھی تقاضہ تھا مگر قدرت کو یہ منظور نہ ہوا۔ اور وہ عین جوانی میں ہم سے اچانک ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

بلا شبہ ہندوستان کی عربی صحافت نگاری میں ان کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ خود اردو میں اسلامی صحافت میں ان کا حصہ ہے جس پر تعمیر حیات کے صفحات شاہد ہیں۔

سچ پوچھئے تو مرحوم کے مرنے کا وقت نہ تھا مگر موت کا کوئی وقت نہیں۔ ۱۹۷۰ء کی ملاقات کے موقع پر میں نے کہا، محمد میاں! ہم لوگوں کے بچے جوان ہو گئے کتنا زمانہ گذر گیا ہم لوگوں کی طالب علمی کو۔ اس پر وہ بولے کہ خود میرا ایک لڑکا بیس برس کا ہے اور ندوہ میں مدرس ہے۔

ایک عرب شاعر نے کہا ہے کہ موتیں اندھی ہوتی ہیں جس کو پا جاتی ہیں دبوچ لیتی ہیں اور جس کو چھوڑ دیتی ہیں اس کو بوڑھا کھوسٹ بنا دیتی ہیں۔

مگر ایک دوسرے شاعر نے بڑی عمدہ تاویل کی ہے اگر چہ دل کا داغ کسی تاویل سے جاتا نہیں۔
(موت کے میدان میں صبر کے سوا چارہ نہیں اس لئے کہ ابدی زندگی کسی کے اختیار میں نہیں)۔

آدمی بلبلا ہے پانی کا   کیا بھروسہ ہے زندگانی کا

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے
غالبؔ

عزیز گرامی مولوی محمدؐ میاںؒ

مولانا محمد عبد السمیع ندوی، معاون ناظر تعمیر و ترقی ندوۃ العلماء

مولانا الحاج ڈاکٹر سید عبد العلیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کے صاحبزادے استاذ محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کے بھتیجے تھے۔ ۱۳، ۱۴ر جون کی درمیانی شب میں مختصر سی علالت کے بعد اللہ کو پیارے ہوئے، راقم سطور سے عمر میں چھوٹے تھے، بچپن بھی دیکھا، جوانی بھی دیکھی۔ سن ۴۲ اور ۴۴ کے درمیان ہی رہا ہوگا، جب کبھی کوئی تحریر ان کے نام لکھنے کی نوبت آئی تو "عزیزی مولوی محمد میاں سلمہٗ" ہی لکھا۔

دینی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی عربی ادب میں امتیاز پیدا کیا، دعوتی فکر و خراج بھی اپنے والد گرامی ہی سے وراثت میں پایا تھا۔ متانت و رزانت، ذہانت و فطانت، سکون و وقار کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ بہی خواہی و سربلندی کی جو فکری آگ ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے سینہ میں بھڑک رہی تھی وہ انھوں نے محمد میاں کے سینہ میں منتقل کردی۔ استاد گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کو مطالعہ، فکر، سوز و ساز اور آفاقیت و گیرائی بخشی، محمد میاں نے اپنی دینی دعوتی زندگی کا آغاز ایک عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے اجراء سے کیا۔ جس کو اندرون ملک اہل علم طبقہ میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے کہیں زیادہ عرب دنیا ان کی تحریروں سے متاثر ہوئی، ان کے مضامین مختلف عربی جرائد میں اہتمام کے ساتھ شائع ہوتے تھے، وہ عالم اسلامی کے دینی، تہذیبی، فکری، اجتماعی کمزوریوں سے واقف تھے، ان کو مشرق وسطیٰ کی سیاست، بے تدبیری بے لگامی، انتشار و افتراق کی تازہ ترین اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ البعث الاسلامی کے ذریعہ وہ ان امراض اور خوفناک صورت حال کی نشاندہی کرتے تھے ان کا اشہب قلم جب رواں ہوتا تھا تو عرب ممالک کے دردمندوں کی آنکھوں سے سیل اشک جاری ہوجاتا تھا، مسلمانوں کے دینی تہذیبی تضاد کی بڑی خوبی سے نشاندہی کرتے تھے مختلف دینی اجتماعات کو بروقت اور مناسب اشارے دیتے تھے ان کے مخاطب عوام ہی نہیں یکساں طور پر وہ امراء و شیوخ، وزراء، زعماء، علماء کو بھی مخاطب کرتے تھے۔

"البعث الاسلامی" کے سرورق کی امتیازی تحریر "شعارنا الوحید الی الاسلام من جدید" ہمیشہ ان کی

شخصیت کا اجمالی تعارف کراتی رہی اور اب ان کی یاد دلاتی رہے گی، خندہ رو، کشادہ جبیں، امر بجا مرنج، "صلاحیت وصالحیت" کا بھرپور نمونہ تھے۔

دین پسند نوجوانوں کی ایک علمی ادبی سوسائٹی بھی قائم کی تھی جس کے ذریعہ نوجوانوں کی علمی، دینی تربیت پیش نظر تھی، اس کی کئی نشستیں ہوئیں، لیکن حالات کی نامساعدت نے اس سوسائٹی کو پنپنے نہ دیا، قریب کے لوگوں کے ذہنوں میں اس سوسائٹی کی یاد ہو تو ہو بیشتر لوگ تو فراموش ہی کر چکے، جوں جوں دن گزرتے گئے محمد میاں کے مشاغل بڑھتے ہی گئے، تعمیر حیات کے اجرار کا منصوبہ بنا تو ادارت کے لیے انہی کا انتخاب ہوا، عربی تحریروں کی طرح اردو تحریر بھی بے حد شگفتہ اور مؤثر ہوتی تھی۔ "تعمیر حیات" کی وجہ سے تعلق میں اضافہ ہوا۔ کوائف دار العلوم کا کالم راقم سطور کے سپرد ہوا، کتابت وطباعت کی مشکلات وپریشانی کی وجہ سے "تعمیر حیات" کے لیے علٰحدہ پریس قائم کرنے کی تجویز سامنے آئی، مرحوم اس پر تیار ہو گئے کہ اپنی زمین فروخت کر کے پریس قائم کریں مشین، جگہ اور آدمی کی تلاش شروع ہوئی خاصی بھاگ دوڑ رہی، لیکن کوئی آدمی ایسا تجربہ کار میسر نہ آسکا جو اس پریس کی پوری پوری ذمہ داری لیتا۔ یوں یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔

استاد گرامی حضرت مولانا زید مجدہ کی کتاب سوانح حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی زیور طبع سے آراستہ ہو کر پہلے ہی آچکی تھی۔ اب حضرت مولانا زید مجدہٗ کو "مولانا محمد علی مونگیری" کے حالات پر کتاب کی تیاری کا خیال پیدا ہوا، یہ کام عزیزی مولوی محمد میاں کے سپرد ہوا، جس کو انھوں نے بڑی دیدہ ریزی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا، اس کتاب کے معًا بعد ہی "تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ" نظر نواز ہوئی۔

ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ اجلاس جب طے پایا تو اس کی تیاریوں کے سلسلہ میں خاصی ہماہمی رہی "ندوۃ العلماء کی اجمالی تاریخ اس کی تحریک وافادیت پر تبصرہ" اس کے کاموں کا جائزہ انہی کے سپرد ہوا، جس کو انھوں نے "روداد چمن" کے عنوان سے پیش کیا بحمد اللہ کہ اس کو بھی قبول عام حاصل ہوا۔

عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمہ پر بھی خاصہ عبور حاصل تھا، حضرت مولانا کی شہرۂ آفاق کتاب "الارکان الاربعۃ" کا انتہائی شگفتہ اور سہل الفہم اردو میں "ارکان اربعہ" کے عنوان سے ترجمہ کیا جس کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہٗ کی عام اور متداول کتاب "فضائل نماز" کا عربی میں "مکانۃ الصلوٰۃ فی الاسلام" کے عنوان سے ترجمہ کیا جو شائع اور مقبول ہوا، سال دو سال کا عرصہ ہوا، حضرت مولانا زید مجدہٗ کی ایک کتاب "السیرۃ النبویۃ" کے نام سے عربی میں دار الشروق جدہ

سے طبع ہو کر آئی جو "فہم ہی مطالعہ اور جدید ترین معلومات" کے لحاظ سے اس فن میں منفرد ہے، اس کا بھی ترجمہ محمد میاں ہی نے کیا۔ چھوٹے موٹے رسائل اور کتابچے اس کے سوا ہیں، جن کا یہاں کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

"الاسلام المستحن" کے عنوان سے مرحوم کے بعض مقالات کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا جس کو عرب ممالک میں بہت پسند کیا گیا۔ اور اس کے کئی ایڈیشن اب تک چھپ چکے ہیں، اور اب حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ کی سوانح کی ترتیب میں مشغول تھے۔

یادوں کے قافلے پرے باندھے کھڑے ہیں کیا لکھا جائے کیا نہ لکھا جائے فیصلہ دشوار۔ مرحوم خلوص و یگانگت کا پیکر تھے ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کے انتقال کے عرصہ کے بعد میری طرف سے آمد و رفت میں کوتاہی محسوس کی تو مجھ سے خوردانہ و مخلصانہ شکوہ کیا اور مجھے اپنے مخلص عزیز کے سامنے حیلہ حوالوں کے باوجود سپر انداز ہونا پڑا اور پھر ملاقاتوں اور نشستوں کا اوسط کچھ بڑھ ہی گیا۔

بڑوں کا اکرام و احترام ان کی شرافت و سعادت کی ایک علامت تھا جس کو انھوں نے کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

اعتماد کی بھی یہ کیفیت تھی کہ "تعمیر حیات" کے لیے کوئی مقالہ یا اداریہ لکھتے تھے تو اکثر و بیشتر مجھ سے کہہ دیتے تھے کہ "آپ بھی دیکھ لیجئے گا، حذف و اضافہ کرنا ہو تو کر دیجئے گا" خوردی و بزرگی سے قطع نظر اپنی تحریروں کے سلسلہ میں میرا خود بھی ان سے یہی معاملہ تھا۔ دس پندرہ یوم پہلے کی بات ہے باہر سے آئی ہوئی ایک تحریر میں نے ان کے حوالے کی، تحریر تو رکھ لی لیکن بعد میں پھر مجھے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ آپ ہی دیکھ لیں مجھے موقع نہیں مل سکا۔

اجتماعی معاشرہ میں کبھی کبھار کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں جن کو اگر سمجھ داری سے حل نہ کیا جائے تو برے اور سنگین نتائج پیدا کرتی ہیں۔ مرحوم نے ہمیشہ حقیقت حال دریافت کرنے میں سبقت کی مجھے ان کی یہ ادا بہت بھاتی تھی کہ حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد وہ ایک طویل "اچھا" کے ساتھ "تو یہ بات تھی" کہہ کر مسکرا دیتے تھے۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب کہ واقعہ پیش آئے چند یوم گزر چکے تھے اور وہ میرے ذہن میں محفوظ بھی نہیں رہا تھا، میرا گوئن روڈ جانا ہوا تو اس طرح انھوں نے میرا خیر مقدم کیا کہ جیسے کئی مہینوں کے بچھڑے مل رہے ہوں اور پھر ایک علحدہ کمرے میں لے گئے، اظہار مسرت کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ "آپ کی فوری تدبیر نے

ایک بڑے فتنہ کو دفن کر دیا" میں سمجھا نہیں، تو انھوں نے مجھے اشارہ دیا اور ساتھ ہی اس کی متوقع سنگینی سے بھی باخبر کیا، چند منٹ تک اس موضوع پر بات ہوتی رہی اس کے بعد "المجالس بالامانۃ" کہہ کر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کانپور نے ایک ماہنامہ کے اجراء کا فیصلہ کیا تو اس کی ادارت کے لیے نظر مولوی محمد میاں ہی پر گئی، لیکن وہ اپنی مشغولیت کی وجہ سے اس کو قبول نہ کر سکے، حال ہی میں ان کا ایک مضمون "دین فطرت" کے عنوان سے ماہنامہ "محکمات" میں شائع ہوا تھا، اس کے لیے یہ پروگرام طے پایا کہ اس میں اضافہ کیا جائے اور پھر اردو، ہندی، انگریزی میں علحدہ علحدہ اس کی اشاعت ہو لیکن افسوس کہ یہ منصوبہ ایک حسرت بن کر رہ گیا۔

شرافت وسعادت، ذوق وطلب، تلاش وجستجو، دین اور اس کی دعوت، دین کی خاطر محنت مشقت، فکر وتردد، دلسوزی واخلاص، وہ کون سا وصف ہے جو "عزیزی محمد میاں" میں نہ تھا، ان کے دوسرے اوصاف وخصوصیات بھی جن تک میری رسائی نہ ہو سکی، لکھنے والے لکھیں گے، بتانے والے بتائیں گے، ان کے چھوٹے اور بڑے ان کے رفقاء کارکوان کی یاد عرصہ تک رلائے گی۔ رب بے نیاز سے دعا ہے کہ اپنے اس نیازمند بندہ کی نیازمندیوں کو قبول فرماکر اپنی رضا ورحمت کے ان پر ڈونگرے برسائے۔ ہمارے ساتھ آپ بھی دعا میں شامل ہوں۔ اللھم اغفرلہ وانزل علیہ شآبیب رحمتك ورضوانك

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے\
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

محمد میاںؒ

شمس الحق ندوی

محمد میاںؒ : یہ نام جب بھی خیال و تصور میں آتا ہے ایک بھولی بھالی اور معصوم سی صورت نگاہوں میں پھرنے لگتی ہے اور دل کو بے چین و بے قرار کرنے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ میں بیگ لیے ہوئے جس میں مضامین کے مسودات و ڈاک بھری ہوئی ہے، اپنی معصوم اداؤں کے ساتھ چلے آرہے ہیں، قریب آجاتے ہیں مسکرا کر سلام کرتے ہیں یا اگر سامنے والے نے سلام میں سبقت کردی تو ہنس کر جواب دیتے ہیں اور بڑے ہی کریمانہ انداز میں پوچھتے ہیں۔

کہیے خیریت ہے ؟ پھر کسی دینی و علمی یا دعوتی موضوع پر بات شروع کر دیتے ہیں اور کچھ نہ کچھ لکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

"محمد میاں" یہ لفظ زمانۂ طالب علمی ہی میں جبکہ ندوۃ العلماء میں پہلے یا دوسرے درجہ کا طالب علم تھا سنا تھا، اس وقت ملنے جلنے اور بات کرنے کی تو کیا جرأت ہوتی اور اس گوہر آبدار کی قدر و قیمت کو تو کیا سمجھتا مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ جب یہ لفظ کانوں میں پڑا ہے اپنے اندر بڑی محبوبیت و پیار لیے ہوئے دل میں سما گیا ہے۔ یہ نام جب بھی میرے سامنے لیا جاتا، ایک ننھے منے معصوم اور پیارے سے بچے کی تصویر نگاہوں میں پھر جاتی جو سب کو پیارا اور سب کو عزیز ہو۔

۱۹۵۵ء میں جب میں دوسرے درجہ میں تھا انھیں کی ادارت میں عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کا اجرا ہوا اس وقت البعث الاسلامی کے مضامین سمجھنے کی صلاحیت تو تھی نہیں مگر الٹ پلٹ کر دیکھ لیا کرتا اور خوش ہوتا کہ ہمارے اساتذہ و بزرگوں کی زیرسرپرستی اس عجمی ملک میں یہ عربی رسالہ نکل رہا ہے وقت کچھ اور گزرا تو ان کے اداریوں کی تعریف سننے لگا تعریف سنتا اور پوچھتا کہ کون صاحب ہیں۔ اتنا تو معلوم تھا کہ ناظم صاحب[1] ندوۃ العلماء کے صاحبزادے اور معتمد[2] تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بھتیجے ہیں مگر صورت آشنا نہ تھا اس وقت تک دارالعلوم میں ان کی آمد بھی بہت کم ہوتی تھی۔ جب میں اپنی رسمی تعلیم کے آخری سال یعنی فضیلت دوم میں پہنچا تو مرحوم کی قائم کی ہوئی انجمن "رابطہ عالم اسلامی" کا کچھ کام میرے اور میرے ایک رفیق درس مولوی رئیس صاحب کے سپرد ہوا۔ اس وقت سے اُن کے ساتھ بیٹھنے، ملنے جلنے اور قریب سے دیکھنے کا کچھ موقع ملا۔ اب میں ان کے اداریوں کو بھی سمجھنے لگا تھا لہذا وہ محبت و عقیدت، جو

---

[1] ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ [2] حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ

بے دیکھے دبے مجھے دل میں سمائی ہوئی تھی اور بڑھی اور بڑھتی ہی گئی۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد کوئی ڈیڑھ دو سال تک میں نے دارالعلوم کے مکتبہ کو منظم کرنے اور اس کی دیکھ بھال کا کام کیا۔ اسی دوران مولانا مرحوم کی پہلی کتاب "سیرت مولانا محمد علی مونگیری" بانی ندوۃ العلماء مکتبہ سے شائع ہوئی اور پروف ریڈنگ کا کام میں نے کیا۔ کتاب کی طباعت کے دوران بار بار ملنا ہوتا۔ پروف پڑھنے میں بھی بعض بعض مقامات پر بڑا لطف آتا اور اس کا ان سے ذکر بھی کر دیتا۔ جیوں جیوں قرب بڑھتا گیا ان کی خوش خلقی محبّت و شفقت دین کی فکر اور اس کی دعوت کی لگن دل میں گھر کرتی چلی گئی۔ زیادہ قریب ہوا تو کچھ لکھنے کی تلقین کرنے لگے۔ جب کچھ لکھ کر دکھایا تو ایسی ہمت افزائی فرمائی جیسے اپنے بچے یا عزیز خاص کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ یہ ان کے اخلاص وللّہیت کی دلیل تھی۔ انھیں کی ہمّت افزائی سے دل بڑھا اور میں نے ان کے عم معظم حضرت مولانا علی میاں (جن کو وہ بڑی محبّت سے چچا میاں کہتے تھے) کی دلچسپ و فکر انگیز و پُر از معلومات کتاب "مذکرات سائح فی الشرق الاوسط" کا ترجمہ کر ڈالا اور شرق اوسط کی ڈائری کے نام سے تقریباً سوا چار سو صفحات کی کتاب شائع ہوگئی۔ انھیں کی ہمت افزائی سے حضرت مولانا کی اُردو کتاب "مذہب و تمدن" کا عربی ترجمہ بھی کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی ہی میں دونوں کتابیں شائع کرا دیں۔ جو کچھ بھی لکھتا ان کو ضرور دکھا لیتا پھر شائع کرنے کے لیے دیتا۔ وہ ایک خاموش استاد و مربّی تھے شہرت و ناموری کے جذبات سے دور اپنے رب کی رضا و خوشنودی کے جذبات سے مسحور و مخمور جب حضرت مولانا مدظلہ کی کسی چیز کا ترجمہ کرتا اور کہتا کہ مولانا آپ تو بہت ہی مشغول ہیں، اس پر ایک نظر ڈال لیں تو میری گزارش پر فرماتے کہ ہزار مشغول رہوں لیکن چچا میاں کی کوئی چیز ہو تو بے تکلف دیکھوں گا۔ آپ کبھی اس میں تکلف نہ کریں حضرت مولانا کی تقریباً تمام عربی کتابوں کا ترجمہ انھیں کے قلم سے بالکل حضرت مولانا ہی کے اسلوب میں ہوا ہے۔ وہ میرے استاذ و مربّی تھے مگر معاملہ دوستوں کا سا کرتے تھے۔ جب بھی گوئن روڈ جانا ہوتا اور کوئی بھیڑ بھاڑ کی مجلس نہ ہوتی تو ہوٹل ضرور لے جاتے اور پُر تکلف ناشتہ کراتے۔

اور جب بھی کسی اور کی ضیافت میں چائے یا ناشتہ ہوتا تو چاہے وہ ذوق کے مطابق نہ ہو مگر اس کا ذرا بھی احساس نہ ہونے دیتے، بلکہ خوب خوب تعریف کرتے۔ کبھی کبھی تو کئی کئی دن گزر جانے کے بعد بھی اس کا ذکر چھیڑتے اور تعریف کرتے۔ لکھنے والے ان پر مضامین لکھیں گے اور ان کے جاندار مضامین کی خوب داد دیں گے اور انھیں داد دینا بھی چاہیے۔ وہ لکھتے ہی ایسا تھے جو دل کے پار ہو اور آنکھوں کو اشکبار کر دے۔

مگر اس کے باوجود کانوں نے کبھی یہ نہ سنا کہ وہ خود اپنے مضمون کی تعریف کر رہے ہوں، ایسی تعریفیں جس میں

خود نمائی کا جذبہ کام کر رہا ہو۔ بعض وقت بے تکلف مجلس ہوتی باتیں ادھر ادھر کی چل نکلتیں جن میں اکثر بے احتیاطی ہو جاتی ہے اور لوگ غیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں مگر مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کبھی کسی کی غیبت کی ہو حتیٰ کہ جب کبھی کسی کے خلاف مضمون لکھتے اور تنقید کرتے تو تحقیر و تذلیل کا اسلوب اپنانے سے دور بہت دور رہتے۔

لکھنے میں خواہ عربی ہو یا اُردو (اپنے چچا میاں کو چھوڑ کر) وہ اپنی مثال آپ تھے۔ اس کے برعکس خطابت و تقریر سے مناسبت نہ تھی حتیٰ کہ طلبہ کے بھی کسی جلسہ کی صدارت کرنی ہو تو اس کو بھی نہیں قبول فرماتے تھے باہر سے دعوت نامے آتے مگر اکثر اُن سے بھی کتراجاتے۔ اکثر کیا بلکہ صرف ایک "ندوۃ الشباب العالمی الاسلامی" کے جلسۂ ریاض میں شریک ہوئے، باقی اور کسی کانفرنس میں نہیں شریک ہوئے۔ خود کو تقریر سے مناسبت نہ تھی مگر یہ آرزو و تمنا رکھتے تھے کہ ان کے بڑے صاحبزادے عبداللہ سلّمۂ تقریر و خطابت کی مشق کریں۔ کئی بار فرمایا تم ان کی ہمت افزائی کرو اور کہو کہ تقریر کی مشق کریں۔ عبداللہ سلّمہٗ ماشاءاللہ دو سال قبل ندوۃ العلماء سے فارغ ہوئے۔ اب تک تکمیل کے طالب علم تھے۔ اس عرصہ میں عربی لکھنے اور بولنے اور تقریر کی بھی مشق کر لی ہے۔ اس کمسنی میں ماشاءاللہ ایک عربی کتاب کے مصنف بھی ہو چکے ہیں، امید ہے کہ باپ دادا کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔

عمر ۴۴ سال تھی چار بچوں کے باپ ہونے کے باوجود[1] سب کو اتنے پیارے تھے کہ اب بھی جب محمد میاں یہ آواز کانوں میں پڑتی تو ننھے منے معصوم سے بچے کا تصور ہوتا چہرے مہرے اور اداؤں سے بھی معصومیت ٹپکتی تھی۔

یہ شعر کئی بار پڑھا تھا اور غالباً حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہٗ نے کسی ایسے ہی موقع پر لکھا ہے مگر اس کی حقیقت کا اندازہ اب جاکے ہوا جب خیال آتا ہے دل دھڑک اٹھتا ہے، ہوش گم سم سا ہو جاتا ہے اور بے اختیار زبان پر یہ شعر آجاتا ہے۔

شعر
جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آئے　　　اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آئے

کسے خبر تھی کہ گلدستہ کا سب سے حسین پھول عین اپنی رونق و جمال کے وقت توڑ لیا جائے گا۔ جذبات محبت کو یقین اب بھی نہیں آتا اور رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ کہیں تنہائی میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں یا ہنستے مسکراتے چلے آرہے ہیں مگر عقل سمجھاتی ہے کہ نہیں اب وہ ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔

---

[1] تین صاحب زادے باحیات ہیں۔ ایک بچی کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔

ان کے کن کن حالات و کن کن خوبیوں کو بیان کیا جائے وہ علمی دنیا کے ایک مردِ مجاہد تھے "البعث الاسلامی" کے اداریے عرب دنیا میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے اور نوجوانوں کے ذہن و فکر پر بڑے اثرانداز ہوتے ابھی ڈیڑھ سال قبل آپ کی عربی کتاب "الاسلام الممتحن" مصر سے شائع ہوئی ہے، کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور چند مہینوں میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ لکھنے کا اسلوب و انداز ایسا ہوتا کہ سخت سے سخت بات بھی بغیر کسی دل آزاری کے نہایت لطیف انداز میں لکھ جاتے۔

کتنی شیرینی تھی اسلوب تحریر میں دل کتنا کھینچتے تھے اور لپکتے تھے ان تحریروں کو پڑھنے کے لیے ڈر تھا کہ

ع نظر لگے نہ کہیں ترے دست و بازو کو

یہ ڈر و اندیشہ اب حقیقت سا بن گیا۔ حکم خداوندی تو اپنے وقت ہی پر نافذ ہوتا ہے، مگر ضعیف البیان انسان کے دل میں خیال و گمان کا آنا جانا تو اس کی فطرت ہے اسے کیسے بدلا جا سکتا ہے۔ البعث کے اداریوں کو پڑھ کر کتنے عربوں نے اپنے دامن تر کر لیے کتنے نوجوانوں کے دل کی دنیا بدل گئی۔

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا   تمھیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

دل میں عالم اسلام کا کتنا درد تھا اس کی اصلاح کے لیے انھوں نے کیسے کیسے مضامین لکھے اس کا اندازہ ان کے مضامین کے مطالعہ ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

ان کے دل میں اسلام و مسلمانوں کا درد و سوز تھا۔ ہر وقت اسی موضوع پر سوچتے رہتے اکثر باتیں کرتے کہ دارالعلوم کے طلبہ میں دینی علمی ذوق کیسے پیدا کیا جائے، ان کے اندر خود اعتمادی و خودداری پیدا کرنے کے کیا کیا طریقے اپنائے جائیں۔ ظاہری و رسمی طور پر طلبہ سے ان کا تعلق نہ تھا، مگر اس موضوع پر اکثر باتیں کرتے اور قیمتی مشورے دیتے اور ایسا کیوں نہ ہوتا جس خانوادہ کے وہ چشم و چراغ تھے جس ماحول میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں وہاں دن رات اسی کے چرچے تھے۔ انھوں نے اس کو اخذ کیا بلکہ جذب کر لیا اور یہی سوغات دوسروں میں تقسیم کرنے لگے۔ ان کے اوصاف و کمالات کا نقشہ کھینچنا چاہوں اور ناز و انداز کی تصویر کشی کرنا چاہوں تو اس کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ اس موقع پر انھیں کے لکھے ہوئے ایک شعر کا سہارا لیتا ہوں جو انھوں نے اپنے جد امجد حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کے حالات میں لکھے تھے۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

آہ جس وقت میں نے تذکرۂ شاہ علم اللہ پڑھا تھا، اس تصنیف اور خاص کر اس شعر پر مرحوم (مرحوم لکھتے ہوئے دل تڑپ اٹھتا ہے اور قلم رک جاتا ہے) کو بڑی داد دی تھی کیا خبر تھی کہ یہی شعر میں ان کے لیے لکھوں گا۔

محمد میاں قریب صبح نمودار ہونے والے ستارہ کی مانند تھے جو ہوتا تو ہے بڑا روشن مگر عمر بہت تھوڑی پاتا ہے۔ محمد میاں خاموش طبیعت تھے خاموشی ہی کے ساتھ بے سان وگمان سب کو حیران وملول خاطر چھوڑ کر چلے بھی گئے، گو وہ کم سخن تھے لیکن ان کی ذات سے چمن ندوہ کی کتنی انجمنیں زندہ تھیں۔

محمد میاں اپنے سارے کمالات وخداداد صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ زندہ دل وظریف بھی تھے۔ دوستوں وبے تکلف احباب کی مجلس ہوتی تو بڑا ظریفانہ مگر شریفانہ مذاق کرتے اور کبھی کبھی مذاق ومزاح ہی کے انداز میں دعوت فکر وعمل دیتے۔ محمد میاں اب ہم میں نہیں رہے مگر یادوں کی ایک سنہری داستان چھوڑ گئے

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
وہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

محمد میاںؒ نے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ زندہ ہیں زندہ رہیں گے وہ نقوش یادوں کے پردے پر اس طرح دیتے ابھرتے رہتے ہیں جس طرح آسمان پر ستاروں کی تنک تابی مگر اس انسانی فطرت وشعور کو کیا کیجیے کہ محمد میاںؒ نہیں ہیں تو ہر مجلس سونی سونی سی معلوم ہوتی ہے اور ان کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔

محمد میاںؒ ہم سے دور ہو گئے مگر اب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں میں ہیں اور کہیں سے چلے آرہے ہیں

یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں
یہ آرہے ہیں وہ جارہے ہیں

محمد الحسنیؒ اور عربی صحافت

(محمود الازہار ندوی)

ندوۃ العلماء کے بانیوں نے عربی زبان کی اہمیت کو محسوس کیا اور یہ یقین کہ قرآن وحدیث کی زبان اور اس کی اصل روح سے واقفیت اسی وقت ممکن ہے جب زبان کے اصل ماخذ تک رسائی ہو، اس کے لئے ایسا نصاب تعلیم مرتب کیا جو ہندوستان کے ماحول اور طرز تعلیم کے مطابق ہو اور ایسی کتابیں مرتب کروائیں جن کے ذریعہ طلبہ میں صحیح علمی وتحقیقی ذوق کے ساتھ عربی میں تحریر وتقریر دونوں پر قدرت ہو اور وہ اپنے مافی الضمیر کو بغیر کسی تردد کے ادا کرسکیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے دور معتمدی میں طلبہ میں صحیح علمی وتحقیقی ذوق پیدا کرنے اور ندوہ کی خصوصیات کو زندہ کرنے کی جو سرگرم کوششیں کیں ان میں ایک عربی ماہنامہ "الضیاء" کا اجرا بھی تھا، جس کو ندوہ ہی کے ایک مایہ ناز فرزند مولانا مسعود عالم ندوی مرتب کرتے تھے۔ مگر نامساعد حالات کی وجہ سے اس کی عمر طویل نہ ہوسکی، اور جلد بند کردینا پڑا اس کے بعد عربی زبان کی ترویج وتشویق اور تقریر وتحریر کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے ایسا لٹریچر نہ تھا، جو طلبا کی رہنمائی کے لئے پیش کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ نے اپنے دور نظامت میں عربی نثر میں جہاں عربی کی پہلی کتاب سے لیکر آخری کتاب تک مکمل نصاب تیار کروایا، وہیں ایک عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے نام سے جاری کروایا، ابتداءً یہ رسالہ ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے لخت جگر محمد الحسنیؒ کے عربی ذوق کو پروان چڑھانے کے لئے جاری کیا تھا اور لیتھو پر چھپا تھا، مگر بعد میں اس کو ٹائپ کے اعلیٰ حروف جو اس وقت ہندوستان میں دستیاب ہوسکتے تھے منگوائے گئے اور "البعث" ٹائپ کے خوبصورت حروف میں شائع ہونے لگا، یہ کام ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی میں ہوچکا تھا اس وقت سے "البعث الاسلامی" ندوہ کے افکار وخیالات کا ترجمان رہا، اس نے اپنی آواز کو عالم عربی واسلامی کے دور دراز علاقوں تک پہونچایا اور مولانا محمد الحسنیؒ نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس کو عالم عربی کے چوٹی کے رسالوں کا ہم پایہ بنادیا۔

مولانا محمد الحسنی نے یہ کام اس وقت کیا جب ہندستان میں سرکاری خبرناموں کے علاوہ عربی ماہنامے کا بالکل وجود تک نہ تھا، اور ہندوستان سے جتنے اخبارات اور رسائل اس وقت شائع ہو رہے ہیں وہ سب اسی مجلّہ کی دین ہے اس کے بعد ہندوستان سے متعدد رسائل شائع ہوئے مگر وسائل کی کمی اور تنگیٔ دامانی کی وجہ سے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

مولانا محمد الحسنی ایک عربی صحافی کی حیثیت ہی سے تسلیم نہیں کئے گئے بلکہ انہوں نے ہندوستان میں عربی صحافت یا برصغیر میں عربی صحافت کو عوام کے ذہنوں سے قریب اور رابطہ کی زبان بنانے میں نمایاں حصہ لیا، انہوں نے "البعث الاسلامی" میں اپنے افتتاحیئے کے ذریعہ ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور زبان کی رعنائیوں، اور لطافتوں کے ساتھ ان کا حق ادا کیا اور اہل زبان سے اپنی عربی صحافت کا لوہا منوایا۔

مولانا محمد الحسنیؒ نے اپنے جوش ایمانی اور غیرت اسلامی اور طرز تحریر کی وجہ سے بہت جلد عربی صحافت میں اپنا مقام بنالیا۔ ان کے لکھے ہوئے مضامین جو بعد میں کتابی شکل میں آگئے اور وہ جو کتابی مجموعوں میں نہ آسکے وہ سب ان کی غیرت ایمانی کے ساتھ ساتھ ذوق لطیف، فکر سلیم اور قلم گربار کی زندہ جاوید تصویر ہیں۔ انہوں نے اپنے عربی رسالے میں علم و معرفت، زبان و ادب اور دعوت اسلام، غرض ہر موضوع پر قلم اٹھایا، کمیونسٹوں کے خلاف مستقل جہاد کرتے رہے اور جدید عرب مفکرین کی زبان درازیوں کا خیالی محل مسمار کیا۔

"البعث الاسلامی" پابندی کے ساتھ پچیس سال تک ان کی ادارت میں نکلتا رہا، اس میں علمی و تحقیقی مقالے، جدید مضامین کی بروقت اشاعت نے اپنا حق ادا کیا، قذافی کی لن ترانیاں ہوں کہ انور سادات کا معرکہ عبور نہر سویز ہو، سفر یروشلم جیسے خالص سیاسی موضوعات ان کے قلم سے بچ نہ سکے ان مضامین میں بھی غیور مومن کی شان نظر آتی ہے،

انہوں نے "البعث الاسلامی" میں اپنے افتتاحی کلمات میں صحیح رائے بھی دی اور اسلامی ذہن کی ترجمانی بھی کی۔ سب سے پہلے "العالم الاسلامی علیٰ مفترق الطرق" (عالم اسلامی چوراہے پر) پر لکھا اور اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اور اس کو ممتاز عربی رسائل نے اپنے پرچے میں نقل بھی کیا اور خراج تحسین حاصل کیا۔ "اسلام المسالمین" لکھ کر اسلام کو جدید ذہن کے مطابق کرنے والوں پر سخت تنقید کی۔ "طبیعة هذا الدین" (اس دین کی روح) لکھا اور ۱۹۵۵ء میں منعقد اسلامی کانفرنس کو خوش آمدید کہا، مغربی

تہذیب کی یلغار اور اس کے سامنے احساس کمتری میں مبتلا ہونے والوں کو متنبہ کیا، سانحہ بنگلہ دیش کے وقت زبانی عصبیت پر سخت تنقید کی اور خبردار کیا کہ کس طرح ایک قوم زبانی عصبیت کی وجہ سے ذلیل وخوار ہوئی، اور "پیغام محبت" کے ذریعہ دین و دنیا اور منزل وراہ میں فرق واضح کیا اور جدید کھوکھلی تہذیب کو بے دل انسان سے تشبیہ دی اور انسان اور اللہ کے بنائے ہوئے سیاروں میں فرق دکھایا، جس میں بادی النظر کوئی فرق نہیں ہے لیکن درحقیقت دونوں میں بڑا فرق ہے اسلام کو دین ہی نہیں بلکہ ایک زندہ جاوید تہذیب تغیرات زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ اور رہنمائی کرنے والا بناکر پیش کیا، اور مغربی تہذیب کا جس انداز سے جائزہ لیا وہ قابل التفات ہے، اور اسلامی سوسائٹی کے پیمانہ پیش کئے، سید قطب کی شہادت پر جس انداز سے قلم اٹھایا وہ مومن ہی کی آواز ہو سکتی ہے اور اس کا بدلہ جنت ہے۔ مصطفی سباعی پر قلم اٹھایا، ایک ستارہ چمکا اور گر گیا، قوموں کے عروج پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھا، دولت کے بل بوتے پر قومیں جاوداں نہیں رہتی ہیں بلکہ وہی قوم زندہ رہتی ہے جو داعی ہو، امریکی تہذیب کی تصویر کشی کرتے ہوئے تحریر فرمایا، چاہا جنت ملی جہنم اور اسلام کو ماوراء الاصلاح قرار دیا، جدید مفکرین پر سخت تنقید کی۔ ادب وجودی اور جان پال سارتر کے فکری کھوکھلے پن کو پیش کیا اور اس کے طلسم کو توڑ دیا، تعمیر انسانی افضل ہے یا تعمیرات اور تعمیر مستقبل پر اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا، دور حاضر کی تعمیر میں ہم کیا کردار ادا کرسکتے ہیں؟ حکومت کے لئے اسلامی اصول، اسلامی نظام اور تخیلات کے آئینے پیش کئے، عالم اسلامی اپنی شخصیت کی تلاش میں، جنگ رمضان سے پہلا سبق، جنگ جون اور جنگ رمضان کے مابین دینی اور غیر روحانی جذبات کارفرما تھے، کو واضح طور پر پیش کیا، حسن البنا، تاریخ کے دریچہ میں، اس کے علاوہ مستقل طور سے "الرائد" میں "اضواء" "مع الحقیقة" اور "اضواء علی الطریق" کے عنوان سے اپنے مختصر مگر جامع کلمات پیش کرتے رہے، البعث الاسلامی میں "صور واوضاع" کے عنوان سے اپنے فکری خیالات وتعلیقات تحریر کرتے رہتے تھے۔

مولانا محمد الحسنیؒ کی صحافتی زندگی محدود بھی تھی وسیع اور عام بھی، ان کے اداریئے مفید بھی تھے اور قابل قدر بھی، اسلام پسندوں کے لئے رشد وہدایت بھی دشمنوں کے لئے تیشہ وتازیانہ بھی تھے ــــ منزل بھی تھے، راہ بھی تھے، اور زاد راہ بھی، عقل سلیم کے لئے درس عبرت اور قلب حساس کے لئے پند ونصیحت تھے، ان کے کلمات میں تبرک وتہنیت، عزت وافتخار، شوق ووارفتگی بھی، شکر وامتنان، عنایت والتفات بھی تھی اور زبان کی چاشنی وحلاوت بھی، زبان سلیس وسلیم اور سبک ملے گی، اس میں غور وفکر بھی ملے گا اور دعوت

الی اللہ بھی۔

ان کی نظر دور رس، خیالات عمیق، اور دل نباض تھا، پاکیزہ معاشرہ کے لئے صالح و پاکیزہ خاندان کی تشکیل اور ظاہر سے زیادہ باطن کی اصلاح ضروری سمجھتے تھے وہ لکھتے ہیں:۔

"خارجی دنیا کبھی نہیں بدلا کرتی، پہلے خیالات بدلتے ہیں، عقیدہ بدلتا ہے پھر اس تبدیلی کے نتائج زندگی کے پردے پر ظاہر ہوتے ہیں" ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم"

ان کے کلمات میں سوز دروں اور جذب اندروں ملے گا۔ زور تحریر، جوش بیان بھی عربی انشاء پردازی پر قدرت اور اہم موضوعات پر قلم برداشتہ و برجستہ لکھنے کی صلاحیت، تحریر کی تاثیر و دل آویزی اور حلاوت زبان و طلاقت بیان، قلم کی روانی، زبان و ادب کی ہم زبانی، خلوص و صداقت کی فراوانی، علم و معلومات وثائق و شواہد ملے گا، الفاظ کی جادوگری، تلواروں کی کاٹ، سیلابوں کی طغیانی، قوموں کے شعور کی نشأۃ دماغوں اور دلوں کی تطہیر اور حیات نو، احساس کمتری کا ازالہ، کھوئے ہوئے اعتماد کی بحالی ملے گی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ فلسفہ کہ زمانہ بدل چکا ہے، زندگی بدل چکی ہے چنانچہ ہم بھی اپنا طرز معیشت بدلیں تاکہ ہم اس ترقی کا پورے طور پر ساتھ دے سکیں اور قافلہ حیات سے نہ بچھڑیں ایک بے معنی اور کھوکھلا فلسفہ ہے اس کا عالم حقائق سے کوئی تعلق نہیں یہ بالکل بے بنیاد بات ہے جس کی کوئی اصل نہیں اور دعویٰ بلا دلیل ہے اور یہ صرف اسی دلکش اور ملمع شدہ زندگی کا دھوکا اور فریب ہے جس کو قرآن نے معجزانہ طور پر صرف ایک کلمہ "ولو اعجبتکم" کے اندر کتنی خوبصورتی سے بیان کر دیا۔"

اسلام ایک آفاقی مذہب ہے، دین فطرت ہے، مذہب خاص و عام ہے، مذہب عقل و فکر ہے، وہ تحریر کرتے ہیں:۔

"اسلام کلمۂ حق ہے، اسلام کلمۂ نصیحت ہے، اس وقت دونوں کے ہاتھ مساوی اور میزان متوازن ہو جاتا ہے، وہ مذہب عوام ہے مذہب حکمراں ہے اور کیا ہی خوب جو دونوں اس کو قبول کر لیں وہ مذہب فطرت ہے وہ مذہب علوم ہے وہ ظاہر و پاکیزہ ربانیت کا مذہب ہے وہ شنیدنی و فرمانبرداری کا مذہب ہے وہ مذہب فکر و عقل ہوشمند ہے وہ

ایمان راسخ کا مذہب ہے وہ فہم عمیق کا مذہب ہے، وہ ان لوگوں کا مذہب ہے، جن کے بارے میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، دل کے صاف، علم میں گہرے اور بہت کم تکلف کرنے والے ہیں، اگر یہ محاسن مناسب انداز میں مومن میں یکجا ہو جائیں تو کیا ہی بہتر ہے۔"

ایک دوسری جگہ رقم طراز ہیں:۔

"مسئلہ فضائل، صفات اور اعلیٰ ترین قدروں کا نہیں ہے یہاں تو معاملہ عقیدہ کا ہے، رسالت کا ہے، دعوت الی اللہ کا ہے، منزل کا ہے، اور اسلام ہی وہ بنیاد ہے جس کا قیام عقیدہ اور رسالت پر ہے اور اسی کی اس نے دعوت بھی دی ہے، اسی نے عربوں کو خاص طور سے اور عالم انسانی کو عام طور سے اس جانب رہنمائی کی اور دائمی معلومات فراہم کی، وہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر اختلاف زمان ومکان اور اختلاف شہر و ملک اور مطالبات وضروریات میں فرق کے باوجود وہ ایک مکمل دستور رہتا ہے۔"

وہ اپنی تحریروں میں ایمان پر بہت زور دیتے تھے اور لکھتے ہیں:۔

"آج ہمیں سد ایمانی کی ضرورت ہے جس کا مسالہ اینٹ، پتھر اور فولاد نہیں بلکہ تعلیم وتربیت ہے سینما، ریڈیو، ٹیلیویژن اور صحافت کو اخلاقی تخریب، اخلاقی زوال اور وقتی لذت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اخلاقی وتعمیری ذمہ داری کا احساس دلانے، مقابلہ کی طاقت پیدا کرنے اور کردار کی مضبوطی کا ذریعہ بنانا ہے۔"

حاصل کلام یہ ہے کہ ان کے کلمات میں ہر چیز ملے گی، ہندوستان کی عربی صحافت کی نمائندگی، عالم اسلام کے لئے جرأت وبے باکی، اصلاحی تحریک کے لئے زمین کی ہمواری اور احیاء وترقی کے لئے راہ بنانا اور دعوت غور وفکر اور اسلامی تفکر کے لئے نئے گوشے اور اس میدان میں کام کرنے کی جدید معلومات۔ ان کا قلم آبشار تھا، جو چٹانوں سے ٹکراتا اور بڑے جوش وشور میں طغیانی کی طرح گذرتا اور افسردہ جذبات کو حیات نو بخشتا۔ قیادت کے لئے انقلاب انگیز مشعل دیتا صاحب قلم کو نیا اسلوب نگارش کا نمونہ پیش کرتا، اہل فکر وعقل کو روشنی وتابناکی دیتا اور دینی واسلامی شعور کا احیاء کرنا۔

محمد الحسنی ندوی مرحوم

(منصور نعمانی ندوی)

۱۴ جون کی صبح دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں طلبہ کی انجمن "حزب الطلبہ" کا سالانہ انعامی مقابلہ تھا، راقم بھی اس جلسہ میں مدعو تھا۔ اس جلسہ کی صدارت امیر دارالعلوم مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری کرنے والے تھے، صبح ۸ بجے مولانا کی قیام گاہ "غریب خانہ" فون کیا گیا تو موصوف نے گلوگیر آواز میں محمد میاں کے انتقال کی دلخراش خبر سنائی، مولانا مدظلہ، اور ندوی برادری اس خبر سے خوش تھی کہ ۱۵ جون کی صبح مولانا علی میاں مدظلہ، دو دن کے لئے بھوپال آنے والے تھے، مگر اس ہوشربا خبر نے علی میاں کا پروگرام بدل دیا اور وہ بمبئی سے سیدھے ہوائی جہاز کے ذریعہ دہلی روانہ ہو گئے، مولانا مدظلہ، نے جب یہ خبر سنی تو سکتہ طاری ہو گیا اور جلسہ کی صدارت سے معذوری ظاہر کر دی، طلبہ و اساتذہ نے اصرار کیا کہ تعزیتی جلسہ میں آپ شرکت کیجئے، مولانا اس میں شرکت کے لئے دارالعلوم آئے، مولانا نے محمد میاں کی جواں مرگی اور صالحیت کی تعریف کی، اور اس کم عمری میں ان کی دینی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا، انہوں نے عالم اسلام میں اسلامی مزاج، اسلامی کردار اور اسلامی صحافت کی جو نمایاں خدمات انجام دیں اس کا خاص طور پر تذکرہ کیا، تقریر کے دوران ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سلسلہ رواں رہا، بہ مشکل ۵ منٹ تقریر کی اور دعاء مغفرت و تعزیتی تجویز پر جلسہ اختتام پذیر ہوا،

راقم الحروف ندوہ میں تعلیم کے لئے گیا تو محمد میاں کا عرصہ تک نام سنتا رہا، اس زمانہ میں وہ ندوہ کم آتے لوگوں سے ملاقات ان کے لئے سب سے مشکل کام تھا، عرصہ اسی میں گذر گیا، لوگوں سے پوچھتا رہا کہ محمد میاں کون ہیں؟ ایک دن اتفاق سے البعث الاسلامی کے دفتر میں ان کے دید سے شادکام ہوا، ملاقات تو عرصہ بعد ہوئی۔ اسی زمانہ میں ندوہ کے "ترجمان" "تعمیر حیات" کے نکلنے کا فیصلہ کیا گیا، اسکی ادارت کے لئے نظر انتخاب محمد میاں پر پڑی۔ مجھے قیام ندوہ کے زمانہ میں مضمون نگاری کا شوق ہوا۔

چنانچہ تعمیر حیات کے لئے مضمون لے کر ان کی خدمت میں پہونچا تو انہوں نے زیر لب تبسم کے ساتھ اس کو رکھ لیا۔ میں نے کہا اس میں حذف و اضافہ کر دیجئے گا، دوسرے دن پہونچا تو کہا آپ کا مضمون آرہا ہے۔ جب مضمون شائع ہوا تو اس میں حذف و اضافہ مطلق نہ تھا۔ اس سے مجھے حوصلہ ملا اور میں برابر تعمیر حیات میں لکھتا رہا، مرحوم ان لوگوں میں تھے جو مضمون نگاروں کے مندرجات و آراء سے اگرچہ متفق نہ ہوتے تھے، لیکن مضمون نگار کے خیالات و الفاظ میں رد و بدل وہ عیب سمجھتے تھے، جب کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ مدیران رسائل و جرائد غیر ضروری حذف و اضافہ ہی کو اپنی کارکردگی یا صحافتی ذمہ داری خیال کرتے ہیں مگر مولانا محمد میاں جو ایک با اختیار ایڈیٹر تھے اس کو بے اصولی سے تعبیر کرتے، ان کا یہ اختیار ان کے ظرف کا پتہ دیتا ہے،

محمد میاں اس خانوادۂ فضل و کمال کے چشم و چراغ تھے جس نے ایمان و یقین، تزکیۂ باطن، اصلاح معاشرہ، تبلیغ و جہاد، اخلاق و انسانیت اور علم و ادب کے میدان میں وسیع و ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، ابتداء میں ان کی تعلیم و تربیت ان کے فرشتہ صفت والد مولانا ڈاکٹر عبد العلی حسنی مرحوم کے زیر سایہ ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے عم مکرم مولانا علی میاں مدظلہ، مربی و سرپرست ہوئے، یہ ان میں صلاحیت و صالحیت ابھارنے کا غیبی انتظام تھا، مولانا موصوف کی مثالی تربیت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے عالم اسلام کی دکھتی رگوں کو ٹٹولا، اور اس کے جسد بے روح میں ایک نئی روح پھونک دی، حق و صداقت کی بات ادا کرنے میں ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ دیا اور ایک چوتھائی صدی تک عربی صحافت پر چھائے رہے اور اپنی فکر انگیز تحریروں سے گہرے نقوش ثبت کرتے رہے۔ انہوں نے مغربی تہذیب قومیت، وطنیت اور اشتراکیت کے دلفریب نعروں پر کاری ضربیں لگائیں، اور البعث الاسلامی کے صفحات پر ان زخموں کی نمائش کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کو اس کے اصل منصب و ذمہ داری سے آگاہ کرنے کا فریضہ انجام دیتے رہے،

ان کا طرز تحریر البیلا تھا، بے باکی و بے خوفی اس پر مستزاد، جس زمانہ میں اخبارات و رسائل جمال عبد الناصر کی شان میں قصائد پڑھ رہے تھے، اس وقت ان کا قلم اخوانیوں پر مظالم کی خونچکاں داستان تحریر کیا کرتا تھا، اس برق و باراں کی جمالی حکومت کو کہاں تاب تھی۔ اسی جرم میں البعث الاسلامی پر مصر میں پابندی

عائد کی گئی، ان کی دلگداز تحریروں سے عالم اسلام حرکت میں آرہا تھا، انہوں نے عرب سربراہوں کی اسلام دشمن پالیسیوں اور لن ترانیوں پر بار بار البعث کے صفحات پر خون کے آنسو بہائے اور جس صاف وکھرے انداز میں باتیں بار بار رقم کی ہیں وہ ان کی جرأت ایمانی، ایمانی بصیرت، لذت کردار اور جرأت اندیشہ کی آئینہ دار ہیں، ابھی حال ہی میں ہندوستانی مسلمانوں نے جس بے ضمیری، بے حسی وبے دانشی کا ثبوت دیا اور مسٹر بھٹو کے سلسلہ میں مغربی طاقتوں کے اشاروں پر جو طوفان بدتمیزی کھڑا ہوا اس پر بھی ان کا شعلہ بار قلم اٹھا اور اس جذباتی بہاؤ پر انہوں نے ماتم کیا، واقعہ یہ ہے کہ باطل تحریکات کا مقابلہ وہ جس بے جگری سے کرتے تھے وہ انہی کا حصہ تھا ؎

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

وہ اسٹیج اور تقریر کے آدمی نہ تھے، گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر قرطاس وقلم سے خدمت کو انہوں نے وظیفۂ حیات بنالیا تھا مگر ایسا نہیں ہے کہ وہ ملی مسائل وضروریات سے باخبر نہ تھے۔ مسلم مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لا، فسادات، اردو، علی گڈھ، اور دیگر مسائل پر بھی انہوں نے اپنے پرزور اداریوں سے شرکت کی، اتحاد واتفاق برقرار رہنے کے لئے صائب مشورے دیے اور انتشار ومنافقت پرول کے پھپھولے پھوڑے۔ اس کے لئے انہوں نے تعمیر حیات کو اختیار کیا اور ۱۵ سال تک بڑی کامیابی کے ساتھ اس کی ادارت کرتے رہے۔ ان میں کام کرنے کی اسپرٹ غضب کی تھی، عربی واردو پرچوں کی بیک وقت ذمہ داری کے ساتھ اپنے چچا کی عربی کتابوں کے ترجمے کرتے رہے، ہر ترجمے اپنے اسلوب طرز تحریر، سلاست ومتانت اور رعنائی خیال میں مولانا علی میاں مدظلہ، کی تحریر کا مثنیٰ ہیں، مولانا ان کے ترجموں سے بہت خوش ہوئے اور فرماتے معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی تحریر پڑھ رہا ہوں، اسلوب تحریر میں ایسی یکسانیت بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ تعمیر حیات میں ان کے گرانقدر اداریوں اور مضامین کو اگر یکجا کر کے شائع کیا جائے تو اس کی کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں جو پاکیزہ صحافت کا ایک قیمتی تحفہ ہو سکتی ہیں۔

انہوں نے اپنی زندگی کی صرف ۴۴ بہاریں دیکھیں، لیکن اس مختصر عرصۂ حیات میں انہوں نے کتابوں اور ترجموں کا ایک انبار لگا دیا، اتنا کام صرف موہوبی صلاحیت والے لوگ ہی کر سکتے ہیں، اس اعتبار سے بھی

ان کا شمار حسنی خاندان کے کثیر التصانیف مصنفین میں ہوگا اور خاندانی روایات کو آگے بڑھانے والوں میں ان کا نام بھی لیا جائے گا، ذیل میں ہم ان کے علمی کام کا ایک سرسری تعارف کراتے ہیں،

۱۔ "طوفان سے ساحل تک"۔ یہ نومسلم محمد اسد کی انگریزی کتاب "روڈ ٹو مکہ" کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ اتنا سلیس و رواں ہے کہ اصل کا گماں ہوتا ہے، اس ترجمہ سے ان کی انگریزی میں مہارت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے ۱۳۸۰ھ میں یہ شائع ہوا اور ارباب علم سے خراج تحسین وصول کیا،

۲۔ سیرت مولانا محمد علی مونگیری: مولانا محمد علی مونگیری ناظم اول ندوۃ العلماء کی سوانح حیات موجود نہ تھی اس ضرورت کو دیکھتے ہوئے ندوہ کے منتظمین کے اصرار پر محمد میاں نے ان کی سوانح حیات لکھنا شروع کی، اس کتاب میں ایک باب شبلی کے اختلافات اور ندوہ سے استعفیٰ پر ہے، اس پر مخالفانہ تبصرے بھی ہوئے اور اس سے اختلاف کی گنجائش بھی ہے مگر اس سے قطع نظر کرتے ہوئے مولانا مونگیری کے ادوار حیات اور ان کی مساعی جمیلہ پر چار سو صفحات پر ضخیم کتاب ان کی تصنیف و تالیف میں مہارت تامہ کا بین ثبوت ہے، یہ کتاب مکتبہ ندوۃ العلماء سے ۱۳۸۳ھ میں شائع ہو چکی ہے۔

۳۔ تذکرہ شاہ علم اللہ: خاندان حسنی کے گل سرسبد کی سیرت اور ان کی خدمات کا اس کتاب میں جائزہ لیا گیا ہے، یہ کتاب شاہ صاحب کی سوانح کے ساتھ اس خاندان کی خدمات کو بھی واضح کرتی ہے، یہ کتاب بھی ان کی تلاش و تحقیق پر شاہد عدل ہے ۱۳۹۰ھ میں شائع ہوئی۔

۴۔ کاروان مدینہ: یہ کتاب دراصل مولانا علی میاں کی عربی کتاب "الطریق الی المدینۃ" کا شگفتہ و سلیس اردو ترجمہ ہے، ترجمہ کی زبان صاف ستھری اور شستہ ہے ترجمہ کے لفظ لفظ سے ذات رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت و عقیدت عیاں ہے، ارباب علم نے اسلوب بیان کی دل کھول کر داد دی ہے۔ یہ کتاب عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے۔

۵۔ جب ایمان کی بہار آئی: یہ بھی مولانا علی میاں کی مقبول عام عربی کتاب "إذا هبت ريح الإيمان" کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں سید احمد شہیدؒ کی خدمات اور ان کے جہاد و تبلیغ پر روشنی ڈالی گئی ہے زبان و بیان کے اعتبار سے یہ ترجمہ ان کی کامل قدرت پر دلالت کرتا ہے ۱۳۹۳ھ میں مکتبہ فردوس

سے شائع ہوا۔

۶۔ ارکانِ اربعہ: یہ مولانا محترم کی شاہکار کتاب "الأرکان الاربعۃ" کا ترجمہ ہے۔ اس میں عبادات پر قرآن وحدیث کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے، یہ ترجمہ کافی ضخیم ہے اور نقل مطابق اصل ہے، عرصہ ہوا شائع ہو کر مقبولیت عام حاصل کر چکا ہے۔

۷۔ معرکۂ ایمان ومادیت: مولانا علی میاں نے "تأملات فی سورۃ الکہف" کے عنوان سے عرصہ ہوا سورۂ کہف کی تفسیر لکھی۔ اس کا ترجمہ بھی افادۂ عام کے خیال سے محمد میاں نے کیا، ترجمہ خوب انداز میں کیا، مجلس تحقیقات سے ۱۳۹۰ھ میں شائع ہو کر قبولیت حاصل کر چکا ہے۔

۸۔ تزکیہ یا احسان: مولانا علی صاحب کی کتاب "ربانیۃ لا رہبانیۃ" کا اردو ترجمہ ہے، یہ ترجمہ ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

۹۔ رودادِ چمن: ندوہ کے ۸۵ سالہ جشن کی یہ بہت ضخیم روداد ہے اس کا اسلوب بیان اتنا دلکش ہے کہ قاری اپنے آپ کو اس جشن میں شریک محسوس کرتا ہے، ندوہ کے فکر اور اس کے مقاصد کو بہت خوبصورت انداز میں سمویا ہے، ندوہ کی تاریخ کی جھلکیاں بھی اس میں ملتی ہیں، یہ روداد دارالعلوم سے شائع ہو کر قبولیت پا چکی ہے۔

۱۰۔ نبی رحمتؐ: مولانا علی میاں نے عربی میں "السیرۃ النبویہ" کے نام سے ایک ضخیم کتاب تحریر کی، جدید وقدیم مآخذ کی روشنی میں سیرت نبویؐ پر ایک لاجواب کتاب ہے، اس کا ترجمہ دو حصوں میں محمد میاں نے کیا، ترجمہ میں ذات رسالت مآب سے شیفتگی وعقیدت سطر سطر سے عیاں ہے، یہ ترجمہ ۱۳۹۸ھ میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے شائع ہو چکا ہے۔ کیا عجب کہ بارگاہِ صمدیت میں یہ شفاعت ومحبوبیت کا ذریعہ بن جائے۔

۱۱۔ حیات مولانا مدنیؒ: محمد میاں عرصہ سے مولانا مدنیؒ کی سوانح حیات مرتب کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں کافی مواد بھی فراہم کر چکے تھے۔ کتاب ابھی نصف ہی ہو پائی تھی کہ پیام اجل آپہونچا اور یہ کتاب تشنہ رہ گئی، امید ہے کہ مولانا ثانی صاحب اس کو مکمل کر کے محمد میاں کی یہ آرزو پوری کرینگے۔

۱۲۔ پا جا سراغِ زندگی: یہ مولانا علی میاں مدظلہ کی کچھ تقاریر کا مجموعہ ہے جس کو محمد میاں نے سلیقہ د

و محنت سے ترتیب دیا، طلبا رحیثکل عرصہ ہوا اس کو شائع کر چکے ہیں۔

اس کے علاوہ مولانا کے مختلف کتابچوں اور مضامین کے ترجمے بھی کیے اور خود بھی سیکڑوں اردو میں مقالات تحریر کئے، اردو مضامین کا انتخاب بھی جلد شائع ہونا چاہیئے، اردو کے علاوہ ان کی عربی کی قابل ذکر خدمات یہ ہیں:۔

۱۳۔ مکانۃ الصلوٰۃ فی الاسلام: یہ دراصل شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی مقبول عام کتاب "فضائل نماز"، کا عربی ترجمہ ہے اس کا اسلوب بیان بہت دلچسپ ہے۔ اور عالم عرب سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔

۱۴۔ رسالہ ندوۃ العلماء، جشن ندوہ کے موقع پر اردو میں "روداد چمن"، لکھی اور عالم عرب میں ندوہ کے پیغام و مقاصد کا تعارف اس سے کرایا، اس میں تحریک ندوۃ العلماء پر بصیرت افروز مقالات کو یکجا کر دیا ہے۔ البعث الاسلامی کے جشن سے پہلے اور بعد دو ضخیم نمبر بھی ان کی قابل قدر یادگار ہیں،

۱۵۔ الاسلام الممتحن: یہ ان عربی مقالات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً البعث الاسلامی کی زینت بنتے رہے، اس فکر انگیز مجموعۂ مقالات کو عالم عرب بلکہ دنیائے اسلام میں بڑی قبولیت حاصل ہوئی، نوجوان طبقہ کو خواب غفلت سے جگانے میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس وقت تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۶۔ مصر تتنفس: مصر کے حالات اور تبدیلیوں پر یہ مقالات کا مجموعہ ہے، یہ بھی البعث میں شائع ہوتے رہے۔ ابھی یہ مجموعہ طباعت کے مراحل میں ہے۔

۱۷۔ الی القیادۃ العالمیۃ: یہ بھی البعث کے اداریوں کا مجموعہ ہے جو عالمی قائدین سے صاف صاف باتوں کی شکل میں ہے، یہ مجموعہ بھی جلد شائع ہوا چاہتا ہے۔

الغرض اردو و عربی زبان کی انہوں نے جو خدمت انجام دی ہے، اس کو فراموش نہیں کیا جاسکے گا، ان کی نا وقت موت ندوہ، ندوی برادری اور عالم اسلام کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے، ان کے عم محترم اور خاندان کے لئے یہ اچانک حادثہ سوہان روح کا باعث ہوگا مگر خدائی حکمتیں و مصلحتیں بڑا

ان کے صبر و شکیب کا سہارا ہوں گی۔ ان کے انتقال سے صحافتِ اسلامیہ کا ایک قوی و جری شہسوار رخصت ہو گیا، خدا ان کی اسلامی، دینی اور ملی خدمات کو قبول کرے۔ آمین

تدمع العین و یحزن القلب ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا لفراقك لمحزونون ٥

سب سے بڑا کمال

انسان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو، ایک طرف اس کا سینہ ایمان و یقین سے اور اس کا دل لازوال محبت سے معمور ہو اور دوسری طرف اسکی زبان اس کے دل کی ہمنوا اور اس کا عمل ان جذبات اور کیفیات کی ترجمانی کر رہا ہو۔ اگر یہ بات کسی انسان کو حاصل ہو جائے تو اس کا ہر قول و عمل اور اس کی ہر تقریر اور تحریر میں ایک ایسی دلکشی اور دلآویزی پیدا ہو جائے گی جس کی تعبیر الفاظ سے نہیں کی جا سکے گی لیکن اس کی مٹھاس ہر شخص محسوس کرے گا اور اسے ایسا معلوم ہو گا کہ جیسے کسی نے اس کے دل کی بات کہہ دی یا اسکی گمشدہ دولت اس کو واپس مل گئی ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

مولانا محمد الحسنیؒ ــــــ اسلامی ادیب کی حیثیت سے

شمس تبریز خاں

بعض ناقدین ادب کا کہنا ہے کہ "اسلوب ہی شخصیت ہے"۔ یہ مقولہ جواں مرگ و جواں قلم اسلامی ادیب مولانا محمد الحسنی مرحوم پر پوری طرح صادق آتا ہے ان کی شخصیت ہی کی طرح ان کے اسلوب تحریر میں بھی جوش و خروش کے ساتھ متانت و سنجیدگی، وقار و تمکنت کے ساتھ سوز و گداز، فکر و خیال کے پہلو میں جذبات و احساسات، علم و فن کی بغل میں ایمان و یقین، اور "جدید نافع" کے ساتھ "قدیم صالح" کا حسین و خوشگوار امتزاج دل کو موہ لیتا اور ان کی دلنشیں تحریروں کے پڑھنے والے کو ان سے ملنے والے کی طرح اپنی طرف پوری طرح متوجہ کر لیتا ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی طرح اپنا یقین بھی یہی ہے کہ "ایک اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے" اور اپنا یہ یقین محمد الحسنی جیسے اچھے انسانوں اور اچھے ادیبوں کے نمونے دیکھ کر کچھ اور پختہ ہو جاتا ہے، ان کی تحریروں میں ایمان و احسان کی جو پختگی اور برگزیدگی، اخلاص و دلسوزی کی جو مٹھاس، اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے جو تڑپ اور بے چینی اور پاکیزہ جذبات کی حدّت و شدّت کے ساتھ فکر و نظر کی جو جامعیت و متانت نظر آتی ہے وہ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ "ہر اسلوب کے پیچھے ایک شخصیت چھپی ہوتی ہے"، یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک بے عمل اپنی باتوں سے لوگوں میں روح عمل پھونک دے، مردہ دل پژمردہ جذبات والا کوئی شخص کسی انسانی معاشرے میں اضطراب اور بیداری کی لہر پیدا کرے اور ایک بے کردار و بے ضمیر آدمی، اپنے ہم جنسوں میں غیرت و حمیت کے جذبات کو متحرک کرے اور خود بیمار ہوتے ہوئے دوسروں کے لئے مسیحا بن جائے؟ ؎

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

ایمان و یقین عمل کی طرح فنی عمل، یعنی ادب میں بھی جان پڑ جاتی ہے اور مقصد کا عشق، منزل کی

لگن اور کامیابی کا اذعان قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا اور اسے مسخّر و مسحور کر دیتا ہے۔ اسلامی یا مقصدی ادب اپنے واضح اور متعین ہدف کے سبب قاری کو دھند لکے اور اشتباہ میں نہیں رکھتا بلکہ شروع ہی سے اسے اپنے اعتماد میں لیکر اور اسے اپنی ہمدردی میں شریک کر کے کسی نصب العین تک پہنچاتا اور اپنے اندر صراحت و صاف گوئی، افادیت و مقصدیت، اور اصلاحی و تعمیری قطعیت کی وجہ سے اس کے لئے زبردست اپیل اور دلکشی رکھتا ہے۔ اسلامی یا ایمانی ادب، انسان و کائنات اور خالق کائنات کے باہمی رشتے کے عرفان زندگی میں اسکے نفاذ اور اس کے ذریعہ رضائے الٰہی کے حصول اور فلاح آخرت کے یقین یا دوسرے لفظوں میں توحید رسالت اور آخرت کے وسیع امکانات پر ایمان کے سبب سے زندگی کا مثالی تصوّر بن کر سامنے آتا اور اپنے اندر خود زندگی جیسا زور اور اثر رکھتا ہے اور ابہام و اشتباہ، فکری انارکی اور بے مقصدیت پر مبنی ادب کے مقابلے میں ہر طرح بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

مولانا محمد الحسنی کی تحریریں بھی اسلامی ادب کی انہی خصوصیات کی حامل ہوتی تھیں اور سب سے پہلے اپنے ایمان پرور اور یقیں آفریں اسلوب سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں، اسے ان تحریروں میں ایمان کی حرارت، اخلاص کی قطعیت و صراحت، اور دعوتی جذبہ کی قوت و تاثیر صاف طور پر محسوس ہوتی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے بے یقینی سے یقین تک، بے مقصدیت سے ایک واضح نصب العین تک اور مادہ و حواس کی محدود دنیا سے نکال کر ماورائے محسوسات کیفیات تک پہنچا دیتی تھیں، خدائے بزرگ و برتر کی ہمہ جہت ذات و صفات پر یقین، توحید و رسالت کے عظیم امکانات پر اور ان کی کارسازی و مشکل کشائی پر غیر متزلزل ایمان، رہتی دنیا تک نبوت محمدی کی چارہ سازی اور انسانیت کی دستگیری و رہنمائی کی ابدی صلاحیت پر مکمل اعتماد کے سبب ان کے قلمی شاہکار زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کی طاقتور عکاسی اور ترجمانی کرتے ہیں، اور افادیت و مقصدیت کے حامل ادب کا اچھا نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔

عصر حاضر میں اسلام کے دعوتی لٹریچر کی پیشکش ایک طرف روایتی زبان اور عوامی و واعظانہ انداز میں ہو رہی ہے جس کی اپیل بہت محدود ہے اور اس میں کہنگی و فرسودگی نظر آتی ہے دوسری طرف دین کو عصری سیاسی اصطلاحات میں پیش کرنے کی کوشش ہے جس سے خود اسلام کی اصلیت (originality) کو خطرہ ہے اور اس کے اصول و مبادی کے اندر تحریف اور سلف صالحین و جمہور اسلام کی روش سے انحراف و علیحدگی کا

اندیشہ پیدا ہوجاتا ہے اس لیئے یہ طرز واسلوب بھی قابل قبول اور سودمند نہیں، یہی حال تجدد پسند اور مغرب زدہ مسلمان اہل قلم کا ہے جو دیدہ و دانستہ تقلید مغرب میں مبتلا ہیں اور وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ اسلام پر اعتماد بحال کرنے کے بجائے اسے متزلزل کردیتے اور قاری کے ذہن میں نئے شکوک وشبہات پیدا کردیتے ہیں۔

ان اسالیب تحریر ودعوت کے درمیان ایک طرز نگارش اور بھی ہے جو جدید وقلم کے امتزاج، فکر و خیال کے ساتھ جذبات واحساسات کی ہم رشتگی اور عقل ودل کے صحیح توازن اور اعتدال وسنجیدگی کا نمونہ ہے جس کے علم برداروں میں مولانا شبلی، علامہ اقبال، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی ہیں، مولانا محمد الحسنی مرحوم بھی فکر وخیال اور طرز واسلوب کے اعتبار سے اس طلائی زنجیر کی ایک کڑی اور اس دبستان فکر کے ایک رکن ہیں۔ ان کی بیش قیمت اردو عربی تحریروں کو پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اسلام کامل اور دین خالص کی وہ ترجمانی موجود ہے جو اسلام کی ۱۴۰۰ سالہ تاریخی میراث کا تقاضا ہے اور جس میں سلف کی تعبیر وترجمانی کا لحاظ رکھا گیا ہے مگر اسے پیش کرتے وقت اپنے لئے مخاطب کے رجحانات نئے ماحول اور نئے مسائل ومطالبات کی بھی پوری رعایت رکھی گئی ہے اور اسلام کو نہ صرف عقائد واعمال کے ایک روایتی مجموعہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس میں سیاست وحکومت کو دنیاداری سمجھا جاتا ہے اور نہ اسے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی نظام حیات بناکر دکھایا گیا ہے جس میں اسلام کا روحانی نظام اور اس کا احسانی وعباداتی پہلو دب کر رہ جاتا ہے اور اس طرح اسلام اپنی پوری آب وتاب اور مکمل شکل وصورت میں سامنے آنے کے بجائے ایک ناقص و نامکمل انداز میں سامنے آتا ہے۔

محمد میاں کے اسلوب میں فکر وجذبہ، علم وایمان اور عقل ووجدان کا ایسا توازن اور رکھ رکھاؤ ملتا ہے جس سے عصر حاضر میں اسلام کی طاقتور ترجمانی اور موثر نمائندگی بہت آسان ہوجاتی اور وہ بیک وقت اسلام کی عقلی وفکری اور وجدانی وقلبی تفہیم وتشریح اور دعوت واشاعت کا بہترین نمونہ ہے۔

اس میں فکری صلابت وپختگی کے دوش بدوش جذبہ واحساس کی رقت وشگفتگی، عقل وذہن کی روشنی و بیداری کے پہلو بہ پہلو قلب ووجدان کی چھٹکی ہوئی چاندنی اور نرم ونازک، لطیف وسبک روحانی تقاضوں کی

تکمیل کا سامان موجود ہے۔

جہاں فکری لحاظ سے اسلام کو دین و دنیا کے ایک مکمل اور جامع نظام کی حیثیت سے روشناس کرانے کے ساتھ اسلامی انقلاب کے راستے میں حائل فکری و سیاسی تحریکات میں مغربیت و مادیت، آمریت واشتراکیت، قومیت وصیہونیت، لادینیت اور اباحیت کی کامیاب تنقید و تردید ان کا یادگار کارنامہ ہے وہیں عطر کا اسلوب وزبان میں ایسے تعمیری و اصلاحی خیالات کی ترویج و اشاعت، اردو و عربی کے اسلامی ادب و انشار میں ایک وقیع و گراں قدر اضافہ ہے، ان کے تیار کردہ لٹریچر کی لسانی قدر و قیمت بھی کسی طرح کم نہیں، انکی تحریر بے تکلف و بے تصنع، جذبات و احساسات اور خلوص و صداقت کا آئینہ، سلجھے ہوئے اور معتدل و متوازن افکار و خیالات کے شایانِ شان زبان و بیان کا گلدستہ ہے، حسن ذاتی کی طرح تکلف سے بری، تصنع سے دور، رواں دواں الفاظ جن میں کہیں کہیں مترنم جذبات و خیالات، رعایتِ لفظی کے سبب شعرِ منثور کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں، اور برمحل اشعار مزہ دے جاتے ہیں، عصری اصطلاحات سے کام لے کر عصری فکر زدہ ریوں پر لطیف طنز و تعریض اور مجموعی طور پر ان کے فکر و اسلوب کی پاکیزگی و برگزیدگی، لطافت و نزاکت اور رفعت و متانت اسلامیات پر لکھنے والوں کے لئے سامانِ ہدایت اور سرمۂ بصیرت ہیں۔

محمد میاں مرحوم کے تحریری کارنامے مختلف موضوعات اور اصناف علم وادب سے متعلق ہیں جن پر مجموعی طور پر انشا پردازی و مقالہ نگاری اور تاریخ و تذکرہ نویسی کا رنگ غالب ہے، وہ ایک کامیاب صحافی بھی تھے جس کے شاہد ان کے رسالے "البعث الاسلامی" اور "تعمیر حیات" ہیں، انہوں نے صحافت کو بھی ایک وقار و اعتبار اور معیار بخشا اور اس میں ثقاہت و شائستگی پیدا کی۔

وہ ایک بہترین مقالہ نگار تھے اور اپنے موضوع میں جذباتی کشش اور وجدانی دلکشی پیدا کرنا جانتے تھے (اگرچہ اس میں کسی تکلف اور شعوری کوشش کو دخل نہ تھا اور یہ فن کاری سے زیادہ ان کے خلوص کا نتیجہ ہوتا تھا) اس صنف کا عمدہ نمونہ ان کی کتاب "الاسلام الممتحن" اور "تعمیر حیات" میں ان کے اداریے مضامین ہیں۔

مستقل تصنیف و تالیف کا انھیں موقع کم ملا ورنہ ان میں ایک کامیاب اور مثالی مصنف کی صلاحیتیں موجود تھیں پھر بھی ان کی لکھی ہوئی "سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ" "تذکرہ شاہ علم اللہؒ" پیام ندوۃ العلماء اور

رودادِ چمن، عرصہ تک باقی رہنے والی کتابیں ہیں، سیرتِ مولانا مونگیری اور تذکرہ شاہ علم اللہ، تاریخ و تذکرہ اور سیرت و سوانح کی بہترین کتابوں میں شامل ہونے کے لائق ہیں، ان میں تاریخی وسوانحی مواد کی عمدہ ترتیب و تنظیم کے ساتھ، تاریخی شعور، صاحب سوانح کے ماحول اور زمانے کا احساس اور اس کے درمیان صاحب سوانح کی عظمت اور حقیقی کارناموں کا تعین بھی کیا گیا ہے اور اس کے خیالات وجذبات کی مؤثر ترجمانی کی گئی ہے اور اس طرح اس کے حالات وواقعات کے ساتھ ذہنی کیفیات اور تصورات ورجحانات بھی سامنے آتے اور ناظرین کے اندر اس کی تقلید واتباع کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

تذکرہ شاہ علم اللہؒ ایجاز وجامعیت اور مختصر نویسی کا ایک اچھا نمونہ ہے، اس کے پونے دوسو صفحات میں مختلف اکابر سادات ومشائخ کا تذکرہ آگیا ہے اس کے ساتھ تصوف وسلوک کے اذکار کا خلاصہ بھی۔

پیامِ ندوۃ العلماء بھی اسی طرح کی مختصر کتاب ہے جس میں ندوۃ العلماء جیسی بڑی تحریک کے آثار وافکار کو چند صفحات میں سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

"رودادِ چمن، ۱۹۷۵ء میں ہونے والے پچاسی سالہ جشنِ ندوۃ العلماء کی روداد اور رپورتاژ ہے، اس میں انہوں نے اپنے موئے قلم سے اس عظیم الشان اجلاس کی ایسی چلتی پھرتی تصویر کھینچی ہے جس سے قاری اپنے کو اجلاس کے ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے اور خبر اس کے لیے نظر بن جاتی ہے۔

مولانا محمد میاں ایک لائق ومشاق مترجم بھی تھے ان کے بیشتر ترجمے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ، کی عربی کتابوں کے ہیں، انہوں نے مولانا کی بہت سی اہم کتابوں کو اردو کا جامہ پہنا کر اردو کو مالا مال کیا اور اسلامی ادب میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے تراجم میں اصل کی روح موجود ہے، بلکہ اصل ونقل کا فرق ختم ہوگیا ہے۔ اور اندازہ ہی نہیں ہوتا ہے کہ یہ کتابیں کسی اور زبان میں لکھی گئی ہیں، ان کے قیمتی تراجم میں "اسلامیت ومغربیت کی کشمکش" "ارکانِ اربعہ" "نبیِ رحمتؐ" اور "تزکیہ واحسان[1]" شامل ہیں۔

ان کا ایک اور کامیاب ترجمہ محمد اسد کی 'ROAD TO MECCA' کا ہے جو اردو میں "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے شائع ہو کر بہت مقبول ہوا ہے۔

---

[1] یہ ترجمہ مرحوم کی وفات کے بعد ابھی حال میں شائع ہوا ہے جسے وہ مطبوعہ شکل میں نہیں دیکھ سکے۔

۴۴ سال کی مختصر عمر میں ان کے ایسے علمی، دینی اور ادبی کارنامے اور ایسی قلمی فتوحات انکی غیر معمولی اور خداداد صلاحیتوں کا نتیجہ کہی جاسکتی ہیں، جس کا ایک ثبوت اُن کا وہ فکر انگیز مضمون ہے جو ۷ا سال کی عمر میں انہوں نے دمشق کے موقر اسلامی مجلہ" المسلمون" میں اپریل ۱۹۵۴ء کے شمارے میں" العالم الاسلامی علی مفترق الطرق" کے عنوان سے لکھا تھا۔

اس تبصرہ کو خود ان کے اس تبصرہ پر ختم کیا جا رہا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب" الاسلام الممتحن" کے دیباچے میں اپنی تحریروں پر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ مقالات مختلف اوقات و حالات میں اور مختلف موضوعات پر لکھے گئے مگر ان کا پیغام یکساں ہے اور ایک ربط باہمی موجود ہے جسے میں اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے نفرت کہنا پسند کروں گا............

اس میں سرگشتہ مسلم نوجوان ایسا مواد پائیں گے جو دین پر ان کے اعتماد کو بحال کرے گا اور ان کے ایمان کی تقویت اور اسلام کے لیے شرح صدر کا باعث ہوگا اور حق و باطل، نور و ظلمت کے معرکے میں اسے ثابت قدمی عطا کرے گا"

(عربی سے ترجمہ)

کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

ایک تعزیتی مکتوب

ڈاکٹر حبیب الحق ندوی۔ ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ

کل پہلی رمضان المبارک کو تعمیر حیات مؤرخہ ۲۵ جون ۱۹۷۹ء سید محمد الحسنی کے اچانک کے سانحہ ارتحال کی جگر پاش خبر لایا، ہاتھ سے پرچہ چھوٹ گیا جیسے بجلی کا جھٹکا سا لگ گیا۔ دیر تک اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس جانگسل حادثہ پر جس قدر اشکہائے ماتم والم کا سیلاب بہایا جائے کم ہے۔ ابھی ڈیڑھ سال قبل برادر عزیز محمد الحسنی سے میری ملاقات ندوہ میں ہوئی تھی۔ چند صحبتوں میں جہاں یادوں کی برات ایام رفتہ کو حیات تازہ عطا کرتی رہی اور ابتدائی طالب علمی کے دور کے بہت سے واقعات کو اجاگر کرتی رہی وہاں مرحوم کی محبت تواضع وانکساری، جو انسانی کردار کے تاج محل کا کلس ہے۔ میرے ذہن پر انمٹ مثبت نقوش بھی نسب کرتی رہی۔ دیر تک سوچتا رہا آخر صیاد اجل نے اس نو دمیدہ کلی کو اسلامی نشاۃ ثانیہ کے گلستاں و بوستاں سے اس قدر جلد کیوں اچک لیا؟ شاید اس لیے کہ ریاض الجنۃ کو اس کلی کی عطر بیزی کی ضرورت تھی۔! فکر و نظر اور دعوت و شجاعت کی نو میدہ کلی سید محمد الحسنی نہضہ اسلامیہ کے گلشن میں بھرپور طور پر کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ اچانک یہ کلی تبسم کے نقطہ ارتکاز یا ارتحال پر جا پہنچی، نونہالان نہضۃ اسلامیہ کی نظریں ہنوز اس کی شگفتگی کی منتظر تھیں۔ افکار کی آبیاری پر نگاہیں جمی ہوئی تھیں کہ "وقعت الواقعۃ لیس لوقعتها کاذبۃ" کا مرحلہ پیش آگیا، یعنی کلی سے جو پوچھا کہ کتنا ہے گل کا ثبات ع

ع .... کلی نے یہ سن کر تبسم کیا۔

کیا واقعۃً فعّال انسانی زندگی کا وقفہ یا لمحہ ایک کلی کے تبسم سے زیادہ نہیں؟ کیا یہی ہے زندگی اور حقیقت زندگی۔؟

نہضہ اسلامیہ کا تابندہ ستارہ

آج جبکہ دنیا کے گوشہ گوشہ اور چہار سمت سے جانبازان راہ حریت اور سرفروشان راہ حق کا

فیروز مند قافلہ توحید کی دعوت دے رہا ہے اور نہضۂ اسلامیہ کی لہریں نشاط و انبساط، حوصلہ و شجاعت کی فضا پیدا کر رہی ہیں۔ محمد الحسنی جیسے تابندہ ستاروں کی ضرورت ہر دور سے زیادہ تھی، تاکہ دردمندان اسلام اور "مخلصین لہ الدین" کا یہ قافلہ حوصلہ و اعتماد کے ساتھ مغربی جادو کی سیاہ چادر کو چاک کرتا ہوا "شعارنا الوحید الی الاسلام من جدید" کا ترانہ گاتا ہوا سوئے حرم تیز گام ہوتا اور خوابیدہ روحوں کو معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز کی اذان سے جگاتا ہوا ایمان و علم اور ایقان کے سرحد تک پہنچا دیتا۔

لیکن کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام ایک ابدی و سرمدی حقیقت ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون "استعانۃ بالصبر والصلوۃ" ہی مومن کا سہارا ہے اور سامان زیست کا ذریعہ بھی۔

اس جانکاہ المیہ اور دلدوز و دلسوز جواناں موئی نے اسلامی نشأۃ ثانیہ کے ہر سپاہی کو مغموم و مجروح کیا ہے اور صدمہ پہنچایا ہے۔ لیکن موت و زیست کے فلسفہ سے باخبر انسان محمد حسنی سے جو صدا سن سکتا ہے وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ؎

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خودنمائی خود فزائی کے لیے مجبور ہے

سردی مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

ہے لحد اس قوت آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردن گردوں میں جو اپنی کمند

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

خوگر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

محمد الحسنی کی زندگی کا شعلۂ نہاں سردی مرقد سے افسردہ نہیں ہو سکتا۔ تحریکی شخصیتیں کبھی مردہ نہیں ہوتیں، وہ زندہ جاوید ہیں، کیونکہ ان کی زیست کا تسلسل دعوت کے تسلسل سے قائم ہے، تاج محل کی حسین آرائشوں ریاضی یا ریاضیاتی پرکاریوں کی سج دھج میں سونے والے آج محض آثار قدیمہ کی یادگار ہیں، زائرین لال قلعہ دیوان عام اور دیوان خاص کی پیشانی پر "اگر فردوس بر روئے زمین است ـ ہمیں است وہمیں است"

کا ٹیکہ دیکھ سکتے ہیں، جو اپنے پیش رو آقاؤں کو آواز دے رہا ہے کہ نو سو برس کی کشور کشائی کے بعد بھی سرزمین ہند تمہیں اپنا نہیں بنا سکی، تم اس کے سینے پر بوجھ ہو، اجنبی ہو اور حملہ آور کے نام سے یاد کیے جاتے ہو، کیوں؟ اس لیے کہ دعوت وعزیمت کی راہ سے تم ناآشنا تھے۔ اس کے برخلاف سید احمد شہید، مجدد الف ثانی، خواجہ اجمیری نظام الدین اولیا، یحییٰ منیری اور محمد علی مونگیری وغیرہم زندۂ جاوید ہیں۔ وہ آثار قدیمہ یا موزیم کی زینت نہیں بلکہ زینت ارواح وقلوب ہیں، ان کی حکومت آج بھی دلوں پر قائم ہے، بیشتر مسلم سلاطین ہند آج تاریخ کے صفحات میں گم ہیں لیکن سلاطین اور اولیا، فکر ودعوت متحرک وفعّال ہیں، اسی دعوت اور سلسلہ افکار کی ایک کڑی محمد الحسنی بھی تھے۔ اس کڑی کو موت چھو نہیں سکتی اور تا قیامت دعوت محمدی اور دعوت حسنی جاری وساری رہے گی۔

عالم اسلام کی فضا تیزی سے بدل رہی ہے، اسلام واپس آرہا ہے۔ چودھویں صدی ہجری کا اختتام نشأۃ اسلامیہ کے آغاز کی تمہید ہے۔ تقدیر کا سینہ چیرنے والوں کو عزم وحوصلہ کا درس دیا جارہا ہے، ہر طرف سے آواز بلند ہو رہی ہے ؎

میری ہمتوں کو مٹانا ہے مشکل　　　　سمندر میں اب اتنا پانی نہیں ہے

اہل مغرب اور ان کے ایشیائی ایجنٹ اسلام کے اقدام کو روک نہیں سکتے۔ کیونکہ اب اہل اسلام خود تقدیر یزداں بن چکے ہیں، وہ خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات کے بجائے وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل پر آمادہ ہیں عشق اسلام اور عشق الٰہی نے آداب خود آگاہی کا درس عام کر دیا ہے اور غلاموں پر اسرار شہنشاہی کو فاش کر دیا ہے۔ اس پوری تحریک میں محمد الحسنی، اہل ندوہ اور رفقاء ندوہ کا نمایاں ہاتھ ہے، اس کارواں کو یقین ہے کہ "عالم پیر دگر بار جواں خواہد شد۔

ذاتی تاثرات کا ذکر سطور بالا میں کسی حد تک کر سکا ہوں، لیکن جنوری ۱۹۷۸ء کی ملاقاتوں میں جو تاثرات مرتب ہوئے ان کا ذکر مشکل ہے۔ مرحوم نے باصرار مجھ سے وعدہ لیا کہ میں تعمیر حیات کے ساتھ پھر تحریری رابطہ قائم کروں اور مسلم ذہنوں کو فسون فرنگ سے نجات دلانے اور فلسفہ اعتذار کے خلاف جس مہم کا آغاز ۱۹۶۴ء میں جامعہ ہارورڈ سے کیا تھا اسے دوبارہ شروع کروں، افسوس ہے کہ ایفاء وعدہ سے قبل ہی مرحوم نم کنوم العروس کی منزل تک جا پہنچے۔ مرحوم نے اپنی چند تالیفات بھی نقد ونظر کے خیال سے ہدیہ پیش کیا تھا تاکہ اپنی رائے لکھ سکوں۔

قصد ہے کہ انشاءاللہ اسلامی نہضہ کے مختلف گوشوں پر وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں۔ خود افریقہ میں اسلامی اور اسلامی تحریکات ایک دلچسپ موضوع ہے۔ افریقہ اسلامی براعظم کے نام سے پکارا جاتا ہے، کیوں کہ ۶۲ فیصدی مسلم آبادی، تمام مسیحی ریشہ دوانیوں کے باوجود فعّال و متحرک ہے، مغربی استعماری افریقہ کو موت کا جنگل، سیاہ و تاریک براعظم ثابت کرتے رہے تاکہ دنیا کی نظریں اس کی طرف نہ اٹھ سکیں۔ اس پردہ زنگار کے پیچھے وہ پورے افریقہ کا استحصال کرتا رہے۔ سونے اور ہیرے و جواہرات کی کانوں پر سیاہ ناگ کی طرح بیٹھے رہے۔ مسیحی تحریکات کا جال بچھا کر۔ مشنری اسکول، کالج، ہسپتال اور رفاہِ عامّہ کے ادارے کھول کر استعماریوں نے سب سے زیادہ صدمہ اسلام اور اہل اسلام کو پہنچایا ہے، لیکن خدا کی شان ہے کہ استعماری مرضیات کے خلاف اسلام پھر افریقہ کی سرزمین پر جاگ اٹھا ہے، شاید اس لیے کہ افریقہ واقعتہً اسلامی براعظم ہے۔ سن پانچ نبوی میں اسلام جزیرہ عرب سے نکل کر سب سے پہلے حبشہ یعنی افریقہ پہنچا، اس قافلہ میں رسولؐ کی لخت جگر اور داماد حضرت عثمانؓ بھی شریک تھے۔ ام المومنین ماریہ قبطیہ اسی زمین کے عزّ و شرف کا سبب بنیں اور اسلام کے جدامجد حضرت ابراہیم کی رفیق حیات حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کی والدہ ماجدہ اسی گلشن افریقہ سے کھلیں۔ بلال حبشی کی ذات نے سرزمین افریقہ کی پیشانی پر عزت کا ٹیکہ لگایا۔ محمد الحسنی مرحوم افریقہ میں بیداری اسلام کی داستان سن کر بلاشبہ بے حد مسرور ہوتے۔ موقع ملا تو ان موضوعات پر محمد الحسنی موریل سریز کے تحت کچھ لکھوں گا۔ محمد الحسنی مرحوم کی پہلی روح پرور کتاب سیرت مولانا محمد علی مونگیری جو پہلی بار اپریل ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ جون یا جولائی میں میری نظروں سے گزری، اسی وقت سے ایک روحانی لگاؤ پیدا ہوا۔ کیونکہ مولانا محمد علی مونگیری میرے خاندان کے پیر و مرشد تھے، بلکہ میری والدہ ماجدہ کا مکتب بھی اپنے دست مبارک سے شروع کرایا۔ مولانا محمد علی کے ۶۲ غیر مطبوعہ خطوط میرے پاس ہیں۔ محمد الحسنی مرحوم انھیں دیکھ کر بے حد خوش ہوتے بلکہ اپنی کتاب سیرت محمد علی کا ضمیمہ تصور کرتے یہ خطوط ہمارے نانا جان سید ابوالبقاء محمدؒ (لفظ محمدؐ حضرت مونگیری مرشد کی جانب منسوب ہے) کے نام لکھے گئے۔ ان میں ذاتی، خاندانی حالات اور مشوروں کے ساتھ ساتھ بعض اہم دینی و ملی مشورے بھی موجود ہیں۔ قادیانی تحریک کے استیصال کی جو مہم ہمارے نانا جان نے ضلع مونگیر و بھاگلپور میں چلائی تھی اس کے رہبر مولانا محمد علی مونگیری ہی تھے، ان خطوط میں ان تحریکات کی بعض جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ ارادہ تھا کہ ان خطوط کو ایڈٹ کر کے محمد الحسنی مرحوم کی خدمت میں ارسال کر دیتا تاکہ آپ کے

مشورہ سے ان کی اشاعت کا سامان کیا جاتا۔ اس کا ذکر میں اپنے سابق خط میں کر چکا ہوں۔ لیکن کیا خبر تھی کہ اس منصوبہ کی تکمیل سے قبل ہی سید محمد الحسنی رخصت ہو جائیں گے۔ اور سید مولانا محمد علی مونگیری، سید احمد شہید اور دیگر مجاہدین اسلام کی ارواح سے جا ملیں گے۔!

مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربك راضية مرضية

سوگوار و غم گسار
سید حبیب الحق ندوی

ایمان....!

ایمان زندگی کی دعوت ہے بغیر تردد و شرمندگی و بے حیائی کے بغیر کسی معذرت و لکنت و اضطراب کے، بغیر کسی خوف و خطر کے وہ ایک صاف واضح اور بین دعوت ہے، اس میں نہ کوئی پیچیدگی ہے نہ ابہام و پوشیدگی،

(مولانا محمد الحسنی ندوی مرحوم)

زندہ دل صاحبِ ذوق

(مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے نام مکتوب)

محمد شبیر ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

۱۴ جون ۱۹۷۹ء کی صبح کو سانحۂ عظیم کی خبر سنی، اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ بمبئی سے ۲ بجے تشریف لا رہے ہیں لیکن ایسی جگہ پھنسا ہوا تھا کہ ۲ بجے پالم حاضر نہ ہو سکا پھر اُسی دن نظام الدین میں آپ سے شام کو ملاقات ہوئی لیکن اُس وقت حال یہ تھا کہ دل میں جو کچھ تھا وہ لب پہ آسکتا نہیں، کا تقاضا پورا کرنا تھا ہم سب ایک دوسرے کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتے تھے پھر اس اندیشے سے کہ دل کا حال کھل نہ جائے نظروں کو ہٹا لیتے تھے۔

کچھ بھی سہی لیکن، ہے وہ درد پسندیدہ　　　چہرے سے نہ ظاہر ہو دل میں ہو جو پوشیدہ

جب آپ لکھنؤ کے لیئے رخصت ہونے لگے تو پھر ایک مرتبہ دل امڈا۔ اتنے میں آپ روانہ ہو گئے اور جامعہ کے لیئے نظام الدین کے بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔ دل میں خواہش تھی کہ کاش میں بھی اس وقت سفر میں ساتھ ہوتا، جن مجبوریوں کی وجہ سے اس وقت اس ارادے پر عمل نہ ہو سکا، انھیں مجبوریوں کی بناء پر جناب مشیر الحق اور محمد اجتبا ندوی کے ہمراہ نہ آسکا دیکھئے یہ مجبوری کس دن دور ہوتی ہے اور خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

جب تعزیت کے نام سے خط لکھنے کا ارادہ کیا تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ سے تعزیت کروں یا خود اپنی ذات سے۔ ایک مرتبہ کبھی ایسے موقع پر شاید آپ کا لکھا ہوا مضمون پڑھا تھا کہ غم اگرچہ مادی چیز نہیں ہے لیکن اس کی کیفیت اور کمیّت ظاہر کرنے کے لیئے تشبیہ کسی مادی چیز سے دی جاتی ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، کبھی کہا جاتا ہے کہ دل، غم والم کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ اگرچہ یہ بوجھ مادی نہیں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ سب بوجھوں سے زیادہ وزنی ہے قضا وقدر کا مالک جو اس بوجھ کو ڈالتا ہے وہی اس کے برداشت کی طاقت بھی دیتا ہے ورنہ انسان کی کیا بساط کہ اسے اُٹھا سکے۔ حضرت مظہر جان جاناں کا شعر ہے

الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا　　محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برساتی

یہ حقیقت ہے کہ غم کی شدت آنسوؤں کی کثرت سے کم ہوتی ہے اور دل کا بوجھ اسی سے ہلکا ہوتا ہے ویسے تو آپ کا خاندان اہل اللہ کا خاندان ہے جسے اللہ تعالیٰ کی مشیت پر پورا اعتقاد ہے جسے اللہ تعالیٰ نے صبر و ضبط اور استقامت کی دولت سے نوازا ہے، جو اس غم کا مداوا ہے ؎

امتحاں سخت سہی، پر دلِ مومن ہی وہ کیا　　جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

جب مرحوم پر نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کا ارادہ کیا تو اندازہ ہوا کہ الفاظ ساتھ نہیں دے رہے ہیں پھر ذہن میں یہ شعر یاد آیا جس سے ہمت بندھی ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے　　نالہ پابندِ نے نہیں ہے

محمد میاں کے ساتھ مرحوم کا لفظ شامل کرتے وقت دل لرز جاتا ہے۔ محمد میاں جن کے بارے میں تھا کہ اپنے دادا حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خوابوں کی تعبیر اور ان کے علم و فضل کا سجادہ نشین بنیں گے، محمد میاں جو اپنے والد بزرگوار محترم ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کے لخت جگر اور ان کی شرم و حیا زہد و تقویٰ کے وارث تھے، محمد میاں اپنے پیارے چچا کے علم و فضل، امنگوں، حوصلوں، آرزوؤں و تمناؤں کے جانشین، ابوبکر حسنی کی نظروں کے سرور و ٹھنڈک، محمد ثانی، محمد رابع، محمد واضح کے ہم جلیس و ہم نشین اور سارے خاندان کے چشم و چراغ و اُجالا تھے، چلے گئے اور سچ پوچھئے تو اس گھر کا عاشق رسول مقبول صلعم چلا گیا ؎

دل ہے تو اُسی کا ہے جگر ہے تو اُسی کا　　اپنے کو رہ عشق میں برباد جو کر دے

مجھے کسی نے سنایا تھا کہ آپ کے ساتھ ایک مرتبہ مدینہ منورہ سے کار میں مکہ مکرمہ کے لئے آرہے تھے جب مدینہ منورہ کے چھٹنے کا احساس ہوا تو بے قرار ہو کر رونے لگے اور سرکار کے دروازے سے ٹکرانے لگے۔ اس واقعہ سے ان کے عشق کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس درجہ کے عاشق تھے۔

محمد میاں اپنے قلم و ذہن سے حقائق کے کھولنے میں مصروف تھے اور ابھی ان کے قلم سے بہت سے حقائق کھُلنے کی توقع و امید تھی جو اُن کے ساتھ جاتی رہی یہ نقصان قوم و ملت کا نقصان ہے وہ زندہ رہتے تو عالمِ اسلام کے علم و فضل کا قطب بنتے۔ اس قطب سے قوم و ملت خود محروم ہو گئی۔

میں جس زمانے میں ندوہ میں طالب علم تھا مجھے یاد نہیں کہ محمد میاں کی عمر کیا تھی یہ بھی یاد نہیں کہ

وہ اس زمانے میں ندوہ کے طالب علم بن چکے تھے یا نہیں ؟ آپ کے تعلق سے ان سے تعارف ہوا، قربت اُس وقت ہوئی جب ندوہ کے ۸۵ سالہ جشن کی تیاری کے سلسلے میں ندوہ میں کثرت سے آنا جانا ہوا اور مختلف موقعوں پر ایک ساتھ اُٹھ بیٹھنے کا موقع ملا۔ عزّت و احترام کے ساتھ جس بے تکلفی سے پیش آتے تھے اس پر مجھے شرمندگی ہوتی تھی لیکن باوجود منع کرنے کے باز نہیں آتے تھے ۸۵ سالہ جشن منانے کے موقع پر انکی انتہائی آرزو ندوہ میں اچھے لان بنانے اور اچھے خوبصورت پیڑ پودوں کے لگانے کی تھی وہ چاہتے تھے کہ ندوہ خوبصورت پیڑوں، اچھے پودوں اور پھولوں سے سجا کر دولہن بنا دیا جائے، ہر ملاقات پر بس اسی کا تقاضا رہتا اور اس کی خواہش، فرماتے کہ جشن کی دوسری باتیں ہو کر کاغذ پر آجائیں گی۔ صرف یہی ایک ایسی یادگار ہوگی جو ہر وقت نظروں کے سامنے رہے گی۔ چنانچہ جب چمن بندی کا کام شروع ہوا تو ان کا دل دیکھ کر باغ باغ ہونے لگا۔ اس ضمن میں جتنا کچھ اُس وقت ہوا تھا اس سے خوش تو تھے لیکن مطمئن نہیں تھے اس لئے کہ ان کے تصور و خیال میں جس نوع کی چمن بندی تھی اس معیار تک نہ ہو پائی تھی، انھیں ماحول اور جگہ کی خوبصورتی، سجاوٹ و بناوٹ سے حد درجہ لگاؤ تھا، اس سے ان کے ذوقِ جمال کی نشان دہی ہوتی ہے کہ وہ خشک نہیں بلکہ شرم و حیا کی چادر میں لپٹے ہوئے زندہ دل اور صاحبِ ذوق تھے۔ جشن کے بعد جس طرح سے جشن کی روداد لکھ کر اُسے ہمیشہ کے لئے ایک دستاویز بنا دیا یہ ان کے ذوق و شوق کا کرشمہ ہے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

محمد الحسنی کی رحلت ناگہانی پر

نشورواحدی

لخت جگر بوالحسن از دارِ فنا رفت
گوئی کہ شب آخر شد و از ماہ ضیا رفت

او بود مبلّغ بہ صف بعثتِ اسلام
آں شمع ہدیٰ بزم ہدیٰ انجم ہدیٰ رفت

در ہند کہ او نطق عرب فکر عرب داشت
محراب بہ شیون شد و منبر بہ قفا رفت

کس نیست کہ اسرار توکّل بہ شناسد
کاں سالک عرفاں کدۂ فقر و غنیٰ رفت

در فرقت او شبنم گل دیدۂ حیراں
مانند سحر آمد و مانند صبا رفت

در ماتم بے لفظ عروسانِ معانی
کز شہر حنا لکھنؤ آں رنگِ حنا رفت

صدق است و لے نیست صفائے بہ مزاجش
آں آئینہ جلوہ گہہ صدق و صفا رفت

خالی شدہ از زیر و بم شعر و تخیل
کاں نغمہ سرائے چمنِ صوت و صدا رفت

در رحلت ناگاہ ندا داد سروشے
راضی بہ رضا آمد و راضی بہ رضا رفت

محمد الحسنی۔ سراپا جمال و کمال

مولانا محمد ثانی حسنی

وہ جگر گوشۂ اہل فضل و کمال — عندلیب چمن قوم کے نونہال
بازوئے بوالحسن جان عبد العلی — نازش خانداں اپنی بہنوں کے لال
میرے محبوب بھائی محمد میاں — جن پہ قرباں مرے جان و دل جاہ و مال
نکتہ رس، خوش طبع، برد بار و حلیم — خندہ رو، خندہ لب، نیک شیریں مقال
نیک خو، پاک رو، خوش دل و خوش نظر — خوش ادا، خوش نوا خوش خیال و خصال
صاحب خیر فیاض، مرد خدا — شیوۂ خاص تھا ان کا، اخفائے حال
صحبت بد سے تا مرگ محفوظ تھے — نیک لوگوں سے ان کا رہا اتصال
ناز اہل قلم علم دین کے چراغ — اپنے اسلاف کی ایک زندہ مثال
مثل دادا کے اپنے تھے مرد غیور — بے حقیقت تھا ان کی نگاہوں میں مال
اپنے والد کے مانند تھے صلح کل — وہ تھے نا آشنائے جدال و قتال
وہ تھے اپنے چچا کے قدم بر قدم — ایک سا تھا خیال ایک سے تھے خصال
فکر بھی ایک تھی طرز بھی ایک تھا — ایک ہی تھا مزاج ایک ہی حال و قال
شہرہ ہر سو ہے ان کے مقالات کا — شرق ہو غرب ہو یا جنوب و شمال
وہ سوانح نگار محمد علی — جن کی عظمت کے قائل ہیں اہل کمال
جن کی تصنیف ہے "روئداد چمن" — جس میں ہے جشن ندوہ کا حسن و جمال
تذکرہ لکھ کے شاہ علم کا کیا — منکشف اہل ہمت مشائخ کا حال
ہے الاسلام الی الممتحن وہ کتاب — معترف جس کے ہیں اہل فضل و کمال
ہے کتاب ان کی طوفاں سے ساحل تلک — ترجمہ روڈ ٹو مکہ کا ہے بے مثال
اَلاِمَامُ الَّذِیْ لَمْ یُوْفِ حَقَّہٗ — ترجمہ اس کا کر کے دکھایا کمال

نبی رحمت بھی ہے شاہکار قلم
جو کہ ہے مظہر عشق حضرت بلال

ایسے اہل قلم نوجواں اب کہاں
دور ہے آج کا دور قحط الرّجال

وہ محمّد میاں نیک دل نوجواں
عمر پائی جنھوں نے چوالیس سال

نو بجے دن ہوا ان کو درد شکم
دی گئی ہر دوا کی گئی دیکھ بھال

شام تک جب نہ کچھ بھی افاقہ ہوا
ہو کے مجبور پھر وہ گئے اسپتال

گم ہوئیں سب کی عقلیں قضا آگئی
نو بجے شب کو وہ کر گئے انتقال

جان دی کرتے کرتے قلم کا جہاد
اک طرف تیغ حق اک طرف حق کی ڈھال

ان کی تعمیر ملت میں گزری حیات
انتقال ان کا ملت کا ہے انتقال

اُن کا نقش قلم حق کی تلوار تھا
کانپتا تھا شکوہ کمال[۱] و جمال[۲]

اُن کے جانے سے غم کی فضا چھا گئی
ہو رہا ہے ہر اک ان کے غم سے نڈھال

وہ جواں سال تھے نیک اعمال تھے
قابل رشک تھا اُن کا ماضی و حال

اس جواں موت سے سب ہی غمناک ہیں
کیا عرب کیا عجم ہیں اسیر ملال

ہے کہاں وہ گہر اور کس حال ہیں
دیدۂ تر کا دل سے یہی ہے سوال

دیکھ کر دیدۂ تر کی بے چینیاں
اس سے بولا دلِ صاحب کشفِ حال

میں بتاؤں تمھیں ہے کہاں وہ گہر
کس مکاں میں مکیں ہے وہ گودڑ کا لال

روضہ شاہِ علم میں وہ مدفون ہے
ہو رہا ہے خَلَف کا سَلَف سے وصال

جمع ہیں آج جس مرکز نور میں
مہر و بدر و کواکب نجوم و ہلال

خوش ہوئے خوش سے خوش تر ہوئے کرکے حل
دو فرشتوں نے آکر کیے جو سوال

اُن سے رخصت ہوئے کہہ کے منکر نکیر
نَمْ کَنَوْمِ العروس اے حمیدہ خصال

روح سوئے جناں مست ہو کر چلی
بولا رضوان پھر یا حبیبی تعال

اُدخلی جنّتی کی صدا گونج اٹھی
ہو گئے داخلِ خلد ہو کر نہال

اُن کو ایسی حسیں ایک جنّت ملی
ہے تصوّر سے بالاتر اس کا جمال

جنۃٌ عالیہ، عیشۃٌ راضیہ
اور اس سے سوا نعمتیں بے مثال

۱؎ مصطفیٰ کمال اتاترک ۲؎ جمال عبدالناصر

ہو مبارک تمھیں اے مری چشم تر — مغفرت ان کی کردی گئی بال بال
تاج سر پر وہ رکھے ہوئے نور کا — چلتے پھرتے ہیں وہ کیف و مستی کی چال
سب کو جانا ہے دنیا سے اک دن ضرور — فکر ہے فکر در اصل فکر مآل
کھو نہ جانا کبھی عیش دنیا میں تم — لحظہ لحظہ رہے آخرت کا خیال
جانے والے سے ملنا ہے جس کو کبھی — کیوں ہو وہ جانے والے کے غم میں نڈھال
جس کو جنّت کے ملنے کی امید ہے — قید دنیا میں رہنا ہے اس پر وبال
ہے دعا میری ہردم یہ اللہ سے — بخشے سب کو رضا بالقضا کا کمال
اہلیہ کو عطا کر تو صبر جمیل — اپنی رحمت سے کر دور ان کا ملال
تیری مرضی پہ راضی رہیں تاحیات — ان کے بھائی عزیزان کے اہل وعیال
ان کے فرزند عبداللہ، عمّار ہیں — تیسرے خورد سال ان کے بیٹے بلال
یہ بنیں اپنے والد کے نعم الخلف — علم دیں کا بنا ان کو بدر و ہلال
ہر قدم ہر نفس ان کا دل شاد ہو — زندگی بھر رہیں نعمتوں سے نہال
ان کی بہنوں کو یارب عطا کر سکوں — دور سے دور کر ان کا رنج وملال
ان کے عمّ مکرم کو دے زندگی — عام سے عام کر ان کا فضل و کمال
ان سے پائیں ہدایت خواص وعوام — مستفید ان سے ہو حلقۂ حال وقال
بخش ان کو محمّد کا نعم البدل — توڑ دے جو قلم سے طلسم ضلال
ان کے بھانجوں کو یارب تو توفیق دے — اپنے ماموں کے ہوں ہم قلم ہم خیال
رحمتیں کر محمد میاں پر مدام — تو رحیم و کریم اور ہے ذوالجلال

کر عطا ان کو یارب تو قرب و رضا
تو غفور و شکور اور ہے بَرّ و عال

بیادِ محمد الحسنی مرحوم

ڈاکٹر طفیل احمد مدنی

کٹے گی کیسے شبِ غم محمد الحسنی
تمہاری یاد ہے اور ہم محمد الحسنی

سُنی ہے جب سے یہ رودادِ غم معاذ اللہ
عجیب دل کا ہے عالم محمد الحسنی

یقین ہی نہیں آتا کہ تم نہیں موجود
ہے حیرتوں کا وہ عالم محمد الحسنی

دل فسردہ کو میرے کچھ ایسا لگتا ہے
ہے زلفِ دہر بھی برہم محمد الحسنی

مرے عزیز، مرے دوست کس زباں سے کہوں
تمہارے مرنے کا ہے غم محمد الحسنی

فضائے ندوہ وتکیہ بڑی اُداس سی ہے
بچھی ہے اک صفِ ماتم محمد الحسنی

و فورِ غم سے ہر اک آنکھ اہلِ ندوہ کی
تمہاری یاد میں ہے نم محمد الحسنی

تمہارے مرنے پہ اہلِ ادب ہیں افسردہ
کہ تم ادب کے تھے ضیغم محمد الحسنی

تمہارے واسطے جتنا بھی روئیں اہلِ قلم
یقین جانو کہ ہے کم محمد الحسنی

تمہارے دوست، اعزا و اقربا سب ہی
ہیں دل شکستہ و پُر غم محمد الحسنی

بھلا سکیں گے نہ تم کو کسی طرح برسوں
تمہارے مخلص و ہمدم محمد الحسنی

ابوالحسن بھی تمہارے لیے بہت روئے
تمہارے محترم و عم محمد الحسنی

کروں تو کیسے کروں ان سے تعزیت آخر
پڑا ہے ان پہ بڑا غم محمد الحسنی

الٰہی دے انہیں اس حادثہ پہ صبرِ جمیل
کہ ہے یہ زخم کا مرہم محمد الحسنی

شدید غم ہے مگر مرضئ الٰہی تھی
ہمارے سر ہیں یہاں خم محمد الحسنی

تمہاری قبر رہے نور سے سدا لبریز
اور اس کو تر کرے شبنم محمد الحسنی

طفیلِ احمدِ مرسل دعا ہے، ہو تم پر
نزولِ رحمتِ پیہم محمد الحسنی

بیادِ
مولانا محمد الحسنی مرحوم

(مجیب بستوی)

حقیقت ہے گدا کے بھیس میں اک شاہ تھے حسنی
یقیناً وقت کی گردش سے بے پرواہ تھے حسنی

ابھی تک محفل ارباب دانش میں یہ چرچا ہے
جہاں کے واسطے اب تک چراغِ راہ تھے حسنی

پیامِ زندگیٔ جاوداں دیتے تھے دُنیا کو
جہادِ زندگی میں آدمی کیا واہ تھے حسنی

تو ہی جانے کہ تیرے علم میں دنیا کی ہر شئی ہے
نہیں معلوم مجھ کو کیا مرے اللہ تھے حسنی

نکاتِ زندگی رازِ حیاتِ آدمیت بھی
رموزِ اشک ہائے غم حدیثِ آہ تھے حسنی

جو ملتا تھا اسے محسوس ہوتی تھی توانائی
سکونِ دل کی گویا ایک جلوہ گاہ تھے حسنی

جو تھے اہلِ نظر وہ دیکھتے تھے اے مجیب ان کو
یقیناً جگمگاتے ماہ سے تا کاہ تھے حسنی

تأثرات

مولانا محمد الحسنی مرحوم کی تعزیت میں آنے والے خطوط کے اقتباسات

مولانا سید محمد الحسنی مرحوم اپنے بلند پایہ، بصیرت افروز اور فکر انگیز عربی و اردو مقالات اور تصنیفات کی وجہ سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلامی میں مشہور تھے۔ ڈاکٹر سید عبد العلی مرحوم کے فرزند ارجمند اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کے ساختہ پرداختہ، انکے نقش ثانی اور بہت سے کاموں میں انکے معاون ہونیکی وجہ سے مرحوم سے محبت و عقیدت رکھنے والوں کا حلقہ خاصا تھا۔ مختلف ممالک میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے سرگرم عمل لوگوں میں اکثر کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات تھے اور جن سے تعلقات نہیں تھے وہ ان کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان سے بڑی امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے یہی وجہ ہے کہ اچانک انتقال کے المیہ کا اثر دور دور تک محسوس کیا گیا، متعدد اداروں میں تعزیتی قرار دادیں منظور کی گئیں، مساجد اور مدارس میں انکے لئے قرآن خوانی اور دعائیں ہوئیں۔ اخبارات و رسائل میں مضامین اور نوٹ لکھے گئے اور ہر طرف سے تاروں اور خطوط کا سلسلہ قائم ہو گیا، ہند و پاکستان کے علماء، دینی اور سیاسی رہنماؤں، ندوی برادری اور ندوہ سے تعلق رکھنے والوں اور حضرت مولانا سے تعلق رکھنے والوں نے اس حادثہ پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ ہندوستان سے باہر کے بھی لوگوں کے خطوط اور تار موصول ہوئے۔ شیخ محمد علی الحرکان سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی مکہ، صفوت السقا امینی نائب سکریٹری، کامل الشریف وزیر اوقاف اردن، عبد الرحمن البکر وزیر عدل وشئون اسلامیہ ابوظبی، ڈاکٹر احمد توتونجی سکریٹری ندوۃ الشباب، مولانا محمد شمیم ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ، سکریٹری جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی دوبئی۔ اور دوسرے ممتاز حضرات نے بذریعہ تار و خط مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی تعزیت کی اور مرحوم کے بارہ میں اپنے احساسات و خیالات کا اظہار کیا۔ اس طرح تاروں اور خطوط کی تعداد کئی سو ہے، ان میں سے چند خطوط کے اقتباسات یہاں دیے جا رہے ہیں۔ تمام خطوط کو شامل اشاعت کرنا ممکن نہیں اور ان میں انتخاب بھی کوئی آسان کام نہیں۔ باقی ماندہ خطوط میں یقیناً بہت سے مختلف اعتبارات سے قابل ذکر و قابل اشاعت ہونگے۔ ہم ان تمام حضرات سے معذرت خواہ ہیں۔

یہاں دیئے گئے خطوط کے اقتباسات میں کسی خاص ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ جو خط جس ترتیب

سے سامنے آگیا ہے لیا گیا ہے۔ عالم عربی کے ممتاز افراد و اہل قلم کے تأثرات پہلے دیے جا رہے ہیں۔
عربی خطوط کا ترجمہ صدر الحسن ندوی کے قلم سے ہے۔ (مرتب)

"ISLAM IN THE WORLD" کے مصنف، مشرق کے بلند پایہ اہل قلم، امیر شکیب ارسلان کے رفیق ڈاکٹر زکی علی مصری حال مقیم سوئزرلینڈ نے مولانا محمد الحسنی مرحوم ۲۷ رجب ۱۳۹۹ھ (۲۲ جون ۱۹۷۹ء) کو ایک خط لکھا۔ اس وقت مولانا کی وفات کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا لیکن ڈاکٹر زکی صاحب کو اطلاع نہیں ملی تھی، وہ اپنے مکتوب میں مرحوم کو ان الفاظ سے خطاب کرتے ہیں:۔

"برادر محترم! مومن و مخلص انشا پرداز، گفتار و کردار کے مجاہد، بیمثال مصنف، سلیم الفکر مفکر، ٹھوس اور معقول رائے کے حامل، جذبات و احساسات اور عزائم کو بیدار کرنے والے اسلوب کے مالک جناب محمد الحسنی صاحب ایڈیٹر "البعث الاسلامی"۔

وفات کی اطلاع ملنے کے بعد انہوں نے مرحوم کے برادر محترم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ایڈیٹر "الرائد" کے نام ایک تعزیتی خط بھیجا۔ ذیل میں اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:۔

"۲۰ رجب ۱۳۹۹ھ (۱۶ جون ۱۹۷۹ء) کے "الرائد" سے جو مجھے آج ہی ملا ہے آپ کے برادر عزیز جناب محمد الحسنی صاحب کی وفات کی اطلاع ملی، اس سانحہ کا مجھ پر کیا اثر ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، اف! کتنا عظیم سانحہ ہے، کیسی جانکاہ مصیبت ہے!! عالم اسلام کے لئے کتنا زبردست خسارہ ہے۔ اس بے مثال انشا پرداز، مخلص داعی، باشعور مفکر، امانتدار صحافی، عظیم مجاہد اور عبقری مصنف کی وفات نے ندوۃ العلماء اور "الرائد" و "البعث الاسلامی" کی برادری کو کتنا متاثر کیا ہے، افسوس! عالم اسلام ان کے وجود سے محروم ہو گیا، حالاں کہ اس وقت مسلمانان عالم کو ان جیسی عبقری شخصیتوں کی شدید ضرورت ہے۔ آہ! نئی نسل ان کے فکر و تدبر اور دانش و حکمت کے ثمرات سے محروم ہو گئی، اسلامی دنیا کے آسمان پر وہ ایک درخشندہ ستارہ بن کر ابھرے جو عین عروج کے وقت غروب ہو گیا۔ مشیت خداوندی میں کسی کو کیا دخل۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کے عم محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام عرب کے مشہور اہل قلم، عالم و ادیب، متعدد بوں کے مصنف، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے استاذ شیخ محمد مجذوب کا تعزیت نامہ۔

"میں جناب کی خدمت میں یہ سطور سپرد قلم کر رہا ہوں اور دل غم سے گھٹا جا رہا ہے۔ آنکھوں میں آنسو ہیں اور ذہن میں یہ پریشان کن سوال کہ ہم آپ کی تعزیت و غم خواری کر رہے ہیں یا خود اپنی۔ یہ سانحہ تنہا آپ کا نہیں بلکہ اس میں عالم اسلام کے وہ سارے افراد شریک ہیں جو ان کے قلم گہربار سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔

اس وقت ہم فتنہ و فساد اور ابتلاء و آزمائش کے دور سے گذر رہے ہیں، اس پرآشوب ماحول میں ہمیں ایسے تازہ دم لشکر کی ضرورت ہے جو عفت و پاکیزگی اور حریت و آزادی میں یکتا و بے مثال ہو۔"

ذیل میں ایک عراقی نژاد عظیم داعی کے مضمون کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ انہوں نے مشرق وسطیٰ میں دعوت ہ کے میدان میں اہم خدمات انجام دی ہیں، ان کے افکار و خیالات پر اسلامیت کی گہری چھاپ ہے —— وہ وستان اور یہاں کی اہم شخصیات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ مضمون ریاض کے مشہور مجلہ "الدعوۃ" میں شائع ہے۔

"مجلہ "البعث الاسلامی" وہ مشعل راہ، حق کی گونجتی ہوئی صدا اور سرچشمۂ صافی ہے جس نے اسلامی عربی فکر کو اس وقت بالیدگی عطا کی جب اسلامی اور عربی ممالک میں مسلم نوجوانوں کی رہنمائی کے سارے چشمے خشک ہو گئے تھے، اس کی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز موجودہ صدی کی چھٹی دہائیوں کے نصف میں ہوا۔ وہ اول روز سے اب تک حق گوئی و فکر صالح کا دریا بہا رہا ہے اور ہندستان کے اسلامی فکر کے نتائج اہل عرب تک پہنچا رہا ہے۔ اس کے روح رواں یگانۂ روزگار نوجوان، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے برادر زادہ مولانا محمد الحسنی مرحوم تھے، یہی وہ رسالہ ہے جس نے خاص مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی میں زمانہ کے سرکش وطاغوتی رجحانات کو چیلنج کیا، خصوصاً وہ مصر کے طاغوت کو برابر چیلنج کرتا رہا اور اس سے

کبھی مصالحت نہیں کی بلکہ اس کے غلط افکار و نظریات کا پردہ فاش کیا اور ان کی منافقت کو آشکارا کرتا رہا۔

مرکز "الدعوۃ الاسلامیۃ" شارقہ کے ناظم اعلیٰ شیخ عبد اللہ بن علی المحمود کا مکتوب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام۔

"برادر محترم! آپ کے لخت جگر مولانا محمد الحسنی ندوی کی خبر وفات انتہائی غم و اندوہ کا پیام لائی، مرحوم بیس سال سے زیادہ مدت سے اسلامی صحافت کے امتیازی شان کے ساتھ ابھرے تھے اور دعوت اسلامی کی نشر و اشاعت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے میدان میں بے باک مجاہد کی حیثیت سے دعوت کا فریضہ انجام دے رہے تھے، انھوں نے ہمیشہ اور ہر جگہ مسلمانوں کے حقوق کی مدافعت کی اور ان کے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لئے تمام باطل طاقتوں کا کھل کر مقابلہ کیا، وہ مسلمانوں کو کفر و الحاد، صیہونیت اور مغربی استعمار کے خطرات سے مقابلہ کی دعوت دیتے رہے۔"

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے استاذ شیخ محمد السید الوکیل کا خط:۔

"برادر عزیز محمد الحسنی ندوی کی وفات کی خبر بڑے رنج و الم اور حسرت و یاس کا باعث بنی، اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

اس خبر سے ہمارے دل غم میں ڈوب گئے، ہم امن و سکون اور راحت و مسرت سب بھول گئے۔ ان کی وفات نے باخبر اور عدیم المثال اسلامی صحافت میں ایک عظیم خلا پیدا کر دیا ہے۔ ان کا طاقتور اور بے باک قلم اپنے ان بھائیوں کے احساسات و جذبات کا ترجمان تھا جو بے وزن سیاست کی تاریک فضا اور قید خانہ کی اندھیری کوٹھریوں میں مقید ہونے کی وجہ سے اپنے ضمیر کی آواز دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔ یہی وہ وزن تھا جس سے وہ ضمیر کی گہرائیوں میں کھوئی ہوئی حریت و آزادی کی خوشبو محسوس کرتے تھے۔ ان کے گرانقدر اور موثر مضامین نے مسلمانوں کی روحانی اقدار کو فروغ دیا اور باطل پرستوں کی لن ترانیوں

کا پردہ چاک کیا اور فریب خوردہ مسلمانوں کی آنکھوں پر سے پردے اٹھا دئے۔

مرحوم کی وفات سے صرف صحافت ہی کے میدان میں نہیں خلا پیدا ہوا ہے بلکہ تعلیم و تربیت کے میدان کے ایک ماہر استاذ، کریم النفس مربی اور شفیق مصلح کے وجود سے محروم ہو گئے۔ اللہ کا فضل ہے کہ انہوں نے ایک باشعور دبستان فکر اور ایسے صالح و وفادار شاگرد چھوڑے ہیں جو انشاء اللہ ان کے نقش قدم پر چل کر ان کے اسلوب کو اپنائیں گے۔

عربی رسائل و اخبارات نے بھی مولانا محمد الحسنی مرحوم کی وفات پر مؤثر ڈھنگ میں حالات اور احساسات پیش کئے۔ اسلامی پرچوں نے عام طور پر مولانا مرحوم کے بے باک و جرأت مندانہ اسلامی قلم کو سراہا، ان میں سے قاہرہ اور ریاض کے الدعوۃ، کویت کے المجتمع، البلاغ، مکہ مکرمہ کے ہفت روزہ اخبار العالم الاسلامی اور روزنامہ الندوہ، مصر کے الاعتصام کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ابھی اخبارات سے اطلاع ملی کہ جناب محترم کے ابن الأخ مولانا محمد الحسنی کا اچانک انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جیسے عم الرجل أبیہ فرمایا گیا ہے، اس کے مطابق حقیقتاً ابن الاخ ابن ہی ہوتا ہے۔ جناب کو جس قدر بھی صدمہ ہو کم ہے، ہم سب اس غم میں شریک ہیں۔ مرحوم ایک بہترین صاحب قلم اور ذی استعداد عالم تھے اور البعث الاسلامی کے نہایت کامیاب اور باصلاحیت مدیر تھے۔ حق تعالیٰ شانہٗ انہیں اپنے جوار رحمت میں قبول فرمائے۔

(مولانا) محمد طیب

دیوبند

برادر زادۂ محترم کے سانحۂ ارتحال کی المناک خبر معلوم ہو کر طبیعت پر انتہائی اثر طاری رہا۔ صبح جناب مولانا عمران خانصاحب سے تفصیل معلوم ہو کر مزید حسرت و غم کے اضافہ کا باعث ہوا۔

ان العین تدمع و القلب یحزن ولا نقول الا ما یرضی بہ

دینا۔ حضرت والا کو کیا تعزیت پیش کی جائے، یہ سانحہ تو تمام اہل علم و ادب کے لئے وجہ تعزیت ہے۔ ان فی اللہ عزاء من کل مصیبۃ وخلفا من کل فائت۔ ارحم الراحمین روح طیبہ پر اپنے رضوان اور رحمتوں کی بارش فرمائے اور ہم سب کو تسلیم و صبر کی توفیق دے۔

محمد سعید مجددی غفرلہ،
خانقاہ شریف مجددیہ بھوپال

کل یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ عزیزم مولانا محمد الحسنی رحمہ ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے۔ خبر سنکر مجھ پر ایک سکتہ کا عالم طاری ہو گیا، اور ایسی سخت چوٹ دل پر لگی کہ دیر تک افاقہ نہ ہو سکا۔ افسوس ہے کہ جنھیں کل تک سلمہ اللہ لکھتے تھے آج انھیں رحمہ اللہ لکھ رہے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صدمہ دہرا ہے، ایک تو اپنے ذاتی تعلق کی وجہ سے، دوسرے اس لئے کہ اس قحط الرجال کے دور میں قوم ایک سلیم الفکر، مخلص، ذہین اور صالح خادم و ناصر دین سے محروم ہو گئی۔ زور قلم رکھنے والے تو بہت ہیں، مگر مولانا محمد الحسنی مرحوم کے زور قلم کا منبع نور ایمان تھا۔ ایسا زور قلم رکھنے والے جس کی قوت، ایمان و یقین کی قوت کی رہین منت ہو احمر کی طرح النادر کالمعدوم ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس جوان صالح پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائیں۔ اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں۔

(مولانا) محمد اسحٰق سندیلوی ندوی
کراچی

یہاں پاکستان کے اخبارات کے ذریعے یہ المناک خبر معلوم کرکے انتہائی

صدمہ ہوا کہ آپ کے فاضل بھتیجے اور "البعث الاسلامی" کے ایڈیٹر عزیزی محمد الحسنی ندوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یقین کیجئے کہ مرحوم سے واقف جس شخص نے بھی یہ خبر سنی سناٹے میں آگیا۔ مرحوم کا قلم اسلام کی ترویج واشاعت کے لئے وقف تھا اور ان کی دینی وعلمی خدمات محتاج بیان نہیں۔ یہ حادثہ فاجعہ آپ اور آپ کے خاندان کے لئے ہی نہیں بلکہ دین کا کام کرنے والے تمام لوگوں کے لئے رنج والم کا باعث ہے۔

طفیل محمد
امیر جماعت اسلامی پاکستان

ابھی ابھی محمد بھائی نے فون پر حادثہ جانکاہ کی خبر سنائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کیا بتاؤں اس خبر کو کس طرح سنا۔ محمد میاں جیسا جوان صالح ولائق دنیا سے اٹھ گیا اور ہمارے ایسے بیکار جی رہے ہیں۔ حادثہ ہمارے لئے سخت ہے تو آپ کا کیا حال ہوگا۔ اللہ پاک صبر جمیل عطا فرمائے اور جواں مرگ محمد میاں کی بال بال مغفرت فرمائے اور اپنے اکرام واعزاز سے انہیں نوازے۔ اسلامی فوج کے ایک باہمت صاحب قلم سپاہی تھے۔ ان کا اداریہ البعث میں پڑھ کر روح تازہ ہوجاتی تھی۔ ان کے قلم کی ہر چیز پڑھنے کا اہتمام کرتا تھا اور مردہ رگوں میں خون دوڑنے لگتا تھا۔

(مولانا) محمد عمران خاں ندوی
بھوپال

بلاشبہ یہ حادثہ بڑا جانکاہ ہے اور نہ صرف آنمحترم اور متعلقین اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے لئے ہی بلکہ پوری امت اسلامیہ کے لئے۔ اس حادثۂ فاجعہ کا میرے قلب ودماغ پر جو اثر ہوا ہے اسکے بیان کرنے سے قاصر ہوں بس بارگاہ الہٰی میں یہی دعا ہے کہ وہ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے۔

عبید اللہ رحمانی۔ اعظم گڑھ

"میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے مرحوم کے غیر معمولی کمالات اور خصوصیات کا بیان ہو سکے۔ وہ صحیح معنوں میں آپ کے جانشین تھے۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت

میں ان کے علم، عمل اور سلامتی طبع کا ہمیشہ معترف رہا۔ . . . مرحوم کا سانحۂ وفات علم و ادب اور دینی و اسلامی ثقافت کی دنیا کا ایک عظیم حادثہ ہے اس لئے تنہا آپ سوگوار نہیں بلکہ ایک عالم آپ کے ساتھ سوگوار ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

وہ ہر اعتبار سے خاندانی روایات کے ترجمان تھے اور ان کے کریمانہ اخلاق، علم و وقار کے ساتھ ان کی دینی خدمات نوجوان اہل علم کے لئے مشعل راہ ہیں۔

قاضی اطہر مبارکپوری

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ہر لحاظ سے ایک ممتاز یادگار جسے آپ کی خاص توجہ اور محبت نے بین الاقوامی شہرت سے نوازا تھا اب اس دنیا میں نہیں رہی اور ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی جو آسانی سے بھری نہ جاسکے گی، کیسا بھرا ہوا گھر خالی ہو گیا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین فاروقی

جامعہ ملیہ دہلی

"واقعہ یہ ہے کہ آپ کے خانوادہ سے ذاتی طور پر مجھے مرحوم و مغفور ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی شفقتوں کے ذریعہ ہی تعلق خاطر پیدا ہوا تھا۔ مرحوم محمد میاں کی زیارت جب کبھی ہوتی تو ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی تمام شفقتوں اور عنایتوں کے ساتھ یاد آجاتے۔ محمد میاں مرحوم بھی اس ربط کو کماحقہ محسوس کرتے تھے۔"

مولانا محمد رضا انصاری

فرنگی محل لکھنؤ

"سب عزیزوں کے ساتھ اس اندوہناک حادثے پر مجھے دلی ہمدردی ہے اور مرحوم کے لئے رحمت و مغفرت کی تہہ دل سے دعا ہے۔

(مولانا) حبیب الرحمٰن خاں شیروانی
علی گڑھ

مرحوم کی رحلت بلاشبہ عالم عربی اور عالم اسلامی کے لئے ایک عظیم اور ناقابل تلافی صدمہ ہے۔

مفتی محمد مکرم احمد
شاہی امام مسجد فتح پوری دہلی

زندگی اور موت کا مالک تو کوئی اور ہی ہے، ہم لوگ افسوس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کو فردوس بریں میں جگہ دے۔

ہیم وتی نندن بہوگنا
وزیر پٹرولیم و کیمیکلز ـــــــ دہلی

" پچھلے سفر میں دوران قیام لکھنؤ ان سے وعدہ لیا تھا کہ آئندہ سفر انگلستان میں وہ آپ کے ہم سفر ہوں گے لیکن وہ وعدہ بقول شخصے "وہ وعدہ ہی کیا جو پورا ہو جائے" کے مصداق ہو گیا۔ ۔ ۔ ہم تو اس منحنی جسم لیکن بیدار مغز شخصیت سے بڑی امیدیں باندھے بیٹھے تھے۔ آہ! ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی"۔

مسرور حسین ــ لندن

"میں نے فقید عزیز کے نام خط میں اپنے دستخط کے نیچے "المطالب بجامعۃ البعث الاسلامی"، لکھا تھا اپنے جواب میں انہوں نے لکھا کہ اس تحریر سے خیال کی رو چلی جس سے متاثر ہو کر انہوں نے کوئی مقالہ سپرد قلم کیا۔

مولانا احمد حسنی
لاہور۔ پاکستان

"مرحوم سے آخری ملاقات پاکستان میں ایشیائی اسلامک کانفرنس کے موقع پر ہوئی تھی ان کے حسن اخلاق اور خداداد صلاحیت کی یاد ہمیشہ رہا کرتی ہے۔"

ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی

دربھنگہ۔ بہار

"ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم نے جو نقش تاباں ورثہ میں چھوڑا تھا افسوس کہ آج قضا نے اسے مٹا دیا۔ جس چمن کو حضرت مولانا علی میاں نے اپنے خون جگر سے سینچ کر شاداب بنایا تھا، صد حیف کہ نذر خزاں ہو گیا، ندوہ کی ایک زبان خاموش ہو گئی جس سے وہ عالم عرب کے ساتھ بے تکلف گویا ہوتا تھا۔"

مولانا سید عبدالکبیر۔ دارالسلام عمر آباد

"۔۔۔۔ رحلت اسلامیان ہند کا خصوصی اور کل ملت کا عمومی سانحہ ہے۔۔۔۔ ابھی جو سعودی عرب کو جھنجھوڑا تھا وہ ان کی غیرت ایمانی اور سوز ملی کی یادگار رہے گی۔"

غلام محمد۔ کراچی

"مرحوم سے نیاز تو گذشتہ سال حاصل ہوا لیکن اس سے قبل سالہا سال سے میں ان کی تحریریں رشک و حسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پڑھتا تھا۔"

مولانا محمد تقی عثمانی

دارالعلوم۔ کراچی

۔۔۔ ہم جیسوں کے لئے بھی یہ حادثہ سخت ہے اس کے علاوہ ندوہ اور اس سے متعلق علمی کارروائیوں کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔"

سید سلمان ندوی

ڈربن جنوبی افریقہ

"مرحوم اتنی کم عمر میں اپنی خداداد عظیم صلاحیتوں کی بنا پر بہت سے اچھے لکھنے والوں میں فوقیت لے گئے تھے اگر وہ رہے رہتے تو آپ کے صحیح جانشین ہوتے۔"

جناب حافظ کا صاحب سفیر ہند۔ جدہ

"مرحوم کے فطری ملکات اور کسبی کمالات کے پیش نظر بہت سی توقعات تھیں کہ حق تعالیٰ شانہ، دینی خدمات کا جو کام قریباً گذشتہ دو صدی سے لے رہے ہیں مرحوم اپنے اسلاف کی اس وراثت کو سنبھال لیں گے کسبی نسبت کے اسرار وہی حکیم مطلق جانتے ہیں۔"

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

کراچی

"مولانا کی وفات سے خالص دینی اسلامی صحافت کا ایک عظیم خسارہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کی جگہ کو پُر فرمائے۔"

مولانا محمد یونس۔ مظاہر العلوم سہارنپور

"اس کم عمری میں اتنی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کے حامل تھے لیکن خدا کو منظور نہیں تھا کہ وہ دنیا میں رہ کر اور خدمت کرتے اور اس نے اپنے پاس بلالیا۔"

محمد شفیع۔ پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"اس خبر کو پڑھ کر دل پر ایک گھونسا سا لگا اور کچھ دیر تک یہ ماننے کو جی نہ چاہا کہ ان جیسا ہونہار عالم ہمیشہ کے لئے اپنے خاندان ہی نہیں بلکہ پوری اسلام پسند دنیا سے یوں جُدا ہو جائے گا۔"

مولانا عرشی۔ رضا لائبریری رامپور

"ان کے اسلوب نگارش، انداز بیان، تحلیل و تجزیہ کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ ابھی بہت دنوں تک زمام عربی ادب ولغت ہمارے ہاتھوں سے شاید نہ جا سکے گی۔ اگر" اپنے صحرا میں ابھی آہو بہت پوشیدہ ہیں"، مگر اس غزال رعنا کے ہاتھ سے نکل جانے پر آنکھیں بے اختیار اشکبار ہیں اور نہ معلوم کب تک "البعث" کے صفحات پر ان کے رشحات نہ پاکر آنکھیں اشکبار رہیں گی۔"

عبدالحلیم ندوی۔ حیدر آباد

"میرا تاثر یہ ہے کہ اس سانحہ کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس ایک

ہفتہ میں یہ مشاہدہ بھی ہوا کہ دعاؤں کا تسلسل وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے، درانحالیکہ ہنوز کسی جریدہ میں خبر شائع ہو کر حرمین میں نہیں پہونچی ہے میں اسے اپنے جذبات کے لحاظ سے "ویوضع له القبول" کا مظہر سمجھتا ہوں۔"

حکیم عبدالرحیم اشرف۔ مکتوب از جدہ

"مجھ کو ان کی جواں مرگی کا سخت صدمہ ہے، اب کی بار جس محبت سے وہ جلد از جلد لکھنؤ آنے کا تقاضا اور خود نہ آنے کی معذرت کر رہے تھے وہ منظر ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔"

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی

"ایک طرف ان کی خاموش طبیعت اور نہایت سادہ مزاج، دوسری طرف ان کی علمی قابلیت اور اتنا عبور دیکھ کر دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا، ان کا عربی رسالہ "البعث" پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی پیدائشی عربی داں لکھ رہا ہے، ان کی دینی وسیاسی تحریروں سے پتہ نہیں کتنے لوگ مستفید ہوتے ہوں گے۔

عبدالرحمٰن نورولی مکہ مکرمہ

"وہ ندوہ کے لئے اور ساری ملت کے لئے سرمایۂ افتخار تھے۔ آئندہ نہ معلوم کس کس انداز سے وہ دین وملت کی خدمت انجام دیتے۔ اس نوعمری میں آسمانِ صحافت کے درخشاں ستارے کا ٹوٹ جانا آپ ہی کے لئے نہیں ہم سب لوگوں کے لئے ایک عظیم حادثہ ہے"۔

مولانا نظام الدین۔ جامعۃ الفلاح۔ اعظم گڈھ

"مرحوم میں جو خصوصیات تھیں اور امت کے لئے جو درد تھا، قلم میں جو تاثیر تھی بلاشبہ ان کی جواں مرگی آپ کے خاندان کے لئے ہی نہیں، اس قحط الرجال کے زمانہ میں امت اسلامیہ کے لئے بڑا حادثہ ہے۔"

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

قاضی شریعت۔ امارت شرعیہ۔ بہار

"ہماری جماعت کا گوہر شب چراغ گم ہوگیا، ان کا باکمال افراد کی صف میں ایک دردناک اضافہ ہوا جن کی عمریں کم تھیں۔ امام سیوطی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد یوسف، مگر ان میں سے کسی بات کو بھی سوچ کر دل کو تسکین نہیں ہو رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ آپ سے کیا عرض کروں جب اپنا یہ حال ہے، بقول ابوفراس کے ؎

انی أجدك أن تكفى بتعزية

عن خير مفتقد يا خير مفتقد

ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی

کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی۔ مکہ مکرمہ

"انہوں نے عربی زبان وادب پر جو قدرت حاصل کی اور ان کے قلم سے عربی میں جو بلند پایہ کتابیں اور بیش قدر مضامین نکلے ان سے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند کے ممتاز عربی مصنفین میں ان کا شمار ہوا۔ ان کی اردو تحریریں بھی سلاست زبان کے ساتھ اعلیٰ علمی و تحقیقی معیار متعین کرتی ہیں۔"

ظل الرحمٰن ندوی

اجمل خاں طبیہ کالج۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"محمد میاں آپ کی علمی، دینی، ادبی اور فکری شخصیت کا عکس جمیل تھے، ان کی وفات تمام عالم اسلام کے لئے ایک زبردست سانحہ ہے۔

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

ابوالمجاہد زاہد

درسگاہ جماعت اسلامی رامپور

"مرحوم کی ذات ملی اور علمی امیدوں کا مرکز تھی۔ ۔ ۔ توقع تھی کہ آپ کے خاندان کی علمی اور دینی روایات انکے ذریعہ اور زیادہ مضبوط ہونگی، مشیت کے معاملات میں انسان کتنا مجبور ہے۔"

پروفیسر خلیق احمد نظامی، شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"ان کے لئے تو یہی خیال ہوا کرتا تھا کہ یہ اپنے دادا صاحب، والد صاحب اور چچا جان کی جانشینی کریں گے۔ مگر۔۔۔۔۔!"

مولانا افتخار فریدی۔ مراد آباد

"یہ پورے حلقۂ ندوہ اور ملت اسلامیہ کا حادثہ ہے۔ محمد الحسنی اس خانوادہ کے فرد تھے جو کئی صدیوں سے اس ملک میں دین و ملت کی اصلاح و تجدید کا کام کر رہے تھے، شاید اس مصرعہ کا مصداق اس خاندان سے زیادہ کوئی نہیں ؎

این خانہ ہمہ آفتاب است

مولانا مجیب اللہ ندوی۔ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ

"موصوف کی عظیم تر علمی اور قلمی صلاحیتیں عرب و عجم کو اپنا معترف بنا چکی تھیں... یقین تھا کہ خانوادہ عامرہ کی مثالی خدمات سے دیر تک ملت کو مستفید ہونے کا موقعہ ملیگا لیکن مشیت ربانی میں مجال دم زدن نہیں ہے۔"

مولانا محمد سالم صاحب۔ دارالعلوم دیوبند

"عزیز گرامی قدر ابھی غنچۂ نوشگفتۂ چمن علم و عمل ہی تھے مگر ان کی شمائل و فضائل کی عطر بیزی سے عرب و عجم کے ارباب علم و فضل محظوظ ہو رہے تھے۔ ... جناب والا کے تو وہ قوت بازو اور قرۃ العین تھے ہی، مگر ملت کے بھی وہ آپ کے متوقع جانشین کی حیثیت سے مرجع آمال تھے مگر مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔"

قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

"یہ ایک ایسا سانحہ ہے جس کو علمی و تحقیقی حلقوں میں مدتوں غم و الم کے ساتھ یاد رکھا جائے گا اور قلب و دماغ مدتوں اس کو فراموش نہ کریں گے۔"

مولانا نسیم احمد فریدی۔ امروہہ

"موجودہ دور میں جب کہ اسلامی صحافت غیر اسلامی ادب و صحافت سے فیصلہ کن جنگ کر رہی ہے اور دنیا کے مسلم نوجوان ملحدانہ افکار و خیالات سے اکتا کر اسلام کے سایہ

میں تیزی سے آرہے ہیں امت مسلمہ کو موصوف کے زبان و قلم کی بہت ضرورت تھی۔"

مولانا محمد باقر حسین، مولانا معاذ الاسلام و دیگر اساتذہ

مدرسہ امدادیہ مراد آباد۔ یوپی

"ایسا حادثہ جس پر مہینوں کے بعد بھی شاید صبر نہ آئے نوجوان صالح، اسلامی فکر و عمل کا پیکر، رواں دواں قلم کا مالک، مجاہد خاندان کا چشم و چراغ، امت کا ہونہار فرزند جس کے قلم نے بہت کم دنوں میں بڑی اہم خدمات انجام دیں۔"

مولانا ظفیر الدین صدیقی۔ دار الافتاء۔ دار العلوم دیوبند

"اپنے حلقہ میں یہ بات پوری قوت سے کہتا تھا کہ حضرت مولانا علی میاں کے جانشین مولانا محمد الحسنی ہوں گے۔ قضائے الٰہی کے آگے کسی کی کیا مجال۔ ہم خدام نہ صرف آپکے شریک غم ہیں بلکہ مستحق تعزیت ہیں۔"

مولانا احمد علی قاسمی۔ مسلم مجلس مشاورت دہلی

"ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم اور جناب سے خصوصی تعلق کی بنا پر میں اس کو اپنا ذاتی نقصان تصور کرتا ہوں۔"

مولانا رشید الدین مدرسہ شاہی مراد آباد۔ یوپی

"مرحوم کے انتقال سے جو علمی خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا دشوار ہے۔"

محمد اقبال انصاری ندوی۔ علی گڑھ

"ایسے صالح باعلم و عمل غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں کسی ایک کا اٹھ جانا بھی مستقبل کی کمر توڑ دیتا ہے۔"

حکیم شکیل احمد شمسی۔ لکھنؤ

"مرحوم کی عمر، صلاحیتوں اور خدمات کے پیش نظر یہ سانحہ ہم سب کے لئے زبردست خسارہ ہے۔"

مرزا عبد الستار بیگ

سکریٹری آل انڈیا خلافت کمیٹی۔ بمبئی

"ایسے متبحر جوان العمر عالم کی اچانک موت سے ہم سب کو جو دھچکا پہنچا ہے وہ تو ایک انفرادی معاملہ ہے لیکن ملت کو جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی مشکل ہی سے ہوگی۔"

ظفر احمد صدیقی ایڈوکیٹ۔ دینی تعلیمی کونسل لکھنؤ

"کتنا عظیم ملی خسارہ ہے، اور آپ کے لئے اور آپ کے تمام متوسلین کے لئے کتنا عظیم حادثہ۔ اور کچھ لکھنے کی ہمت نہیں۔"

قاضی محمد عدیل عباسی۔ بستی

"انسان بڑی محنتوں اور مشکلوں سے کسی قابل بنتا ہے پھر ایک دم اس کی جدائی کس قدر شاق ہوتی ہے ... مرحوم کیا تھے، ملت کی توقعات ان سے کیا وابستہ تھیں، آپ کو کس قدر لگاؤ تھا اور نہ معلوم کیا کیا باتیں بے چین کئے ہوئے ہیں۔"

مولانا محمد تقی امینی۔ سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

".... سچ یہ ہے کہ رونے کو جی چاہتا ہے مگر یہاں کون ہے کس سے مل کر روؤں، یہ کیسا حادثہ ہوگیا اللہ ہی اپنی مصلحتیں جانتا ہے، بس اس کی بارگاہ علم وحکمت میں سر تسلیم خم ہے۔"

مولانا عتیق الرحمن سنبھلی۔ مقیم حال لندن

"ایسے ہونہار، ذی علم، متقی اور پرہیزگار بھتیجے کی واقعی جدائی سے آپکو جتنا ملال ہوا ہو کم ہے۔"

محمد یونس سلیم۔ دہلی

"علم وفضل کے ساتھ ان کی نیک نفسی قابل رشک تھی۔ کیا بات ہے کہ ایسے چنے ہوئے اور منتخب افراد جن کی یہاں ضرورت ہے وہ جلد وہاں طلب کر لئے جاتے ہیں۔"

شاہ عون احمد قادری۔ پھلواری شریف۔ پٹنہ

"افسوس کہ مولانا دین وملت کی جو خدمات فرمارہے تھے اس سے محرومی ہوگئی۔"

مولانا ابوبکر اصلاحی

جامعۃ الفلاح۔ بلریاگنج۔ اعظم گڑھ

"خبر سنتے ہی عجیب سا اثر دل ودماغ پر ہوا، اتنے بڑے عالم ہونے کے باوجود

ان کی سادگی اور لوگوں کے ساتھ اخلاص سے ملنا اور خوش اخلاقی ان کی عظمت میں اضافہ کا سبب ہے۔"

حاجی علاء الدین حاجی محمد۔ بمبئی

"واقعہ تو یہ ہے کہ یہ پورے طبقہ علم و دانش کے لئے ایک بڑا حادثہ ہے، خاص طور پر ان حالات میں جب کہ علم و عمل کا میدان کچھ روکھا پھیکا جا رہا ہے۔"

مولانا محمد شفیع مونس۔ لکھنؤ

"اس حادثہ سے عالم اسلامی کو جو نقصان پہنچا ہے قحط الرجال کے دور میں اسکے ازالہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

مولانا عبد الرؤف رحمانی
جھنڈانگر۔ نیپال

ملت اسلامیہ کے اس مایۂ ناز فرزند کی اچانک رحلت نے ہمارے دل ہلا دیے، ہر جگہ میں نے لوگوں کو مغموم پایا، میرے اس سفر میں آخری قیام کراچی میں ہوا، وہاں مولانا ناظم صاحب ندوی خصوصیت سے ذکر فرما رہے تھے اور بڑی شفقت اور محبت سے مرحوم کے پچھلے سفر کراچی کے بعض فوٹو دکھاتے رہے۔

مزمل حسین صدیقی ندوی
نیویارک

لکھنؤ

تعمیر حیات

ہندوستان

کی

خصوصی اشاعت

بیادگار

مولانا اسحاق جلیس ندوی

چند اہم اہل قلم

مولانا ابوالحسن علی ندوی
مولانا محمد منظور نعمانی
مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل
ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی
حکیم عبدالقوی دریابادی
مولانا محمد رابع حسنی ندوی
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی
عبدالکریم پاریکھ
ڈاکٹر سید انور علی
شمس الحق ندوی

۲۰ جنوری ۶۲ء

باسمہ سبحانہ

نشانِ خط مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم

عنایت نامہ نے سرفراز کیا ۔ نادم ہوں کہ میرے خط کے استفسار کی زحمت حضرت والا کو برداشت کرنی پڑی ۔ مجھے اپنی کوتاہ قلمی پر خود کوفت ہوتی ہے ۔ میری یہ کوتاہی اکثر میرے کرم فرماؤں کی زحمت و عتاب کا باعث بن جاتی ہے ۔

حضرت والا کا عنایت نامہ دیکھ کر جی خوش ہوا ۔ اس کو بار بار پڑھا اور کئی بار دہرایا والا مضمون میرے حق میں درست ثابت ہو رہا ہے ۔ اللہ تعالیٰ وہ دن جلد لائے کہ جب میں حضرت والا کے قدموں کے سائے میں پھر مستعد ہو سکوں ۔ مجھے یہاں کا لمحہ لمحہ بھاری ہو رہا ہے ۔ دنیا کی ہر مصلحت کو ٹھکرا کر وہاں کا قصد کر رہا ہوں اور پھر حضرت والا کے سایۂ عاطفت میں مجھے دنیا کی ہر مصلحت بھی حاصل ہو سکتی ہے ۔ کسی اعلیٰ مقصد سے اٹھائی جانے والی تکلیف بھی تکلیف معلوم نہیں ہوتی ۔ میں کبھی ان دعاؤں کو فراموش نہ کر سکوں گا اس لیے کہ حضرت والا کی شفقت و محبت مجھے اول روز سے میرے خواب سے بڑھ کر اطمینان ہوا کہ میرا خواب ... حضرت والا کے خیال و تحریر کی تصدیق و تائید ہوتی ہے ۔

خوشا مراتب خوابے کہ بہ ز بیداری است

وسط اپریل میں سالانہ امتحانات ہوں گے ۔ اور آخر اپریل تک رہائی ۔ یہاں کے مراحل (انشاء اللہ) آسانی سے حل ہو جائیں گے ۔ صرف والدین کی رضامندی کا مسئلہ ہے ۔ دعا فرمائیے کہ (اللہ تعالیٰ) میرا رخ اور مشکلات کو دور فرمائے ۔ ہمشیرہ، بہنوئی صاحب اور بچوں کی ابھی تک کوئی خیریت معلوم نہ ہو سکی ۔ دعاؤں کی درخواست ہے ۔ والسلام ۔ خادم اسحاق

اسحاق جلیس ندوی

حیات و خدمات ایک نظر میں

سنہ ۱۹۳۴ء ۶ر جولائی۔ پیدائش

سنہ ۱۹۵۶ء ۱ر جون۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں بغرض تعلیم داخل ہوئے۔

سنہ ۱۹۵۹ء (سنہ ۱۳۷۸ھ) عالمیت پاس کیا۔

سنہ ۱۹۶۱ء (سنہ ۱۳۸۰ھ) فضیلت پاس کیا اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام سے وابستہ ہوئے۔

سنہ ۱۹۶۳ء (جون) مجلس میں آفس سکریٹری مقرر ہوئے اور سنہ ۶۴ء میں احمد نگر چلے گئے۔

سنہ ۱۹۶۵ء (اگست) ندوہ آئے اور مجلس مشاورت کے اجلاس تأسیسی پر بہار اشٹر کے وفد کے ساتھ شریک ہوئے۔

سنہ ۱۹۷۰ء (مارچ میں) سکنڈری اسکول اکزامینیشن پاس کیا اور لیڈی حوّا بائی گرلس ہائی اسکول میں ملازمت کی۔

سنہ ۱۹۷۱ء (اکتوبر) کتب خانہ ندوۃ العلماء کی تنظیم جدید کے لئے بلائے گئے اور دسمبر میں واپس چلے گئے۔

سنہ ۱۹۷۳ء (مئی) مستقل طور پر تعمیر حیات اور کتب خانہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔

سنہ ۱۹۷۴ء (دسمبر) تحریک پیام انسانیت کا آغاز الٰہ آباد سے ہوا اور اس میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا۔

سنہ ۱۹۷۵ء ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ تعلیمی اجلاس ہوا اس موقع پر علمی و تاریخی نمائش کا اہتمام کیا۔

سنہ ۱۹۷۶ء (نومبر) ریاض کی مؤتمر الفقہ میں شرکت کے لئے سعودی عرب کا سفر کیا، حج و زیارت سے شرف یاب ہوئے اور کویت اور خلیج کی امارات کا دورہ کیا۔

سنہ ۱۹۷۸ء (جولائی) پاکستان کا سفر کیا اور پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔

سنہ ۱۹۷۹ء (مئی) تحریک پیام انسانیت کے سلسلہ میں کرناٹک کا دورہ کیا۔

سنہ ۱۹۷۹ء (۱۱ر جولائی) وفات، لکھنؤ میڈیکل کالج میں۔

سنہ ۱۹۷۹ء (۱۲ر جولائی) وصیت کے مطابق مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے خاندانی قبرستان تکیہ کلاں، رائے بریلی میں مدفون ہوئے۔

تصنیفات: تاریخ ندوۃ العلماء (اس کا صرف ایک حصہ مکمل کر سکے تھے) اسلامیات پر انگریزی لٹریچر۔ برصغیر کے چند سفرنامے جو جلد شائع ہونے والے ہیں۔

(مرتبہ، نعمت اللہ ندوی)

مولوی اسحاق جلیس ندوی مرحوم

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ہمارے دینی عربی مدارس عرصۂ دراز سے ہر قسم کے ہنگامہ سے دور، اور زندگی کے سمندر میں خاموش اور الگ تھلگ جزیروں کی حیثیت رکھتے ہیں، ہندوستان میں انگریزوں کے عہد سے جو تعلیمی انقلاب شروع ہوا، پھر اس ملک میں جو سیاسی، اقتصادی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کے نتیجہ میں آسودہ حال، ذہین وباصلاحیت خاندانوں کے بچے اور ہونہار نوجوان زیادہ تر اپنے شہروں اور قصبات کے اسکولوں، کالجوں اور اگر اس سے زیادہ حوصلہ مندی اور وسائل ہوئے تو پھر اٹاوہ کے اسلامیہ اسکول اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی بھیجے جاتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے یہ قومی ادارے اور جدید تعلیم کے مرکز مسلمان "شاہین بچوں" کا مرکز بن گئے، اور انہی نے دور آخر میں انگریزی زبان کے ادیب و انشاء پرداز، سیاسی اور قومی میدان کے خطیب و مقرر اور محکموں کے اعلیٰ افسر، قانون ساز مجالس کے ممبر، وزارت و حکومت میں حصہ لینے والے پیدا کئے، ہونا تو نہیں چاہیئے تھا مگر ہوا یہی کہ عام طور پر جن سرپرستوں اور والدین کے پاس اعلیٰ تعلیم دلانے کے وسائل نہیں تھے (یا ان پر کسی وجہ سے دینی جذبہ کا غلبہ تھا) وہ اپنے بچوں کو عربی مدارس میں بھیجتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں پڑھنے والوں کی بڑی تعداد، جدت فکر، "جرأت اندیشہ" اور طباعی کے اس جوہر سے محروم ہوتی جو اقتصادی، نسلی فطری اور روایتی اسباب کی بنا پر جدید دانش گاہوں کے حصہ میں زیادہ آئی۔

لیکن نہ یہ عربی مدارس کے حق میں کوئی کلیہ تھا جس میں کوئی استثناء نہیں، نہ جدید دانش گاہوں کے حق میں، دونوں طرف بہ کثرت استثنائی مثالیں ملتی ہیں، جدید تعلیم گاہوں میں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پانے والوں کی ایک بڑی تعداد ذہانت و جرأت کے جوہر سے محروم، لکیر کی فقیر اور رٹے ہوئے طوطوں کی طرح اپنے ذہن و دماغ سے کام لینے کے جوہر سے عاری ہے اور اس کے برخلاف مدارس میں تعلیم پانے والے سادہ اور محدود ماحول میں زندگی گزارنے والے طلباء میں ایسے لوگ نکلتے رہتے ہیں جن میں بعض اوقات عقابی روح اور شاہین کا جگر ہوتا ہے، لیکن عام طور پر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی اچھی کان کا ہیرا یا کسی

پھلنے پھولنے والے باغ کا ثمر نورس، کسی علمی اور دینی خاندان کا نونہال (جس کے سلسلہ میں پشتہا پشت سے علم اور ذہانت چلی آرہی ہے) آجاتا ہے، پھر انہی مدارس سے ایسے فضلا نکلتے ہیں جن کی ذہانت وطباعی، جرأت وہمت، خود اعتمادی وخودشناسی، شخصیت کی دلآویزی ودلربائی، قوت تقریر وتحریر کے سامنے کسی بڑی سی بڑی ملکی یا بیرونی دانش گاہ کے فضلا، اور مغربی زبان کے ماہرین کا چراغ نہیں جلتا، وہ جس میدان کی طرف رُخ کرتے ہیں اپنی ذہنی وعلمی صلاحیت، اپنی قوت عمل اور اپنے امتیاز کا نقش قائم کر دیتے ہیں اور اقبال کا یہ شعر تخ بستہ مدارس پر بھی صادق آتا ہے کہ ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تُند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

اس کی بڑی بڑی مثالیں دی جا سکتی ہیں، اور قدیم نظام تعلیم کے ساختہ پرداختہ اور عربی مدارس کے ایسے فضلاء کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں، جن کا سارے ہندوستان نے نہیں بلکہ ساری دنیا نے لوہا مان لیا اور اُن سے ہندوستان کا نام روشن ہوا، انھوں نے آزادی کی تحریک میں قائدانہ کردار ادا کیا، عربی، فارسی، اور اُردو کتب خانوں کو اپنی بلند پایہ تصنیفات سے مالامال کر دیا، اپنے ملک کی زبان وادب کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی اپنی برتری اور انفرادیت ثابت کر دی، تاریخ وتحقیق کی طرف متوجہ ہوئے تو اس میدان میں بھی جھنڈے گاڑ دیئے، سیاست کی طرف رخ کیا تو اس میدان میں بھی اپنی ضرورت تسلیم کرالی، یہ فہرست بہت طویل ہے اور ان باوقار ناموں کے درج کرنے میں یہ نزاکت بھی ہے کہ کہیں کوئی اہم نام چھوٹ جائے اور یہ بھی خطرہ ہے کہ ان سے مماثلت نہ سمجھ لی جائے، کہنا صرف یہ ہے کہ ان مدارس میں بھی وقتاً فوقتاً ایسے بچے یا نوجوان آجاتے ہیں جن میں فطری یا خاندانی طور پر ذہانت وطباعی کا خداداد جوہر ہوتا ہے، ان کی طبیعت میں اخذ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی صلاحیت، ان کی فطرت میں وہ بے چینی وبیتابی ہوتی ہے جو بعض اوقات ان کو ایک شعلۂ جوالہ بنا دیتی ہے، قسمت سے اگر کسی ادارہ کو ایسے کچھ نوجوان مل جائیں اور وہ بھی اقبال کے مصرعہ ؏

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

پر نظر رکھتے ہوئے کسی جماعت سے منسلک ______ یا کسی دعوت سے مربوط رہیں تو بڑا کام کر لیجاتے ہیں اور ملت کے لیے بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہمارے جوان سال وجواں مرگ لائق رفیق وعزیز مولوی اسحاق خاں ندوی تھے۔ ۱۹۵۶ء میں[1] دارالعلوم میں ایک نوجوان نظر آیا، بلند و بالا قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کتابی چہرہ چوڑی پیشانی اور فراخ اور روشن آنکھیں، معلوم ہوا کہ یہ افغانی النسل، ہندی الوطن لڑکا ہے، اس کے والد (مولوی عبدالستار خاں صاحب) احمد نگر کے (جو ہندوستان کا ایک بڑا فوجی مرکز ہے) ملٹری سنٹر کے جامع مسجد کے امام اور فوج کے مولوی ہیں، ہندی مراٹھی، ابتدائی انگریزی اور عربی وہیں کے اسکول اور مدرسہ میں حاصل کی۔ اب آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی اللہ کے بندے کے مشورہ اور تحریک سے یہاں آئے ہیں پشتو اب بھی ان کے خاندان میں بولی جاتی ہے اور یہ خود بھی بول لیتے ہیں، تھوڑے دن کے بعد جب زیادہ ملنا جلنا ہوا تو معلوم ہوا کہ ان کے والد سخت کٹر بریلوی عقائد کے ہیں، مزاجاً نہایت سخت، غصہ ور بے لوچ ہیں، مزاج میں ضد ہے، آدمی ذاکر شاغل اور خوش اوقات ہیں۔ اخوند صاحب سوات (حضرت حاجی عبدالغفور نقش بندیؒ) کے سلسلہ میں کسی شیخ سے بیعت ہیں۔ معلوم نہیں کس طرح وہ اپنے بیٹے کو ندوہ بھیجنے پر راضی ہوگئے، باپ بیٹے میں مزاجوں کا بڑا تباین اور مسلک کا اختلاف ہے، گھر بھی بعض خاص وجوہ کی بنا پر خانگی کشمکش کی آماجگاہ ہے، اسحاق خاں کی والدہ کا عرصہ ہوا انتقال ہوچکا ہے، والد نے دوسری شادی کرلی ہے، اور اس طرح وہ شفقتِ مادری اور کسی حد تک محبتِ پدری سے بھی محروم ہیں۔

دن گزرتے گئے، مولوی اسحاق خاں حالات کا مقابلہ کرتے رہے اور دارالعلوم میں پڑھتے رہے۔ تھوڑے ہی دن میں ان کے جوہر کھلنے لگے، چستی و مستعدی، ہمت وجرأت اور ذہانت و وجاہت انھوں نے وراثت میں پائی تھی، جو کام سپرد کردیا جائے بہت جلد وقت میں خوبی کے ساتھ انجام دیتے، پڑھنے میں بھی اچھے تھے اور اجتماعی ومجلسی کاموں میں تو بہت مستعد و پیش پیش، طلبا کی انجمن الاصلاح سے تعلق پیدا ہوا تو ان کی تقریر اور تنظیمی صلاحیت کے جوہر کھلے، وہ بہت جلد طلبا میں ہردلعزیز اور معتمد علیہ بن گئے، کتب بینی اور مطالعہ کا ان کو شوق تھا، اُردو کا بہت بڑا لٹریچر انھوں نے پڑھ لیا، اخبارات ورسائل اور سیاسیات سے

---

[1] ان کا دارالعلوم میں داخلہ ۶ جون ۱۹۵۶ء کو درجہ پنجم میں ہوا، وہ مرہٹی کا سکنڈری امتحان کا سرٹیفکٹ حاصل کرچکے تھے، اور ابتدائی عربی مقامی مدرسہ میں پڑھ کر آئے تھے، ان کے سرٹیفکٹ پر پیدائش کی تاریخ، جولائی ۱۹۳۴ء لکھی ہوئی ہے، اس طرح وہ جب دارالعلوم آئے تو ان کی عمر ۲۲ سال ہوگی۔

بھی دلچسپی تھی، جدید مضامین وہ کچھ پڑھ کر آئے تھے، کچھ یہاں کے مطالعہ سے اور پڑھ لیا، کوئی بڑے سے بڑا آدمی آتا تو اس سے بات کرنے اور اس کے ساتھ رہنے میں ان کی آنکھ نہ جھپکتی، وہ بھی ان کی ذہانت اور خوش تقریری سے متاثر ہوتا۔ دارالعلوم کے اساتذہ اور کارکنوں میں وہ راقم السطور سے زیادہ قریب اور مانوس تھے، تبلیغی کام میں بھی جس کا مرکز اس زمانہ میں شہر میں تھا وہ دلچسپی لینے لگے، ان کے ماموں پہلے سے بھی تبلیغی جماعت سے منسلک تھے۔ انھوں نے ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۹ء) میں عالمیت پاس کیا اور ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۱ء) میں فضیلت کے آخری سال کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے، اس درجہ کی کامیابی کے لیے ایک تحقیقی مقالہ عربی میں لکھنا ضروری ہوتا ہے، ان کے مقالہ کا عنوان تھا تدوین الفقہ فی الہند اُن کو اس میں ۱۰۰/۷۰ نمبر ملے۔

مولوی اسحاق صاحب کچھ تو خانگی حالات کی وجہ سے، کچھ والد صاحب کے مزاج و مسلک سے عدم توافق کی بنا پر اور کچھ فطرتاً بے چین طبیعت کے واقع ہوئے تھے، اور یہ اکثر ذہین نوجوانوں کی خصوصیت ہے یہ بےچینی اور طبیعت کی ہمہ گیری اکثر اوقات عدم استقلال اور تلون پیدا کر دیتی ہے اور جب اس کو کنٹرول میں رکھنے والی کوئی شخصیت یا طاقت نہیں ہوتی تو اکثر ایسے نوجوانوں کو ضائع ہوتے دیکھا ہے، مولوی اسحاق خاں بھی سالہا سال سے اس خطرہ سے دوچار رہے، وہ خود اپنی اس کمزوری یا آزمائش کو سمجھتے تھے، اور ان کے خطوط میں اس کا بکثرت اظہار اور اس کا شکوہ ہے، اس کی وجہ سے وہ زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے گزرے، متعدد اور بعض اوقات متضاد میدان اختیار کئے اور اگرچہ اپنی ذہانت، قوت عمل اور خلوص کی وجہ سے ہر میدان میں انھوں نے کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل کی اور اپنے رفقاء میں وہ جلد ہر دلعزیز بن گئے لیکن ان کی طبیعت کو سکون حاصل نہ ہوا، لیکن ایک اطمینان کی بات یہ تھی کہ ان میں فطری طور پر سعادت تھی اور انھوں نے مجھ سے مستقل رابطہ قائم رکھا اور یہ طے کر لیا کہ وہ میرے مشورے اور حکم پر عمل کریں گے۔

دارالعلوم کی چھٹیوں میں وہ احمد نگر جاتے تھے، وہ اپنے والد ماجد کے بدستور نہایت سعید فرزند تھے ان کے حکم کی حتی الامکان تعمیل کرتے تھے اور ان کے فرائض منصبی میں بھی ہاتھ بٹاتے تھے۔ ۱۲ر رمضان المبارک ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۸ء) کے ایک خط میں انھوں نے اطلاع دی ہے کہ وہ فوجی سنٹر کی مسجد میں تراویح کے بعد درس حدیث دیتے ہیں، جس میں نمازی جو تمام تر فوجی ہیں، دلچسپی سے شریک ہوتے ہیں، ہفتہ میں ایک بار تقریر کا پروگرام ہوتا ہے، جس میں مسلمان فوجی سپاہیوں اور افسروں کے علاوہ، ہندو، سکھ سپاہی

اور آفیسر بھی شریک ہوتے ہیں، طرز "پیام انسانیت" کا ہوتا ہے، تبلیغی کام بھی جاری ہے۔

یہ چھ صفحے کا ایک طویل خط ہے جس سے اظہار ہوتا ہے کہ ان کو اپنی خامیوں کا شدید احساس اور ان پر سخت گھٹن ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ "ان باتوں پر غور کر کے اب مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ندوہ پہنچائے تو اپنے آپ کو آپ کے حوالہ کردوں گا، والد صاحب نے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے دی ہے، میں آپ کی علمی رہنمائی اس سے بھی زیادہ آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کا متمنّی ہوں۔"

میں نے جواب میں لکھا کہ دارالعلوم کے طلباء کی بڑی تعداد میں آپ پر خصوصیت کی نگاہ پڑتی تھی، اور ہمیشہ چاہا کہ آپ کی ذہنی صلاحیت پرورش پائے اور اس سے آپ بھی فائدہ اٹھائیں اور ملّت کو بھی اس سے فائدہ اور فیض پہنچے۔

۱۹۵۹ء میں مجلس تحقیقات و نشریات دارالعلوم میں قائم ہو چکی تھی جس کا بڑا مقصد جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے رابطہ پیدا کرنا، اس کے لیے مؤثر و دلآویز اسلامی لٹریچر، انگریزی، اُردو اور علاقائی زبانوں میں شائع کرنا اور اس "ذہنی اور تہذیبی ارتداد" کے خطرہ کا مقابلہ کرنا تھا، جس کی نشاندہی بڑی وضاحت و قوت کے ساتھ راقم نے اپنے عربی رسالہ " ردة ولا ابابکر لها " میں کیا تھا، اور جس کا اردو ترجمہ "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" اور انگریزی ترجمہ " the new Menace and its Answer "کے نام سے شائع ہوا اس مجلس میں آفس سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے اپنے حلقہ و فضلائے دارالعلوم میں مولوی اسحاق جلیس سے زیادہ کوئی موزوں نظر نہیں آیا، ان کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی۔ ۱۹۶۱ء سے انھوں نے اسی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا، اور اچھی صلاحیت کا اظہار کیا، لیکن ان کی ذہنی کشمکش (جس کو ان کے خانگی حالات، زندہ و متحرک کرتے رہتے تھے) دور نہ ہوئی، ان کو خود بھی اس کا احساس تھا کہ ان کی طبیعت عجلت پسند اور انقلابی واقع ہوئی ہے، اسی کے ساتھ ان کو تعلق مع اللہ اور قلب کی اصلاح کی اہمیت کا بھی احساس رہا اس کشمکش سے وہ ایک مرتبہ مغلوب ہو کر کوئی لمبی چھٹی لے کر احمد نگر چلے گئے اور وہاں کے قیام پر غور کرنے لگے۔ میں نے ۲ فروری ۶۲ء کو کویت سے ان کے نام جو خط لکھا ہے اس میں یہ جملے آئے ہیں۔

"آپ کی صلاحیتوں کا مجھے پورا احساس ہے، اس لیے آپ کو چھوڑتا نہیں، اور آپ کے احمد نگر کے مستقل قیام سے ہمیشہ اختلاف کرتا رہا .... آپ مایوسی اور احساس کہتری کو دور کریں ...."

برخود نظر کشاز تہی دامنی مرنج　　　در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

انھوں نے اس کے جواب میں لکھا۔

"شفقت نامہ نے سرفراز کیا، برخود نظر کشاز تہی دامنی مرنج ۱۸؍ کو انجمن الاصلاح کے ایک کتبہ میں بار ہا پڑھا تھا، مگر حضرت والا کے عنایت نامہ میں اس حیات بخش پیغام کو دیکھ کر اثر ہی کچھ اور ہوا۔ اور" بنا ہے شہ کا مصاحب" کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔"

لیکن ان میں قوت فیصلہ کی کمی تھی اور متضاد حالات کا شکار تھے جس نے ان کی قوت ارادی کو کمزور کر دیا تھا، غالباً مئی ۱۹۶۳ء تک وہ احمد نگر ہی رہے جون ۱۹۶۳ء میں پھر مجلس آ گئے اور آفس سکریٹری اور لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام شروع کر دیا، اس عرصہ میں ان کے والد صاحب نے جو ضعیف ہو گئے تھے اور بیمار رہنے لگے تھے، اپنی جگہ ان کے لیے فوج میں مستقل ملازمت کی کوشش کی اور اس کی ضرورت و منافع بتاتے ہوئے مجھے ایک طویل خط لکھا، میں اس کو ایسے باصلاحیت انسان کے حق میں خودکشی کا مرادف سمجھتا تھا اور مولوی اسحاق صاحب کا رجحان بھی نہ تھا، میں نے ان کے والد صاحب کو ۲۶ اگست ۱۹۶۳ء کو خط لکھا جس میں اس سے اختلاف ظاہر کیا اور موصوف سے درخواست کی کہ وہ ان کو اسی لائن میں رہنے دیں جس میں وہ ہیں میں نے لکھا کہ۔

"عزیز موصوف کو اللہ نے بڑی اچھی علمی و ذہنی صلاحیت عطا فرمائی ہے، اور وہ اسی کام کے اہل ہیں جو وہ کر رہے ہیں، آپ جو ملازمت ان کے لیے تجویز کر رہے ہیں، اس میں ان کا کامیاب ہونا مشکل ہے اور وہ ہمیشہ ذہنی انتشار میں مبتلا رہیں گے۔"

لیکن وہ اپنی اسی ذہنی کشمکش اور قوت فیصلہ کی کمی کی وجہ سے مجلس سے تعلق کو زیادہ دن قائم نہ رکھ سکے اور پھر احمد نگر پہونچ گئے لیکن وہاں جا کر بھی مطمئن نہیں ہوئے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"احمد نگر میں تو قیام کا ارادہ نہیں، کیونکہ چھوٹا شہر ہے، اور اختلافات کی کثرت، پونا یا بمبئی کا خیال ہے ان دونوں مقامات پر صحافتی کام اور ہائی اسکول یا کسی اُردو میڈیم کالج میں کوئی کام کیا جا سکتا ہے اگر ممکن ہوا تو بمبئی سے ڈائجسٹ کے اجراء کا جائزہ لینے کا خیال ہے۔

قربت و تعلق سے محرومی کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے لکھنے پڑھنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں گویا سلب ہو گئی ہیں۔"

پونہ کے زمانہ قیام میں انھوں نے اپنی انگریزی استعداد بڑھائی اور مارچ ۱۹۷۰ء میں سکنڈری اسکول سرٹیفکٹ اکزامینیشن پاس کرلیا۔

۱۹۷۰ء میں وہ اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق پونا منتقل ہوگئے اور وہاں لیڈی حوّا بائی گرلس ہائی اسکول میں ملازمت کرلی لیکن وہاں سے بھی وہ اپنے خطوط میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے رہے اور ان کو ہمیشہ یہ خیال تکلیف دیتا رہا کہ انھوں نے میرے مشورہ اور منشا کے خلاف عمل کیا اور اپنی لائن بدل دی ہے، اس سلسلہ میں وہ مجھے برابر خط لکھتے اور اس طرح اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے رہے، بالآخر ان کو میں نے ایک مفصل خط لکھا جس میں ان کی ان ذہنی آزمائشوں کا صفائی سے ذکر کیا جو ان کے لیے پریشانی کا باعث اور ترقی کی راہ میں مانع بنی ہوئی ہیں، اس خط کا ایک اقتباس درج ذیل ہے اس لئے بھی وہ نقل کیا جارہا ہے کہ وہ گوناگوں صلاحیتیں رکھنے والے بہت سے بےچین نوجوانوں اور "تازہ واردان بساطِ عمل" کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔ میں نے لکھا کہ۔

"آپ کی دقت اور آزمائش یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں وہ ایک وسیع علمی و دینی ماحول کی طالب ہیں، اور آپ اپنی بےچین طبیعت اور ذکاوتِ حس کی وجہ سے اس ماحول کی وقتی مشکلات اور فطری مرحلوں پر (جو عبوری ہوتے ہیں) صبر نہیں کرپاتے۔ اگر آپ عجلت میں یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ نہ کرتے تو اس وقت تک بہت مفید کام انجام دے چکے ہوتے، بہرحال جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا، اب آپ عزم و فیصلہ کے ساتھ اپنے کسی ایسے بہی خواہ اور واقف کار پر اعتماد کریں جو آپ کی صلاحیتوں سے واقف بھی ہو، اور آپ کے اندر فیصلہ کرنے اور حالات کا مقابلہ کرنے کی جو کمی ہے اس کو پورا کرسکے اور زمام کار اس کے حوالہ کردیں۔ ع

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ"

احمد نگر کے اس قیام کے زمانہ میں وہ خاص خاص موقعوں پر لکھنؤ آتے رہے، کچھ دن قیام کرتے اور اس زمانۂ قیام کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے، جس سے ان کی تنظیمی و تحریری صلاحیت کا ایسا اظہار ہوتا کہ پھر منہ میں پانی بھر آتا کہ یہ ادارے اور جماعت سے منسلک رہیں اور اپنی صلاحیتوں کو ایک ہدف اور نشانہ پر لگائیں اگست ۱۹۶۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مسلم مجلس مشاورت کا تاسیسی تاریخ ساز اجلاس منعقد ہوا جس کو ہندوستان کی ملت اسلامی کی تاریخ میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، مولوی اسحاق صاحب نے

اس کے انتظامات میں مدد کی، پھر اس جلسہ کی کارروائی اور اس کی تصویر کشی اتنی خوبی اور کامیابی سے کی کہ ان کی صحافتی اور تحریری صلاحیت نمایاں ہو کر سامنے آگئی، اس میں صرف ان کی تحریری صلاحیت ہی کا اظہار نہ تھا، ان کا جذبہ بھی شامل تھا جس نے اس میں جان ڈال دی تھی۔

اسی زمانہ میں وہ پونا سے ایک موقر و معزز وفد لے کر لکھنؤ آئے، جس نے پورا سفر کار سے طے کیا تھا، اور جس میں شہر کے اچھے قومی ملی کام کرنے والے اور فعال اور صاحب فکر مسلمان تھے، مقصد یہ تھا کہ شمالی ہند کے مسلم رہنماؤں بالخصوص مجلس مشاورت کے ذمہ داروں سے مل کر راہ عمل دریافت کی جائے اور کام کا پروگرام معلوم ہو۔ اس وفد نے لکھنؤ اور دہلی کا سفر کیا، اس کے روح رواں مولوی اسحاق صاحب ہی تھے۔

پونا کے دوران قیام میں وہ شہر کی قومی، سیاسی اور تعلیمی زندگی اور تحریکوں میں نہ صرف دخیل رہے بلکہ پیش پیش، وہ جس اسٹیج پر پہنچ جاتے اور جس پلیٹ فارم سے خطاب کرتے چھا جاتے، اُردو اور مراٹھی زبان پر قدرت، بیچ بیچ میں انگریزی زبان سے مدد لینا، حالات حاضرہ سے واقفیت، ملک کی سیاسیات میں خود اپنا مطالعہ اور ذاتی خیال پھر سب سے بڑھ کر خلوص اور جوش، پورے جلسہ پر حاوی ہو جاتے اور اکثر جلسہ کو لوٹ لیتے۔

لیکن ان سب مشغولیتوں اور کارگزاریوں کے ساتھ ان کا دل اندر سے مطمئن نہ تھا اور ان کو یہ محسوس ہوتا رہتا تھا کہ جیسے انھوں نے میدان جنگ سے فرار اختیار کیا ہے یا اپنے گھر سے روٹھ کر آ گئے ہیں، اس ۱۹۶۸ء کے اوائل سے دار العلوم کے کارکنوں پر خاص طور پر مجھ پر اس خیال کا غلبہ ہوا کہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی جدید تنظیم کی جائے اور اس کے لئے لائبریری سائنس کے کسی ایسے واقف کار سے مدد لی جائے جو شرقیات، و دینیات کے کوچہ سے بھی نابلد نہ ہو، ادھر ندوۃ العلماء کا اُردو ترجمان "تعمیر حیات" دینی حلقوں میں مقبول ہوتا جا رہا تھا، لیکن اس کو ابھی تک کوئی ایسا مستقل ایڈیٹر نہیں ملا تھا جو اس کو مستقل مزاجی اور انہماک کے ساتھ چلائے، اس کے لیے بھی مولوی اسحاق صاحب ہی پر نظر پڑی، جو ایک پیدائشی صحافی اور ایڈیٹر تھے، پھر ندوۃ العلماء کی تحریک کے بہترین ترجمان بھی، چنانچہ ان سے اس سلسلہ میں خط و کتابت شروع کی گئی اُدھر وہ بھی گرلس اسکول کی ٹیچری سے غیر مطمئن اور خائف تھے، فروری ۱۹۶۸ء سے پھر ان سے مراسلت شروع ہوئی، میں نے ان کو ایک خط میں مفتی صدر الدین خاں آزردہ کا وہ مشہور شعر لکھ دیا جو مجھے بہت

محبوب ہے اور میں اس کو اپنے بہت سے خطبات و مقالات میں پیش کر چکا ہوں۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

غالباً اسی سے متاثر ہو کر انھوں نے لکھنؤ آنے کا فیصلہ کر لیا اور یہ لکھ دیا کہ میں تجویز کردہ دونوں خدمات انجام دوں گا، اسی کے ساتھ انھوں نے صلاح لینے کے لئے یہ بھی لکھا کہ میں لائبریری سائنس کا ایک کورس لے چکا ہوں، اگر اجازت ہو تو اس کو مکمل کر لوں تاکہ کتب خانہ کے کام کے لیے زیادہ مفید بن سکوں، میں نے اپنے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے خط میں ان کو لکھا کہ آپ لائبریری سائنس کا کورس ضرور پورا کر لیں وہ ہمارے ہی کام کی ایک کڑی ہے۔

اتفاق سے اپریل ۱۹۷۱ء میں خود پونا کا ایک سفر پیش آگیا، جو غالباً انھی کی تحریک و دعوت پر تھا، وہاں ان کے اثرات، مقبولیت اور افادیت کو دیکھ کر میں خود تردد میں پڑ گیا کہ کیا ان کو لکھنؤ بلانا اور اس ماحول اور حلقہ کو جس میں وہ بہت مفید کام انجام دے رہے ہیں ان سے محروم کر دینا صحیح ہوگا، لیکن پھر اندازہ ہوا کہ وہ لکھنؤ میں زیادہ مفید اور وسیع تر کام انجام دے سکتے ہیں اور ان کی قدرتی جگہ وہیں ہے، درمیانی راہ یہ سمجھ میں آئی کہ فی الحال ان کو طویل چھٹی پر عارضی طور پر لکھنؤ بلایا جائے، پھر اگر ان کا جی لگ جائے اور یہ تجربہ کامیاب ہو تو وہ مستقل آجائیں، چنانچہ انھی کے مشورہ سے ۲۱ جولائی ۱۹۷۱ء کو لیڈی حوا بائی گرلس ہائی اسکول کے صدر سلیمان یوسف صاحب کو خط لکھا جس میں ان سے درخواست کی کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے ان کی خدمات کو ہمارے ادارہ کو منتقل کر دیں، یہ کوشش کامیاب ہوئی اور وہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو لکھنؤ آگئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ دن نہیں رہ سکے، دسمبر ۱۹۷۱ء میں پھر پونا چلے گئے۔

پونا کے دوران قیام میں انھوں نے کئی مفید کام انجام دیئے، مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک پر ایک بڑا الزام تھا کہ خود مسلم خواتین اس کے ساتھ نہیں ہیں، وہ خود ان معاشرتی نظام اور قانون نکاح و طلاق میں ترمیم و تبدیلی چاہتی ہیں، مشہور تجدد پسند اور باغی عبدالحمید دلوائی نے مسلم خواتین کا ایک اجتماع بھی کیا جنھوں نے اس کا مطالبہ کیا اور موجودہ مسلم پرسنل لا سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا، ضرورت تھی کہ اس کی عملی تردید کی جائے اور اس کو چیلنج کیا جائے اور ثابت کیا جائے کہ مسلمان خواتین

اپنے مذہبی، معاشرتی قوانین پر پورا عقیدہ رکھتی ہیں اس سے وابستہ رہنا چاہتی ہیں اور اس میں کسی ترمیم تنسیخ کی خواستگار نہیں ہیں۔ مولوی اسحاق صاحب نے اپنے رفقاء واحباب کے ساتھ خواتین کے ایک جلسہ کا انتظام کیا جو بہت کامیاب رہا، جس میں ہزاروں خواتین نے شرکت کی اور یہ ثابت ہوگیا کہ مسلم خواتین میں سے جنھوں نے اختلاف ظاہر کیا تھا ان کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔

۱۴/ جنوری ۱۹۷۲ء کے میرے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پونا میں ہیں اور کتب خانہ کی تنظیم اور "تعمیر حیات" کے لیے پھر ان کو بلایا جارہا ہے، اس مراسلت کے نتیجہ میں وہ یکم رمضان ۱۳۹۲ھ (۱۰/ اکتوبر ۱۹۷۲ء) کو کتب خانہ کی تنظیم کا کام شروع کرنے کے لیے لکھنؤ آگئے اور تقریباً تین مہینہ ٹھہر کر اس کام کو آندھی پانی کی طرح انجام دیا، طلبہ کی ایک ٹیم ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ دیر گئے رات تک وہ اسی کام میں منہمک رہتے اور اپنی صحت وراحت کا بالکل خیال نہ کرتے، طلباء بھی ان کے ساتھ سب کچھ بھولے رہتے۔

بالآخر اس خواب کی تعبیر پوری ہوئی اور انھوں نے مئی ۱۹۷۳ء میں مستقل طور پر کتب خانہ اور "تعمیر حیات" کا چارج لے لیا، لائبریری سائنس کا کورس انھوں نے پورا کرلیا تھا اور اس میں بھی وہ لکیر کے فقیر نہیں تھے کتب خانہ کی نوعیت اور علوم مشرقیہ کے مزاج اور تقاضہ کے مطابق انھوں نے جدت واجتہاد سے کام لیا اور اسی کے مطابق کارڈ بنوائے اور کتب خانہ کو آراستہ کیا، دوسری طرف انھوں نے "تعمیر حیات" کی طرف توجہ کی، صحافت ان کا پسندیدہ مشغلہ اور ان کی HOBBY تھی اس لئے بہت جلد اس میں ایک نئی روح اور نئی زندگی پیدا ہوگئی، اس کام میں محمد میاں (جن کو قلم ہمیشہ سلۃً لکھنے کا عادی تھا اور اب مرحوم لکھنے کا عادی ہورہا ہے) ان کے معاون اور دست راست تھے، پرچہ پر بحیثیت ایڈیٹر کے شروع سے انہی کا نام آرہا تھا، لیکن عملاً اب مولوی اسحاق صاحب اس کے مدیر مسئول تھے، دونوں میں بڑا اتحاد مذاق تھا دونوں کا ذہن نئی نئی تجویزیں سوچتا، اور نئی نئی روشیں نکالتا تھا۔ دونوں کا ذہن وسیع، طباع اور "تخلیقی" تھا اس لیے دونوں میں خوب بنی۔

کتب خانہ اور "تعمیر حیات" کے علاوہ مولوی اسحاق صاحب نے طلبہ سے رابطہ پیدا کیا، یہ بھی ان کی دلچسپی اور شوق کا خاص میدان تھا، نوجوانوں کی تنظیم، ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا، ان کو متحرک بنانا ان کے لیے بہت آسان تھا، ان دونوں دوستوں مولوی اسحاق خاں اور محمد میاں (جن کو سفر آخرت میں بھی ایک دوسرے کی رفاقت اور آگے پیچھے جانا تھا) دارالعلوم میں نئی زندگی، نیا ولولہ، طلبہ میں خودداری اور اپنی

درسگاہ پر فخر وناز (SENCE OF PRIDE) پیدا کرنے کی نئی نئی تدبیریں سوچتے، اسی سلسلہ میں انکو خیال ہوا کہ دارالعلوم کا ایک ترانہ ہونا چاہئے اور طلبہ کی ایک خاص وردی، دوسری چیز تو بعض مشکلات کی بنا پر نہ چلی، لیکن ترانہ کی میں نے منظوری دے دی اور عزیزی محمد ثانی نے جن کو فطرت سے طبع موزوں اور شاعری کا ملکہ ملا ہے، ایک بڑا ولولہ انگیز ترانہ نظم کردیا، اس کے پڑھنے کا طریقہ (TUNE) بھی مولوی اسحاق صاحب نے ہی بنایا، جن کو اس میں بھی بڑا دخل تھا، اس وقت سے یہ ترانہ طلبہ کے جلسوں میں پڑھا جاتا ہے۔ ندوہ کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے موقعہ پر جب طلبہ کی ایک جماعت نے اپنے خاص انداز میں یہ ترانہ پڑھا تو جلسہ پر ایک کیف طاری ہوگیا، عرب اور غیر ملکی مہمان جو اُردو نہیں سمجھتے تھے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، یہ ترانہ ایسا مقبول ہوا کہ بعض دوسری جامعات اور مدارس نے بھی اپنی تعلیم گاہوں کے لئے ترانے کہلوائے اور مدارس عربیہ میں اس کا رواج ہوا۔

ستمبر ۱۹۷۴ء کے آخر میں "پیام انسانیت" کی تحریک شروع ہوئی، اس مہم کا آغاز دسمبر ۱۹۷۴ء میں الہ آباد میں کیا گیا، یہ تحریک مولوی اسحاق صاحب کی فطری صلاحیتوں اور ذہنی ساخت کے بالکل مطابق تھی اور وہ گویا اصلاً اسی کے لئے پیدا کئے گئے تھے، وہ ملک کے حالات سے بہت باخبر ہر طبقہ کی نفسیات سے واقف اور غیر مسلم تعلیم یافتہ نوجوانوں اور سیاسی کارکنوں کے بہت قریب رہے تھے، ان کو ملک کی تیزی کے ساتھ گرتی اور بگڑتی ہوئی اخلاقی حالت کا پورا اندازہ تھا، ان کو کام کا ایک پسندیدہ میدان اور کام کو ایک لائق اور پرجوش ترجمان مل گیا، اور ان کی دبی ہوئی صلاحیتیں اور جوہر اُبھر کر سامنے آگئے، وہ بہت جلد اس موضوع پر بہت اچھی تقریر کرنے لگے کہ سارا مجمع ان کا ہم نوا اور ان کا گرویدہ ہوجاتا، کسی طبقہ کے لوگ اور کسی سطح کے سامعین ہوتے ان کی تقریر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے، ملک کی صورتحال کی تصویر کشی، اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی کہانی ہندی اور انگریزی الفاظ اور جملوں کا برمحل استعمال، ان کی تقریر میں خاص دلآویزی پیدا کردیتا اور اس کو مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لیے قابل فہم اور دلچسپ بنا دیتا، یہاں بھی وہ اور محمد میاں دونوں ایک دوسرے کے کلّی طور پر ہم خیال اور شریک حال تھے دونوں نے مل کر وہ حلف نامہ تیار کیا جو ہر طبقہ پر حاوی اور ہمہ گیر ہے، تحریک کا تعارف کرانے میں بھی دونوں کا قلم یکساں رواں دواں تھا۔

اب اس سلسلہ کے دورے شروع ہوئے، ان دوروں میں بھی مولوی اسحاق صاحب کا دماغ

زبان، دل اور قوت عمل اپنے نقطۂ عروج پر تھی جہاں پہنچتے آبادی کے مختلف طبقوں، دانش گاہوں، وکلاء و پروفیسران اور سیاسی کارکنوں سے رابطہ پیدا کرتے، مختلف صحبتوں، نشستوں اور عام جلسوں کا پروگرام بناتے، تحریک کے تعارف اور اس کی ضرورت پر سب سے پہلے ان کی تقریر ہوتی اور اکثر اوقات ایسی کافی و شافی کہ اس کے بعد حقیقتاً کسی تقریر کی ضرورت نہ رہتی، کئی بار ایسا ہوا کہ ان کی تقریر سن کر سمجھ میں نہ آیا کہ اب اس کے بعد کیوں تقریر کی جائے، میں نے مراد آباد کے ایک جلسہ میں ایسے ہی ایک موقعہ پر کہا کہ یہ کوئی مشاعرہ نہیں ہے جس میں ہر شاعر کو اپنی غزل پڑھنی ضروری ہے کہ اس نے اس میں محنت کی ہے، مولوی اسحاق صاحب کی اس تقریر کے بعد کسی تقریر کی ضرورت نہیں ہے، میں تقریر سے بالکل معذرت کر دیتا لیکن اس خیال سے کچھ کہے دیتا ہوں کہ میرے نام کی تشہیر کی گئی ہے، اندیشہ ہے کہ بلانے والوں اور جلسہ کا انتظام کرنے والوں پر دروغ گوئی یا فریب دہی کا الزام نہ لگایا جائے۔

اس سلسلہ میں پہلا طویل دورہ مالوہ (مدھیہ پردیش) کا ہوا جو ۲۰ نومبر ۱۹۷۷ء سے شروع ہو کر ۱۰ دسمبر ۷۷ء کو ختم ہوا۔ اس دورہ کے مقامات میں بھوپال، اندور، دھار، دیپال پور، اجین مہو تھے، ہر جگہ تحریک کا بڑا استقبال ہوا، اندور کا ٹیگور کلب اور بار ایسوسی ایشن کا جلسہ حاضرین کی دلچسپی و سکون کی حیثیت سے ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے، اس سفر میں محمود خلجی، غیاث الدین اور ناصر الدین خلجی اور ہوشنگ شاہ کے پایۂ تخت اور نویں صدی کے شادی آباد یعنی مانڈو کی سیر کا بھی موقع ملا، مولوی اسحاق صاحب نے واپس آنے کے بعد مالوہ کے سفر کی سرگزشت ایسے ادیبانہ و مؤرخانہ انداز میں لکھی کہ وہ خاصہ کی ایک چیز اور ایک ادبی و تاریخی مضمون بن گیا[1]

دوسرا معرکہ کا سفر ہریانہ اور پنجاب کا ہوا جو ۲۱ مارچ ۷۸ء سے ۳۱ مارچ ۷۸ء تک جاری رہا، بہت سی حیثیتوں سے یہ دورہ اہم بھی تھا، نازک بھی اور اس میں مہم جوئی اور خطر پسندی کی روح بھی کام کر رہی تھی، ہم ایک ایسی سرزمین میں انسانیت و اخوت کا پیام لے کر جا رہے تھے، جہاں ۳۰-۳۲ سال پہلے خون کی ہولی کھیلی گئی تھی، قسمت سے یہ ہولی ہی کا زمانہ تھا اور اس کا خطرہ تھا کہ کسی ناگوار اور دشوار صورتحال سے واسطہ نہ پڑے، لیکن توقع اور اندازوں کے خلاف اس دورہ میں اس

---

[1] امید ہے کہ یہ ایک علحدہ رسالہ کی شکل میں شائع ہو جائے گا۔

تحریک کا (خاص طور پر غیر مسلم طبقہ کی طرف سے) سب سے بڑا استقبال ہوا، سکھ و ہندو حضرات نے جلسوں کی صدارت کی اپنے گھروں، فارموں اور سردار صاحبان (جن کی کبھی یہاں حکومت رہ چکی تھی) اپنے قلعوں میں لے گئے، جنیری گڑھ کے جلسہ میں جس کی صدارت ڈویژن کے کمشنر صاحب نے کی جو تعلیم یافتہ اور کتابوں کا مطالعہ کرنے والے ہندو فاضل تھے، ہزاروں کا مجمع تھا، دوبار بجلی چلے جانے اور ایک بار مائک فیل ہوجانے کے باوجود اپنی جگہ سے کسی نے حرکت نہیں کی، جس پر خود صدر صاحب نے اپنی حیرت و استعجاب کا اظہار کیا، اگر کوئی مسلمان اٹھتا تو ہندو اور سکھ بھائی بٹھاتے اور کہتے کہ کہاں جا رہے ہو، بیٹھو اور سنو بعض غیر مسلم سامعین کی زبان سے سنا گیا کہ دیکھو مسلمان ایسے ہوتے ہیں، غرض فضا خوشگوار اور ہوا کا رُخ موافق۔ جمنا نگر (سابق عبداللہ پور) جوگا دری، سرہند، مالیر کوٹلہ، سادھوڑا، بوڑیا اور جنیری گڑھ اس کی اہم منزلیں تھیں، اس کے علاوہ اندرون علاقہ (INTERIOR) پہاڑی حصوں اور قصبات و دیہاتوں میں جانا ہوا، جہاں رائے پور (ضلع سہارنپور) کی روحانی مرکز و خانقاہ اور خاص طور پر مرشدنا حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری کی تحریک و مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں مدارس، مکاتیب اور ذکر و علم کی بچی کھچی فضائیں قائم تھیں، اور وہاں یہ شعر یاد آجاتا تھا، کہ ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　　کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

بہرحال یہ سفر کام کے نئے میدانوں اور آفاق کو کھولنے والا ہمت و شوق کو بڑھانے والا اور یاس و ناامیدی کے بادلوں کو چھانٹنے والا تھا، اور وہاں کی فضا زبان حال سے گویا تھی کہ ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف　　　بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

۱۱، ۳۱، ۴ر دسمبر ۷۶ء کو مراد آباد کا کامیاب دورہ ہوا، مدرسہ امدادیہ اور ٹاؤن ہال میں بڑے کامیاب جلسے ہوئے، اس دورہ میں شہر کے غیر مسلم حضرات اور شہر کی خدمت اور سیاسی کام کرنے والے ہندو صاحبان نے بڑی دلچسپی لی، مدرسہ امدادیہ کے جلسہ میں مولوی اسحاق صاحب کی بڑی طاقتور اور مؤثر تقریر ہوئی۔ انھوں نے آگرہ کا بھی ایک دورہ کیا اور وہاں کے کالج میں اعلیٰ تعلیم یافتہ، ہندو و عیسائی معزز اساتذہ اور طلباء کے سامنے ایسی تقریر کی کہ عرصہ تک اس کا شہر میں چرچا رہا اور جب دسمبر ۱۹۷۶ء میں میرا اپنے رفقاء کے ساتھ آگرہ جانا ہوا تو اس کا ذکر اور تعریف سنی۔　　دسمبر ۱۹۷۶ء راجستھان کے دورہ میں میرے جلپور پہونچنے سے پہلے ان کے جے پور کے ایک جلسۂ عام میں بڑی زوردار تقریر ہوئی جس نے

شہر کی فضا کو "پیام انسانیت" کے کام کے لیے ہموار و تیار کر دیا۔ اس سفر میں جے پور، اجمیر اور جودھ پور جانا ہوا۔ کرناٹک کا ذکر تو ہم آخر میں کریں گے جو ان کے سفر آخرت کی تمہید تھی، اس سلسلہ کو یہیں چھوڑتے ہوئے عنان قلم کو ہم ان کی خداداد صلاحیت و قوت عمل کے ایک دوسرے میدان کی طرف موڑتے ہیں۔

۳۱/ اکتوبر۔ ۲/ نومبر ۱۹۷۵ء کو ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ تعلیمی جشن منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا، اور بھوپال سے جہاں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا جلسہ ہو رہا تھا اس کی تیاری کی مہم شروع کی گئی، مولوی اسحاق صاحب کو گویا اپنی محنت و ذہانت، تنظیمی سلیقہ اور تزئین و آراستگی کی قابلیت کے اظہار کا ایک نیا اور وسیع میدان مل گیا، اس تاریخی اجلاس میں جس میں پہلی مرتبہ ممالک عربیہ کے ممتاز فضلاء، ماہرین تعلیم، جامعات کے سربراہ (وائس چانسلر) ارکانِ حکومت اور اربابِ فکر بڑی تعداد میں آرہے تھے۔ اس کی صدارت عالم اسلام کی سب سے بڑی اور قدیم ترین دانش گاہ کے صدر شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کرنے والے تھے اور خود ہندوستان کے فضلاء اور دانشوروں اور سربرآوردہ مہمانوں کے ایک بڑی تعداد کے شریک ہونے کی توقع تھی، ایک علمی و تاریخی نمائش کا فیصلہ کیا گیا، جس میں ملت اسلامیہ ہندیہ کی ہزار سالہ علمی و تصنیفی کارگزاری، اس کی ذہنی شادابی اور زرخیزی، علوم اسلامیہ میں اس کے مجددانہ و مجتہدانہ کردار کی روداد مشکّل و مصوّر شکل میں پیش کرنی تھی اور نقشوں، کتبوں اور چارٹس کے ذریعہ اس تاریخ کا ابھرا ہوا خاکہ نگاہوں کے سامنے پیش کرنا تھا، یہ مشکل اور طویل کام جس کے لیے اب وقت بہت کم رہ گیا تھا مولوی اسحاق صاحب کے ذمہ کیا گیا اور وہ اپنی افتادِ طبع اور معمول کے مطابق جن کی طرح اس سے لپٹ گئے، انھوں نے حسب معمول اونچے درجے کے متعدد طالب علموں کو اپنے ساتھ لے لیا جن میں مولوی نظام الدین رانچوی ندوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور مہینوں کا کام دنوں میں کر ڈالا، انھوں نے کتب خانہ ندوۃ العلماء کے وسیع اور خوبصورت ہال کو ایسا آراستہ کیا کہ

ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

ممالک عربیہ کے فضلاء اور ہندوستان کے اہل ذوق و اہل نظر ایک ایک نقشہ کے سامنے کھڑے ہوتے اور ہزاروں صفحات کا عطر ایک صفحہ میں دیکھ لیتے، یہ نمائش جواب بھی اس ہال کی زینت ہے ان کی قوت عمل، حسن تنظیم، مذاق سلیم اور ساتھیوں سے کام لینے کی شاہد عادل ہے، اور یہ ان کی ایک ایسی یادگار ہے جو عرصۂ دراز تک ان کی خداداد صلاحیتوں کا اعلان کرتی رہے گی، اس نمائش

کے علاوہ بھی انھوں نے دارالعلوم کی آراستگی، نمائش کے لیے صحیح کتبوں اور تحریروں کے صحیح انتخاب میں بنیادی حصّہ لیا، اس میں ان کے شریک کار اور مشیر و معاون حسب معمول محمد میاں مرحوم ہی تھے۔

ایک اور اہم کام بھی میں نے مولوی اسحاق صاحب کے سپرد کیا تھا اور وہ اس کی تکمیل میں آخر تک مشغول رہے۔ وہ "تاریخ تحریک ندوۃ العلماء" کی ترتیب تھی، ندوۃ العلماء کی تاریخ ساز تحریک کی خود تاریخ ابھی تک نہیں لکھی گئی تھی، اس کا قیمتی مواد جلسوں کی رودادوں، مجلس انتظامی کی کارروائی کے رجسٹروں، "حیات شبلی" "تذکرہ مولانا محمد علی مونگیری" اور "حیات عبدالحی" کے اوراق میں منتشر ہے، مولوی اسحاق صاحب نے از خود ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں کی تصویر کشی اور اہم تجاویز کو "تعمیر حیات" کے صفحات میں پیش کرنا شروع کیا تھا، میں نے ان کو رائے دی کہ اس کے بجائے وہ تحریک ندوۃ العلماء کی مکمل و مفصل تاریخ مرتب کریں، انھوں نے یہ کام شروع کر دیا اور اپنی افتاد طبع کے مطابق اپنی صحت و راحت کا خیال کئے بغیر اس میں منہمک ہو گئے اس کے لیے انھوں نے سیکڑوں بلکہ ہزاروں متعلق صفحات پڑھے، تحریک کا پس منظر تفصیل کے ساتھ دکھایا اور ہندوستانی مسلمانوں کی کہانی ۱۸۵۷ء بلکہ اس سے پیشتر اصلاحی و تجدیدی تاریخوں سے شروع کی، لیکن افسوس ہے کہ ان کا قلم مولانا محمد علیؒ کے دور نظامت اور ان کی کنارہ کشی اور نئے دور کے آغاز تک پہنچا تھا کہ خود ان کی زندگی کا ورق الٹ گیا، اور یہ کام پہلی جلد پر ختم ہو کر نامکمل رہ گیا، لیکن یہ ایک جلد بھی ان کی محنت، حسن ترتیب اور سلیقۂ تصنیف کی گواہ ہے، اور ان شاء اللہ وہ ان کی ایک اچھی تصنیفی یادگار بن کر باقی رہے گی۔[1]

نومبر ۱۹۷۶ء میں انھوں نے مولوی سعید الرحمٰن صاحب ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مدیر "البعث الاسلامی" کے ساتھ سعودی عرب کا سفر کیا، انھوں نے ریاض کی مؤتمر الفقہ میں جو جامعۃ الامام محمد بن سعود کی طرف سے منعقد ہو رہی تھی شرکت کی، حج و زیارت سے مشرف ہوئے، پھر مولوی سعید الرحمٰن صاحب کے ساتھ کویت اور خلیج کی امارات کا سفر کیا، دسمبر کے آخری ہفتہ میں ابو ظبی میں میرا ان کا ساتھ ہوا جہاں میں عزیزی مولوی محمد واضح ندوی کے ساتھ امارات کے دورہ پر گیا ہوا تھا، اچھی اچھی مجلسیں اور کامیاب جلسے ہوئے، سرآوردہ

---

[1] یہ کتاب جلد ان شاء اللہ زیور طبع سے آراستہ ہوگی۔ دوسری جلد کی ترتیب کا کام مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے فاضل رفیق مولوی شمس تبریز خاں کے سپرد کیا گیا ہے۔

اشخاص اور ذمہ دار اصحاب سے ملاقاتیں رہیں۔

دارالعلوم میں کتب خانہ اور "تعمیر حیات" کی بڑھی ہوئی مصروفیت کے ساتھ شہر میں ہونے والی سرگرمیوں تقریبات اور تحریکوں پر وہ پوری نظر رکھتے تھے، اگر باہر سے تعلیم یافتہ اور معزز مہمان آتے تو ان سے رابطہ قائم کرتے، ان کو دارالعلوم اور کتب خانہ دکھاتے اور اگر میں موجود ہوتا تو مجھ سے ملاتے۔ نومبر ۱۹۷۳ء میں لکھنؤ میں آل انڈیا اُردو ایڈیٹرس کانفرنس ہوئی، آنے والوں میں سے متعدد اصحاب سے ان کے پہلے سے روابط تھے، اور بعض سے ان کا غائبانہ تعارف، ۱۶؍نومبر ۷۳ء کو انھوں نے میرے مشورہ سے ان مدیران جرائد کو کتب خانہ کے شاندار ہال میں مدعو کیا اور ایک چائے پارٹی کا انتظام کیا، خوش قسمتی سے اس دن مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مرحوم ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ و مدیر "معارف" بھی تشریف رکھتے تھے، اس سارے اہتمام کا مقصد یہ تھا کہ ان اڈیٹر صاحبان کے کان میں (جو دوسروں ہی سے کہنے کے عادی ہوتے ہیں اور ان کو سننے کی کم نوبت آتی ہے) کوئی ایسی مفید بات پڑجائے جس سے ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو اور وہ ملک کے مختلف فرقوں کے جذبات میں ہیجان، باہمی منافرت اور طفلانہ ذہنیت پیدا کرنے کے بجائے اپنے اخباروں اور اپنے قلم کی طاقت سے ذہن و دماغ کی تربیت اور بالغ شہری و سیاسی شعور پیدا کرنے کا کام لیں، یہی موقع تھا جب میں نے ان اہل قلم کو مخاطب کر کے فارسی کا مشہور غزلیہ شعر کے مصرعہ

زیر قدمت ہزار جان است

کو بدل کر

زیر قلمت ہزار جان است

پڑھا تھا[1]

۷-۸ جولائی کی تاریخوں میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے کراچی میں اپنی پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا، بہت سی حیثیتوں سے یہ کانفرنس بڑی اہمیت رکھتی تھی، ایک تو یہ کہ وہ رابطہ عالم اسلامی جیسی عظیم ترین بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے تھی جس میں مسلم اور عرب ممالک کی سب سے زیادہ نمائندگی ہے اور اس میں تمام ایشیائی اسلامی ممالک کے ممتاز ترین نمائندوں کے آنے کی امید تھی، دوسرے یہ کہ

---

[1] اس تقریب کی رپورٹ اور تقریر "تعمیر حیات" کے شمارہ میں آئی، اُردو کے دوسرے اخبارات نے بھی اس کو نقل کیا۔

یہ کانفرنس جنرل ضیاء الحق کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس عالمی پیمانہ پر کراچی میں ہو رہی تھی، پاکستان کے اس انقلاب سے جو جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا، ساری دنیا کے مسلمانوں بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کو جن کا دوسرا گھرانہ پاکستان میں آباد تھا گہری دلچسپی تھی، اور انھوں نے جنرل صاحب سے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، ہم لوگوں کی دلچسپی کی ایک تیسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے خاندان کا دو ثلث حصّہ پاکستان جا چکا تھا، اور دونوں مملکتوں کے دنیا سے الگ قوانین کی بدولت پاکستان جانے کی برسوں نوبت نہیں آتی تھی، یہ وہاں جانے کا بڑا اچھا ذریعہ ہاتھ آیا، میں اپنے رفیق مولوی معین اللہ صاحب ندوی کے ساتھ اس وقت جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ کی مجلس اعلیٰ میں شرکت کے لیے حجاز گیا ہوا تھا، ہندوستان میں میرے اور مولانا منظور صاحب کے علاوہ (جو رابطہ کے مجلس تاسیسی کے مستقل رکن ہیں) مسلم صحافی کی حیثیت سے محمد میاں مدیر "البعث الاسلامی" اور مولوی اسحاق صاحب ایڈیٹر "تعمیر حیات" کے نام بھی دعوت نامہ آیا تھا، ہم لوگوں نے طے کر لیا کہ اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا ہے، مولوی اسحاق صاحب جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، اصلاً صوبہ سرحد ہی کے رہنے والے تھے اور ان کی حقیقی بہن اور قریب ترین اعزہ وہاں تھے جن سے ان کو ملے ہوئے برسوں ہو چکے تھے، ہم لوگوں نے طے کیا کہ وہ پہلے ہی پاکستان چلے جائیں وہاں کے حالات کا مطالعہ کریں، اور ایسا پروگرام پہلے سے بنا لیں جس کی وجہ سے اس مختصر قیام اور دورہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے، اور مختلف حلقوں تک یہ بات پہونچائی جا سکے، وہ پاکستان روانہ ہو گئے اور انھوں نے حسب توقع یہ کام بڑی خوش اسلوبی اور سلیقہ سے انجام دیا، مختلف حلقوں اور مرکزوں سے رابطہ قائم کیا اور عزیزی مولوی کفیل ربّی ندوی مالک "ادارہ نشریات اسلام" ناظم آباد کراچی (جو پاکستان میں ہماری کتابوں کے ناشر ہیں) اور عزیز گرامی مولوی قاری سید رشید الحسن خطیب جامع مسجد نیو ٹاؤن کے مشورہ سے کراچی پہنچنے کے بعد کے ہماری تقریروں و مجالس کا کئی روز کا مفصّل پروگرام بنا لیا اور اس کو اخبارات میں شائع بھی کرا دیا، کانفرنس کے انعقاد سے کچھ پہلے جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ کے مجلس اعلیٰ میں شرکت کے لیے مجھے حجاز کا سفر کرنا پڑا، اس سفر میں مولوی معین اللہ صاحب ندوی میرے ساتھ تھے، کانفرنس کی تاریخیں ۶۔۸ جولائی ۱۹۷۸ء تھیں، ہم لوگ ۵ جولائی کو جدّہ سے روانہ ہو کر کراچی پہنچ گئے، وہاں مولوی اسحاق صاحب نے پوری زمین تیار کر رکھی تھی، کانفرنس کے بعد یہ پروگرام شروع ہونے والے تھے، ۹ تا ۱۰ جولائی سے اُن کا سلسلہ شروع ہو گیا، اس سلسلہ کی اہم تقریروں کا مجموعہ "حدیث پاکستان" کے نام سے

"ادارہ نشریات اسلام" نے شائع کردیا ہے، ایک مرتبہ کانفرنس میں ایک اہم اور نازک مسئلہ پر (جس پر جذبات میں تھوڑی دیر کے لیے ایک ہیجان پیدا ہوگیا تھا) اور اسی طرح ایک دوسرے نازک موقع پر جس میں بڑی احتیاط اور توازن کی ضرورت تھی ———————————— انھوں نے تقریر کی اور حاضرین ان کی خطابت، حاضر دماغی اور خلوص سے بہت متاثر ہوئے، کراچی کے بعد وہ پاکستان کے پورے دورے میں (جس کا تذکرہ محمد میاں مرحوم کے تذکرہ میں آچکا ہے) وہ شریک رہے، اسلام آباد سے ہم لوگ محب عزیز مولانا سمیع الحق صاحب مدیر رسالہ "الحق" کی شدید خواہش واصرار پر اکوڑہ خٹک روانہ ہوئے، اس طرح ان کو اپنے قدیم آبائی وطن (صوبہ سرحد) کی فضا اور ہوا سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ان سطور کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ برادر عزیز سید احمد الحسنی مقیم لاہور کا خط ملا۔ اس کی حسب ذیل سطور بالکل اسی موقع و محل سے تعلق رکھتی ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

"مرحوم اسحاق جلیس کے ساتھ جب اکوڑہ کار میں جارہے تھے تو وہ رفقائے سفر کو اپنے آبائی وطن کے بارے میں آگاہ کررہے تھے، اتنے میں ہم نے سڑک کے کنارے ایک نشان راہ دیکھا جس پر لکھا تھا بفہ (BAFFA) یہ عام راستہ سے ہٹ کر ایک راستہ کا نشان تھا، رفقائے سفر نے انھیں بتایا کہ یہ آپ کے گاؤں کا راستہ ہے۔"

اس سفر کی آخری منزل لاہور تھی، جہاں ہم سب ۸۔۱۰ دن ٹھہرے، اہل علم اور اہل فکر کی ملاقاتوں اور تمام اجتماعات و تقریبات میں وہ رفیق اور میرے معاون خاص تھے، واپسی کا سفر ٹرین سے ہوا اور بڑی مسرت و دلچسپی کے ساتھ طے ہوا، ہم لوگ جولائی کی آخری تاریخوں میں لکھنؤ پہنچے۔

پاکستان کے دورے میں جن اہم شخصیتوں سے بھی ان کی ملاقات ہوئی وہ اُن کی ممتاز ذہنی صلاحیتوں وسیع واقفیت و باخبری، خوش گفتاری اور اخلاق سے متاثر ہوئے جیسا کہ پروفیسر غفور احمد سکریٹری قومی اتحاد و سابق وزیر مرکزی حکومت پاکستان، مولانا مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل رکن اسلامی نظریاتی کونسل اور مولانا سمیع الحق صاحب وغیرہ کے تعزیتی خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔

پاکستان کے اس تاریخی سفر کے بعد ان کے دو اور بڑے سفر اندرون ملک کے ہوئے، ایک کرناٹک کیرالا کا، جہاں وہ اس غرض سے گئے تھے کہ ندوۃ العلماء کے ایک سالانہ جلسہ کے لیے موزوں مقام کا انتخاب کریں، اور ندوۃ العلماء کی تحریک نیز "پیام انسانیت" کے کام سے لوگوں کو روشناس کریں، اسی سفر میں ان کو میسور و کالی کٹ میں پہلی مرتبہ پیٹ کے درد کی تکلیف ہوئی، کالی کٹ میں تکلیف بہت بڑھ گئی، ڈاکٹروں نے

السر تجویز کیا اور پہلی مرتبہ اس کا انکشاف ہوا کہ ان کو یہ مرض (غالباً بہت دنوں سے) ہے، ان کی طبیعت اپنی صحت، پرہیز اور احتیاط کے بارے میں "لاابالی" واقع ہوئی تھی، جب وہ کسی کام میں لگ جاتے تو پھر ان کو کسی بات کا ہوش نہ رہتا، اس کے بعد بھی جو پرہیز اور علاج ضروری تھا اس میں غفلت ہوتی رہی، وقتی طور پر وہ مسکن دواؤں کا استعمال کر لیتے اور کام میں لگ جاتے، یہی مرض بالآخر جان لیوا ثابت ہوا

وکان امر اللہ قدراً مقدوراً

ان کے دورۂ کرناٹک و کیرالہ سے وہاں کی زمین "پیام انسانیت" کے لیے تیار ہو گئی تھی، خاص طور پر بنگلور میں عزیزی سید مصطفیٰ رفاعی نے اس سلسلہ میں بڑا کام کیا تھا، انھوں نے میر جعفر علی صاحب پرنسپل الامین کالج اور بعض اور رفیقوں کے ساتھ "پیام انسانیت" کے ہمدردوں کا ایک بڑا حلقہ بنا لیا تھا، جو ہم لوگوں کے دورۂ کرناٹک کا مشتاق اور بے چینی سے منتظر تھا۔ وہاں اس کا ایک باقاعدہ حلقہ بھی بن گیا تھا جس کی صدارت جنوبی ہند کی مشہور دینی و علمی شخصیت مولانا مفتی ابوالسعود صاحب امیر شریعت کرناٹک و ناظم دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور نے منظور فرمالی تھی، اس حلقہ کی طرف سے متواتر خطوط اور تار آئے کہ کرناٹک کا جلد دورہ ہونا چاہیے اور میں ضرور آؤں، چنانچہ مئی ۱۹۷۹ء میں دورہ کا پروگرام طے کر لیا گیا، ۲۶ مئی تا ۴ جون اس کی تاریخیں مقرر ہوئیں، مولوی اسحٰق صاحب پہلے سے بنگلور پہنچ گئے تاکہ وہاں کے کام کے نقشہ کو دیکھ لیں اور اس تحریک کا مزاج پیدا کرنے کی کوشش کریں، ناگپور کے مشہور داعی دین مولوی عبدالکریم پاریکھ صاحب بھی تشریف لائے۔ ۲۶ مئی ۱۹۷۹ء کو میں مولوی معین اللہ صاحب ندوی کی رفاقت میں دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز بنگلور پہنچا، یہ دورہ بھی گزشتہ دوروں کی طرح بڑا کامیاب رہا، بڑی مصروفیت میں وقت گزرا۔ اس سفر میں بنگلور کے علاوہ، میسور، ہاسن، مرکارہ، اور بعض دوسرے مقامات پر جانا ہوا، بنگلور کے ایک جلسہ میں وزیر اعلیٰ کرناٹک مسٹر دیوراج ارس اور میسور کے ایک جلسہ میں وہاں کے بشپ اور دو ہندو فرقوں کے سب سے بڑے روحانی پیشوا شریک ہوئے، اس دورہ کی روداد بھی مولوی اسحاق صاحب کے قلم سے "تعمیر حیات" میں شائع ہو چکی ہے۔

کرناٹک سے واپسی پر میں بمبئی ٹھہر گیا مجھے کچھ آرام کی ضرورت تھی اور کچھ تصنیفی کام بھی پیش نظر تھا، مولوی اسحاق صاحب بمبئی ۲، ۳ دن ٹھہر کر احمد نگر چلے گئے، اور مجھے اسی قیام میں محمد میاں مرحوم کی سنگین علالت کی اطلاع ملی اور میں اسی پریشانی کے عالم میں لکھنؤ پہنچا جہاں مجھے ان کی وفات

کا علم ہوا، یہ حصہ مفصّل طریقہ پر محمد میاں سے متعلق مضمون میں لکھا جا چکا ہے، مولوی اسحاق صاحب میرے بھی بعد لکھنؤ پہونچے، وہ بھی بالکل بے خبر تھے، لکھنؤ پہونچنے پر ان کو یہ صاعقہ اثر خبر معلوم ہوئی، اور وہ کچھ دیر ٹھہر کر میرے پاس رائے بریلی آ گئے، ان پر اس حادثہ کا بڑا گہرا اثر تھا، دونوں ساتھیوں میں بڑا توافق، بہت سی چیزوں میں مناسبت اور بڑا اُنس واتحاد تھا، کوئی چیز کرنی ہوتی تھی تو پہلے دونوں نقشہ بناتے مشورہ کرتے پھر میرے پاس لاتے تھے، دارالعلوم کی ترقی اور اس میں نئی زندگی پیدا کرنے اور "پیام انسانیت" کی تحریک پر دونوں کا دماغ یکساں چلتا تھا، مولوی اسحاق صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کا ایک بازو کٹ گیا اور ایک پشت پناہ جس کی تائید بڑی قیمتی ثابت ہوتی تھی، دنیا سے رخصت ہو گیا، زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے خبری کا ایک عبرت انگیز نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی پوری توجہ اور جوش وخروش کے ساتھ (جو ان کے ہر کام میں ہوا کرتا تھا) "تعمیر حیات" کا خصوصی نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا اور اس کا اعلان کر دیا، اور اپنے عزیز ومحبوب دوست کے متعلق مضامین اور تعزیتی خطوط جمع کرنے لگے، کس کو خبر تھی کہ ایک مہینہ بھی نہ گزرے گا کہ وہ اپنے بچھڑنے والے دوست کے پاس پہنچ جائیں گے، اور جس طرح زندگی کے آخری دور میں وہ ساتھ رہے، وہ اس خصوصی نمبر میں بھی ساتھ رہیں گے، اور اپنے محبوب و مرحوم دوست سے چند گز کے فاصلہ پر اپنا مدفن بنوائیں گے۔

اس حادثہ نے مجھ پر جو اثر ڈالا تھا وہ اس کو دیکھ رہے تھے، ان کی خواہش تھی کہ وہ اس غم کو کسی طرح ہلکا کریں، ان کو اس کا احساس تھا کہ میرے تاثر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مرحوم نے نوعمری میں انتقال کیا اور صرف ۴۴ سال کی عمر پائی، وہ ایک دن ایک کتاب ہاتھ میں لیے میرے پاس آئے کہنے لگے کہ "حضرت آپ کے محبوب دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم نے بھی تو ۴۴ سال کی عمر پائی، میں ان لوگوں کی فہرست بنا رہا ہوں جنھوں نے ایسی ہی عمروں میں وفات پائی ہے، اس فہرست میں بڑے بڑے عبقری اور نامور اہل کمال نکلے ہیں"، میں نے کہا کہ آپ کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ مولانا مسعود صاحب کی ۴۴ سال کی عمر ہوئی؟ کہنے لگے کہ آپ نے خود لکھا ہے، یہ کہہ کر میری کتاب "پرانے چراغ" میں میرا مضمون دکھایا، جس میں لکھا تھا کہ افسوس ہے کہ انھوں نے ۴۴ سال کی عمر پائی۔ ع

خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود

دوبارہ انسان کی بے خبری دیکھئے کہ ان کو خبر نہ تھی کہ وہ بھی اسی عمر میں جانے والے ہیں، اور اسی فہرست میں ان کا بھی نام آنے والا ہے۔

جون ۱۹۷۹ء کی آخری تاریخوں میں مجھے جامعہ اسلامیہ کی مجلس اعلیٰ میں شرکت کے لئے حجاز روانہ ہونا پڑا، خیال ہوا کہ وہاں جوار نبوی میں مغموم و شکستہ دل کو کچھ تسکین حاصل ہوگی، میں مدینہ طیبہ میں تمام حالات سے بے خبر تھا کہ (غالباً ۹ جولائی کو) صدیق محترم مولانا محب اللہ صاحب ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء کا تار ملا کہ مولوی اسحاق صاحب سخت علیل ہیں، دعا کیجئے، اتنی دور دوسرے ملک تار دینے کا کیا مطلب ؛ دل جو پہلے سے چوٹ کھایا ہوا تھا اور ایسی اطلاع کا تجربہ کر چکا تھا کھٹک گیا رفیق سفر مولوی معین اللہ صاحب نے کانپور کے دوستوں کو ٹیلکس کیا کہ حالات سے مطلع کیا جائے، وہاں سے پہلے اطلاع آئی کہ کیفیت بدستور ہے دعا کی جائے، آخر ۸ جولائی ۱۹۷۹ء کو ظہر کے وقت جب ہم لوگ اپنی قیام گاہ بستان نوروَلی مدینہ طیبہ میں تھے، ٹیلیفون کی (جو سراہنے ہی رہتا تھا) گھنٹی بجی مجھ میں توہمت نہ ہوئی کہ میں سنوں، مولوی معین اللہ صاحب نے سنا اور میرے استفسار پر کہا کہ " ابھی خبر نہیں ہے" سب کچھ معلوم ہو گیا، لیکن صبر و رضا بالقضاء کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ہندوستان پہنچے تو علالت کی ابتداء و انتہا کی تفصیل میڈیکل کالج لکھنؤ کے اسپتال کے ذمہ داروں کی مجرمانہ غفلت کی روداد، ان کا بار بار اسپتال سے لے چلنے کا مطالبہ، دارالعلوم کے ذمہ داروں اور ان کے رفقاء کی امکانی کوششیں، طلبہ کی تیمارداری اور خدمت کا حال، ان کا محمد میاں کو بار بار یاد کرنا اور کہنا کہ وہ میرے منتظر ہیں، ذکر میں مشغولیت، دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی ہمارے خاندانی مقبرہ میں دفن کئے جانے کی وصیت، دل پر پتھر رکھ کر یہ ساری داستان سنی اور پھر جب رائے بریلی پہنچنا ہوا تو بادیدۂ نم ان کی تربت پر حاضری ہوئی جنھوں نے مرنے کے بعد بھی دوری اور جدائی گوارا نہ کی۔

ان للہ ما اخذ و لہ ما اعطی وکل عندہ باجل مسمّیٰ

یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ ان کی نماز جنازہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری نے پڑھائی جو وقت کے مقبول و بلند پایہ مشائخ میں سے ہیں اور جو محض ایک لطیفۂ غیبی کی بنا پر رات میں اچانک دائرۂ شاہ علم اللہ رائے بریلی تشریف لے آئے تھے، ان کو اس واقعہ کی کچھ خبر نہ تھی، مرحوم کے لیے یہ ایک فال نیک اور اللہ کی خاص رحمت تھی۔

جس وقت انھوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا ہے، اس وقت ان کی فطری صلاحیتیں اور نورسیدہ کمالات اپنے عروج پر تھے "تعمیرِ حیات" کے صفحات پر ان کی کمان چڑھی ہوئی تھی اور ابھی ان کے ان مقالات کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی جو انھوں نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت پر صحیح نقطۂ نظر واضح کرنے اور ان حقائق کو ظاہر کرنے کے لیے لکھے تھے جن سے اس اقدام کے اسباب و محرکات کا علم ہوتا ہے۔ یہ مقالات ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے رجحانات وجذبات کے خلاف تھے اور اس کے ردِ عمل میں بعض علاقوں میں سخت ہنگامے ہو چکے تھے لیکن یہ مقالات اتنی طاقت کے ساتھ اور ایسے مدلل طریقہ پر لکھے گئے تھے کہ ان کے پڑھنے کے بعد بیسیوں آدمیوں کے خیالات بدل گئے، اس پرچہ کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان کی زندگی میں اس کے تین ایڈیشن نکالنے پڑے اور دو ایڈیشن ان کے بعد نکلے، دوسری طرف "پیامِ انسانیت" کے موضوع پر ان کی دلنشین و دلآویز تقریریں سننے کے لیے کتنے لوگ گوش برآواز تھے، ہندوستان کے کتنے اطراف و نواح سے ان کے بلانے کے لیے خطوط آرہے تھے "تعمیرِ حیات" ندوۃ العلماء کا تعارف، پیامِ انسانیت اور کتنے ملی اور دینی کام تھے جو ان کی ممتاز صلاحیتوں کے طالب اور مشتاق تھے کہ اچانک انھوں نے سب سے آنکھیں بند کر لیں اور سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

وہ اندازوں سے زیادہ بلند تھے

مولانا محمد منظور نعمانی

ہمارے اکثر ناظرین کو اخبارات وغیرہ کے ذریعہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ممتاز فرزند، اس کے اردو ترجمان "تعمیر حیات" کے ایڈیٹر اور "پیام انسانیت" کی دعوت اور اس طرح کے دوسرے میدانی کاموں میں مولانا علی میاں کے رفیق خاص اور دست راست مولوی اسحاق جلیس ندوی کے حادثۂ رحلت کا علم ہوچکا ہوگا۔

صرف ۴ ہفتے پہلے ندوۃ العلماء کے عربی ترجمان "البعث الاسلامی" کے رئیس التحریر مولانا علی میاں کے حقیقی اکلوتے بھتیجے و لخت جگر اور قوت بازو، مولانا محمد میاں حسنی نے صرف ۴۴ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے سب اہل تعلق کو "الوداع" کہا تھا، ابھی اس صدمہ کا زخم ہرا ہی تھا کہ بالکل اسی نوع کا یہ دوسرا انتہائی المناک سانحہ قضا و قدر کے فیصلہ کے مطابق ظہور میں آگیا۔ اسحاق جلیس صاحب کی عمر بھی اس وقت ۴۴ سال ہی تھی۔ ان کی بعض غیر معمولی خصوصیات، اعلیٰ صلاحیتوں اور قوت عمل کے لحاظ سے ان کو نادرۂ روزگار کہا جا سکتا تھا، اور ان سے بڑی امیدیں تھیں ــــ لیکن ــــ یفعل اللہ ما یشاء ویحکم ما یرید۔

ہمارا ایمان ہے کہ ہمارا رب فعال لما یرید اور احکم الحاکمین ہونے کے ساتھ حکیم ورحیم اور ارحم الراحمین بھی ہے۔ یقیناً ایک وقت آئے گا جب ہم پر بھی منکشف ہو جائے گا کہ جن حادثات و سانحات کو ہم نے اپنی نادانی سے بے وقت سمجھا تھا اُن کے ظہور و وقوع کے لیئے وہی مناسب ترین وقت تھا، واللہ یعلم وانتم لا تعلمون ہ

مرحوم کے والد بزرگوار صوبہ سرحد کے ایک معزز گھرانے کے پٹھان تھے اور فوج کے ایک مرکز میں امام اور دینی معلم کے منصب پر فائز تھے، اسی سلسلہ سے اُن کا قیام مہاراشٹر کے مشہور شہر احمد نگر میں رہا اور وہیں مرحوم کا نشو و نما ہوا، انہوں نے دینی عربی تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء ہی میں پائی۔ اب سے ٹھیک ۲۰ سال پہلے

۱۹۵۹ء میں فراغت حاصل کی، یہ وہ زمانہ تھا کہ دارالعلوم کے سابق شیخ الحدیث مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ کی وفات کے بعد درس حدیث کا کوئی بہتر انتظام ہونے تک کے لیئے دارالعلوم میں حدیث کے ایک دو سبق پڑھانے کی ذمہ داری اس عاجز نے قبول کر لی تھی، اس وجہ سے مرحوم سے اچھی واقفیت ان کی طالب علمی ہی کے زمانہ سے تھی، وہ اپنی جماعت میں بلکہ یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ دارالعلوم کے تمام طلبہ میں فہم وفکر اور ذہانت وفعّالیت میں منفرد اور وجاہت وخوش گفتاری کے لحاظ سے بھی ممتاز تھے ـــــ اسی سال (۵۹ء میں) مولانا علی میاں کی زیر سیادت "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" قائم ہوئی۔ مولوی اسحاق جلیس صاحب کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے مولانا نے ان کو مجلس کا معاون سکریٹری مقرر کر دیا۔ اگرچہ عہدہ کے لحاظ سے وہ "معاون سکریٹری" تھے لیکن مجلس کا زیادہ کام وہی کرتے تھے، انہوں نے اپنی خداداد قابلیت اور محنت سے مجلس کو تھوڑے عرصہ میں بہت ترقی دی۔ کچھ عرصہ کے بعد خرابی صحت اور بعض ذاتی حالات سے مجبور ہو کر وہ وطن (احمد نگر) چلے گئے، اور پھر مہاراشٹر ہی میں پونہ کے ایک کالج میں تدریسی ذمہ داری قبول کر لی ـــ اسی دوران انہوں نے وہاں شعبۂ لائبریری سائنس میں اس فن کی تعلیم بھی حاصل کی، نیز انگریزی میں اچھی خاصی دسترس بھی حاصل کر لی ـــــ اتفاق سے انہی ایام میں مولانا علی میاں کا اُدھر کا سفر ہوا، مولانا نے ان کو دارالعلوم آجانے کا حکم دیا اور دارالعلوم کے وسیع کتب خانہ کی جدید ترتیب وتہذیب کا کام انکے سپرد ہوا، کچھ دن بعد پندرہ روزہ "تعمیر حیات" کی ادارت کی ذمہ داری بھی ان کے حوالہ ہوئی، انہوں نے ان دونوں کاموں کو بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی سے انجام دیا۔ "تعمیر حیات" کہیں سے کہیں پہونچ گیا، اسکی اشاعت کا دائرہ بھی بہت وسیع ہو گیا۔

وہ جس درجہ کے صاحب قلم تھے اسی درجہ کے خطیب اور مقرر بھی تھے، خاص کر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مخلوط اجتماعات اور خالص غیر مسلم مجمعوں میں وہ جس طرح اصلاحی ودعوتی تقریر کرتے تھے وہ انہی کا حصہ تھا۔ اُن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنی تقریریں حسب موقع ہندی اور انگریزی زبانوں کے استعمال پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ پشتو اور مرہٹی گویا ان کی مادری زبانیں تھیں۔

صاحب قلم اور خطیب ومقرر ہونے کے ساتھ مرحوم سحر خیز اور ذاکر شاغل بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندہ میں یہ صفات جمع فرما دے بلا شبہ اس پر اس کا خاص انعام واحسان ہے، وفی ذالک

فلیتنافس المتنافسون ؀

مولانا علی میاں سے ان کو ارادت بلکہ کہنا چاہیے کہ فدائیت کا تعلق تھا، انہوں نے اپنے کو کلی طور پر مولانا کے سپرد کر دیا تھا۔

لیکن اللہ کی مشیت کہ مولانا محمد میاں مرحوم کی طرح ان کی بیماری اور انتقال کے وقت بھی مولانا علی میاں یہاں نہیں تھے، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس اعلیٰ کے مشاورتی جلسہ میں شرکت کے لئے مدینہ منورہ گئے ہوئے تھے، یہ جلسہ ۷ رجولائی سے ہونے والا تھا، مولانا یہاں سے ۵ رجولائی کی شام کو روانہ ہو گئے تھے اور ۷ رکی صبح کو مدینہ منورہ پہنچنا تھا، ابھی وہاں پہنچے بھی نہیں تھے کہ مولوی اسحاق جلیس مرحوم کے پیٹ میں کچھ تکلیف شروع ہوئی اور جلدی ہی اس نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ علاج کے لیئے میڈیکل کالج میں داخل کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا ـــــ لیکن ؎

"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

مسلسل یہی اطلاع ملتی رہی کہ حالت قابل اطمینان نہیں ہے ـــــ ۱۱ رجولائی چہار شنبہ کی صبح یہ عاجز انھیں دیکھنے کے لیے میڈیکل کالج گیا، اس وقت ان کے سانس کی کیفیت خطرہ کے قرب کا پتہ دے رہی تھی، لیکن ان کا حال وہ تھا جو مرد مومن کا ہونا چاہیئے ـــــ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو اپنے بارہ میں اندازہ ہے اور وہ سفر آخرت کے لیئے تیار ہو چکے ہیں۔

اسی دن عصر کے قریب ان کی روح نے داعی اجل کو لبیک کہا اور جسم سے مفارقت اختیار کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؀

جو احباب و مخلصین تیمارداری کے سلسلہ میں اُن کے پاس تھے انہوں نے بتلایا کہ سانس کی تکلیف کے باوجود مرحوم نے آخری وقت سے بہت پہلے سے ذکر تسلسل کے ساتھ شروع کر دیا تھا، کلمۂ شہادت اور درود شریف مسلسل پڑھتے رہے، ان کے علاوہ بھی ذکر کے دوسرے کلمے زبان پر جاری رہے، بالکل آخری وقت میں بآواز درود شریف پڑھی اور کلمۂ شہادت ادا کیا جس کا آخری حصہ سنا بھی نہیں جا سکا ـــــ اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ وتقبل حسناتہ وتجاوز عن سیئاتہ۔

انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی اور وصیت کی تھی کہ ان کو مولانا علی میاں کے خاندانی قبرستان "تکیہ شاہ علم اللہ" میں دفن کیا جائے ——— ایسا ہی کیا گیا۔

دارالعلوم میں مرحوم کی نماز جنازہ پنجشنبہ کی صبح بعد نماز فجر پڑھی گئی اور اُسی وقت ایک خاص بس کے ذریعہ جنازہ تدفین کے لئے رائے بریلی روانہ ہو گیا، وہاں دوسری نماز جنازہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی دامت برکاتہم نے پڑھائی جن کو اللہ تعالیٰ نے بے سان وگمان ایک "لطیفۂ غیبی" کے طور پر وقت سے پہلے "تکیہ شاہ علم اللہ" پہنچا دیا تھا۔ ان ربی لطیف لما یشاء ط

پسماندگان میں مرحوم کی بیوہ اہلیہ، چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں ——— دو بڑے لڑکے دارالعلوم ہی کے درجۂ حفظ سے فراغت حاصل کر کے حافظ ہو چکے ہیں اور آگے دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اُن سے چھوٹے دونوں دارالعلوم ہی میں قرآن پاک حفظ کر رہے ہیں، ایک کا قریب الختم ہے اور دوسرے نے ابھی شروع کیا ہے، دو پارے ہو چکے ہیں۔

راقم الحروف کے نزدیک اس زمانہ میں کسی بندہ کا اپنے بچوں کو قرآن پاک حفظ کرانا اس کے کمال دینداری اور سچی خدا طلبی کی خاص الخاص علامت ہے۔ ظاہر ہے کہ حفظ میں بچہ کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے، پھر اس کو یاد رکھنے کے لئے ساری عمر محنت اور وقت کا کچھ حصہ اُس پر صرف کرنا پڑتا ہے اور اس دنیا میں اُس سے کسی منفعت کی امید نہیں کی جا سکتی بس ——— قربانی ہی قربانی ہے ——— فی زماننا یہ خصوصیت صرف حفظ قرآن کی ہے ——— اس عاجز کو مرحوم کی زندگی میں اُن کی اس قربانی کا علم نہیں تھا، انتقال کے بعد جب بچوں کو دیکھا اور یہ تفصیل معلوم ہوئی تو ان پر بڑا ہی رشک آیا اور دل نے کہا کہ ان کے رب کریم کا ان پر خاص الخاص فضل تھا اور وہ ہمارے اندازوں سے زیادہ عظیم اور بلند تھے۔

اللہ تعالیٰ اُن کے اس عمل اور اولاد کی اس قربانی کو اپنی شان عالی کے مطابق قبول فرمائے ان کے ساتھ مغفرت ورحمت کا خاص معاملہ فرمائے، درجات بلند فرمائے۔ اُن کے ان بچوں کو دین و دنیا کی بلندی نصیب فرمائے اور سب پسماندگان اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے ——— ناظرین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔ (الفرقان اگست ۱۹۷۹ء)

ناقابلِ تلافی نقصان

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے نام تعزیتی مکتوب

مولانا مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل، رکن اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان

جناب محترم مولانا سید محمد الحسنی کی وفات کے سانحۂ کبریٰ سے مطلع ہوجانے کے بعد ایک تعزیت نامہ آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ اور حقیقۃً یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا جس کا برداشت کرنا اور صبر و استقامت اختیار کرنا محض اللہ تعالیٰ کی غیبی توفیق سے اہل دل کی قسمت میں ہوتا ہے۔ اس عظیم صدمہ کا برداشت کرنا اور صبر و استقامت اختیار کرنا آپ جیسے مردانِ کار اہلِ دل کا کام ہے اور آپ نے برداشت کر کے یہ سعادت مندی حاصل کی اور آپ کے درجات عالیہ کو اور بھی اللہ تعالیٰ نے بلند کر دیا۔ ۸ر شعبان کے بعد فیصل آباد سے پشاور آیا ہوں۔ یہاں آکر مختلف مصروفیات میں ایسا پھنس جاتا ہوں کہ اخبار و رسالہ کے مطالعہ سے تعلق منقطع ہوجاتا ہے، باقاعدگی سے کچھ بھی پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ جولائی میں دس دن اسلام آباد میں رہا اور کونسل کے کام میں انہماک رہا۔ اگست میں کراچی کا سفر ہوا وہاں بھی یہی مشغولیت رہی اور مجھے باہر کی دنیا اور خاص کر انڈیا کے حالات و واقعات کا کچھ بھی علم نہیں ہوا۔ پرسوں ایک مجلس میں دورانِ گفتگو میں کسی نے یقینی اطلاع کے طور پر مولانا اسحق جلیس صاحب کی وفات کا ذکر کیا کہ کسی اخبار میں آیا تھا۔ تعمیر حیات کا پرچہ میرے نام فیصل آباد کے پتے پر آتا ہے اور رمضان المبارک میں تعطیلات کی وجہ سے میں یہاں وطن میں تھا۔ شوال میں جلد واپس جانے کا پروگرام نہیں تھا اس لئے میں نے وہاں لکھا کہ میرے نام کے خطوط اور رسائل وغیرہ ۲۵ر شوال تک یہاں بھیجدو، چنانچہ تعمیر حیات کے پرچے وہاں سے یہاں منتقل ہو کر آئے تو ان میں یہ واقعہ فاجعہ پڑھ کر اس مجمل خبر کی تصدیق ہوگئی، إنّا للہ و إنّا الیہ راجعون پڑھ کر واقعۃً دل کو بہت صدمہ ہوا اور اس سے اندازہ ہوا کہ اس حادثۂ فاجعہ سے آپ کو کس قدر شدید صدمہ ہوا ہوگا۔ اور غم در غم نے آپ کے قلبِ اقدس کو کس قدر نڈھال کیا ہوگا ؎

ولکن نکأ القرح بالقرح أوجع

اس تازہ زخم نے اس زخم کو بھی ہرا کر دیا ہوگا اور دوہرے غم کی وجہ سے انتہائی تکلیف پہنچی ہوگی۔ مولانا اسحاق

جلیس صاحب سے گذشتہ سال کراچی، فیصل آباد اور لاہور کے سفر میں ملاقاتیں ہوتی رہیں اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ میں نے محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو کس قدر علمی، عملی اور انتظامی صلاحیتیں اور قابلیتیں عطا فرمائی ہیں اور آپ کی رفاقت و معاونت کے لئے وہ آپ کے بہترین تلمیذ و خادم اور باصلاحیت و موزوں رفیق کار تھے۔ یقیناً ان کی جدائی سے آپ کو، ندوۃ العلماء کے دارالعلوم کو، تعمیر حیات کے ادارہ کو اور دوسرے احباب و اعزّا کو کس قدر ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کرسکیں گے جن کو مولانا مرحوم کی صلاحیتوں اور افادیت و کارکردگی کا پورا پورا علم تھا۔ میں نے چند صحبتوں میں جو اندازہ لگایا تھا اس کی بنار پر میں سمجھتا ہوں کہ نہ صرف ندوۃ العلماء سے متعلق اداروں اور افراد کو بلکہ پورے مسلمانانِ ہند کو نظر بظاہر بہت بڑا نقصان پہونچا ہے مگر ماشاء اللّٰہ کان اور کل نفس ذائقۃ الموت اور لکل اجل کتاب کے حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر رضا بالقضا اور صبر و استقامت کے سوا اور کوئی علاج اس قسم کے صدمات اور رنج و غم کا نہیں۔ آپ کو اس بارے میں کچھ لکھنا تو درحقیقت پند بہ لقمان، و زیرہ بہ کرمان، و فلفل بہ ہندوستان بُردن والی بات ہے۔ میں محض اپنے ذہن میں ایک بات تازہ کر کے اپنے دل کے اطمینان اور تسلیہ و تعزیہ کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ نے ایک دفعہ مجلس میں بڑے اہتمام کے ساتھ ذکر فرمایا کہ "حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی کوئی بڑی سی بڑی مصیبت آجائے اور شدید رنج و غم اور شدید صدمے کا موقع ہو، تو پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا استحضار کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے وہ سب حقیقتوں کو کما حقہٗ جانتا ہے ہم بندے کچھ بھی نہیں جانتے وہ آغاز و انجام سے خبردار ہے ہمیں کچھ خبر نہیں وہ حکیم ہے اس کا کوئی فیصلہ اور فعل حکمت سے خالی نہیں ہر فعل ضرور کسی نہ کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے ہم کو اُن مخفی حکمتوں کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ اپنے بندوں کے ساتھ اس کی کوئی ذاتی دشمنی اور عداوت نہیں بلکہ وہ تو بندوں پر بہت مہربان، رحیم و رحمان اور کریم ہے۔ لہٰذا جو حادثہ پیش آیا، اس کے علم و خبر کی بنار پر حکمت کا تقاضا ہوگا اور کسی حکمت ہی کی بنار پر اس رحیم و کریم نے ہمارے کسی ایسے فائدے کی خاطر یہ فعل کیا ہوگا جو ہم سے مخفی ہے اور وہی اس کو جانتا ہے۔ تو اس عقیدہ کے استحضار سے اس صدمے اور رنج و غم کا علاج ہوجاتا ہے اور پریشانی ختم ہوجاتی ہے۔"

اس وقت اس حادثہ کی اطلاع کے بعد مجھے جو قلبی صدمہ ہوا اس کے ازالہ کے لئے میں نے استحضار کی

خاطر حکیم الامتہ کا یہ نسخہ لکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس پریشانی اور صدمے کا علاج بنا دے۔ مولانا مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس کی ابدی خوشیاں نصیب فرمائے، اُن کی چھوٹی بڑی نیکیاں اور دینی اور علمی خدمات قبول کر کے اُن کا بہترین بدلہ عطا فرمائے اور قبر مبارک کو انوارِ رحمت و مغفرت سے منور کر دے اور ان کی لغزشوں کو معاف کر کے ابدی زندگی میں آرام و راحت اور نعمائے جنت سے نوازے۔ مرحوم کے دوسرے متعلقین کو میری طرف سے آپ تعزیت کے کلمات پہونچا دیجئے۔

ناقابلِ فہم

مسلمان ہر سطح پر اور زندگی کے ہر گوشہ میں چاہے وہ سیاست و حکومت، تعلیم اور اقتصادیات سے تعلق رکھتا ہو یا شہر، قصبہ اور محلہ کی سربراہی، حتیٰ کہ کسی مسجد کی تولیت سے تعلق رکھتا ہو، خالص مادی نقطۂ نظر اور دنیوی وجاہت کو معیار بناتے ہیں، اس پیمانہ سے اپنے قائدین کا انتخاب کرتے ہیں اور آنکھیں بند کئے ان کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور اس موقع پر دین ان کی نظر سے ایسا اوجھل ہو جاتا ہے کہ اپنی قیادت کے دینی احتساب، تدبر، بصیرت اور خلوص کے امتحان کی نہ انہیں فرصت ملتی ہے نہ ضرورت محسوس ہوتی ہے، جس ملت کی تاریخ دین کی خاطر جاں نثاری سے مالا مال ہو، جو شعائرِ دین کو عزیز رکھتی ہو، جو اسلامی شریعت کے نفاذ کے لئے کسی قسم کی قربانیوں سے دریغ نہ کرے، وہ ملت اپنی قیادت کے نازک مسئلہ میں ایسی بے شعوری کا ثبوت دے اور ایسے قائدین کا انتخاب کرے کہ جو کاروانِ ملت کا رُخ مکہ کی بجائے ترکستان کی طرف کر دیں، اسکی کوئی تاویل اور توجیہ ناقابلِ فہم ہے۔

(مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم)

سنگ آمد سخت آمد

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

یہ خبر بجلی بن کر گری کہ مولانا اسحاق جلیس بھی اچانک موت کا شکار ہو گئے۔ گزشتہ ماہ کے تعمیر حیات میں ان کا افتتاحیہ مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کی ناگہانی وفات پر ابھی نظروں کے سامنے ہے بلکہ بہت سے قارئین تک پہونچا بھی نہ ہوگا کہ وہ خود اپنے پیش رو سے جا کر مل گئے۔ ان کے قلم سے ٹپکے ہوئے خون کے آنسو صفحۂ قرطاس سے خشک بھی نہیں ہوئے تھے کہ خود ان کا سانحہ پیش آگیا۔

للہ ما اعطی ولہ ما اخذ ، وہ اللہ ہی کی ملکیت تھی جو اس نے دی تھی، اور جو اس نے لیا وہ بھی اسی کی چیز تھی۔ اللہ کی مصلحت ہر مصلحت پر بالا، اس کی مرضی ہر مرضی سے اولیٰ، اس کی شانِ بے نیازی ہم عاجز و ناتواں بندوں کے فہم و ادراک سے بہت بلند ہے، ہماری جانیں، ہماری خواہشات، ہماری آرزوئیں سب اس کی رضا پر قربان ہیں، ہم مٹنے اور فنا ہونے کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے دین کے لئے آخری سانس تک معروف کار رہنا ہی ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ ہم عاجز و درماندہ نہ اس کی عطا و بخشش میں کوئی دخل رکھتے تھے، اور نہ آج اس کے فیصلے میں دم مارنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

یوں ہماری ظاہری آنکھیں، یہ کوتاہ بیں نگاہیں ہمیں یہ دکھا رہی ہیں کہ موت کی ایک لہر ایسی چلی کہ جس نے ہمارے چمن کو تاراج کر دیا، ہمارے چمن کا گل سرسبد (محمد میاں) ہم سے چھین لیا گیا، ہماری جماعت کا گوہر شب تاب گم ہو گیا، ابھی اس کے غم میں بہنے والے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے کہ اس چمن کا ایک اور گل تازہ (مولانا اسحاق جلیس) موت کے بے رحم ہاتھوں سے مسل دیا گیا۔

سنگ آمد سخت آمد کا محاورہ سنا تھا، ہمارے لئے یہ حقیقت ثابت ہوا، اور وہ بھی اس طرح کہ ایک پتھر کے گرنے سے کمر سیدھی بھی نہ کرنے پائے تھے کہ دوسرا پتھر آگرا۔

رب کریم کی مرضی کے آگے سر نیاز خم ہے، آنسو بہے ہیں اور بھی بہیں گے کہ آنکھوں پر اختیار نہیں ہے، غم سے دل بیٹھ رہا ہے، نبض کی رفتار سست ہے، چہروں سے غم و اندوہ نمایاں ہے، کہ ان پر ہمارا کوئی بس نہیں ہے۔ ہاں زبان پر اللہ نے قابو دیا ہے اس سے وہی نکلے گا جس سے ہمارا معبود راضی ہو۔ اور اس کی پناہ چاہتے ہیں کہ زبان سے کوئی حرفِ شکایت نکلے۔ اور اللہ محفوظ رکھے اس جزع و فزع سے جو اس کی مرضی کیخلاف ہے۔

ایک ماہ کے مختصر وقفہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دو امانتیں اس زمین سے واپس لیں۔ ان میں ایک تو محمد میاں تھے (مولانا سید محمد الحسنیؒ) اور دوسرے مولانا اسحاق جلیس ندویؒ۔ اللہ کی رحمتیں ہوں ان دونوں پر، دونوں اس دنیا میں ایک دوسرے کے قدرداں اور معترف تھے، آپس میں دوست تھے، ان کی محبت اللہ تعالیٰ کے دین اور دین کی فکر پر مبنی تھی، ان کا رشتۂ اتصال اسلام تھا، اللہ کی رحمتوں کے سائے میں آج دونوں اس کے انعامات سے بہرہ مند ہوں گے اور انشاء اللہ اس گروہ میں جگہ پا چکے ہوں گے جو قیامت کے دن عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوں گے۔ رجلان تحابا فی اللہ (حدیث) قیامت کے دن اللہ کا سایۂ رحمت پانے والے وہ دو مرد ہوں گے جو صرف اللہ کے لئے آپس میں ایک دوسرے کے محب ہوئے۔

مولانا اسحاق جلیس ایک جوہر قابل تھے، ان کے فطری جوہر نے حضرت مولانا کی صحبت و تعلق سے جلا پائی تھی، وہ ندوہ کے ایک ستون بن گئے تھے، حضرت مولانا کو ان پر اعتماد تھا، جس سے تعلق کی استواری میں وہ ہم جیسے کم ہمتوں کیلئے قابلِ رشک اور لائق محبت و احترام تھے۔ اللہ نے ان کو اچھی صلاحیتیں مرحمت فرمائی تھیں، ایک جرأت مند اور حوصلہ مند صحافی تھے، اچھے اور کامیاب مقرر تھے، پیام انسانیت، کی تنظیم اور اس کا کام پھیلانے میں وہ حضرت مولانا کے، دست راست تھے، انھوں نے لائبریری سائنس کا اچھا مطالعہ کیا تھا، اور اس کے اصول کو عملی طور پر ندوۃ العلماء کے کتب خانہ پر کامیابی کے ساتھ منطبق کیا جس کی وجہ سے کتب خانہ جو قدیم طرز پر ایک روایتی ڈھرّے پر قائم تھا، اس کو اس طرح ترتیب دیا کہ عصر حاضر کی سہولتیں میسّر آگئیں، وہ جگہ جو تنگ تاریک تھی روشن اور وسیع ہوگئی، کتابوں کا حصول آسان ہوگیا، ان کی قابلیت کا جوہر ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن میں بھی کھلا، انہوں نے علمی نمائش کی ترتیب کا کام اپنے ذمہ لیا تھا اس کام کو بڑے سلیقہ اور ذوق سے اللہ تعالےٰ نے ان سے انجام دلایا۔ ان کی عمر زیادہ نہ تھی، محمد میاںؒ کے کم و بیش ہم عمر تھے، صحت اچھی تھی، خوش ذوق اور خوش لباس تھے، کبھی نہ تھکنے والی طبیعت اور مسلسل کام سے آسودہ ہونے والا مزاج پایا تھا، مولانا اسحاق اس حقیقت کا زندہ نمونہ تھے کہ ذہانت پر جب ایمان و اخلاص کی آب پڑتی ہے تو اس کی قوت دو آتشہ بن جاتی ہے، عفاف و حیا، خیالات و افکار کی سلامتی ہر صلاحیت کو بروئے کار لاتی ہے۔

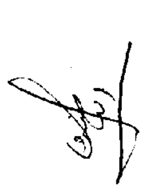
مولانا اسحاق جلیس نے اپنی عمر سے زیادہ کام کیا اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ کارآمد بنایا، انھیں اللہ تعالیٰ کی جو امانت سپرد ہوئی تھی، صحت، ذہانت، علمی مزاج، سلامت فکر اور ذوقِ عمل ان سب کا حق انہوں نے ادا کیا، ایسے خوش نصیب کم ہی ہوں گے جنھوں نے قدرت کی بخشی ہوئی طاقتوں کا صحیح اور جائز استعمال کیا، اور ان کی جھولی میں جو

بھی تھا وہ دین پر قربان کردیا،

مولانا اسحاق اس طرح اور یکبارگی بزم ہستی سے اٹھ کر چلے گئے جیسے اس دنیا سے ان کو سروکار ہی نہیں تھا، محمد میاں اور اسحاق جلیس آگے پیچھے ایک مہم پر روانہ ہوگئے، اس مہم سے وہ واپس نہیں آئیں گے، لیکن ان کے قدموں کے نشان باقی ہیں اور باقی رہیں گے، بھری محفل سے ان کے اٹھ کر جانے کی ادا یاد رہے گی، محفل ان کے بغیر سونی ہوگئی اور جانے کب تک دل کی دنیا سونی رہے۔ مرورایام سے زخم مندمل ہوجائیں گے، لیکن زخم کا نشان کبھی نہیں مٹے گا۔ محمد میاں اور مولانا اسحاق آگے پیچھے چل دیئے اور ایک بڑا خلا چھوڑ گئے، نگاہ جستجو کو ان کا بدل نظر نہیں آرہا ہے۔

تعمیر حیات میں اسحاق جلیس صاحب نے زندگی کی روح پھونک دی تھی، یہ پرچہ ابتدا میں محمد میاں اور ان کے رفیق کار مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے نکالا تھا، لیکن یہ دونوں البعث الاسلامی کے بھی ذمہ دار تھے، ایک وقت میں عربی اور اردو دونوں کے کام سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، ایک کی طرف پوری توجہ صرف کرتے تو دوسرا پلڑا ہلکا پڑجاتا، چنانچہ یہی ہوا ان دونوں کی توجہ اور کاوش کا مرکز البعث الاسلامی تھا، اور تعمیر حیات لسٹم پسٹم گھسٹا جارہا تھا۔ مولانا اسحاق جلیس نے اس کی ادارت کا بار سنبھالا تو اس میں نئی جان آگئی، اس کی اشاعت کا حلقہ بڑھا، اس کو آفسٹ میں چھاپنا شروع کیا اور جدید صحافت کی رعنائی اس کے اندر آگئی۔ یہ پرچہ آج یتیم ہوگیا ہے، اسی طرح کتب خانہ کی تدوین جدید ان کی بہترین یادگار ہے، اللہ تعالیٰ ان کے پس ماندگان سے خصوصی رحم وکرم کا معاملہ فرمائے۔

ان کا غم تنہا ان کے خاندان کا غم نہیں ہے، ہم سب کا غم ہے۔ ہم سب اپنا بازو کٹا ہوا محسوس کر رہے ہیں۔ وہ خوش نصیب تھے کہ ان کے لئے حرمین شریفین میں بصد الحاح وزاری اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور نفوس قدسیہ نے دعائیں کی ہیں، اور ان کے ساتھ چند ناکاروں اور معصیت زدہ بندوں نے بھی رحم کی التجا کی ہے، اس کی شان رحیمی سے یقین ہے کہ وہ جانے والے پر بھی رحم فرمائے گا اور باقی ماندہ افراد پر بھی۔ انہ لعلی المولیٰ ونعم المجیب



مولانا اسحٰق جلیس ندوی

تاثرات و حالات

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صدر شعبۂ ادب عربی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا اسحٰق جلیس ندوی ۱۵ر شعبان ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۱ر جولائی ۱۹۷۹ء بوقت عصر اس دنیا سے رخصت ہو کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون،

یہ حادثہ ندوۃ العلماء کے لئے اور اس کے سربراہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے لئے ایک ماہ کے فرق سے دوسرا سخت ترین حادثہ ہے کیونکہ ندوۃ العلماء کے مقصد و فکر کی خدمت کے سلسلے میں اور مولانا کی سرکردگی میں دعوت و علم دین کے میدان میں کام کرنے والے دو اہم ترین سپاہی یکے بعد دیگرے کم عمری میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنے رفقائے کار کو اپنے تعاون و رہبری سے محروم چھوڑ گئے۔ عموماً جب جہاد اسلامی میں قتال کا موقع ہوتا ہے تو اس طرح کے حادثے پیش آیا کرتے ہیں اور بعض وقت یہ حادثے جہاد کی طاقت اور اس کی فعالیت پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں اور ان سے میدان کے سپاہیوں اور قائدوں کی صف میں بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے، لیکن بہر حال وہاں وہ حادثے تعجب کا باعث نہیں ہوتے اور ان کو توقع کے خلاف بھی نہیں سمجھا جاتا لیکن علمی و ادبی اور عام دعوتی میدان میں پے در پے دو اہم حادثے بڑی بات ہیں۔ ان سے جتنا تاثر ہو اور غم و افسوس ہو کم ہے لیکن دعوت و علم دین کے راستے میں ساری جد و جہد جس پروردگار کی رضا کے لئے کی جا رہی ہے وہ قوی اور عزیز بھی ہے اور اپنے بندوں کا محافظ بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔

اس دنیا میں کوئی چھوٹی بات یا بڑی بات نہ اس کی مرضی کے خلاف ہو سکتی ہے اور نہ اس کے علم کے بغیر، اس کی حکمت و مرضی جو بھی ہو اس پر سب بندوں کو راضی رہنا ہے وہ علیم و حکیم ذات ہر شخص کو ایک مقررہ عمر کے ساتھ اس دنیا میں بھیجتی ہے اور جتنا اور جتنی مدت اس کے حصہ میں رکھی ہے اتنا پورا ہونے کے بعد وہ اس کے یہاں واپس بلا لیا جاتا ہے۔ اس کی حکمت کا خدا تعالیٰ کو علم ہے البتہ ان نوخیز و نوجوان . . . عزیزوں

کے جدا ہونے سے تمام رفقاء بہت ملول، افسردہ اور غم زدہ ہیں اور یہ ایک فطری بات ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ کے انتقال پر اپنے تاثر کا اظہار آنسوؤں سے اور ان الفاظ سے کیا تھا، ہم تمہاری جدائی سے ابراہیم واقعتاً غم گین ہیں۔

ایک ماہ کے عرصہ میں ندوہ نے اپنے دو عظیم سپاہی کھودیے۔ یہ واقعتاً بڑے صدمے کی بات ہے بلکہ بقول عربی شاعر ؎

ولیس لعین لم یفض ماءھا عذر

(اس حادثہ پر جس آنکھ سے آنسو نہ بہے اس کا عذر قابل قبول نہیں)

مولانا اسحٰق جلیس ندوی اپنی متعدد خصوصیات میں اپنے پورے حلقہ میں منفرد حیثیت کے مالک تھے ان کا سب سے بڑا ہنر مسلم و غیر مسلم اجتماعات میں انسانیت کی ستھری اور تعمیری دعوت کو اچھی زبان و اسلوب میں طاقت و تاثر کے ساتھ پیش کرنا تھا اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے شیخ و مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے فکر و ذہن کو پوری طرح اپنا لیا تھا اور وہ ان کے دست راس بن گئے تھے ان کو اپنے شیخ کا پورا اعتماد تھا اور ان کو ان سے بڑی مدد ملتی تھی ابھی ڈیڑھ ماہ قبل اسی سلسلے کا ایک دورہ کرناٹک کا کر کے واپس آئے تھے۔

مولانا اسحٰق جلیس صاحب کی دوسری بڑی خصوصیت و صلاحیت اردو صحافت پر ان کی قدرت تھی وہ اس کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے اور موثر و طاقتور اسلوب کے مالک تھے انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے کے بعد پونا میں قیام کے دوران ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا تھا جس کے ذریعہ ان کی صحافتی صلاحیت کا پہلی بار لوگوں کو علم ہوا۔ پھر جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کے لئے ان کی خدمات حاصل کی گئیں تو اردو کا پندرہ روزہ "تعمیر حیات" ان کے سپرد کیا گیا جس کو انہوں نے خاصی ترقی دی اور اپنی تحریر و انتظام کے ذریعہ ملک میں اس کی ایک اچھی جگہ بنادی، افسوس یہ پندرہ روزہ اب ان کی تحریر و انتظام سے محروم ہوگیا۔

مولانا اسحٰق جلیس صاحب نے بھی بہت کم عمر پائی وہ بھی مولانا محمد الحسنی کی طرح صرف ۴۴ سال کی عمر میں اس دنیا سے رحلت کر گئے اور عجیب بات یہ ہے کہ دونوں نوجوان خادمان علم و دین کا انتقال ملتی جلتی بیماری میں ہوا، بیماری ایسی کہ اپنی ابتدائی منزل میں نہایت غیر اہم اور معمولی لیکن نتیجے کے اعتبار سے

فیصلہ کن۔ وہ انتقال کے خطرہ کا ذہن پوری طرح بننے سے قبل اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کرتا ہے۔ ایک پتہ بھی اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہل سکتا، لیکن یہ بات بھی نظر کے سامنے بار بار آتی ہے کہ دونوں مرحومین اسپتال کے ایمرجنسی کے کارپردازوں کے ہاتھوں اس دنیا سے رخصت ہوئے اور تیماردار "اے کاش" کا لفظ دہراتے رہ گئے۔

مولانا اسحاق جلیس صاحب کا تعلق کئی صوبوں سے تھا۔ ان کے والد صاحب صوبہ سرحد کے ایک معزز پٹھان گھرانے کے فرد تھے اور فوج کے ایک مرکز میں ایک مذہبی منصب پر فائز تھے، امام و مفتی تھے اقیام صوبہ مہاراشٹر کے شہر احمد نگر میں تھا یہیں مولانا اسحٰق صاحب کی نشو و نما ہوئی اور وہ وطن کے لحاظ سے مہاراشٹری بنے لیکن جب تعلیم کی تکمیل کا وقت آیا تو لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء آئے یہاں ۵ سال میں انہوں نے دینی و عربی تعلیم کی تکمیل کی یہ ۱۹۵۹ء کا سن تھا اور یہ ان کی تکمیل تعلیم کا آخری سال تھا کہ ترجمہ و تصنیف و اشاعت کے مشہور شعبہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی ندوہ میں بنیاد پڑی۔ مولانا اسحاق جلیس صاحب اپنی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کی بنیاد پر اس شعبے کے معاون سکریٹری مقرر ہوئے اور انہوں نے اس ادارہ کو شروع کے مرحلے میں اپنی صلاحیتوں سے بڑی مدد پہونچائی پھر وہ اپنے وطن احمد نگر واپس چلے گئے۔ وہاں پھر ایک کالج میں تدریسی منصب پر فائز ہوئے جس کو کئی سال تک انجام دیتے رہے اسی دوران انہوں نے وہاں کے شعبۂ لائبریری سائنس میں اس فن کی تعلیم حاصل کی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء آکر اسلامی کتب خانوں کے مخصوص حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے حاصل کردہ فن میں مناسب تغیر کرکے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کو نئے ڈھنگ پر ڈھالنا شروع کیا جو ان کے انتقال سے خاصا پہلے تکمیل کی منزل تک پہنچا۔

مولانا اسحاق جلیس صاحب کو کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا ان کا آبائی وطن صوبہ سرحد تھا لہذا وہ پشتو جانتے تھے اور حسب ضرورت لوگوں سے اس میں گفتگو کرتے تھے۔ ان کی نشو و نما مہاراشٹر میں ہوئی اس طرح وہ مرہٹی زبان پر بھی عبور رکھتے۔ لکھنؤ میں رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ یوپی کے آدمی معلوم ہوتے تھے اور اردو ادب سے علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے کامیاب واقفیت رکھتے تھے، ہندی و انگریزی ملک کی سرکاری زبانیں ہونے کی بنا، پر ان کو اچھی طرح سمجھتے اور استعمال کرتے تھے اس طرح ان کو کسی بھی صوبہ میں مسلم وغیر مسلم کسی مجمع میں اپنی بات کو کہنے اور سمجھانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی

تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو زبان وقلم دونوں کی صلاحیت یکساں عطا فرمائی تھی۔ وہ اچھے اور موثر ڈھنگ پر لکھتے اور اچھے اور موثر ڈھنگ پر تقریر کرتے تھے۔ ان کو ندوۃ العلماء کے تخیل وتحریک کے اور مولانا علی میاں صاحب کے اسلامی و دعوتی فکر سے بڑا لگاؤ اور تعلق تھا وہ مولانا مدظلہ کو اپنا خصوصی مربی وشیخ سمجھتے تھے اور ان کو مولانا مدظلہ سے اس سلسلے میں محبت کا تعلق تھا اور مولانا کو بھی ان سے بہت تعلق خاطر تھا۔ مولانا ان کو بڑا عزیز رکھتے اور ان کے خلوص وصلاحیت کے بڑے قدرداں تھے۔

مولانا اسحٰق صاحب کا مولانا سے تعلق ومحبت ان کے تمام ان لوگوں کے تعلق ومحبت میں ظاہر ہوتا تھا جو مولانا مدظلہ کو عزیز ومحبوب تھے۔ چنانچہ محمد میاں سے ان کا قریبی تعلق تھا اور دونوں ایک دوسرے سے بہت مانوس تھے۔ یہ انس، غور وفکر کی یکسانی اور عملی کوششوں کی شرکت کی صورت میں ظاہر ہوتا چنانچہ مولانا محمد میاں کا انتقال ان کے لئے بڑا صدمہ تھا وہ اپنی اس بیماری میں مجھ سے کہنے لگے کہ محمد میاں کے انتقال کے بعد جلد ہی ان سے جاملنے کی دعا کی تھی بس یہ خیال ہوتا ہے کہ حضرت (یعنی مولانا علی میاں) نماز جنازہ پڑھانے کے لئے اس وقت تشریف نہیں رکھتے ہیں۔ مولانا مدظلہ، ان کے انتقال سے ایک ہفتہ قبل مدینہ منورہ گئے تھے اس وقت تک مولانا اسحٰق صاحب بالکل معمول کی صحت میں تھے۔ علالت بڑھ جانے پر ان کو بذریعہ تار اطلاع کی گئی جس کے جواب میں فکر وتشویش کے اظہار اور دریافت حال کا تار آیا لیکن افسوس کہ اس کے جواب میں رحلت ہی کی اطلاع دی جاسکی۔

مولانا اسحٰق صاحب کو ان کی خواہش و وصیت پر مولانا مدظلہ کے گاؤں دائرہ شاہ علم اللہ کی مسجد کے جنوب مغربی رُخ پر واقع قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

مولانا اسحاق صاحب کو چند ماہ قبل معدہ میں السر کی شکایت محسوس ہوئی تھی جو کئی بار درد کی صورت میں ظاہر ہوئی اور ٹھیک ہوگئی۔ اس بار جمعہ کے روز پھر محسوس ہوئی زیادہ بڑھنے پر میڈیکل کالج کے ایمرجنسی وارڈ میں داخلہ ہوا لیکن وہاں مرض پیچیدہ ہوتا گیا اور کئی نئی اندرونی شکایات میں تبدیل ہوگیا۔ چار روز سے زیادہ اسپتال میں رہنے کے بعد چہارشنبہ ۱۵ شعبان کو انتقال کیا ـــــ تیمارداروں کو یہ بڑا احساس ہے کہ اسپتال میں فائدہ سے زیادہ نقصان ہوا۔ انتقال کے قریب وہ ہوش وحواس پر قائم تھے ضروری باتیں بھی کرتے رہے اور خوشی خوشی کچھ دیر میں اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ واجزل مثوبتہ الی الآخرۃ۔

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

مولانا اسحاق جلیس ندوی

ابھی ایک حادثہ، جان کاہ سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ دوسرا عظیم حادثہ رونما ہو کر رہا، ۱۷ ر رجب ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۳ ر جون ۱۹۷۹ء کو صدیق محترم مرحوم مولانا سید محمد الحسنی (اڈیٹر البعث الاسلامی) کی اچانک وفات نے ایسا جھنجھوڑا اور اس قدر تڑپایا کہ جینے کا حوصلہ جیسے ختم ہو گیا ہو، اور زندگی میں کوئی لذت و رعنائی اور کوئی کشش و ندرت باقی نہ رہی ہو، ہم سب اس حادثہ سے پژمردہ، نڈھال اور انتہائی ملول خاطر تھے، مولانا اسحٰق جلیس صاحب نے تو دعا مانگ لی کہ اے اللہ! اب ہم کو بھی اٹھا ہی لے، اور یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ اس حادثہ کے چوتھے ہفتے کے اختتام تک خود مولانا جلیس صاحب بھی اپنے اللہ سے جا ملے اور اپنی زندگی کے ایک محترم رفیق پر اپنی جان نچھاور کر کے ان کی ابدی خواب گاہ کے بالکل قریب خود بھی آسودۂ خاک ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۱۵ ر شعبان ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۱ ر جولائی ۱۹۷۹ء کو چار ہفتوں کے اندر ندوۃ العلماء کے لئے یہ دوسرا سب سے بڑا حادثہ تھا، اور اگر مولانائے مرحوم سید محمد الحسنی رحمہم اللہ کی اچانک وفات سے ان کے عم مکرم اور ہم سب کے مربی و محسن حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی دامت برکاتہم کو شدید ترین صدمہ پہنچا تھا تو یقیناً مولانا اسحاق جلیس کی اچانک وفات سے حضرت مولانا دامت برکاتہم کو دوہرا شدید صدمہ پہنچا اور ان کو ایک قابل ترین نہایت ثقہ اور لائق فرزند کی جدائی کا غم برداشت کرنا پڑا، پہلا حادثہ بھی حضرت مولانا دامت برکاتہم کی عدم موجودگی میں پیش آیا اور دوسرا حادثہ بھی بالکل اسی جیسے حالات میں پیش آیا، مرض میں بھی بڑی یکسانیت تھی اور پورے چار ہفتے کے بعد وہی بدھ کا دن اور تیسرے پہر کا وقت تھا، حضرت مولانا دامت برکاتہم کے دل پر حادثہ کی خبر سن کر کیا کچھ گذر گئی ہوگی یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے بظاہر یہ غم بھی بہت ہی سخت اور حادثہ بھی نہایت

سنگین ہے، اور اس نقصان کی تلافی بھی مشکل ہے، اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے ان حوادث کی شدت سے ندوۃ العلماء کو جو نقصان پہونچا ہے اسکی تلافی کی کوئی صورت پیدا فرمادیں، اور دلوں کو صبر و سکون عطا فرمادیں۔

مولانا اسحاق جلیس صاحب کو مجھے بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا، اکتوبر ۱۹۷۶ء میں سعودی عرب اور بعض دوسرے عرب ممالک کے سفر میں ڈھائی مہینے سے زیادہ ہمارا ان کا ساتھ رہا، ہم لوگ ریاض میں جامعۃ الامام محمد بن سعود کی طرف سے منعقد کی جانے والی فقہی کانفرنس میں شرکت کیلئے ندوۃ العلماء کے نمائندہ کی حیثیت سے وہاں گئے تھے، اور کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد حج کی سعادت سے بھی بہرہ اندوز ہوئے تھے، حج کے بعد کویت، خلیج عرب کی امارات کا سفر بھی ہوا اور پوری مدّت سفر میں ہم لوگوں نے باہمی اعتماد و احترام کے ساتھ گذاری کسی جگہ بھی کوئی ایسی ناخوش گوار بات پیش نہیں آئی جو اکثر سفروں میں اور خاص طور سے حج کے سفر میں پیش آتی ہے۔

یوں تو مولانا جلیس صاحب سے میں بہت قریب سے واقف تھا، وہ جب دارالعلوم میں بغرض تعلیم آئے تو اگرچہ دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے میرا تقرر ہو چکا تھا اور البعث الاسلامی کی کی ادارتی ذمہ داریوں میں شرکت کی ابتدا بھی ہو چکی تھی مگر ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے ان سے ملنے اور اور ان کے ساتھ نشست و برخاست کا موقعہ ملا، ان کو ہمارے مرحوم دوست مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ سے غائبانہ عقیدت تھی اس لئے جب وہ ندوہ آئے تو ان سے ملاقات اور ملنے جلنے کا سلسلہ شروع ہوا بعد میں جب وہ ۱۳۷۹ھ میں فارغ التحصیل ہو کر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے انچارج مقرر ہوئے تو تعلقات وسیع ہوئے اور برابر مختلف امور میں تبادلۂ خیال کے لئے ملنا ہوتا رہا۔

تعمیر حیات نکلنے سے پہلے کی بات ہے کہ انہوں نے ایک اردو ڈائجسٹ نکالنے کا فکرہ پیش کیا ہم لوگوں نے اس کی ترحیب کی اور اس کے لئے ابتدائی تیاریاں بھی مکمل ہو گئی تھیں، مضامین کا انتخاب، عربی مضامین کا انتخاب کر کے ان کا ترجمہ کرانا اور ترتیب و کتابت سبھی مرحلہ مکمل ہو گیا تھا کہ اچانک کاتب تقدیر نے یہ فیصلہ بدل دیا اور مولانا جلیس صاحب احمد نگر چلے گئے۔

کئی سال تک وہ اپنے وطن میں رہ کر مختلف پہلوؤں کی تکمیل کرتے رہے۔ انہوں نے لائبریری سائنس کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل کیا، اور ہندی زبان بھی بے تکلف

لکھنے اور بولنے لگے، پشتو زبان پر بھی پورا قابو تھا، عربی اور فارسی زبان وہ پہلے ہی سے جانتے تھے اس طرح انھوں نے بیک وقت بہت سی ضروری زبانوں پر دست رس حاصل کر لی اور زندگی کے مختلف کاموں میں ان سے کام لیتے رہے۔ وہ پونہ کالج میں لکچرار کی حیثیت سے بھی اس وقفہ میں مقرر ہوئے اور ایک جریدہ بھی انھوں نے اس زمانہ میں نکالا تھا، اس میں وہ اپنے افکار و نظریات کو پیش کرتے رہے۔

اس اثنار میں وہ کبھی بھی اپنے شیخ و مربّی حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ سے بے تعلق نہیں ہوئے بلکہ برابر ان سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم رہا اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیتے رہے اسی زمانے میں حضرت مولانا دامت برکاتہم کو ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی تنظیم جدید کی طرف توجہ ہوئی تو مولانا اسحاق جلیس صاحب کو اس غرض سے خط لکھا اور ان کی خدمات اس کام کے لئے طلب کیں، پہلے وہ عارضی طور پر کچھ دنوں کے لئے آئے تاکہ وہ خود بھی اندازہ لگا سکیں کہ اس کام کو وہ کس حد تک بآسانی انجام دے سکیں گے، پھر یہ کہ ان کے کام سے حضرت مولانا کو اطمینان بھی ہو جائے، اگر اس کے بعد ضرورت محسوس ہوئی تو وہ مستقل طور سے آنے کے بارے میں سوچ سکیں گے، چنانچہ انہوں نے پہلے عارضی طور پر آکر بہ طور نمونہ کے اس کام کی ابتدا کی پھر حضرت مولانا دامت برکاتہم کے حکم سے وہ پونہ سے استعفاد ے کر مستقل طور سے ندوہ آ گئے۔

ان کا یہ دوسرا دور ندوہ میں ۱۹۷۲ء سے شروع ہوا، اس دفعہ انہوں نے پوری ہمت اور اپنی مکمل صلاحیت کا مظاہرہ کیا، کتب خانہ کی تنظیم جدید میں وہ دل و جان سے مشغول ہو گئے اور آخر کار اجلاس ندوۃ العلماء جو ۱۹۷۵ء میں ہوا، اس وقت تک وہ اس کام سے بڑی حد تک فارغ بھی ہو گئے، اسی کے ساتھ انہوں نے تعمیر حیات کو بھی حیات نو بخشی، اس کو ایک فعال اور باصلاحیت اڈیٹر کی ضرورت تھی جو انہوں نے پوری کی۔ اور تعمیر حیات نئی آب و تاب اور نئے خد و خال کے ساتھ شائع ہونا شروع ہوا، تو اس کا حلقہ وسیع ہو گیا اور اس کے ذریعہ پیام ندوۃ العلماء از سر نو ملک کے گوشے گوشے میں پہونچنے لگا، وہ ہر شمارہ میں ندوۃ العلماء کی تاریخ، اس کی فکر اور اس کے پیغام و ضرورت پر کچھ نہ کچھ شائع کرتے تھے اجلاس کے زمانے میں خاص طور سے تعمیر حیات کو انہوں نے اس کام کا ایک بڑا ذریعہ بنایا اور ہندوستان اور عالم اسلام کے مختلف ضروری مسائل پر لکھنے کے ساتھ ساتھ وہ پیام ندوۃ العلماء کو کسی حال میں بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے تھے، طلبہ کی ہمت افزائی کرتے اور ان سے بھی مفید عربی مضامین کے تراجم کرا کے شائع

کرنے، ندوۃ العلماء کے شب و روز اور تازہ ترین حالات پر لکھنے کے لئے طلبہ ہی کا انتخاب کرتے تھے اور ندوہ کا خبرنامہ ان سے لکھوا کر ہر شمارہ میں شائع کرتے تھے۔

اجلاس کے زمانہ میں جہاں دوسرے لوگوں کو بہت سے کام سپرد کئے گئے ان کو حضرت مولانا دامت برکاتہم نے ایک علمی اور تاریخی نمائش کی ترتیب و تدوین کا کام سپرد کیا جس میں ہندوستان کا علمی، ثقافتی چہرہ اور علوم اسلامیہ کے میدان میں علمائے اسلام کا کارنامہ اور مختلف علوم وفنون کے میدان میں مسلمانانِ ہند کا کردار سامنے آجائے اور ایک نظر میں صدیوں کی تاریخ کا خلاصہ اور اس کا عطر پیش کیا جاسکے۔ اس کام کو مولانا جلیس مرحوم نے بہت ہی محنت اور احساس ذمہ داری کے ساتھ حضرت مولانا دامت برکاتہم کی نگرانی میں اور صدیق مکرم مولانا سیّد محمد الحسنی مرحوم کے مشوروں کی روشنی میں اس سلیقہ سے انجام دیا کہ جب نمائش کا افتتاح ہوا اور دیکھنے والوں نے دیکھا تو بے ساختہ وہ اس صاف ستھرے ذوق اور اس عظیم الشان کام کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے، بعض بین الاقوامی سطح کی یونیورسٹیوں کے ذمہ داروں نے برجستہ کہا کہ یہ نمائش ندوہ کا امتیازی وصف ہے جس سے دوسرے عصری ادارے بھی محروم ہیں۔ الحمدللہ کہ آج بھی اس نمائش کے باقی ماندہ لوحات (ڈسپلے) کتب خانہ ہال کے اندر موجود ہیں اور مرحوم کی صلاحیتوں اور ان کے صاف ستھرے علمی ذوق کی نشاندہی کرتے ہیں۔

مولانا جلیس صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا وہ اخلاص تھا جس کو وہ اپنی بہترین کوششوں کے ساتھ جوڑ دیتے تھے، اسی لئے جب وہ کسی مشکل سے مشکل کام کا بیڑا اٹھاتے تھے تو اپنے اس وصف کی بناء پر وہ حسب ضرورت اس کے لئے رفیق بھی مہیا کر لیتے تھے اور دوسرے وسائل بھی حسب مقدرت ان کو حاصل ہو جاتے تھے، جس سے بھی کام لیتے اس کی محنت سے زیادہ اس کو حق المحنت فراہم کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ اپنے اخلاص کے ساتھ اپنے بڑوں کی بھی قدر کرتے اور اپنے کام کی لگن میں وہ کسی اور طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے، نہ ان کو دوسروں کے حالات سے بحث ہوتی اور نہ کسی کی کم ہمتی اور کمزوری کی جستجو میں رہتے، اگر ان کو کسی کے بارے میں کوئی بات معلوم بھی ہوتی تو اس کو زیادہ اہمیت نہ دیتے، ہاں اگر دینی نقطۂ نظر سے اور ادارہ کے نقصان کے خیال سے ضروری ہوتا تو حسب ضرورت اس کی فکر کر لیتے، لیکن محض کسی کو نقصان پہونچانے کے لئے کوئی اقدام کبھی نہیں کرتے تھے۔

وہ پیغام ندوۃ العلماء کی اتنی اچھی اور دل آویز تشریح کرتے تھے اور خاص طور سے موجودہ

دور میں ندوۃ العلماء کے پیغام کی ضرورت کو اتنی خوبی اور پاکیزگی سے بیان کرتے تھے کہ سننے والا دنگ رہ جاتا، اور ندوۃ العلماء سے اپنی ناواقفیت پر اس کو دیر تک افسوس ہوتا، جب بھی ندوہ میں کوئی علمی یا ثقافتی وفد اندرون یا بیرون ملک سے آتا تو مولانا جلیس صاحب اس وفد کی رہنمائی کے لئے منتخب ہوتے تھے، وہ دارالعلوم کے تمام شعبوں کتب خانہ کے تمام گوشوں، مجلس تحقیقات ونشریات کی مطبوعات اور ندوۃ العلماء کی عربی و اردو صحافت کی سرگرمیوں کا نہایت خوبی اور وضاحت کے ساتھ تعارف کراتے اور اپنے اخلاق کریمانہ سے پوری طرح اس وفد کے ارکان کی پذیرائی کرتے اور ان کے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑتے تھے، جب بھی کسی سرکاری ادارے یا عصری تعلیم گاہ سے کوئی شخص ندوۃ العلماء کو دیکھنے یا کسی سے ملنے یا استفادہ کرنے کے لئے آتا تو مولانا اسحاق جلیس صاحب اس کے لئے ندوۃ العلماء کی زبان اور اس کا ترجمان بنتے تھے۔

وہ ایک کامیاب صحافی اور طاقتور قلم کے مالک تھے، بامقصد اور صاف ستھری انشاء پردازی میں بہت کم لوگ ان کے ہم پلّہ تھے، اردو کے ادیب بھی تھے اور ہندی زبان پر بھی عبور رکھتا اور لکھ بھی سکتے تھے، کتنے ہی خالص ہندی مضامین کو انہوں نے اردو کا جامہ پہنایا، عالمی صحافت کا بغور مطالعہ کرتے تھے اور بہت سی ایسی چیزیں نکال کر اسے منظر عام پر لاتے اور شائع کرتے تھے جو عام طور سے لوگوں کے لئے نئی ہوتی تھیں، عام معلومات اور سیاسی تازہ ترین حالات سے اتنے باخبر رہتے کہ کم لوگ ان کا اس میدان میں مقابلہ کرسکتے تھے۔

جب حضرت مولانا دامت برکاتہم نے "پیام انسانیت" تحریک کو عملی جامہ پہنایا تو اس کے روح رواں مولانا اسحاق جلیس ہی تھے، انہوں نے اپنی قابلیت اور خداداد تقریر وتحریر کی صلاحیتوں سے کام لے کر اس تحریک کو ملک کے مختلف گوشوں میں روشناس کرایا اور حضرت مولانا دامت برکاتہم کے ساتھ ان کے دوروں میں جو اس سلسلہ میں ہوئے ہمیشہ ساتھ رہے اور نہایت انہماک ودلچسپی اور نشاط و سرگرمی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا۔ مختلف الخیال اور مختلف المذہب لوگوں کے درمیان بات اور تقریر کرنے میں وہ اتنے کامیاب تھے کہ بے تکلف لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے اور ان سے اپنا نقطۂ نظر منوا لیتے تھے۔

وہ بہت خوبیوں اور صفات کے مالک تھے، وہ عالی ہمت، بلند پرواز، بامقصد ذمہ دار اور بلند کردار شخص تھے، کسی کام میں سستی اور کاہلی کا کوئی جواز ان کے نزدیک نہیں تھا، وہ خود بھی سرگرم

تھے اور دوسروں کو بھی ہمیشہ سرگرم عمل دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی نظروں میں ذمہ داری کا احساس اور ذمہ داری کو امانت داری کے ساتھ انجام دینا ہی وہ بنیادی پتھر تھا جس پر زندگی کی صحیح اور متوازن عمارت قائم ہوتی ہے، وہ پوری زندگی اسی پر عامل رہے اور دوسروں سے بھی اسی پر عمل پیرا ہونے کی امید رکھتے تھے، وہ حضرت مولانا دامت برکاتہم کے حکم سے تاریخ ندوۃ العلماء مرتب کر رہے تھے اور اس کا بیشتر حصہ انہوں نے تیار بھی کر لیا تھا، امید ہے کہ یہ تاریخ مکمل اور شائع ہو کر ان کے یادگار کارناموں میں وقیع اضافہ کرے گی۔

اللہ تعالیٰ ان کی تمام لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف کر کے ان کے درجات بلند فرمائیں اور اعلیٰ علّیین میں جگہ دیں اور ان کے اہل و اولاد اور پس ماندگان کو اور ان کے اس علمی خاندان کے تمام افراد کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔ آمین

وہ چلے گئے مگر ان کی یاد اس بستی کے پتے پتے اور اس کے بوٹے بوٹے میں موجود ہے، ان کو فراموش کر دینا آسان نہیں ہے، ان کا شمار ان خاصان میکدہ میں تھا جو ہمیشہ زندہ و پائندہ رہتے ہیں ؎

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدّتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

مولوی اسحاق جلیس ندوی مدیر تعمیر حیات

(جناب حکیم عبد القوی دریابادی)

جون میں دار العلوم ندوہ کے مایۂ ناز و سرمایۂ افتخار عربی ماہنامہ البعث الاسلامی کے مدیر شہیر مولوی محمد میاں حسنی کی ناگہانی وفات کا حادثہ پیش آیا تھا۔ اور اب جولائی کے مہینہ میں اسی دار العلوم کے اردو ترجمان پندرہ روزہ تعمیر حیات کے مدیر مولوی اسحاق جلیس ندوی کا سانحہ وفات رونما ہو کر رہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انہوں نے چند روز کی شدید علالت کے بعد ۱۱ر جولائی کو بعد نماز عصر میڈیکل کالج کے ایمرجنسی وارڈ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہی۔

ایک ماہ کے اندر یہ دو دو سانحے دار العلوم ندوہ اور ملت اسلامیہ کو سہنے پڑے۔ دونوں کا قلم اپنے اپنے رنگ میں دین و ملت کی بہترین خدمت انجام دے رہا تھا اور ان سے آیندہ کے لئے بھی بہت کچھ توقعات وابستہ تھیں لیکن مشیت ایزدی اس کی مقتضی ہوئی کہ دونوں یکے بعد دیگرے ایک ماہ کے اندر اس خاکدان عالم سے اٹھا لئے جائیں، دونوں کی عمر تقریباً ۴۴ سال کی ہوئی اور دونوں کی بیماری بھی بڑی حد تک مشترک تھی۔ دونوں کا انتقال ڈاکٹری اسپتالوں کے ایمرجنسی وارڈ میں ہوا اور دونوں کی تدفین تکیہ ضلع رائے بریلی (مولانا علی میاں مدظلہ کے وطن) میں عمل میں آئی، اور ان دونوں حادثوں سے شدید ترین صدمہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کو پہونچ کر رہا۔ محمد میاں تو خیر ان کے بھتیجے اور ان کے تصنیفی کارناموں میں ان کے شریک و معاون کی حیثیت سے ممتاز تھے اور یہ دوسرے ان کے عزیز شاگرد اور مرید تھے اور ندوۃ العلماء اور تحریک پیام انسانیت کے بہترین تحریری و تقریری شارح و ترجمان کی حیثیت سے نمایاں نظر آرہے تھے۔

اسحٰق جلیس مرحوم صوبہ سرحد کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو مہاراشٹر کے شہر احمد نگر میں آباد ہو گیا تھا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء سے سند فراغ حاصل کرنے کے بعد انہوں نے پونا سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا جس سے ان کی اعلیٰ صحافتی صلاحیتوں کا پہلی بار مظاہرہ ہوا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے ایک کالج میں تدریسی

مشغلہ بھی اختیار کیا اور ساتھ ہی لائبریری سائنس کے فن کی اعلیٰ سند بھی حاصل کی۔ مولانا علی میاں نے ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انھیں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بلالیا۔ یہاں اولاً دارالعلوم کے نوادر علمی سے مالامال کتب خانہ کی تہذیب و ترتیب بطرز جدید کا اہم کام ان کے سپرد ہوا جسے انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا اور پھر انہیں پندرہ روزہ "تعمیر حیات" (جو دارالعلوم ندوہ کے ترجمان و نقیب کی حیثیت رکھتا تھا) کی ادارت سپرد کی گئی۔ ان کی پرزور تحریروں اور حسن ترتیب کے باعث اس اخبار نے ہندو پاکستان ہی میں نہیں بیرون ہند کے اردو خواں حلقوں میں بڑی وقعت اور قدر حاصل کرلی۔ ان کی وفات تعمیر حیات کے لئے بظاہر ایک ناقابل تلافی نقصان کی حیثیت رکھتی ہے۔ وفات سے دو ہی ڈھائی ماہ قبل انہوں نے اخبار کی دو اشاعتوں میں مسٹر بھٹو کے سلسلہ میں مسلمانان ہند خصوصاً یہاں کے ارباب صحافت کو ان کی بے راہ روی پر ٹوک کر جس جرأت ایمانی سے کام لیا تھا وہ ان کے قلم کے شاہکار کی حیثیت رکھتی تھی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشن کے ضمن میں جو تعلیمی نمائش ہوئی تھی اس کے روح رواں بھی مولوی اسحٰق جلیس تھے۔ اس نمائش کے ذریعہ ہندوستان کے مسلمان اہل علم و فضل کی خدمات کا جو بولتا ہوا مرقع پیش کیا گیا تھا وہ اپنی نوعیت میں بالکل منفرد اور بڑی حد تک اسی فرد واحد کی کوشش و کاوش کا ثمرہ تھا۔

تحریر کے ساتھ تقریر پر بھی ملکہ حاصل تھا جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ مولانا علی میاں کی تحریک پیام انسانیت کے سلسلہ میں وہ ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے اس پیام کی ترجمانی بڑے موثر انداز میں کر رہے تھے اور ان کی تقریروں سے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم سامعین بھی انتہائی متاثر ہوتے تھے۔ ان کی تقریریں بڑی ہی تبلیغی قدر و قیمت رکھتی تھیں۔

مولانا علی میاں کے وہ شاگرد ہی نہیں بلکہ مرید بھی تھے، اور مرید بھی ایسے کہ اپنی مرضی کو شیخ کی مرضی میں بالکل گم کر چکے تھے۔ خود علی میاں بھی اُن سے بڑا تعلق خاطر رکھتے تھے۔ ان کی علالت کی اطلاع ان کو اپنے سفر مدینہ منورہ کے دوران میں ملی، وہاں سے انہوں نے تار بھیج کر ان کی خیریت دریافت کی تھی۔ افسوس کہ تار کے جواب میں رحلت کی خبر بھیجنی پڑی۔ مرحوم اس خاندان کے ایک جزو کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اس لئے وفات کے بعد بھی وہ حسب وصیت اسی خاندان کے قبرستان واقع تکیہ کلاں ضلع رائے بریلی میں مدفون ہوئے۔

مرحوم دینی حمیت و غیرت کے پتلے تھے۔ تحریر پرجوش ہونے کے ساتھ مدلل اور سنجیدہ ہوتی تھی اور وہ

صحیح معنی میں ندوی القلم تھے۔ ندوہ کی تحریک کے علاوہ ہندوستان کے ملی مسائل اور عالم اسلامی کے حوادث پر گہری نظر رکھتے تھے اور ان موضوعوں پر ان کی تحریریں صحیح معنی میں بصیرت افروز ہوتی تھیں۔ غالباً کوئی مستقل تصنیف یادگار نہیں چھوڑی۔ تاہم ان کے مضامین جن کا سلسلہ کم وبیش کئی سال جاری رہا، ان کی قابل ذکر یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

محمد میاں مرحوم کے حادثۂ وفات سے قدرتاً وہ بھی بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے قبل اس کے کہ اُن پر ان کے قلم سے کوئی مفصل تعزیتی مضمون تعمیر حیات میں نکلتا وہ خود تعزیت کے مستحق ہو گئے۔

فلاح کی ضمانت

ہمیں اپنا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ کہیں ہمارا ذکر، ہماری نمازیں، ہماری عبادت ہمارا دینی شعائر پر عمل بے روح، بے کیف اور بے جان تو نہیں ہو گیا ہے، ہماری وہ خشوع وخضوع والی نماز جو فلاح کی ضمانت تھی، جو فحشا، اور منکر کے لئے ڈھال بن جاتی تھی، جس میں ہم مالک کائنات کو دیکھ لیتے تھے یا کم از کم اس یقین وتصور کے ساتھ اسے ادا کرتے تھے کہ مالک کائنات ہمیں دیکھ رہا ہے، وہ نماز جس کی لذت ہمیں ایسے محو کردیتی تھی کہ ہمیں اپنے جسم کے زخم اور ان کی تکلیف و درد کا احساس باقی نہیں رہتا تھا، ہماری وہ نماز جو نہ صرف ہمارے وجود کو روحانی سرور وسرمستی بخشتی تھی بلکہ غیر بھی جسے دیکھ کر متاثر ہوتے تھے اور اسلام قبول کرتے تھے۔ دنیا کے جس خطے، جس علاقے، جس شہر، جس بستی اور جس محلے میں ایسی نمازوں کے عملی نمونے مفقود ہیں وہاں اسلامی تعلیمات بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں۔ جہاں رب سے بے تعلقی یا برائے نام رسمی اور دستوری تعلق رہ جائیگا رسم اذان رہ جائے گی بلالی روح مفقود ہو گی۔

(مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم)

آہ! مولانا اسحاق جلیس

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی

ابھی مولانا محمد میاں ایڈیٹر البعث الاسلامی کی اچانک موت کے غم سے لوگ سنبھلے نہیں تھے کہ بالکل اسی طرح اسی مرض میں اور اسی عمر میں مولانا اسحاق جلیس ندوی ایڈیٹر تعمیر حیات ایک مہینے کے اندر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ یہ دوسرا سانحہ بھی کچھ اس طرح پیش آیا کہ اس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا موت برحق ہے طبعی عمر کی موت کا احساس بھی کم ہوتا ہے لیکن ہونہار ابھرتے ہوئے نوجوان کی موت جس سے توقعات وابستہ کی جانے لگی ہوں اور جس نے اپنی افادیت ثابت کر دی ہو برسوں فضا کو سوگوار رکھتی ہے اور صبر و تحمل کے لیے بڑی آزمائش بن جاتی ہے۔

میں ان کی طالب علمی سے انھیں جانتا تھا وہ اس وقت بھی اپنے ساتھیوں میں ممتاز تھے۔ متحرک گرم جوش، خوش رو، خوش گفتار اس کے نتیجے میں وہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام سے وابستہ ہوگئے جو بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھی پھر کچھ صحت کی خرابی اور گھریلو حالات سے مجبور ہو کر وہ گھر چلے گئے، بہت دنوں کے بعد ان کا ایک خط آیا جس میں باہر کے ملک میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کی تھی میں نے اس کی ہمت افزائی نہیں کی اور لکھا کہ اس طرح بہت سے لوگ کھو جاتے ہیں اور ضائع ہو جاتے ہیں، پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے، جو تعلیم حاصل کی ہے اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ اور وہ بڑے سے بڑے امتیاز کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس زمانہ میں وہ پونہ میں کسی ادارہ میں استاد تھے اتفاق سے حضرت مولانا کا سفر ہوا اور انھوں نے وہاں ان کی کارگزاری دیکھ کر ندوہ آنے کا حکم دیا، مالی اعتبار سے یہاں کے لیے سخت آزمائش تھی لیکن وہ یہاں آگئے، یہاں آکر سب سے پہلے ندوہ کی لائبریری کا کام سپرد ہوا، دن رات کی مسلسل محنت سے اس کو یکسر بدل دیا اور اس کی افادیت بہت بڑھا دی، تھوڑے دن کے بعد تعمیر حیات کے ایڈیٹر کی خدمت بھی سپرد ہوگئی اور بہت کم وقت میں اس اخبار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی کہ جس کام میں لگتے تن من دھن سے برق رفتاری لیکن پوری سلیقہ مندی

سے اس کام کو انجام دیتے اور اپنے قریب کے ماحول کو بھی پوری طرح متحرک رکھتے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ندوہ کے ۸۵ سالہ جشن کے موقع پر تعلیمی نمائش تھی جو حسن و آرائش اور افادیت کے اعتبار سے اس جشن کی جان تھی ہندستان میں ایک ہزار سالہ علمی خدمات کا ایک ایسا بولتا ہوا مرقع تھا جس کی نظیر مشکل سے ملے گی جنھوں نے اس کو نہیں دیکھا وہ اس کا اندازہ نہیں کرسکتے کہ اس نے کتنے ریسرچ اسکالروں کے کام کے لئے پورا مواد فراہم کردیا، کتنے لوگ اپنے علماء کے کارناموں سے مختصر ترین مدت میں واقف ہوگئے اور خدا معلوم کتنی شخصیتوں کے کارنامے دوبارہ زندہ ہوگئے، پھر تسلسل اور ترتیب سے اس میں ایسی زندگی پیدا کردی کہ آدمی یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوا کہ سارے اسلاف گویا خود اس کے سامنے چل پھر رہے ہیں۔

ادھر چند برسوں سے ملک میں جو تشویشناک حالات پیدا ہو رہے تھے اور جس کے نتیجہ میں ہر چیز کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے اس نے حضرت مولانا کو "پیام انسانیت" کے نام پر نیا کام شروع کرنے پر مجبور کیا، اس کام میں سب سے زیادہ عملی مدد مولانا اسحاق جلیس سے ملی وہ رفیق سفر بھی تھے اور رپورٹر بھی۔ مقرر بھی تھے اور مصنف بھی، خادم بھی تھے اور قائد بھی، زود رنج بھی تھے اور قہقہہ زار بھی شمشیر برہنہ بھی اور مونس و غمخوار بھی رقیق القلب بھی تھے اور سحر خیز بھی۔ یہ سب حضرت مولانا علی میاں کی اس تربیت کا نتیجہ تھا جو برسوں سے جاری تھی مولانا اسحاق جلیس نے اپنے کو بالکل حضرت مولانا کے تابع کر رکھا تھا جو عام طور پر ان صفات کے ساتھ مشکل ہوتا ہے۔

لکھنے والے لکھیں گے لیکن جانے والا جاچکا اور خدا کی ذات سے پوری امید ہے کہ جلد کام کرکے جانے والے کو کچھ زیادہ ہی ملے گا ان کی خوش قسمتی ہے کہ ان کی نماز جنازہ لکھنؤ میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے پڑھائی اور رائے بریلی میں قطب وقت مولانا محمد احمد پھولپوری نے۔

زندگی بھر اپنے شیخ سے وابستہ رہے اور مرنے کے بعد بھی قدموں میں پڑے رہنے کا شرف حاصل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ سارے ہی متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور اس نعمت کا صحیح نعم البدل بطفیل حضرت مولانا کو اس غم کے برداشت کی قوت عنایت فرمائے جو انھیں اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے۔

ایک تارا اور ٹوٹا

مولانا عبدالکریم پاریکھ

دوسرا شہاب ثاقب بھی اپنے ہالہ سے جُدا ہوا آسمان دنیا کے اس پار کے برادری میں مولانا محمد الحسنی کے بعد ایک تارا اور ٹوٹ گیا۔ مولانا اسحٰق جلیس ندوی اڈیٹر تعمیر حیات دار العلوم ندوۃ العلماء کو اپنے رب کے حضور میں طلب فرمایا گیا۔ لمبا تڑنگا پٹھان، بھاری بھرکم شخصیت، چٹان کی طرح مضبوط ایمان، خدمت خلق کا جذبہ رواں دواں، ملک کے بیشتر صوبوں میں سیکڑوں ہزاروں تقاریر قلم اور کاغذ پر رب کی حمد وثنا، اہل ایمان کے نشان ــــ اور پیام انسانیت کے صف اول کے رہنما کا سفر آخرت شروع ہوا اور اڈیٹر تعمیر حیات کی مت حیات اذا وقعت الواقعۃ دنیا میں پوری ہوئی ایک بات ہونی تھی ہو گئی ارجعی الی ربك راضية مرضية کی صدا آسمان سے آئی اور مسافر چل دیا۔

کوئی یقین کرے نہ کرے لیکن مولانا اسحاق جلیس ندوی اب اس فانی دنیا میں نہیں رہے کسی کو ملنا ہو تو خود اپنی موت کا انتظار کرے۔ دنیا میں ان کے ملنے والے چاہنے والے لاکھوں ہو گئے تھے مداح لاتعداد اور حلقۂ احباب بڑا وسیع تھا، وسیع تر، یوپی، پنجاب، ہریانہ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک، مدراس، تامل ناڈو کہاں کہاں ان کے قدم اللہ نے پہونچائے۔ راہ حق کے اس مسافر نے بڑی بڑی وادیوں میں قدم بڑھائے طویل اسفار اور دعوتی کام کا تسلسل آخر تک جاری رہا۔

ولا یقطعون وادیًا الا کتب لھم لیجزیھم اللہ أحسن ما کانوا یعملون
(کسی بھی میدان میں قدم رکھا اور کوئی وادی طے کی سب کا سب ان کے اعمال صالحہ میں لکھ دیا گیا تاکہ اللہ ان کے اس بہترین عمل کی جزا عطا فرمائے)۔

مجھے امید ہے کہ عالم برزخ میں مولانا اسحاق جلیس ندوی محسوس کر رہے ہوں گے کہ یوم الحساب کو اب دیر ہی کتنی ہے۔ علیین کا دفتر سب کچھ درج کئے ہوئے ہے۔ اعمال کا صلہ انشاء اللہ جنت کی شکل میں ملنے والا ہے۔

جون سنہ ۶۲ء میں ایک طویل سفر پر مرشد نا محترم حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی کی قیادت میں ایک وفد پیام انسانیت کے لئے کرناٹک صوبہ میں دورے پر تھا۔

میں اور اسحق صاحبؒ بھی حضرت کے ساتھ تھے۔ سر درد کا مرض تو معلوم ہو گیا تھا۔ پرہیز کے لئے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دودھ زیادہ پیتے جائیں۔ میں بعض مواقع پر ان کے لئے سفر میں دودھ کا انتظام کروا تا کبھی پیتے اور کبھی ہنس کر کہتے کہ یہ کیا لگا رکھا ہے خود مُرغ پلاؤ کھاتے ہو اور ہم کو دودھ پر ٹرخاتے ہو تھوڑا بہت کبھی کھا لیتے تو رات میں پیٹ میں درد ہوتا۔

مرض کی تشخیص اور تجویز میں مرحوم کے مزاج کی پٹھانیت سدِّ راہ بنتی اور کسی طرح بھی صحت کے ضابطوں کی پابندی نہیں کر پاتے۔

سفر میں اکثر اخیر شب میں بیدار ہوتے، تہجد کی نماز کے بعد خاص انداز پر ذکر بالجہر کی آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

چند ماہ قبل احمد نگر میں میری اور حضرت مولانا مفتی ضیاء الحق دہلوی کی تقریر تھی۔ میں رات دو بجے احمد نگر پہنچا تھا صبح کو معلوم ہوا کہ طویل سفر سے بخار میں مبتلا ہو کر مولانا اسحق جلیس ندوی احمد نگر آئے ہیں ان کی ملاقات کے لئے صبح ضروریات سے فارغ ہو کر " CAMP " کی مسجد میں جانے کے لئے ہم لوگ رکشے پر بیٹھنے لگے کہ سائیکل پر مولانا اسحق جلیس ندوی خود ہی آ گئے۔ بیماری سے جسم آدھا ہو گیا تھا۔ چہرہ باوجود نورانی ہونے کے تکان اور کمزوری کے آثار لئے ہوئے لیکن ہم چھوٹوں کی محبت میں فوراً لپک کر دوڑے ہوئے ملنے آئے۔

بڑے پیار و محبت کا اظہار کیا۔ اس وقت ان کے والد مرحوم صاحب فراش تھے ان کی خدمت کا بھی خوب خوب اہتمام و انتظام کرتے تھے جب کہ خود کھا بھی نہیں سکتے تھے اور اطمینان سے رات میں سو بھی نہ پاتے تھے لیکن والد کی خدمت خوب سے خوب تر کرتے تھے۔ رات میں دو تین گھنٹے بمشکل سوتے ہوں گے۔ رات میں پڑھنا لکھنا لیٹے لیٹے بھی پڑھائی، دن میں لکھنا، بولنا، تقاریر، ملاقاتیں، ندوہ کے کتب خانہ میں بڑا پر وقار دفتر اور ہر چیز سلیقہ سے قرینہ سے رکھی ہوئی ٹیبل کسی چیف منسٹر سے کم نہیں کتابوں کے انبار رسالوں اور روزناموں کا سیلاب، ملاقاتیوں اور ڈاک کا ہجوم، اذان ہوئی نماز با جماعت کے لئے بڑی تیز رفتاری سے دوڑتے، مزاح میں بھی شرعی حدود کا لحاظ رکھتے اور ہنس بول لیتے لیکن ہر وقت اللہ کے دین کی دعوت، پیام انسانیت کا سوز اور درد لئے ہوئے کوئی موقعہ ہاتھ

ہاتھ سے جانے نہ دیتے ریل میں سفر کرتے کرتے بھی مسافروں کو اپناہم خیال بناکر ہی دم لیتے۔

ندوہ میں طالب علم دوستوں کا ایک بڑا ہجوم موصوف مرحوم کو گھیرے رہتا۔ اپنائیت محبت اور تعلق کا اظہار ہر ایک سے کرتے تعلیمی مسائل میں شب و روز طلباء سے مذاکرے ہوتے ہی رہتے اس دھن اور مصروفیات میں اپنے بیوی بچوں کے حقوق میں بھی شاید کوتاہی ہو جاتی ہو ایسا مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا۔ مہمان نوازی میں پٹھان برادری کا کوئی ثانی نہیں۔ اس کا بھی خاص الخاص اہتمام، پیام انسانیت کے سلسلے میں جو بھی باہر کے لوگ آتے انکے میزبان مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم و مغفور ہوتے۔ اللہ اللہ اب ایسا آدمی کہاں ملے گا؟ مجھ ناکارہ سے بڑا تعلق اور محبت۔ ہم چار تھے ایک مولانا محمد الحسنی مرحوم دوسرے مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم اور تیسرے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور چوتھا میں۔ ان چاروں میں اول الذکر دو اللہ کے حضور میں پہنچ گئے ہیں اور ڈاکٹر صاحب بقید حیات ہیں۔ دار آخرت میں جانے کا شاید اب میرا ہی نمبر لگے گا کہ پچھلے دنوں لکھنؤ میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنے مطب میں اختلاج قلب ہونے پر ڈیڑھ دن باندھ رکھا۔ بڑی توجہ اور دلسوزی کے ساتھ علاج فرمایا اور جاتے وقت دوائیاں باندھ دیں اور یہ بھی فرمایا کہ بلڈ پریشر چیک کراتے رہو اور اس حملے کو معمولی نہ سمجھو کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں تو وہیں سے یہ سمجھ کر چلا تھا کہ مولانا محمد الحسنی کے بعد اپنا ہی نمبر ہے لیکن بدھ کے دن عصر کے وقت ۱۱ جولائی کو مولانا اسحٰق کو لینے ملک الموت تشریف لے آئے۔

کیا کہوں۔ . . مبارک ہو مولانا اسحٰق صاحب کو اپنے رب کی ملاقات ـــــ انشاء اللہ "ضاحکۃ" اور "مستبشرہ" والے لوگوں میں انہیں حشر کے میدان میں دیکھیں گے۔ ہم چاروں میں اب دو ہیں۔ یہ چاروں افراد مولانا محترم حضرت سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، کی عوامی دعوت کے لئے بار بار سر جوڑ کر بیٹھے پروگرام بنائے، اور آخر میں سارا منصوبہ حضرت کی خدمت میں منظوری کے لئے جاتا اور ہلکی پھلکی ترمیم کے ساتھ ہم کو منظوری مل جاتی۔ اب تو چار میں دو ہی باقی ہیں۔ الحمد للہ ہم چاروں پر حضرت مولانا محترم کی محبت اور چاہت ایسی ٹوٹ کر برستی کہ ہم میں سے ہر ایک یہ سمجھتا کہ سب سے زیادہ حضرت والا مجھ سے ہی محبت اور تعلق رکھتے ہیں۔ تخلقوا باخلاق اللہ" والی حدیث کا عملی مظہر مولانا علی میاں کی ذات میں کسی کو دیکھنا ہو تو دیکھ لے۔

مولانا اسحٰق جلیس مرحوم اخلاص اور اخوت میں موجودہ دور میں ایک نمونہ تھے بڑے بڑے اعزازی مواقع اور اہم سے اہم تر مقامات میں ان کی آسانی سے پہنچ ہو جاتی لیکن ایسے تمام مواقع پر خود پیچھے ہٹ کر ہم کو آگے کرنے

میں مسرت محسوس کرتے۔ ابھی ابھی وفات سے ایک ماہ قبل بنگلور میں ایک بڑا جلسہ تھا۔ چیف منسٹر دیوراج ارس کی صدارت تھی۔ جلسہ میں وزیروں کے لئے گنی چنی کرسیاں تھیں ہم لوگ ڈائس کے سامنے بیٹھے تھے۔ مولانا نے ہی ہم پر نگاہ ڈالی۔ ڈائس سے تشریف لائے اور ہاتھ پکڑ کر وزرائے کرناٹک کے پہلو میں لا بٹھایا خود آخر میں جا بیٹھے جلسہ میں مرشد محترم نے بڑی اہم تقریر فرمائی مجمع ساکت اور مبہوت تھا۔ اندراجی سے لے کر موجودہ حکومت، انارکسٹوں سے لے کر انسانیت کے قاتلوں تک ایک ایک کی اچھی طرح خبر لی اور کرناٹک کی تاریخ میں اس مرد حق نے ایک اہم رول ادا کیا۔ اس موقع پر مولانا اسحٰق صاحب نے حضرت مدظلہ کی دعوت کے بنیادی اور اہم نکات سے واقف کرانے میں ایک خاموش قدم بڑی سرعت کے ساتھ اٹھایا اور دیوراج ارس صاحب کو چند اہم معاملات پر رہنمائی کر دی یہ کام اگر وہ نہ کرتے تو ہم میں سے کسی کے بس میں بھی نہ تھا اور میرے سوا یہ اقدام کسی کے علم میں بھی نہیں تھا۔ بعد میں چیف منسٹر نے جو تقریر کی اس میں اسحٰق صاحب کی دی ہوئی لائن پر ہی بولنے والا چل پڑا تھا۔

میسور کا ٹاؤن ہال ہے ڈائس پر داعی حق مولانا علی میاں عصائے موسیٰ لے کر رونق افروز ہیں۔ بڑے بڑے مٹھوں کے ہندو سوامی، لنگایت مسلک کے پنڈت، عیسائی، پادری، چاروں طرف "عفریت من الجن" کا ہجوم مولانا علی میاں مدظلہ بیچ میں اور دائیں بائیں فرعونی جادوگر، ڈائس پر شاہی کرسیاں، ہم اپنی عادت کے مطابق جہاں جگہ ملی بیٹھ گئے۔ علی میاں کی صحبت سے پہلے یہ عادت نہیں تھی اب جا کر پڑی۔ اسحٰق جلیس ندوی آئے فوراً کان پکڑ کر فرمایا اٹھو حضرت کے پہلو میں بیٹھو۔ یہاں کیوں بیٹھ گئے ہو؟ اور لا کر مولانا محترم کے سایہ میں بٹھایا جس کی ٹھنڈک کو ہم خادموں نے تو محسوس کیا ہی ہے لیکن مخالف بھی مولانا محترم کے پہلو میں بیٹھ جائے تو چاہے اپنے ظرف کے مطابق صدیق کی صداقت کی ٹھنڈک محسوس کرے یا نہ کرے ایمان کی آنچ کی حرارت کا احساس تو پا ہی لے گا۔ حضرت کی تقریر ایسی ہوئی کہ عصائے موسیٰ تمام عصاؤں اور لاٹھیوں کو نگل گیا۔ گو جادوگر سجدے میں نہیں گرے اور "آمنا برب موسیٰ وھارون" کی آوازیں نہیں آئیں ۔ لیکن "واستیقنتھا انفسھم ظلماً وعلوا" کی صدا ہر جادوگر کی ضمیر سے برابر آرہی تھی جبکہ " فانظر کیف کان عاقبۃ المفسدین" کا ظہور ابھی باقی ہے جو یوم الحساب میں نظر آئے گا۔

مجھے پچھلے تیس برس سے دینی قافلہ چلانے کی ہلکی سی مشق ہے۔ ہم عصر علماء و صلحاء میں قریب قریب ہر ایک کی صحبت نصیب ہوئی لیکن مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم نے مولانا علی میاں محترم کی خدمت میں حاضر

کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ عاجز کے درس قرآن کی تحریک کا تعارف اس ناکارہ کے ٹیپ ریکارڈ جو درس قرآن کے ہوتے حضرت مولانا کو سنا سنا کر حضرت کے مزاج میں یہ بات لانے کی کوشش برابر کرتے رہے کہ یہ ناکارہ کسی کام کا ہے۔ بس حضرت نے طے فرمایا اور مقناطیسی کشش سے کھینچ ہی لیا۔ پتھر کے اس ٹکڑے کو پتہ نہیں کیا قیمتی سمجھا گیا۔ کیا بڑے بڑے لوگ بھی کبھی کبھی چھوٹوں کا دل پرچانے اور ان کی تربیت کے لئے شاید غیر اہم کو اہم بنا کر دلاسا دلاتے ہوں گے۔ بہرحال مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ جو ہندوستان میں درس قرآن کے داعی اور بانی تھے۔ ہمارے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کے اساتذہ میں سے ہیں اور حضرت کو مولانا احمد علی سے بڑا انس بڑی عقیدت ہے اور حضرت کے دل میں حضرت لاہوری کا بڑا احترام ہے۔ یہی سبب ہے کہ درس قرآن کی وجہ سے حضرت مرشدنا نے اس ناکارہ کو بڑی عزت بخشی۔ کھانے پر، ناشتہ پر، عشاء کے کھانے پر یا خصوصی مجلس میں حضرت فرماتے پاریکھ صاحب کو بلاؤ کہاں ہیں؟ آئیے۔ یہاں بیٹھئے۔ یعنی اپنے پہلو میں بٹھاتے اور ان مجالس میں مولانا اسحاق صاحب بھی موجود ہوتے۔ مجھے دھکا دے کر اشارہ کرکے فرماتے۔ جاؤ جاؤ حضرت نے جہاں فرمایا وہیں بیٹھو اور اس پر خوش ہوتے کبھی یہ احساس نہ ہوتا کہ پیچھے والے آگے کیوں جارہے ہیں خود حضرت مدظلہ بھی اسحاق مرحوم کو بہت چاہتے بڑا اعزاز عطا فرماتے، بڑی محبت اور تعلق سے کام سپرد کرتے اور ہر کام پر خوش ہوتے شاید یہی وجہ ہے اسحاق صاحب نے وصیت کی تھی کہ میری تدفین رائے بریلی میں ہو۔

اللہ ان کی تربت پر اپنی رحمت کا نزول فرماتا رہے اور حشر تک لاخوفٌ علیکم ولا انتم تحزنون کی ملکوتی صدائیں ان کی روح کو بخشش اور مغفرت کا وعدۂ ربانی سناتی رہیں۔ آمین

مولانا اسحٰق جلیس ندوی ـــــ میرادوست میرا محسن

ڈاکٹر سید انور علی

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہو یا نہ ہو لیکن اس کے سینہ میں جانے ہی کتنے دُرِ نایاب اور گنجہائے گرانمایہ آسودۂ خاک ہیں۔ علم و عمل کے موتی، فکر و نظر کے ستارے، ادب کے شہسوار اور تاریخ کے یگانۂ روزگار سبھی اس کی آغوش میں دفن ہیں اور انھیں میں میرا دوست، میرا محسن اسحاق جلیس ندوی بھی ہے جس کی جواں مرگی دل پر ایک بوجھ کر بن کر رہ گئی ہے لیکن اس سے زیادہ غم اس کا ہے کہ اس کے قلم حق نگار کا فیض بند ہو گیا ہے جس سے احساس و شعور کے تاروں کو تحریک ہوتی تھی، مُردہ دلوں میں تمنائے حیات کروٹیں لیتی تھی اور جو تعمیر حیات کے ان اصولوں کی نشاندہی کرتا تھا جن سے انسانیت کی صورت گری بدرجہ اتم ہوتی تھی اور رعنائی ہستی کے خدوخال اور اُجاگر ہو جاتے تھے۔

مولانا سے میری پہلی ملاقات پونہ میں برادرم محمد سلیم کے مکان پر ہوئی اور آجکل کناڈا میں ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں ایسا لگا جیسے ہم دونوں پہلے سے شناسا تھے۔ مولانا اپنی تحریکیت اور جذبۂ دروں کی وجہ سے پونہ کی سماجی، سیاسی اور تعلیمی زندگی کے لئے ایک جزو لاینفک بن گئے تھے۔ امراء کی بے حسی، لیڈروں کی بے اصولی اور مولویوں کی مفاد پرستی کے ہمیشہ شاکی رہے۔ چنانچہ ایک انجمن بنائی جس کے روح رواں وہ خود تھے۔ نوجوانوں کا ایک جم غفیر ان کی پُشت پر تھا جس کے تعاون سے مختلف سماجی کام انجام دیتے تھے لیکن ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے وقت کے چودھریوں کے دل میں حسد کے جذبات بھڑکائے چنانچہ اس ٹولی نے سازشوں کا ایک جال بچھایا اور اس بات کی کوشش کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس نوجوان کے خلاف بدگمانیاں پھیلائی جائیں اور اس تنظیم کو انتشار میں بدل دیا جائے جس سے شیطان کی ذریات بے خوابی کے مرض میں مبتلا ہو گئی تھی۔ یہ شیطانی چال کامیاب ہوئی اور ایک تعمیری تنظیم کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا لیکن مولانا کے ذاتی اوصاف کے جو اثرات پونہ کے در و دیوار پر نقش ہو گئے تھے ان کو مٹایا نہ جاسکا اور کوئی بھی سماجی یا سیاسی کام مولانا کی شمولیت کے بغیر انجام نہ پاتا تھا۔

آنجہانی حمید دلوائی نے مسلم پرسنل لا کے خلاف پونہ ہی سے آواز اٹھائی تھی اور اس کی تہہ میں اُن

کے اپنے خاندان کے بعض واقعات تھے. علم کی کمی اور اسلام سے دوری کی وجہ سے انھوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ دراصل اس خرابی کی وجہ مسلم پرسنل لا ہے چنانچہ نفرت، جھنجھلاہٹ اور غیض وغضب کی حالت میں وہ اسلام کو نشانہ ملامت بنانے لگے۔ اس آواز کے اٹھتے ہی شری کے۔کے۔شاہ، مسٹر چھاگلہ اور دوسرے سیکولر ذہن رکھنے والے افراد کو جیسے منہ مانگی مراد مل گئی. تحریری تائید کے علاوہ انھوں نے مختلف طریقوں سے حمید دلوائی صاحب کا ساتھ دیا اور ایسے انتظامات کئے گئے کہ وہ مکمل طور پر فارغ البال ہو کر اس "کارخیر" میں دل وجان سے لگ جائیں۔ چنانچہ جب ہزاروں روپئے ماہانہ آمدنی کا انتظام ہوگیا تو پھر آنجہانی کا وظیفۂ حیات مسلم پرسنل لا میں اصلاحات کے علاوہ کچھ نہ تھا لیکن ان اصلاحات کے پس پردہ دراصل اس الحادی ٹولہ کی یہ سازش تھی کہ وہ اسلام کو قصۂ پارینہ ثابت کرسکیں یا کم ازکم مسلمانوں کے ذہن کو متزلزل کردیں۔ اُن عورتوں کو لے کر جن کی ازدواجی زندگی میں کسی نہ کسی خانگی نزاع کی وجہ سے خلا پیدا ہوگیا تھا۔ جلسے اور جلوسوں کا اہتمام کیا جاتا اور مسلم عورتوں کے ذہن کو برگشتہ کرنے کے لئے واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کیا جاتا اور مظلومیٔ نسواں پر آنسو بہائے جاتے۔ یہ لہر جب بڑھنے لگی اور مختلف گوشوں سے کمیونزم اور دہریت کے علمبردار شریک کارواں ہو کر اسلام کے خلاف محاذ بنانے لگے تو اسلام پسندوں کی غیرت نے بھی انگڑائی لی. جماعت اسلامی حلقہ مہاراشٹر نے ہر شہر میں اجتماع منعقد کرنے کا پروگرام بنایا۔ پونہ میں مشورہ کے بعد طے ہوا کہ پہلے مسلم شہریوں کی جانب سے اس جلسہ کے انعقاد کی کوشش کی جائے جب اس میں کامیابی نہ ہو تو جماعت اسلامی کی جانب سے کیا جائے۔ مولانا اسحاق جلیس سے اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی وہ فوراً ہی راضی ہوگئے۔ انھیں کے توسط سے شہر کے عمائدین سے ربط قائم کیا اور بالآخر ایک شہری کمیٹی تشکیل دی گئی۔ طے پایا کہ شہر اور مضافات میں کارنر میٹنگ کرکے رائے عامہ ہموار کی جائے تاکہ مطلوبہ جلسہ میں زیادہ سے زیادہ خواتین شرکت کرسکیں۔ اس سلسلہ میں اس بات کے اظہار میں کوئی باک نہیں ہے کہ یہ مولانا ہی کی سعیِ مسلسل کا نتیجہ تھا کہ ہر گلی کوچے سے مسلم پرسنل لا کی تائید میں صدائیں بلند ہونے لگیں اور خواتین کی کانفرنس میں دس ہزار سے زائد مستورات نے شرکت فرماکر حمید دلوائی صاحب کی اسلام دشمن تحریک کا بھرپور عملی جواب دیا اور بے دین بہرہ پیوں پر ظاہر کردیا کہ مسلمان اپنے مسلم پرسنل لا سے دست بردار ہونے کے لئے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں ہے۔ اس کانفرنس کے بعد شہر میں ایک ایسی فضا بن گئی کہ دلوائی صاحب کا برسر عام چلنا پھرنا مشکل ہوگیا۔

مولانا گروہی عصبیت کے مقابلہ میں امت مسلمہ کے مسائل کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب پونہ میں تبلیغی جماعت نے ایک ایسی روش اپنائی جو مناسب نہیں کہی جاسکتی تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں جو شہری کمیٹی بنی تھی اس میں جہاں دوسری پارٹیوں سے دو دو نمائندے لئے گئے تھے وہیں تبلیغی جماعت سے بھی دو نمائندے شامل کئے گئے تھے لیکن دوسرے ہی دن تبلیغی جماعت نے یہ کہہ کر علیحدگی اختیار کرلی کہ اس میں جماعت اسلامی کے لوگ شریک ہیں۔ مولانا کا جھکاؤ اگرچہ تبلیغی جماعت ہی کی طرف تھا، لیکن اس اطلاع کے ملتے ہی میرے پاس آئے، چہرہ پر نظر پڑی تو محسوس ہوا کہ آج وہ مسکراہٹ نہیں ہے جو ان کا طرۂ امتیاز تھا بلکہ کسی ٹیس، کسی درد اور کسی اضطراب پیہم کو چھپانے کی ناکام کوشش فرمارہے ہیں۔ میں نے پوچھا خیریت تو ہے کہنے لگے کہ یہ منحوس خبر سن لیجئے سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے جس پر آپ اسقدر دل گرفتہ اور پریشان ہوں۔ ہمیں اتحاد ہر قیمت پر برقرار رکھنا ہے اور تبلیغی جماعت کے تعاون کو کھونا نہیں ہے جس کی آسان صورت یہ ہے کہ میں اور جناب یوسف عطار صاحب کمیٹی سے اس وعدہ محکم کے ساتھ علیحدہ ہو جاتے ہیں کہ جو تعاون اس وقت دیتے رہے ہیں اس سے زیادہ تعاون آئندہ دیتے رہیں گے۔ میری بات سن کر دو منٹ تک خاموش سوچتے رہے۔ پھر بولے لیکن۔ . . . میں نے جملہ کاٹتے ہوئے کہا کہ لیکن ویکن کچھ نہیں کل کی میٹنگ میں ہمارا یہی موقف ہوگا اس لئے کہ اس کے علاوہ تبلیغی بھائیوں کے تعاون حاصل کرنے کی کوئی دوسری سبیل نہیں ہے۔ دوسرے دن کی نشست میں میں نے یہ بات رکھی تو بولے کہ جن لوگوں کی وجہ سے یہ کام شروع ہوا ہے اُن کے الگ ہو جانے کی بات سوچنا فضول اور بے معنی ہے بہتر یہ ہے کہ ایک وفد جائے اور تبلیغی جماعت کے اکابرین کو افہام وتفہیم کے ذریعہ تعاون کے لئے تیار کرے۔ وفد گیا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مولانا نے تبلیغی جماعت کے اس موقف پر رنج وغم کا اظہار کیا اور کہا کہ امت مسلمہ کے ایک اہم ترین مسئلہ میں ان کا یہ موقف فہم سے باہر ہے۔ ان کے اس تبصرہ میں ان کے جذب دروں اور خلوص کی گرمی کے علاوہ حقائق کی صحیح عکاسی بھی ہے جس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ نوجوان نسل میں اب ایسے لوگ بہت ہی نایاب ہیں جو گروہی اور جماعتی عصبیت سے بلند ہو کر سوچیں اور حق پسندی کو اپنا شعار بنائیں۔ اقبال نے ایک جگہ کہا ہے کہ "تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من" مولانا شاید اس راز کو پاگئے تھے اس لئے اپنے دل و ذہن کو احساس غلامی کی ہر زنجیر سے بے نیاز رکھتے تھے۔ پونہ کے

ایک گرلس اسکول میں مدرس تھے لیکن شان کجکلاہی وہاں بھی غالب رہی۔ نہ کبھی خود کو ملازم سمجھا اور نہ ہی ارباب انتظامیہ کے دل میں یہ خیال جمنے دیا کہ وہ انھیں ملازم سمجھیں۔ اگر کوئی بات غلط دیکھتے تو ارباب انتظامیہ سے باز پرس کرتے۔ وہ لوگ بھی اس لئے طرح دے جاتے کہ اس مردِ قلندر کو چھیڑ کر کون مصیبت مول لے لیکن خلوص اس دور میں دیوانہ پن ہے چنانچہ جس نے بھی اپنے خونِ دل میں انگلیاں ڈبوئیں اور پیکر اخلاص بن کر صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کی وہ بندگانِ اقتدار و ہوس کی نگاہوں میں کھٹکا اور بالآخر ایسا خار بن گیا جسے نکال کر ہی دم لیا گیا۔ مولانا بھی اپنے اخلاص کی وجہ سے اسی صورت حال سے دوچار ہوئے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس شر سے اُن کے لئے خیر پیدا کر دیا اور وہ ندوہ پہنچ کر اپنی اُن خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کر سکے جنھوں نے انھیں شہرت کے بام پر پہنچا دیا۔

مولانا اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ہر طبقہ خیال کے لوگوں سے ان کی راہ و رسم تھی لیگی، کانگریسی تبلیغی جماعتی حتیٰ کہ جن سنگھی حضرات سے بھی صاحب سلامت تھی۔ جس راہ سے گذرتے سب کی خیر و عافیت پوچھتے، امیر و غریب کے تصور سے بے نیاز تھے۔ امراء سے ملتے تو محسوس ہوتا کہ اُن پر چھائے ہوئے ہیں، نیاز مندی کا کوئی اظہار نہ کرتے۔ گفتگو سیاست کی ہو یا کسی سماجی مسئلہ پر اپنا نقطۂ نظر منوا کر چھوڑتے۔ ذوقِ مطالعہ کی وجہ سے حالاتِ حاضرہ سے اتنے باخبر رہتے تھے کہ بازی گرانِ سیاست کی ایک نہ چلنے دیتے۔ عوامی تعلقات کا یہ عالم کہ سیاسی اور سماجی رہنماؤں سے لے کر کلّن اور جمّن تک ان کے دوستوں میں شامل تھے وہی شخص جو امراء کی محفلوں میں شانِ بے نیازی سے بیٹھا نظر آتا تھا جب کسی جمن پنواڑی کی دوکان پر پہنچتا تو سامنے پڑے ہوئے اسٹول پر بیٹھ کر بڑی ہی انکساری سے محوِ گفتگو رہتا اور ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے کسی عزیز سے ہم کلام ہیں۔ مولانا کو معلوم تھا کہ میری فطرت ہوٹل بازی سے ابا کرتی ہے اور چائے کے سلسلہ میں بھی ایک ذوق رکھتا ہوں لیکن راہ چلتے چلتے اگر کسی کلّن سے ملاقات ہو گئی اور اس نے از راہ محبّت ہاتھ پکڑ کر چائے کی دعوت دیدی تو میری مروت میں پہلے تو انکار فرما دیتے اور جب اصرار بڑھتا تو مجھ سے کہتے ڈاکٹر صاحب، آئیے اب ان کی چائے سے انکار کیا کریں اور مجھے "دل بدست آورد کہ حج اکبر ست" اور اس غریب کے خلوص کی بنا پر راضی بہ رضا ہونا پڑتا۔ اس سے مولانا کے جذبہ اندروں میں چھپی ہوئی اس انسانیت نوازی کا پتہ چلتا ہے جس نے بعد میں چل کر "حلقۂ پیام انسانیت" کے ایک سرگرم، فعال اور ہمہ وقتی کارکن کی شکل اختیار کی اور دمِ واپسیں تک ہندوستان کی

نیم مردہ انسانیت کے جسم میں جان ڈالنے کے لئے انھیں سیماب پا ہی نہیں بلکہ آتش بجاں رکھا۔

کام کرنے میں وہ بھوت تھے۔ جب کسی کام کو ہاتھ میں لیتے تو ایسا لگتا کہ ان کی توانائیوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ نہ دن کو دن سمجھتے نہ رات کو رات۔ حیرت ہوتی تھی کہ یہ بندۂ خدا کس طرح صبح سے رات تک بغیر آرام کئے کام کرتا چلا جا رہا ہے۔ انہماک کا یہ عالم ہوتا کہ کھانا کھانا بھی بھول جاتے اور جب ہوش آتا تو کہتے کہ شاید کھانا نہیں کھایا۔ جشن ندوہ کے موقع پر جس طرح انہوں نے اپنے حسن سلیقہ اور حسن کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا اس کو ندوہ کے بام و در کبھی نہیں بھول سکتے جس کی پوری تفصیل "روداد چمن" میں محفوظ ہے میں اس پر کچھ اضافہ کرنے سے قاصر ہوں۔

اپنی افتاد طبع کی بنا پر مولانا کو صحافت سے فطری مناسبت تھی۔ اس میدان میں وہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی کے صحیح معنوں میں جانشین تھے۔ صحافت کو ذریعۂ معاش بنانے والے ان کی نگاہ میں مجرم تھے۔ ان کے نزدیک صحافت اصلاح معاشرہ کا موثر ذریعہ تھا جو ہوا کے رُخ پر بہنے کے لئے نہیں بلکہ حالات کے دھارے کو اپنے رُخ پر بہانے کے لئے تھا۔ اس لئے تھا کہ اقتدار وقت اور ظالمانِ عصر سے ان کی غلطیوں پر باز پرس کی جائے، حق و صداقت کی آواز بلند کی جائے، جہاں سب کی زبانیں حق کے اظہار کے لئے گُنگ ہو جائیں صحافی کا قلم وہاں رواں ہو، داد رسی کے جب سارے دروازے بند ہو جائیں تب بھی صحافت کا در کھُلا ہوا ہو تاکہ مظلوم کو اپنی فریاد کے لئے سہارا موجود رہے۔ "تعمیر حیات" کے اداریے اور مضامین اس کی شہادت کے لئے کافی ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو قتل کے مقدمہ میں پاکستان کی سپریم کورٹ نے پھانسی کی سزا سنائی اور انھیں ۴ر اپریل ۱۹۷۹ء کو پھانسی دے دی گئی۔ ہندوستان کے قومی اخبارات نے اسلام دشمنی میں مسٹر بھٹو کو ہیرو بنا کر پیش کیا۔ اردو اخبارات کے بعض نام نہاد مسلم ایڈیٹر صاحبان بھی کچھ تو اپنی اشتراکی اور الحادی فکر و نظر کی بنا پر اور کچھ سیاسی و اقتصادی منفعت کی بنا پر بھٹو صاحب کی ایسی تصویر پیش کی کہ گویا وہ مسلمانوں کے قائد، اسلام کے محافظ اور مظلومِ محض ہیں۔ ساتھ ہی ان حضرات نے بڑی چابکدستی سے یہ بات بھی عوام میں پھیلائی کہ مسٹر بھٹو کی پھانسی میں جماعت اسلامی کا ہاتھ ہے۔ یہ سب باتیں کچھ اس طرح جذباتی انداز میں پیش کی گئیں کہ مسلم عوام جن میں پہلے ہی سے ہوش و حواس کم ہے اور زیادہ جذباتی ہو گئے اور ایک دور ایسا آیا کہ ان پر ہسٹریا کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ پاکستان کے اس واقعہ کو بہانہ بنا کر جگہ جگہ جماعت اسلامی ہند کے دفاتر پر پتھر برسائے گئے، تفہیم القرآن اور دیگر دینی کتب کی بے حرمتی کی گئی، ارکان کو زدو کوب کیا گیا اور کشمیر میں تو ظلم و

بربریت کا وہ ڈرامہ کھیلا گیا جس کے تصور ہی سے ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی اتنی بڑی جان و مال کی تباہی ہوئی کہ جسے سن کر دل لرز اٹھتا ہے، ٹھیک اس وقت جب مسلمانوں کے جذبات اشتعال سے بے قابو ہو چکے تھے اور کسی معقول بات کا کہنا خود اپنے لئے اور اخبار کے لئے قہر عوام کو دعوت دینا تھا، مولانا اٹھے اور صحافیانہ ذمہ داری کے تحت لومۃ لائم سے بے پروا ہو کر حق کی آواز بلند کی اور تعمیر حیات کا بے مثال بھٹو نمبر نکال کر عوام کے ذہن کو موڑنے کی کوشش کی جسکی اشاعت نے حالات کے رخ کو پلٹ دیا اور بعض مدیران نے بھی اپنی روش بدل لی۔ اس طرح ایک بار پھر دنیا کو اس پیغام حق کی متوجہ کر دیا کہ ؎

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں　　مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

یہ نمبر اس قدر مقبول ہوا کہ یکے بعد دیگرے اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہوئے اور شاید مولانا کا یہ کارنامہ خالقِ کائنات کو اس قدر پسند آ گیا کہ جلد ہی انھیں اپنے پاس بلا لیا حالانکہ ابھی وہ عمر کی اس منزل میں تھے جو عام طور پر زندگی کی توانائیوں سے بھرپور ہوتی ہے، جہاں ولولے، آرزوئیں اور حوصلے ہر آن مچلتے رہتے ہیں اور رگ و پے میں گردش کرتی ہوئی بجلیاں ہر کوہ و دمن سے گذرنے اور مہ و انجم پر کمندیں ڈالنے کے لئے بے قرار رہتی ہیں۔

فروری ۱۹۸۰ء میں خبر ملی کہ مولانا بھٹکل آ رہے ہیں لیکن میرے پاس کوئی خط نہ آیا۔ انتظار جاری تھا کہ یکایک مجھے جماعتی کام سے بنگلور جانا پڑا۔ جاتے جاتے اس خیال سے کہ کہیں میری عدم موجودگی میں آ گئے تو حالات سے باخبر نہ ہو سکیں گے ایک تحریر اہلیہ کے حوالہ کر گیا کہ اگر مولانا آجائیں تو انہیں دیدیں۔ اتفاق دیکھئے کہ میرے جانے کے دوسرے ہی روز مولانا آ گئے اور جب پتہ چلا کہ میں بنگلور چلا گیا ہوں تو اخلاص و محبت کے تقاضے کے طور پر سخت برہم ہوئے کہ جب انھیں میری آمد کا علم تھا تو پھر کیوں گئے؟ لیکن یہ غلط فہمی صرف "عشق است ہزار بدگمانی"، کے مثل تھی۔ مکان پر چند بھٹکلی حضرات کے ساتھ آئے اور چھوٹتے ہی اہلیہ سے اس بات کی شکایت کی لیکن جب انھیں ساری صورت حال معلوم ہوئی تو جن صاحب کے ذریعہ سے اپنی تاریخ آمد کی اطلاع پہنچائی تھی ان پر خفا ہوئے کہ پیغام کیوں نہیں پہنچایا؟ میری تحریر سے جب ذمہ دارانِ انجمن کی کارستانیوں کا علم ہوا تو رنج و غم کی ایک ایسی کیفیت ان پر طاری ہوئی کہ غیض و غضب میں بھر گئے اور کہا کہ جب تم لوگ انور علی کی قدر نہیں کر سکتے ہو تو میری کیا کرد گے۔ مجھے یہ سب باتیں پہلے سے معلوم ہوتیں تو میں بھٹکل میں قدم نہ رکھتا اور اب جتنے پروگرام بن چکے ہیں وہ سب ختم۔ اب

میں کسی پروگرام میں شرکت نہیں کروں گا اور حقیقتاً ایسا ہی کیا۔ اہلیہ کا بیان ہے کہ تقریباً نصف گھنٹہ سے زیادہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجتے رہے اور اُن کی اس اظہار حق پرستی اور ظلم کے خلاف صدائے احتجاج سن کر ایسا لگا کہ دل کے زخموں پر کسی نے مرہم رکھ دیا ہو۔ اگر آپ کا کوئی سگا بھائی بھی ہوتا تو وہ بھی شاید اس حد تک نہ جاتا اور نہ اس طرح سے آپ کے لئے لڑتا۔

مولانا مرحوم کا یہ وہ کردار ہے جس کی وجہ سے وہ میری نگاہ میں بہت بلند ہوگئے تھے۔ جب ؎

ہر بلائے کز آسماں می آید گرچہ بر دیگراں بلا باشد
بر زمیں نمی رسد و می پرسد خانہ انوری کجا باشد

کی سی صورت حال تھی، اس وقت اپنی ذات سے بے نیاز ہو کر یہ اُن کا ہم پر ایسا احسان ہے جس سے سبکدوش ہونے کی اب کوئی سبیل بھی نہیں رہی محبت تو ان سے پہلے بھی تھی لیکن اس واقعہ نے ان کی ذات سے جو عقیدت پیدا کردی ہے اس کی وجہ سے اگرچہ شاہد ازل کا ارشاد "کل من علیها فان" پیش نظر ہے لیکن دل میں اٹھنے والے جذبات واحساسات کی صدا یہ ہے کہ ؎

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

انسانی زندگی کا یہ پہلو بھی بڑا عجیب اور دلچسپ ہے کہ آدمی کسی نہ کسی کو اپنا دکھ درد ضرور سنانا چاہتا ہے اس کے بغیر اس کے دل و ذہن کا بوجھ دور نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ آدمی کسی نہ کسی سے بے تکلف ہونے پر مجبور رہے۔ مولانا کی مجھ سے جو بے تکلفی تھی اس کی بنا پر بعض باتیں وہ ایسی کہہ جاتے تھے جن کا اظہار شاید ہی کسی سے اس بے تکلفی سے کرتے ہوں گے۔ اُنھیں میں سے ایک بات میرے بزرگ اور محترم مولانا علی میاں سے متعلق ہے، وہ مولانائے محترم کے انتہائی عقیدت مند تھے چنانچہ جب موڈ میں آتے تو کہتے کہ مولانا علی میاں اس دور میں ولی کامل ہیں۔ اسی عقیدت کا نتیجہ تھا کہ جب فروری میں ٹھٹکل آئے اور کیفیت جذب میں جب بے تحاشہ اہل ٹھٹکل پر برہم ہوئے چلے جارہے تھے تو بے اختیار یہ بھی کہہ گئے کہ "یاد رکھو کہ اگر مولانا علی میاں کو یہ سب معلوم ہوا تو بہت ہی رنجیدہ ہوں گے اور اگر انہوں نے دل سے بددعا دے دی تو ٹھٹکل تباہ ہو جائے گا، برباد ہو جائے گا، جل کر ختم ہو جائے گا" اس سے مولانا علی میاں کے ساتھ ان کی گہری عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ ان کی موجودگی میں ان باتوں کا ذکر مناسب نہ تھا،

لیکن اب جب کہ وہ اس دنیا کو خیر باد کہہ چکے ہیں ان کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔
مولانا کا اٹھ جانا، انسانیت کے ایک سچے خادم کا اٹھ جانا ہے، ایک ایسے فرد کا اٹھ جانا ہے جس کی رگ رگ پے پے میں مستی کردار تھا، ایک ایسی ہستی کا اٹھ جانا ہے جو حق کے اظہار میں انتہائی جری اور بے باک تھا، ایک ایسے صحافی کا اٹھ جانا ہے جو میدان صحافت کا درخشندہ ستارہ تھا جو اصول پرست تھا اور ناساعد حالات میں بھی قلم کو موڑ دینے کا قائل نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میخانۂ ندوہ کے جام و پیمانے مدتوں اس مرد قلندر کے لئے رویا کریں گے لیکن مولانا اسحاق جلیس اب کہاں ملیں گے . . . . . ہاں وہی اسحٰق جلیس جو میرا دوست، میرا محسن تھا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

معیارِ سربلندی

ملت اگر اپنی پستی کو سربلندی سے، زوال کو عروج سے، ذلت و ادبار کو عزت و وقار سے بدلنا چاہے تو اسے ہر سطح پر اور زندگی کے ہر گوشہ میں قیادت کے انتخاب کے سلسلے میں خدا اور رسول کے معیار کو سامنے رکھنا ہوگا۔ خدا نے "اعلون" (سربلندی) کو مشروط رکھا ہے "ان کنتم مومنین" کے ساتھ ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ ایک مومن پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان کے بعد چند فرائض بھی عائد ہوتے ہیں، اس میں ایک فرض کے بارے میں ارشاد ہے کہ "نماز دین کا ستون ہے، جس نے اسے قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے اسے ڈھایا گویا اس نے دین کو ڈھا دیا۔

(مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم)

ہمدمِ دیرینہ کا بچھڑنا

(انیس چشتی۔ پونہ)

مولانا اسحٰق جلیس ندوی کے انتقال کی خبر پونہ والوں پر بجلی بن کر گری۔ حیرت سے لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پونہ والوں کو مرحوم پر بڑا ناز تھا۔ وہ شمالی ہندوستان کے لئے مہاراشٹر کا تحفہ سمجھے جاتے تھے۔ اب لاکھ تعزیتی جلسے ہوں، ایصال ثواب کی محفلیں ہوں، جو کھویا سو کھویا۔ جواں مرگ ساتھیوں کا غم بہت شدید ہوتا ہے اور پھر ایسی شخصیت جس سے ملت کی امیدیں وابستہ ہوں، جسے دلِ زندہ کی لذت نصیب تھی جس نے ابھی اڑنے کے لئے پر کھولے تھے، جس نے ابھی بلند پروازی کے لئے لمبا سانس لیا تھا۔ کسے یقین تھا کہ موت کا دام سخت اس کے آشیاں سے اتنا قریب تھا کہ اڑتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔

مولانا اسحٰق میرے والد کے دوستوں میں تھے۔ میں ان سے عمر میں چھوٹا تھا۔ بعد میں یہ ہوا کہ وہ میرے دوستوں میں سے ہو گئے۔ چنانچہ ہم دونوں میں احترام اور بے تکلفی، دوستی اور بزرگی کی ایک ایسی ہموار فضا بن گئی تھی جس کے لئے کسی خاص لفظ کا انتخاب میرے بس میں نہیں۔

مولانا اسحٰق جلیس کا نام آتے ہی کسی متحرک شے کا تصور ذہن میں آنا ضروری ہے۔ ہر وقت مصروف، غضب کا اختراعی ذہن پایا تھا۔ لکھنے میں، پڑھنے میں، بولنے میں، بحث میں غرض ہر کام میں یکتا، انہیں جلدی مچی رہتی، ہر کام کی جلدی۔ سست آدمی کا ان کے ساتھ نباہ مشکل تھا۔ میں اپنی تمام تر تیزی کے باوجود کاموں میں ان سے پیچھے رہ جاتا۔ وہ مجھ سے اُلجھتے اور کبھی کبھار ان کی عجلت پسندی پر میں انھیں ٹوک بھی دیا کرتا کہ کھائیں گے تو جلدی، چلیں گے تو جلدی، ہر کام میں تیزی اور عجلت، جیسے ان کو پتہ چل گیا ہو کہ جلدی جانا ہے اس لئے ہر کام کو جلدی جلدی نپٹا دو۔

ندوہ سے فراغت کے بعد ان کی سماجی زندگی کا یوں تو احمد نگر میں دارالعلوم کے قیام اور اسمیں دلچسپی سے آغاز ہو چکا تھا۔ تاہم وہاں کے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ زیادہ دن وہاں قیام کر پائیں، پونہ چلے آئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پونہ میں پہلی بار میں نے انہیں جماعت اسلامی کے دفتر کے اس شعبے میں دیکھا جو مجوزہ اسلامی

ڈائجسٹ کا دفتر بننے جارہا تھا یہ اس کی ادارت سنبھالنے والے تھے لیکن چند ہی دنوں میں یہ خواب پاش پاش ہوکر رہ گیا۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان سے جنگ چھڑ گئی۔ جماعت اسلامی کے تمام رفقاء جیلوں میں بند کردیئے گئے اور پھر پتہ نہیں مولانا اسحٰق کہاں رہے لیکن اب تک اتنا ضرور ہوا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے خوب متعارف ہوچکے تھے میں ان دنوں طالب علم تھا۔

پونہ میں ان کا دوسرا سب سے بڑا سیاسی بلکہ ایک طرح یوں کہئے کہ سماجی کام ۱۹۶۶ء میں مسلم مجلس مشاورت کا قیام اور احیاء ہے۔ مولانا اسحٰق پر جب مشاورت کا جوش سوار ہوا تو پھر انہیں کسی چیز کا ہوش نہ رہا، نہ کھانے کا نہ کپڑے کا، نہ نیند کا نہ آرام کا، الکشن بازی کے ہنگاموں میں وہ سب سے پیش پیش تھے، اسٹیج سجنے لگے تقریروں کا ریلا بہہ نکلا۔ غیر مسلم امیدواروں نے اسٹیج پر قسمیں کھائیں، اللہ کا نام لیا۔ مولانا اسحٰق نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنی زنبیل سے کئی نئے چہرے نکال کر پونہ کے سماجی اور سیاسی میدان میں پیش کردیے، لنگڑوں کو چلنا سکھایا، ہکلوں کو بولنا سکھایا، نئی قیادت ابھاری۔ آج وہی قیادت پونہ کے سماجی ڈھانچے پر برپا ہے ان ہی میں سے اکثر نے بعد میں مولانا اسحٰق کی مخالفت کی۔ مولانا پونہ کے مولانا محمد علی جوہر ثابت ہوئے۔ انہوں نے راستہ صاف کیا، نئے چہروں نے اپنی سیاست کی گاڑی آگے بڑھائی۔ یہ لوگ آج بھی پونہ کی سماجی اور سیاسی فضا پر چھائے ہوئے ہیں۔

نوجوانوں سے انھیں خاص دلچسپی تھی آج کے نوجوان نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ انتہائی مخدوش، غیر صحت مند، علم وعمل سے عاری اور متضاد تحریکوں اور رجحانات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ غیر یقینی مستقبل نے مسلمان نوجوانوں میں ایک طرح کی بے راہ روی پیدا کردی ہے، جو لوگ سماجی کاموں سے واقف ہیں وہ میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ آج کے دور کا سب سے مشکل کام جوانوں کی تنظیم ہے۔ پڑھے لکھے، صالح، مخلص، کسی سیاست کا کھلونا نہ بننے والے، اسٹنٹ بازی اور ہنگامہ آرائی سے دور، جلد مشتعل نہ ہونے والے، عمدہ سماجی اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے، سلیقہ مند، صبر وتحمل کے پیکر، مقصد کے حصول میں عجلت نہ کرنے والے جوانوں کا ملنا نہ صرف مشکل بلکہ لگ بھگ ناممکن سا ہے۔ بھیڑ بہت ملے گی لیکن کام کے لوگ چند ایک ہی ملیں گے۔ اب اگر جوانوں میں کوئی کام کرنا ہو تو پہلے نہایت پتہ ماری سے انہیں چھانٹیے، سدھاریئے، ان کی ایسی تربیت کیجئے جو آپ کی تنظیم کے لئے مفید ومعاون ثابت ہوں، اور صرف اتنا ہی

نہیں بلکہ ان کی تنظیم کو نظر بد سے بچانے کے لئے روئیے، گڑگڑائیے، دعائیں مانگئے، دوسرے بزرگوں سے بھی دعاؤں کی درخواست کیجئے ـــــ مولانا اسحٰق صاحب نے پونہ میں "مجلس فلاح ملت" کے قیام کے بعد یہ سب کچھ کیا۔ یہ ایک سماجی ادارہ تھا جس کا مقصد نہ صرف جوانوں کی تنظیم تھا بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں ان کی مستقل رہنمائی تھا۔ اس ادارے نے اپنا ذاتی اخبار "ملت ٹائمز" بھی شائع کیا، مولانا اسحٰق اس کے مدیر تھے، اخبار کی ہر حال اپنی آواز تھی۔ اس نے پونہ کے مسلم دشمن عناصر کو بھی جھنجھوڑا۔ جلد ہی اس انجمن نے تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ کاش کہ اس مجلس کو مخلص افراد میسر آتے۔ مجلس فلاح ملت ۶۵ء میں شروع ہوئی تھی اور ۶۹ء کے قریب قریب یہ تحریک تقریباً ختم ہو کر رہ گئی۔ اخبار بند ہو گیا اور مولانا اسحٰق لیڈی حوابائی اسکول میں استاذ عربی مقرر ہو گئے۔ ان کی بے باکی اور مقبولیت سے یہاں کے انتظامیہ کی بھی کور دبتی تھی۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کئے کہ مولانا نے غصے میں آکر اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ وہ دن مولانا پر بہت سخت تھے، وہ چاہتے تو فلاح ملت کے فنڈ سے (جس کے وہ ہنوز صدر تھے) اپنے اخراجات چلا سکتے تھے لیکن لوگ گواہ ہیں کہ انہوں نے اپنا اثاث البیت بیچ بیچ کر اپنے خاندان کی کفالت کی۔

پونہ میں مولانا اسحٰق کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لوگوں کو "مشاورت" کے دور میں اور "مجلس فلاح ملت" اور "ملت ٹائمز" کے اجراء کے وقت ہوا۔ انہوں نے کچھ شرپسندوں کے جواب میں مسلم پرسنل لا کی خواتین کانفرنس بلائی تھی۔

ان کی "ندرت" لوگوں کے سر چڑھ کر بولی۔ کوئی موضوع ہو، ان کی زبان اور قلم کبھی کوتاہ ثابت نہیں ہوئے، ان کی متحرک شخصیت نے پورے شہر کو اپنے احاطے میں لے لیا تھا۔ وہ سراپا تحریک تھے۔ رات رات بھر پرچہ تیار ہو رہا ہے۔ نئے کھلاڑیوں کے لئے تقریریں لکھی جارہی ہیں، جلسوں کے زائچے بن رہے ہیں۔ نہ خود سوتے ہیں نہ لوگوں کو سونے دیتے ہیں کئی کئی ہفتے ایسے گذر جاتے کہ وہ چند گھنٹوں سے زیادہ سونے نہ پاتے۔

بہت اچھے لکھنے اور بولنے کے علاوہ وہ بہت اچھے سننے والے بھی تھے۔ ایسے ایسے لوگوں کو وہ برداشت کرتے رہتے جن کے تصور سے ہی کوفت ہوتی تھی۔ جاہلوں کی عالمانہ باتیں بڑی توجہ سے سنتے تھے وہ اگر نہ بولیں تو سامنے والا یہ سمجھ کر کہ عام مولوی ہے اپنی ہانکنے لگتا۔ میں نے کسی مجلس، جلسے یا میٹنگ میں

انہیں ناکام ہوتے نہیں دیکھا۔ ناکام تو وہ لوگ بھی نہیں ہوتے جو بولتے ہی نہیں یا محض ہاں ہوں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن بولنے والے کی پسپائی کا اکثر خدشہ رہتا ہے۔ بڑے سے بڑا پڑھا لکھا، انگریزی داں، سیاستداں، تاریخ داں، ماہر تعلیمات، سماجی امور پر نظر رکھنے والا ان کے سامنے بونا لگتا تھا۔ ان کی زبان اور لغت میں اللہ نے ایسی وسعت دی تھی کہ ہر موضوع اور مضمون کے لئے بالکل "فٹ" بیٹھتی تھی۔ اس کے علاوہ ادبیت بھی ان کی شخصیت کا خاص حصہ تھی، کیسی ہی مجلس ہو، مولانا اسحٰق وہاں سب کو قائل کر کے ہی اٹھیں گے۔

انجمن خیر الاسلام والوں کو پونہ مدعو کر کے پونہ میں ایک کالج کھولنے کی تحریک دینے والے دو افراد تھے۔ ایک مولانا اسحٰق صاحب دوسرا راقم الحروف۔ اس سلسلے میں لگاتار کوششیں کی گئیں۔ آخر متھا صاحب اس بات پر راضی ہوئے کہ ایک بار پونہ آئیں گے اور حالات کا جائزہ لیں گے، چنانچہ ایک شام محمد علی متھا صاحب، جناب محمد خاں صاحب (چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ) مفیدہ خاتون اور انجمن خیر الاسلام کا پورا وفد پونہ آیا۔ اس وقت کھانے سے پہلے اینگلو اردو ہائی اسکول کے اسمبلی ہال میں تعلیم کی اہمیت اور ضرورت پر مرحوم نے جو تقریر کی ہے اس نے تمام عمائدین کو پونہ میں ایک کالج کھولنے پر آمادہ کر ہی لیا، اور یہ لوگ فیصلہ لے کر اٹھے ہیں کہ پونہ میں کالج کھولا جائے گا، پروگرام ترتیب دیا جائے اور جگہ کا انتظام کیا جائے۔ وہی فیصلہ آج پونہ میں "پونہ کالج" کے نام سے عملی جامہ پہن چکا ہے جہاں ہزاروں طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔

مرحوم جولائی ۱۹۸۳ء میں پونہ سے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ اپنے شیخ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بار بار اصرار کے باوجود بھی وہ اپنا ذہن نہیں بنا پا رہے تھے کہ لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لیں۔ انھیں پونہ سے لکھنؤ ہمیشہ کے لئے رخصت کرانے کی آخری کوشش میں نے ہی کی تھی اور اللہ کے فضل سے کامیاب رہا تھا ورنہ یوں ہوتا کہ لوگ انہیں اسٹیشن رخصت کر کے آتے اور وہ شام پھر بمبئی سے لوٹ آتے، کہتے کہ انشراح نہیں ہے حضرت مولانا ان دنوں حیدر آباد آئے ہوئے تھے ہم نے موقع غنیمت سمجھا کہ کسی طرح یہ حیدر آباد پہنچ جائیں۔ چنانچہ میں انہیں گاڑی میں بٹھا کر نہیں بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ ٹھونس کر آیا اور بھیڑ کی وجہ سے رخصتی مصافحہ بھی نہیں کر سکا۔ وہ حیدر آباد کیا گئے پونہ سے ہمیشہ کے لئے لکھنؤ چلے گئے۔

لکھنؤ پہنچ کر اور اپنے شیخ کے قدموں میں رہ کر ان کی طبیعت اور شخصیت میں زبردست نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ لکھنؤ پہنچ کر ان کے تین کارناموں نے صرف حلقۂ احباب کو ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔

۱۔ ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشن کی اسلامی نمائش۔

۲۔ پندرہ روزہ تعمیر حیات۔

۳۔ تحریک پیام انسانیت میں ان کا وجود۔

مجھے لکھنؤ اکثر جانے اور ندوۃ العلماء میں ہفتوں قیام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے وہاں میں نے ان کے اطراف ہمیشہ طلبہ کا جمگھٹا دیکھا۔ حالانکہ ان کے ذمے درس و تدریس کی کوئی خدمت نہیں تھی۔ لائبریری کا نظم اور تعمیر حیات کی ادارت۔ بس یہ دو ذمہ داریاں ان کے سپرد تھیں۔ طلبہ ان سے بڑے مانوس تھے۔ طلبہ کی ایسی فوج ہماری نجی زبان میں "اجنۃ" یعنی "جن" کی جمع کہلاتی ہے، ایک ہفتے کا کام چار گھنٹے میں کرنا ہو تو مولانا اسحٰق سے کہہ دیجئے۔ چراغ گھستے ہی جنات حاضر۔ اب آپ جو چاہیں کروا لیجئے۔

جشن ندوہ کے سلسلہ میں انہوں نے مجھے اجلاس سے پہلے ہی لکھنؤ بلوا لیا تھا۔ ابھی میں اسٹیشن سے پہنچکر سانس بھی نہیں لے پایا تھا کہ انہوں نے کاموں کا انبار میرے سامنے پیش کر دیا۔ اس روز رات تین بجے تک مجھے تپائے رکھا اور اتنا کام لے لیا کہ آٹھ آدمی مل کر آٹھ دن میں بھی نہیں کر سکتے تھے۔

نمائش کے سلسلے میں انہوں نے جس عرق ریزی اور جانفشانی سے ندوہ کی تاریخ مرتب کی تھی وہ کام پوری ایک اکیڈمی کر سکتی تھی۔ ندوہ کے مختلف ادوار کو ناظرین ایک نظر میں ملاحظہ کر سکتے تھے۔ مصنفین ندوہ کو کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ گویا وہ اپنی کہانی آپ بیان کر رہے ہوں۔ نمائش میں ان کے ذوقِ مطالعہ، دقتِ نظر، سخت کوشی، علمی بصیرت کے علاوہ ان کا ذوقِ جمال اور پیش کش کا سلیقہ بھی جھلکتا تھا، کتنے ہی ریسرچ اسکالر اب تک اس سرمائے سے فیض اٹھا رہے ہیں۔

ان کے سیال قلم نے "تعمیر حیات" میں جان ڈال دی تھی، اداریہ ایسا لکھتے جس سے بہتر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ "بھٹو نمبر" ان کے مزاج، بے باکی اور سیاسی بصیرت کی روشن دلیل ہے۔ اس شمارے کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اس کے اب تک پانچ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں۔ اس شمارے میں ان کا مضمون پڑھنے کے بعد لوگوں کے ذہن بدل گئے۔ ضیاء الحق کو پیدائشی گناہ گار اور بھٹو کو ازلی غوث الاعظم کہنے والوں کی زبان و قلم پر تالے پڑ گئے۔ تعمیر حیات صالح صحافت کی عمدہ نظیر ہے۔

جلسوں کی رپورٹنگ ایسی کرتے کہ پورا منظر کھنچ جاتا، جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ جلسے کے اکابرین شرکا نے بعض مرتبہ ان کی اس طرح سے رپورٹنگ پر اظہار حیرت کیا کہ یہ آخر اتنا سب کچھ لکھ کب لیتے تھے تو اس پر حضرت مولانا علی میاں نے فرمایا کہ" ان کا دماغ ہر وقت حاضر رہتا تھا۔ نہ صرف دماغ بلکہ دل بھی۔
تحریک پیام انسانیت کے پُرزور داعی، مبلغ اور سپہ سالار تھے۔ اس تحریک میں ان کے پورے قوائے عمل کو کام کرنے کا موقع مل گیا تھا خود حضرت مولانا علی میاں نے فرمایا کہ ایسی تقریر کرتے تھے کہ اسکے بعد کسی کو کچھ بولنے کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ بعض مرتبہ رسمًا اور بعض مرتبہ تبرکًا کچھ کہہ سن کر جلسہ برخاست کرنا پڑتا۔
تحریک پیام انسانیت ان کا اوڑھنا بچھونا بن چکی تھی، جب کہیں ذرا سا وقت ملتا تحریک کی بات کر ڈالتے۔ وزراء کی موجودگی میں اسٹیج پر، ریل میں، موٹر میں، اسٹیشن پر، یہاں تک کہ نائی کے ہاں خط بنانے تک میں سامنے والا ایسا متاثر ہوتا کہ ہاتھ جوڑتے جوڑتے نہ تھکتا۔ خود فرماتے کہ آج کل مجھ پر پیام انسانیت کا جن سوار ہے۔ تحریکوں کو جب ایسے افراد مل جاتے ہیں تو پھر وہ تحریکیں، تحریکیں نہیں رہتیں بلکہ عوام کا معمول بن جاتی ہیں۔
زندگی کا اس سے بڑا لطف کیا ہوسکتا ہے کہ زندہ رہیں تو حضرت مولانا کے سایۂ عاطفت میں رہیں اور موت کا اس سے بڑا عیش کیا ہوسکتا ہے کہ مرکر رائے بریلی میں دفن ہوں۔ مولانا اسحٰق دونوں صورتوں میں خوش نصیب ثابت ہوئے۔ جب تک زندہ رہے اپنے شیخ کی توجہ کا مرکز بنے رہے اور مرے تو ان ہی کے قدموں میں پڑے رہنے کو جگہ ملی۔

ہم میں مشترک بات یہ بھی تھی کہ حضرت کی عمر میں برکت کے لئے اگر دعا کرتے جس میں یہ بھی خواہش رہتی کہ اگر خدانخواستہ حضرت کی عمر میں کوئی کوتاہی ہو تو اللہ ہماری عمر کو اس کا ضمیمہ بنادے۔ اللہ تعالیٰ نے اسحٰق صاحب کی سُن لی اور وہ دیکھتے دیکھتے صرف ۴۴ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ اپنے شیخ کا دست راس، شیخ کے ایک ایک لفظ کو موتیوں کی طرح قیمتی سمجھنے والا، خود قدر کرنے والا اور دوسروں کو قدر دان بنانے والا رخصت ہو گیا۔ ایک آفاقی شخصیت گُم ہو گئی ایک فعّال ترین شخصیت سے ملّت محروم ہو گئی جس کی نظر میں وسعت تھی، دماغ قافلہ سالاری کی پوری صلاحیت رکھتا تھا، جس کے دنوں میں تپش تھی شبوں میں گداز تھا، پیشانی عبادت کے لئے وقف تھی، اور دل سوز سے پُر تھا۔ آج ملت ایک ایسی شخصیت سے محروم ہو گئی جو اپنی پارہ صفتی کے لئے دور و نزدیک مشہور تھا۔ مجھے یقین ہے کہ۔ ؏

مرقد کا شبستاں بھی اسے راس نہ آیا
آرام قلندر کو تہہ خاک نہیں ہے

کیونکہ: ــــــــــــــــ

خاموشیٔ افلاک تو ہے قبر میں لیکن
بے قیدی و پہنائیٔ افلاک نہیں ہے

امت دعوت

ملت مسلمہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ امت دعوت ہے، اس کی انفرادی زندگی کا ہر لمحہ اس کی اجتماعی سرگرمیوں کا اصل موضوع دنیا کے انسانوں کو خیر و فلاح کی طرف راغب کرنا ہے، اس ملت کے افراد کو تجارت، ملازمت جیسے دنیوی مشاغل میں بھی اس طرز عمل کو اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جس سے غیر اقوام پر اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کا نقش قائم ہو، وہ اسلام کی حقانیت اور عالم انسانی کے لئے اس کی افادیت کے قائل ہوں، اپنے اس مقصد حیات سے بے خبری، چشم پوشی اور روگردانی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا تشخص ہمارا امتیاز جاتا رہا ہے، اور ہم دنیا کی دیگر اقوام کی طرح ایک ایسی قوم بن کر رہ گئے ہیں جس کے پیش نظر صرف تجارت و معیشت، معیار زندگی کو برقرار رکھنے کی جد و جہد اور اپنے خاندان کی مادی ضرورتوں کی تکمیل ہو، ہماری اس خود فراموشی نے خالص دینی سرگرمیوں میں بھی دعوت خیر کے پہلو کو اوجھل کر دیا ہے۔

(مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم)

ایک مخلص و مستعد کارکن

مولانا اسحاق جلیس ندویؒ

مولانا محمد عبد السمیع ندوی

اصلاً تو صوبۂ سرحد کے رہنے والے تھے، ان کے والد بہ سلسلۂ ملازمت احمد نگر میں مقیم ہوئے، بچپن اور جوانی کا بڑا حصہ یہیں گزرا، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، چال ڈھال، وضع قطع سے یوپی ہی کے معلوم ہوتے تھے، لہجہ کبھی کبھی مہاراشٹری علاقہ کی غمازی کر جاتا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، شروع ہی سے ان کی ہوش مندی، معاملہ فہمی اور دین سے وابستگی کا تاثر ذہن میں رہا، فراغت کے بعد کچھ دن کے لیے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام سے وابستہ رہے، پھر احمد نگر چلے گئے جہاں لائبریری سائنس میں ڈگری حاصل کی اور وہیں کسی تعلیم گاہ میں تدریس کے فرائض کچھ عرصہ تک انجام دیتے رہے، ایک ہفت روزہ اخبار پونہ سے جاری کیا، جس نے کچھ زیادہ عمر نہیں پائی۔

طالب علمی ہی کے زمانہ سے ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کی دینی دعوتی فکر سے بڑا لگاؤ تھا، یہ تعلق و لگاؤ ہی ان کو کھینچ کر پھر ندوہ لے آیا، کتب خانہ کی "تنظیم جدید" کی خدمت ان کے سپرد ہوئی، محنتی اتنے کہ اس جدید تنظیم کے لیے دن رات ایک کر ڈالے، دو چار دن، ہفتہ دو ہفتہ نہیں بلکہ مہینوں انتھک محنت کرتے رہے اور بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی، لکھنے پڑھنے کی خاصی صلاحیت تھی، اس لئے حضرت مولانا زید مجدہ نے "تعمیر حیات" کی ذمہ داری بھی ان کو سونپ دی، جہاں انھوں نے اپنے صحافتی اور قلمی جوہر خوب خوب دکھائے، دین کی "دعوت" خوب خوب دی، تعمیر حیات کو صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے کامیاب بنایا۔

حضرت مولانا زید مجدہٗ کی دعوتی فکر کا ندوہ میں رہ کر مزید رنگ چڑھا تو "پیام انسانیت" کے عنوان سے عمومی دعوت کا آغاز کیا، پنجاب، ہریانہ کا سفر معرکہ کا سفر تھا جس میں غیر مسلم احباب بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ پھر دوسرے سفر ہوتے رہے، مراد آباد کے سفر میں بھی غیر مسلم دوستوں نے بڑی پذیرائی کی، آخری سفر بنگلور

اور میسور کا ہوا وہیں سے بیمار ہو کر آئے۔

دعوتی کام کے سلسلہ میں ان کو بڑی سہولت مختلف زبانوں سے واقفیت کی وجہ سے ہوئی، پشتو اور عربی تو جانتے ہی تھے انگریزی اور مہاراشٹری زبانوں سے بھی واقف ہو گئے تھے موقعہ پڑنے پر جن سے کام لیتے تھے اور ہر مجلس پر چھا جاتے تھے۔

دینی ادارے بالعموم کارکن افراد کی قلت کے شاکی رہتے ہیں، ندوہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، ایک بار نہیں بار بار یہ بات سامنے آچکی ہے، لیکن دینی اداروں کو جہاں قحط الرجال کا شکوہ ہے وہاں اللہ کی یہ نعمت بھی ان کو حاصل ہے کہ کم و بیش ان کا ہر کارکن اپنی مختلف صلاحیتیں بروئے کار لانے کے لیے مستعد رہتا ہے، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھتا دین کی خدمت اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ جذبہ صادق و پر خلوص ہوتا ہے، اس لئے کسی دوسرے کام کرنے میں کوئی باگ اور جھجک محسوس نہیں کرتا۔ دیکھنے سننے والے حیرت زدہ رہتے ہیں کہ فلاں اور یہ کام؟ کچھ ایسی ہی صورت مولوی اسحاق خاں صاحب کی بھی تھی، ایک داعی ایک صحافی، ایک لائبریرین، بھلا کیا جوڑ ہو سکتا ہے اس کو اینٹ اور چونے گارے سے، آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ اجلاس کا جب موقع آیا تو دارالعلوم کی عمارت کے سامنے ایک چہار دیواری کی تعمیر کا منصوبہ بنا، لمبی چوڑی دیوار، کم و بیش دو مہینہ میں تو بن کر تیار ہوئی ہوگی، اس کی دیکھ بھال، مٹیریل کی فراہمی، مزدوروں کے کارکردگی کی نگرانی، اس کی ہر چیز کی ذمہ داری مولوی اسحاق خاں صاحب ہی نے لی اور اس دیوار کی تعمیر اپنی نگرانی میں مکمل کرائی۔

کچھ اسی قسم کا مسئلہ اجلاس کے ڈائس کی تیاری کا بھی تھا، ڈائس کے لیے لکڑی کے جال دار فریم تیار کرانا اور ان پر روغن و پالش کرانا یہ کام بھی انھوں نے اپنی ہی نگرانی میں کرایا۔

اسی اجلاس کے زمانہ میں علمی نمائش کا اہتمام انھوں نے بڑے سلیقہ سے کیا تھا، ہندوستانی علماء اور دانشوروں کی تخلیقات کی نمائش کا کام معمولی کام نہ تھا۔ گویا صدیوں کی تاریخ پیش کرنا تھی، اس ہفت خوان کو مولوی اسحاق خاں صاحب نے سر کیا۔ ہر فن کے علٰحدہ علٰحدہ انھوں نے چارٹ تیار کرائے، جو قیمتی معلومات پر مشتمل تھے جن تک رسائی عرصہ تک کتابوں کی ورق گردانی کے بغیر ممکن نہیں، حیرت ہوئی کہ اپنے دوسرے مشاغل کے ساتھ اس کام کے لیے ان کو وقت کہاں سے مل گیا، اس نمائش کے سلسلہ میں یہ کام بھی ان ہی سے بن آیا کہ فضلاء ندوہ کی مختلف علوم و فنون پر جو کتابیں مرتب ہو کر شائع

ہو چکی تھیں ان کی بھی چارٹ نما فہرست تیار ہو گئی جس میں کہ آئندہ اشاعت پذیر کتابوں کا اضافہ ہوتا رہے گا، یہ چارٹ آج بھی ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں موجود ہیں اور جب تک رہیں گے آئندہ کے کام کی رہبری و رہنمائی کے ساتھ ساتھ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

اوپر میں نے عرض کیا کہ کرناٹک کے سفر سے مولوی اسحاق خاں صاحب بیمار ہو کر آئے تھے السر کا مرض تجویز ہو چکا تھا دوا اور پرہیز کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے معمولات بھی جاری تھے۔ کتب خانہ "تعمیر حیات" اور "پیام انسانیت" کے کاموں کی نگرانی کر رہے تھے، اس لیے عام طور پر ان کی علالت کو محسوس نہیں کیا جاتا تھا، حضرت مولانا زید مجدہٗ کے حجاز تشریف لے جانے کے دوسرے ہی دن درد کا حملہ ہوا جو بڑھتا ہی رہا، شب میں میڈیکل کالج لے جایا گیا، موجود ذمہ داروں نے علاج و معالجہ کے لیے دوا دوش اور تیمارداری کا پورا حق ادا کیا۔

عزیز گرامی مولوی محمد میاں مرحوم کی علالت و انتقال کا حادثہ اس قدر اچانک پیش آیا تھا کہ حدود دارالعلوم میں مقیم طلبہ و اسٹاف کے افراد خدمت و تیمارداری کا حق ادا کرنے سے محروم رہے تھے، مولوی اسحاق خاں کی علالت کے دوران وہ اپنے حوصلے نکال لینا چاہتے تھے، ہر فرد رواں دواں فکر مند، بے چین، قلب و زباں سے ان کی صحت کے لیے دعا گو تھا، ڈاکٹر نے کہا خون چاہیے، طلبہ اور اسٹاف کے پرے کے پرے میڈیکل کالج خون دینے کے لیے پہنچ گئے نمبر نہیں ملا تو خون کی تلاش میں آدمی کانپور بھیجا گیا، ڈاکٹر نے کہا کہ ایک دوا ضلع گورکھ پور کے فلاں گاؤں میں فلاں ڈاکٹر کے پاس موجود ہے وہ اگر مل جائے تو بہت کچھ افاقہ کی توقع ہے، ایک صاحب راتوں رات اس دوا کو حاصل کرنے کے لئے گورکھ پور روانہ ہو گئے، لیکن مریض کے کانوں میں "اجیبوا داعی اللہ" کی صدائیں آ رہی تھیں، سمجھتے بوجھتے، بولتے چالتے، ہوش و حواس اور ذکر و فکر کی حالت میں ۱۱؍جولائی یوم سہ شنبہ کو جان جاں آفریں کو سپرد کی۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کے حسنات و مبرات قبول فرمائے، ہم سب کی دعا ہے مولوی اسحاق خاں کو لے رب کریم بخش دے

۹۹ ۱۳ ھ

تعزیتی مکتوب

رخصت اے بزم جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں

سید حبیب الحق ندوی

اہالیان ندوہ برادرم محمد الحسنی مرحوم و مغفور کے جانکاہ المیہ سے جاں بر بھی نہیں ہو سکے تھے کہ دوسرا بڑا سانحہ جاں گسل پیش آگیا اور خلوص و انکساری اور تواضع کے پیکر مولانا اسحاق جلیس یہ کہہ کر اچانک روانہ ہو گئے:۔

رخصت اے بزم جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں
گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
اجنبیت سی مگر تری شناسائی میں ہے
مدتوں ترے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا
مدتوں بے تاب موج بحر کی صورت رہا
مدتوں بیٹھا ترے ہنگامہ عشرت میں میں
روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں میں
چشم حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارے کو ہے
آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے
چھوڑ کر مانند بو تیرا چمن جاتا ہوں میں
رخصت اے بزم جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں

ان دو حوادث نے یکے بادیگرے ذہن و فکر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایک تعزیت کے قلم کی سیاہی خشک بھی ہونے نہ پائی تھی کہ دوسری تعزیت نے نوک قلم کو خونچکاں بنا دیا۔ ابھی پچھلے سال کی ہی بات

ہے کہ ندوہ کے دوران قیام میں مولانا اسحاق جلیس صاحب سے خوب خوب ملاقاتیں رہیں، بڑا گہرا نقش مرحوم نے مجھ پر چھوڑا، نئے عہد و پیمان بھی کئے گئے۔ ندوۃ العلماء سے اور بالخصوص تعمیر حیات سے تحریری رابطہ کے احیاء و تجدید کی میثاق بھی ہوئی۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ نشأۃ اسلامیہ کے شگفتہ پھول اچانک شہر خموشاں میں جا کھلیں گے۔ ؎ چھوڑ کر مانند بو تیرا چمن جاتا ہوں میں

گھر بناتا ہے سکوت دامن کہسار میں
آہ! یہ لذت کہاں موسیقی گفتار میں
ہمنشین نرگس شہلا، رفیق گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن، ہمسایۂ بلبل ہوں میں
ہم وطن شمشاد کا، قمری کا میں ہمراز ہوں
اس چمن کی خامشی میں گوش برآواز ہوں
عاشق عزلت ہے دل نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسند دارا و اسکندر پہ میں
لیٹنا زیر شجر رکھتا ہے جادو کا اثر

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے راز ہست و بود

بلاشبہ شہر خموشاں ہی ہم سبھوں کا گھر اور وطن ہے اور زیر شجر ہی ہم سبھوں کو لیٹنا ہے اور گل کی پتی ہی اپنے دامن میں راز ہست و بود کو چھپائے ہوئے ہے لیکن بایں ہمہ انسانی قلب کمزور واقع ہوا ہے وہ صدمات فاجعہ و محزنہ کو برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہو پاتا۔ برادرم اسحٰق جلیس کی رحلت سے نشأۃ اسلامیہ کی تحریک کو ایک دوسرا شاک یا جھٹکا پہنچا ہے، اللہ اپنے خزانۂ غیب سے اس خسارہ کی تلافی فرمائے لیکن ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است والی بات اپنی جگہ پر درست ہے، تحریکی شخصیات چوں کہ انفرادی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ وہ ملت میں گم ہو جاتی ہیں اور سرمایہ ملت بن جاتی ہیں اس لئے ان کا زیاں بھی سرمایہ ملت کا زیاں ہے۔ گزشتہ دو عشروں میں سید قطبؒ اور شاہ فیصل کی شہادتوں نے نشأۃ

ونہضۂ اسلامیہ کے دوزاویوں کو متاثر کیا تھا، افق ہندی سے جو شفق پھوٹ رہی تھی اور جو کرنیں نمودار ہو کر حیات اسلامیہ کو جنت بداماں اور پر بہار بنانے والی تھیں وہ بھی موت کے بادل میں چھپ گئیں مجھے تو بعض وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی تحریک تہوید کی ایک کڑی ہے۔ چونکہ اس تحریک کے مطالعہ کا مفصل موقع ملا ہے اور میں جانتا ہوں کہ کن کن طریقوں سے اہل یہود نے اسلامی تحریکی شخصیات کو قتل وغارت اور سلب و نہب کے ذریعہ منظر عام سے ہٹایا ہے اور اسلام کی بربادی کا سامان فراہم کیا ہے۔ عبداللہ بن صبا کے وقت سے جو تحریک شروع ہوئی ہے وہ اب تک ختم نہیں ہوئی یہ لوگ ایسی دوائیں، ایسی گولیاں، ایسے کھانے کھلاتے ہیں جن کے مہلک اثرات مہینوں کے بعد نمودار ہوتے ہیں اور ان کا پتہ لگانا تو کیا ان کی طرف وہم وگمان بھی نہیں جا سکتا ہے۔ ان تمام کید وفریب کی داستانیں امریکہ ویورپ میں معلوم ہوئیں۔ ہندی منظر (انڈین سین) پر بھی نہضہ اسلامیہ کی غارتگری کے لئے تحریک تہوید فعّال ہے جس کی طرف اشارات میں نے فلسطین کی کتاب میں کیا ہے، چوں کہ انھیں ندوہ سے خطرہ ہے، چونکہ ندوہ صرف ہندی ذہن کو نہیں بلکہ عرب ذہن کو بھی — عربی تحریرات کے ذریعہ — جھنجھوڑ رہا ہے، اس لئے تحریک تہوید ان تمام شخصیات کو راستے سے صاف کر سکتی ہے، جو عالم اسلام کو جگا رہے ہیں۔ یورپ میں اسی طرح مسیحی قائدین کو اہل یہود نے فنا کیا ہے اور تحریک تہوید کو کامیاب بنایا ہے۔ ہماری معروضات مضحکہ خیز معلوم ہو سکتی ہیں لیکن بعید از قیاس نہیں۔

یادوں کے چراغ

اسحاق جلیس ندوی ــــ نقوش و تاثرات

(پروفیسر سید اختشام احمد ندوی)

اکتوبر ۱۹۷۵ء میں ندوہ کے جشن کے موقع پر میں نے مولانا واضح رشید ندوی سے کہا کہ چلئے اسحٰق جلیس صاحب سے ملاقات کرلیں۔ اگرچہ نام جانا تھا اور تعمیر حیات کی ادارت نے ان کو شہرت بھی عطا کردی تھی مگر ان کی صورت ذہن میں نہ تھی مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت تھا ہم دونوں کتب خانہ کے ہال میں پہونچے اور پھر وہاں سے اس بغلی کمرے میں گئے جہاں مولانا اسحاق جلیس صاحب کی نشست گاہ تھی۔ میں گیا تو بڑی محبت سے ملے۔ میں نے کہا کہ بھائی زمانہ نے بال تک سلامت نہیں چھوڑے سیاہی میں سفیدی کی گل کاریاں شروع ہوگئی ہیں۔ مولانا اسحاق جلیس صاحب نے فرمایا، لیکن آپ پھر بھی بہتر پوزیشن میں ہیں میرا حال دیکھئے کہ بابا بن گیا ہوں اور داڑھی کا ایک بال بھی سیاہ نہیں رہا۔ میں نے تعمیر حیات کی ترقی اور ان کی ادارت میں اس کی مقبولیت اور معیار کی بلندی پر ان کو مبارک باد دی۔ وہ بولے کہ میری جدوجہد کا اصل میدان تعمیر حیات ہی نہیں ہے بلکہ اصل موضوع میرا کتب خانہ ہے سامنے مرصع و مزین کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ان پر اصل محنت کی ہے اور ان کو جدید انداز سے مرتب کیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس فن کے ماہرین میں سے ہیں اور باقاعدہ لائبریری کی ٹریننگ حاصل کی ہے۔

اس وقت ان کی میز کے سامنے اور بھی کئی حضرات تشریف فرما تھے میرا انہوں نے ان سے تعارف کرایا اب ان کے نام ذہن میں نہیں رہے۔ مولانا اسحاق جلیس صاحب نے کہا کہ میں تو آپ سے جونیر ہوں جس زمانہ میں آپ جامعہ میں تھے میں ندوہ کا طالب علم تھا۔ اس دور میں آپ سے مل چکا ہوں۔ بہر حال مجھے تو اس قبل کی ملاقات کا خیال نہیں آتا عالم شعور میں یہ ان سے پہلی ملاقات تھی اور بڑی محبت سے ملے جشن کا ہنگامہ تھا اور وہ نہایت مصروف تھے ان کے گرد کام کرنے والوں کا حلقہ تھا میں نے دخل اندازی مناسب

نہ سمجھی اور اجازت لے کر ان کی نشست گاہ سے باہر آگیا۔

ان سے تعلقات برابر قائم رہے تعمیر حیات کی مضمون نگاری کے باعث میں نے ۳۵۔۴۰ مضامین تعمیر حیات میں لکھے ہوں گے جن کو اسحاق جلیس صاحب نے شائع کئے اور بڑی محبت سے۔ ادھر سال بھر سے میں نے تعمیر حیات میں کچھ نہیں لکھا۔ کسے معلوم تھا کہ ان کی وفات کا حادثہ اس طرح پیش آجائے گا اور خود ان کے بارے میں اتنی جلد لکھنا پڑے گا۔ موت کی بے اختیاری کے سامنے کس کو اختیار حاصل ہے ؎

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے ۔۔۔ اپنی خوشی سے آئے، نہ اپنی خوشی سے چلے

ندوہ کو اور ابنائے ندوہ کو ان سے بڑی امیدیں تھیں ابھی وہ جوان تھے اور دراصل ندوہ کے موجودہ کاموں میں ان کی ان تھک کوششیں، خلوص اور محنت کو بڑا دخل ہے۔ مجھ سے ایک بار کہنے لگے کہ میں تو ان ہی طلبہ کو ساتھ لیتا ہوں جو ہمارے ساتھ گھنٹوں مل کر کام کر سکیں اور رات کو رات نہ جانیں۔ انہوں نے بتایا کہ ندوہ کے جشن میں کتب خانہ میں جو علمی نمائش ہوئی اور علمی چارٹ تیار کئے گئے ان میں رات اور دن انہوں نے مسلسل کام کیا اور ان کے ساتھ طلبہ بھی لگے رہے۔

انہوں نے ایک بار کہا کہ وہ پونا میں تھے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی نے انھیں لکھا کہ اب میرے زندگی کے کچھ دن باقی ہیں دل چاہتا ہے کہ تم یہاں ندوہ میں میرے ساتھ رہو۔ وہ بولے کہ ان کا یہ خط پا کر میں ندوہ آگیا۔ کسے معلوم تھا کہ کچھ دن خود انھیں کی زندگی کے باقی تھے جو انہوں نے اپنی مادر علمی کی خدمت میں گذار دیے۔ شاعر نے تو کہا تھا کہ ؎

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن ۔۔۔ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

مگر اسحاق جلیس کی زندگی میں نہ آرزو کو دخل تھا اور نہ انتظار کو وہ صاحب عمل تھے، عمل پیہم جہاد زندگی میں ان کی شمشیر تھی۔ ان کے دفتر زندگی میں عمل ہی عمل ہے، مگر افسوس کہ قدرت نے انھیں طویل موقع عطا نہ کیا لیکن اس تھوڑے سے وقت میں بھی انہوں نے اردو صحافت میں امتیاز و افتخار حاصل کر لیا ؎

کھلتا ہے کوئی پھول تو جی ڈرتا ہے ۔۔۔ کہ ڈھونڈھتی ہو نہ اسے گردش ایام کہیں

دوسری ملاقات جلیس صاحب سے آل انڈیا کانفرنس کے موقع پر ہوئی جس کا حال میں نے اپنے مضمون "روداد گلشن بہاراں" میں لکھا ہے۔ البتہ یہاں یہ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اور

میرے ایک شاگرد ڈاکٹر سید قدرت اللہ صاحب دونوں کانفرنس کے بعد رات میں ان کے گھر پہونچے دیکھا تو ان کے پاس ۶۔ ۷ طالب علم موجود تھے اور تعمیر حیات کا پروف وغیرہ دیکھا جارہا تھا بلکہ غالباً ساتھ ہی ساتھ کئی قسم کے کام چل رہے تھے۔ کھلی چھت پر کرسیوں پر نشست تھی ذکر نکلا ندوہ کی طالب علمی کا۔ میں نے ایک واقعہ ان سے بیان کیا کہ میری عادت تھی کہ صبح فجر کی نماز سے قبل ٹہلنے جاتا تھا گومتی کے کنارے۔ اس زمانہ میں ندوہ کے سامنے سد سیلاب نہ تھی بلکہ بڑا دلکش منظر تھا۔ راستہ میں مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی کی رہائش گاہ تھی جو درسگاہ کی عمارت کی دوسری منزل پر رہتے تھے ایک دن ان کی عقابی نگاہ نے مجھے دیکھ لیا اوپر سے ڈکارے تو کون ہے اس وقت کہاں جارہا ہے۔ میں بھیگی بلّی بن گیا آواز نکلنی مشکل ہوگئی۔ بہرحال میں نے کہا کہ میں ٹہلنے گیا تھا اور قبل اس کے کہ وہ کچھ کہیں میں آگے بڑھ گیا۔ اور بھی کئی واقعات میں نے بیان کئے بڑی لطف کی صحبت رہی۔ دوسرے دن تو انہوں نے نہایت اہتمام سے میرے ساتھ وقت صرف کیا تین گھنٹے ساتھ رہے رات کو دس بجے کے قریب مجھے لے کر شبلی ہوسٹل گئے اور بولے کہ آپ کس کمرہ میں تھے میں نے ۱۳ نمبر بتایا وہاں جاکر ان طلبہ سے جو اس میں تھے میرا تعارف کرایا۔ بولے کہ آپ کل ٹھہریں تو طلبہ کے جلسہ میں تقریر کرائی جائے میں نے معذرت کی کہ مجھے فوراً نکلنا ہے کہ میری بہن کی شادی ہے اور میں رک نہیں سکتا۔

تیسری ملاقات اتفاق دیکھئے کہ خود کالی کٹ میں ہوئی۔ وہاں وہ مدراس سے آئے تھے۔ اس دورہ کے سلسلہ میں جو تحریک پیام انسانیت کے سلسلہ میں وہ کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ وہ کالی کٹ پہونچ رہے ہیں، میں اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب یونیورسٹی سے کالی کٹ اس جلسہ میں شرکت کے لئے گئے جو بھٹکل برادری کے جماعت خانہ میں منعقد کیا گیا تھا۔ میں ذرا دیر سے پہونچا وہ تقریر کر رہے تھے فوراً تقریر روک دی اور بڑے تپاک سے ملے۔ فرمایا کہ تعجب ہے کہ آجتک آپ اس جماعت خانہ میں نہ آئے اور محض میری وجہ سے یہاں پہلی بار آپ کو آنا پڑا۔ میں نے عرض کیا کہ اتفاقات ہیں زمانہ کے۔

میں نے پہلی بار ان کی تقریر سنی۔ بڑی عمدہ تقریر تھی جس نے دلوں کو جیت لیا تھا اور جو تحریک پیام انسانیت کی ترجمانی کرتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کیسے لوگوں کو

کام کے لئے تیار کیا ہے۔ میں نے دوران گفتگو کہا کہ مگر حضرت مولانا کا کوئی جانشین نظر نہیں آتا۔ اس پر مولانا جلیس صاحب بولے کہ حضرت مولانا نے ایک ٹیم تیار کردی ہے وہی ان کی ترجمانی کرے گی۔

آر۔ ایس۔ ایس کے بارے میں انہوں نے اختصاصی مطلع کیا تھا فرمایا کہ میں نے ہندی اور مرہٹی میں ۱۰۰ کتابیں پڑھی ہیں اور ان کی اکثر کتابیں مرہٹی میں ہیں۔ انہوں نے بیان کیا کہ اگر آپ ان کتابوں کو پڑھیں تو آپ یقین کرلیں گے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہے۔ پھر بولے کہ مگر یہی چیز ہمارے لئے کام کرنے کا موقع عطا کرتی ہے یہ میدان ہے کام کا۔ انہوں نے بتایا کہ تحریک پیام انسانیت دراصل مولانا علی میاں کا ایک عظیم الشان کام ہے جو برادران وطن میں محبت اور اخوت کا جذبہ ابھارتا ہے اور اس نفرت کا تریاق بن جاتا ہے جو آر۔ ایس۔ ایس ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں بو رہی ہے۔ اگر یہ تحریک پیام انسانیت پھیلائی جائے تو ملک میں اس کے اثرات بڑے خوش گوار ہوں گے۔ خود مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہ العالی نے بھی ان کی تقریر کی تعریف کی۔ ہم لوگ شام تک ساتھ رہے اسماعیل صاحب کے یہاں کولبو ہاؤس میں کھانا بھی کھایا۔ دوسرے دن وہ ہمارے یہاں تشریف لائے کالی کٹ یونیورسٹی میں۔ ان کی تقریر ہوئی۔ موضوع وہی پیام انسانیت تھا غیر مسلم طلبہ کی اکثریت تھی۔

تقریر انہوں نے عمدہ ہندی میں کی۔ ہندی کا پورا شعبہ موجود تھا۔ مجھے تقریر کے بعد ہی مدراس جانا تھا لہذا ان سے اجازت لے کر میں سفر پر روانہ ہوگیا ورنہ لطف صحبت اور کچھ دیر باقی رہتا۔

جلیس صاحب نے دیوراس بالا صاحب سے اپنی ملاقات کا حال مجھ سے تفصیل سے بیان کیا بولے کہ انہوں نے جلیس صاحب سے کہا کہ صاحب ہم کو قلق تو اس بات کا ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے ہماری لڑکیوں کو اپنے حرم میں زبردستی رکھا۔ اس کا معقول جواب جلیس صاحب نے دیا مگر میری سمجھ میں نہ آیا دل میں تھا کہ ایک خط لکھ کر اس کو پوچھوں مگر آہ اب کس سے دریافت کروں۔

وہ ندوہ کی تاریخ لکھ رہے تھے جس کے کئی جزؤ ندوۃ العلماء منزل بہ منزل،، کے عنوان سے تعمیر حیات میں چھپتے رہے ہیں۔ خدا کرے یہ کتاب مکمل ہوگئی ہو اور اس طرح وہ ان کی ایک دل کش یادگار بن سکے ؂

آدمی بلبلا ہے پانی کا　　کیا بھروسہ ہے زندگانی کا

زندگی بے یقینی کا نام ہے مگر ان لوگوں کے بارے میں زیادہ افسوس ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں عطا کیں اور ان کو انہوں نے صحیح انداز سے استعمال کیا علم وادب اور اسلام کی خدمت کی راہ اختیار کی زندگی کے میدان میں ایک نصب العین بنایا مگر قبل اس کے کہ ان کی آرزوئیں پوری ہوں اور ان کا کام تکمیل کو پہونچے وہ اچانک ہم سے جدا ہو گئے۔ عمر طبعی ملنے کے بعد اتنا زیادہ آدمی کو قلق ہوتا ہے اور نہ اس کے متعلقین کو۔ یہاں تو یہ معاملہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جن کی زندگیاں معلق ہیں، ادھورے علمی کام ہیں جو منتظر فردا تھے مگر افسوس کہ قزاق اجل نے ندویانہ برادری سے ایک جوہر قابل اور چھین لیا۔

میں نے کالی کٹ میں ان کی تقریر پیام انسانیت کے سلسلہ میں سنی تو معًا دل میں خیال گذرا کہ کہیں اس پھول کو نظر نہ لگ جائے اس لئے کہ ان کو اس دن شدید درد تھا اور انہوں نے یہاں ایکسرے بھی لیا تھا۔

مجھے احساس ہوتا ہے کہ مولانا محمد الحسنی کی موت نے عربی ادب کے میدان میں ہم سے ایک ایسا ادیب چھین لیا جو ایک دلکش اسلوب کا مالک تھا جس کی نظیر ہندوستان کے عربی لکھنے والوں میں کم تر ملے گی جس سے ندوہ کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہونچا اور دوسرا نقصان ندوہ کو مولانا اسحاق جلیس ندوی کی وفات سے پہونچا جنھوں نے اردو کی اسلامی صحافت میں دھوم مچادی تھی اور ندوہ کے پیام کو عام کر دیا تھا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ تعمیر حیات نے ان کے دور ادارت میں ہندوستان گیر اہمیت حاصل کر لی تھی اور اس کے مضامین بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی قبر پر رحمت کے پھول برسائے اور اہل ندوہ کو صبر وسکون کی دولت عطا کرے۔ آمین

مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم

کچھ یادیں کچھ باتیں

شمس الحق ندوی

دن و تاریخ تو یاد نہیں کہ اسحاق صاحبؒ سے کب اور کیسے ملاقات ہوئی بس اتنا یاد ہے کہ میں درجۂ سوم میں تھا اور وہ درجۂ پنجم میں داخل ہوئے۔ گو درسیات کے اندر مجھ میں اور اسحاق صاحبؒ میں دو ہی سال کا فرق تھا مگر وہ چونکہ عمر میں مجھ سے پانچ سال بڑے تھے اور کالج کی راہ سے ندوہ آئے تھے اور کالج کی زندگی میں کمیونسٹ خیالات رکھتے تھے لہٰذا ہندوستان کی تحریکات ترقی پسند ادب اور جدید ادب کا مطالعہ اچھا خاصا تھا۔ مرحوم اس دور کو اپنے دورِ جاہلیت سے تعبیر کرتے تھے اس دورِ جاہلیت سے نکلنے کا بھی لطیفہ سناتے تھے، سنایا کہ ایک مرتبہ حاجی یوسف صاحب بمبئی کی امارت میں احمد نگر میں تبلیغی جماعت آئی، گشت میں مجھ سے اور میرے کچھ نوجوان ساتھیوں سے مڈبھیڑ ہوئی جماعت والوں نے مسجد آنے کی دعوت دی میں اور میرے کچھ اور ساتھی محض تفریحاً کہ دیکھیں یہ لوگ کیا کرتے ہیں چلے گئے۔ گئے تو تھے تفریحاً مگر تبلیغ والوں نے مجھے شکار کر لیا اور میرے خیالات میں انقلاب آگیا اس انقلاب ہی نے مجھے ندوہ پہنچایا۔ ندوہ پہنچتے ہی ان کے مطالعہ کا رُخ بدلا اور اسمیں مزید وسعت و مقصدیت پیدا ہو گئی تھی۔ ہم میں اس وقت تک خارجی مطالعہ کا زیادہ شعور نہ تھا۔ میں رواق شبلی کے کمرہ نمبر ۱۴ میں رہتا تھا اور اسحاق صاحبؒ اسی سے متصل کمرہ نمبر پندرہ میں[1] اور پندرہ نمبر ہی میں اسمٰعیل صاحب مدراسی بھی رہتے تھے۔ نگراں اسوقت مولانا اسحٰق صاحب سندیلوی ندوی تھے، اس زمانے میں میری صحت بہت خراب رہتی تھی اس لئے کسی طرح درسیات ہی پر وقت صرف ہوتا تھا طبیعت کچھ ایسی بجھی بجھی سی رہتی تھی کہ زیادہ ملنے ملانے اور انجمن آرائی میں طبیعت نہیں چلتی تھی، چونکہ غسل خانہ کی طرف جانا ہو تو اسحاق صاحبؒ کے کمرے کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا اس لئے اس کمرے کے ماحول پر نظر پڑ جاتی، کبھی تو کمرے پر خاموشی کی فضا طاری

---

[1] افسوس چھ ماہ قبل الجزائر میں ان کا بھی انتقال ہو گیا

ہوتی اور اسحٰق صاحبؒ اور مدراسی صاحبؒ مطالعہ میں منہمک ہوتے اور کبھی کمرہ آوازوں سے گونج رہا ہوتا اور اسحٰق صاحبؒ و مدراسی صاحبؒ میں بحث جاری ہوتی اور کبھی یہ منظر ہوتا کہ مولانا اسحٰق صاحب سندیلوی مدظلہ العالی تشریف فرما ہوتے فضا کچھ پُر سکون ہوتی اور مولانا حَکَم کا فریضہ انجام دے رہے ہوتے اور کبھی اپنے کلمات عالیہ سے نواز رہے ہوتے۔ چونکہ مولانا عالم باعمل متقی و پرہیزگار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت اچھے مربی و پرجوش داعی بھی تھے اس لئے باصلاحیت طلبہ کے ساتھ بے تکلف بیٹھ جاتے اور نہایت حکمت عملی کیساتھ اپنے طلبہ کا ذہن بناتے۔ مولانا کی شخصیت محبوب و پرکشش بھی تھی اور بارعب و پروقار بھی۔ اس کی ظاہری وجہ غالباً یہ تھی کہ مولانا اپنے معمولات کے بہت پابند تھے اور طلبہ کے سامنے ایک عملی نمونہ آتا تھا۔ مولانا جب تک دارالعلوم میں رہے خود ہی امامت فرماتے تھے اور بڑے پیارے انداز میں قرأت فرماتے۔ فجر کے وقت میں اذان بعد متصلاً اٹھتا تو بلاناغہ مولانا کی تلاوت کلام پاک کی دھیمی دھیمی لے سنائی دیتی۔ اسی کے ساتھ ساتھ مولانا طلبہ کے ساتھ بہت شفیق و مہربان بھی تھے۔ چونکہ خود حکیم تھے لہٰذا طلبہ کا نہ صرف علاج بلکہ تیمارداری بھی خود ہی فرماتے یہ اس کے بیان و تفصیل کا وقت نہیں ورنہ اسمیں بھی ایک لذت سی محسوس ہورہی ہے اور یاد ماضی کے کچھ سنہرے ورق پلٹنے لگے ہیں خود میں جیساکہ اوپر ذکر کر چکا ہوں اکثر بیمار رہتا تھا مولانا جس شفقت پدرانہ کے ساتھ علاج و تیمارداری فرماتے تھے اس کا نقش دل پر ایسا قائم ہے کہ زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتا۔

اتنا عرض کر دینا میں نے اس لئے ضروری سمجھا کہ آپ کے سامنے چوبیس گھنٹے کا وہ ماحول ہو جس میں شخصیت پروان چڑھتی ہے۔ اس کا ذکر کہ اسحٰق جلیس صاحبؒ کو حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ ان کی تحریر و تقریر اور ان کے فکر سے اول روز سے کتنا عشق تھا طوالت کا سبب بن جائے گا۔ ان دو بزرگوں کے ساتھ ساتھ تیسری شخصیت استاذ محترم مولانا محمد رابع صاحب کی ہے جن سے اسحٰق جلیس صاحبؒ کو بہت تعلق تھا اور درسیات کے علاوہ مولانا کے مشوروں سے بہت فائدہ اٹھاتے تھے۔ اگر میں یہ عرض کروں کہ اسحٰق صاحبؒ کی شخصیت کی تعمیر ان تین بزرگوں کے سایۂ عاطفت میں ہوئی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ باوجودیکہ میں اسحٰق صاحبؒ کے کمرے سے متصل کمرے میں رہتا تھا مگر ایک دوسرے سے ملنا جلنا اور بے تکلفی نہیں تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں دارالعلوم کی یہ روایت تھی کہ نیچے درجات کے طلبہ اوپر کے طلبہ سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کا ایسا ادب و احترام ہوتا تھا کہ نیچے درجہ کا طالب علم بڑے درجات کے طلبہ کے سامنے مؤدب ہوتا تھا اور

کوئی بھی غیر سنجیدہ حرکت کرنے سے ڈرتا تھا لہٰذا ہمارے اور اسحٰق صاحبؒ کے درمیان یہ روایت بھی حائل رہی۔

خدا کا کرنا کہ دارالعلوم میں طلبہ کی تعداد بڑھنی شروع ہوگئی اور ایسی بڑھی کہ دارالاقامہ میں جگہ نہ رہ گئی اسی زمانے سے استاذ محترم مولانا معین اللہ صاحب ندوی (حال نائب ناظم ندوۃ العلماء) ناظر شعبۂ تعمیر و ترقی مقرر ہوئے۔ اور مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے، ناظر بننے کے بعد مولانا نے سب سے پہلے رواقِ شبلی غربی پر رواقِ رحمانی غربی تعمیر کرائی جب رواق رحمانی کا یہ بازو تعمیر ہوگیا تو سنجیدہ اور اونچے درجات کے طلبہ کو وہاں بھیجا گیا تاکہ نگرانی نسبتاً آسان ہو۔ اتفاق دیکھئے کہ ہم اور اسحٰق جلیس صاحبؒ ایک ہی کمرے میں گئے میں اسوقت درجہ ششم میں تھا اور اسحاق صاحبؒ ہشتم میں۔ یہاں سے ہم دونوں کی دوستی اور بے تکلفی کا آغاز ہوتا ہے۔ کمرے کے دیگر ساتھیوں میں الطاف صاحب ندوی جو اسوقت علی گڑھ مولوی مظفر صاحب ندوی کانپوری اور ایک اور دوست مختار احمد صاحب گھاٹم پوری تھے

اسحٰق صاحبؒ ذہین، ظریف اور زندہ دل تھے وہ اپنی ذہانت سے فائدہ اٹھاتے میں گو ان سے چھوٹا تھا لیکن میری کم گوئی و یک رنگی کی وجہ سے وہ میرا احترام کرتے تھے اور نہ جانے اسحٰق صاحبؒ کیوں میری تمامتر بے مائگی و بے بضاعتی کے باوجود میرے ساتھ محبت و اکرام کا معاملہ کرتے تھے، مگر بہرحال ہم دونوں ساتھ رہتے تھے وہ ہم سے عمر و صلاحیت اور تعلیم دونوں میں بڑے تھے لہٰذا برادر خورد ہونے کی بلا مجھ پر . . مسلط تھی اور ان کی ذہانت کا بھی کمال دیکھئے کہ مجھے کسی کام کا حکم نہ دیتے بلکہ کام لینے کا لطیف انداز اختیار کرتے مثلاً پانی کی ضرورت ہوتی تو کہتے شمس اسحٰق صاحب دیکھئے لوٹے میں پانی ہے کیا؟ میں دیکھتا تو لوٹا خالی ہوتا اور چپکے سے پانی لینے چلا جاتا۔ جب پانی لے کر آتا تو خاص انداز میں فرماتے ارے آپ نے یہ زحمت فرمائی معاف کیجئے گا۔ سردیوں کے دن ہوتے دروازہ کھلا رہ جاتا تو بڑی ٹھنڈی ہوا آتی ان کی چارپائی سامنے پڑتی تھی ہوا کمرے میں داخل ہو کر براہ راست اسحٰق صاحبؒ کا استقبال کرتی، فرماتے شمس اسحٰق صاحب درِ توبہ کھلا ہے کیا؟[1] میں فوراً اٹھ کر دروازہ بند کر دیتا۔

اسحٰق صاحبؒ کا غیر درسی مطالعہ جتنا وسیع تھا میرا اس وقت تک خاص اسباب کی بناء پر اتنا ہی کم، لہٰذا اسحٰق صاحبؒ اپنے خاص انداز میں جو بڑا کامیاب اور پیارا انداز تھا مجھے غیر درسی

---

[1] درِ توبہ یہاں استعارہ ہے۔ جب شدت ٹھنڈک سے اوے توبہ کے الفاظ زبان سے نکلتے ہیں۔

گذرے تھے پورا ایک گروپ زندہ دلوں کا تھا سب جماعت میں جاتے[1] "الاصلاح" کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے، انعامی مقابلہ اس اہتمام کے ساتھ ہوتا کہ مقابلہ کے دن اعیان بلد کو دعوت دیجاتی بڑی گرما گرم تقریریں ہوتیں "الاصلاح" سے مطالعہ واستفادہ کا بڑا اچھا ماحول تھا عصر کی نماز کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کی مہمان خانہ میں مجلس ہوتی تو اکثر اسحٰق صاحبؒ اور کبھی ہم لوگوں میں سے کوئی سوال کرتا اس پر حضرت مولانا کچھ بولتے اور تمام طلبہ کو فائدہ ہوتا ہم لوگوں نے ایک سازش کر رکھی تھی کہ حضرت مولانا سے سوال کیا جائے ورنہ یا مجلس میں سکوت ہوتا ہے یا پھر لوگ ادھر ادھر کی باتوں میں حضرت کا اور ہم سب کا وقت ضائع کرتے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم میں سے کسی نے سوال کیا اور ایک سوال کے جواب میں مغرب کی اذان ہوگئی، ان سوالات سے بڑا فائدہ ہوتا تھا۔

اسحٰق صاحبؒ کھیلوں میں صرف والی بال کھیلتے تھے مگر سوجھتی اسمیں بھی تھی نئی نئی، ایک مرتبہ جب وہ فضیلت دوم میں تھے ندوی اور غیر ندوی کے ٹورنامنٹ کی اسکیم بنائی جسمیں ہاکی، فٹ بال، والی بال، بیڈ منٹن کئی کھیل تھے، دو ہفتہ بڑی چہل پہل رہی طلبہ بھی ایسے سنجیدہ تھے کہ ہار جیت پر کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا تھا، اسحٰق صاحبؒ کی ندوی برادری ہار گئی اور ہم لوگ غیر ندوی جیت گئے مگر کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔

اسحٰق صاحبؒ نے فضیلت دوم پاس کیا تو مجلس تحقیقات ونشریات سے باقاعدہ متعلق ہوگئے، حضرت مولانا علی میاں صاحب سے ان کو مناسبت اور ان کی تصنیفات سے دلچسپی اسی وقت سے تھی جب وہ ندوہ میں داخل ہوئے تھے، غالباً فراغت کے بعد ہی بیعت وارشاد کا بھی تعلق ہوگیا وہ مجلس میں ڈیڑھ سال رہے پھر اپنے خاص حالات کی بنا پر اپنے وطن احمد نگر چلے گئے اور اس وقفہ میں حضرت مولانا سے خط وکتابت بڑے وقفہ وقفہ میں ہونے لگی، اسحٰق صاحبؒ کے بعض نجی حالات ایسے تھے کہ وہ بڑی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے (وہ ہم سے چونکہ بے تکلف بھی تھے اعتماد بھی تھا اس لئے بہت پرائیویٹ باتیں بھی ذکر کرتے اور مشورہ کرتے) دو سال سے زائد مدت گزر جانے کے بعد ایک دن وہ بہت خستہ حال مرکز پہنچے اس وقت ان کے حلیہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت ایسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں کہ دماغ

---

[1] ہر جمعرات کو طلبہ کی جماعت نکلتی تھی یہ سلسلہ الحمدللہ اب بھی جاری ہے۔

مطالعہ کا شوق دلاتے، ہوتا یہ کہ اسحٰق صاحبؒ کو جس کتاب کا مطالعہ کرانا مقصود ہوتا اُس کی اور اس کے مصنّف کی خوب تعریف کرتے پھر اس کا کوئی جاندار صفحہ یا پیراگراف پڑھ کر سُناتے، اس سے از خود اس کتاب کے پڑھنے کا شوق پیدا ہو جاتا، اس طرح کی سیکڑوں مجلسوں میں سے ایک مجلس خوب یاد ہے کہ دسمبر کی لمبی راتیں تھیں ہم اسحٰق صاحبؒ اور مولوی مظفر صاحب تینوں اپنے اپنے لحاف میں پڑے بیٹھے تھے عشاء کی نماز ادا کی جا چکی تھی، اسحٰق صاحبؒ نے اپنے خاص انداز میں گفتگو شروع کی شعر و شاعری، ادب و اسلوب شخصیات غرض یہ کہ مختلف موضوع پر باتیں ہوتی رہیں، بات میں بات نکال کر اسحٰق صاحبؒ آتش شوق بھڑکاتے رہے خوب یاد ہے اور جیسے اس نورانی رات کی تصویر اس وقت بھی میری نگاہوں کے سامنے سے گذر رہی ہے، اسی رات اسحٰق صاحبؒ نے حضرت مولانا علی میاں صاحب کے مضمون۔ دوست کی یاد میں۔ کا تذکرہ کیا جو مولانا مدظلہ نے مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم پر لکھا تھا اور چراغ راہ کراچی میں شائع ہوا تھا، پروفیسر رشید احمد صدیقی کی گنجہائے گراں مایہ اور آشفتہ بیانی میری کا ذکر اب بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ غالباً دوسرے ہی دن میں نے چراغ راہ الاصلاح سے نکال کر دوست کی یاد میں، پڑھا اور بعد میں دوسری کتابیں بھی، میرے غیر درسی مطالعہ کی مفید داستان یہیں سے شروع ہوتی ہے اس ایک رات کی مجلس نے ایسی بہت سی راتوں کی انجمن تنہائی میں سجانے کی توفیق دی اس ناحیہ سے میں اسحٰق صاحبؒ کو اپنا محسن نہ جانوں تو ناشکری و خود پنداری کی بات ہوگی، یہ ۵۹ء کا زمانہ تھا، اسی سال مجلس تحقیقات و نشریات کی داغ بیل پڑی تھی، اور اسحٰق صاحبؒ زمانۂ طالب علمی ہی سے اس کے دفتری اور خط و کتابت کے امور کے ذمہ دار جزئی طور پر بنائے گئے تھے اس لئے کہ اس وقت تک کام پھیلا نہیں تھا۔ لہٰذا اب ہم لوگوں کی انجمن آرائی میں مجلس بھی شریک ہو گئی تھی، اسحٰق صاحبؒ مجلس کا ذکر کرتے اور وہاں جانے اور پڑھنے کا شوق دلاتے وہ یہ بھی کہتے کہ شخصیات سے ملنا چاہئے خط و کتابت بھی کرنی چاہئے اس سے جرأت پیدا ہوتی ہے پھر ان کو مجلس کے کام سے جو فائدہ پہنچ رہا تھا اس کا ذکر کرتے، مجلس کے موضوع پر ان کی گفتگو زیادہ تر مجھ سے اور میرے مخلص دوست نذر الحفیظ صاحب ندوی سے ہوتی، کچھ دنوں بعد انہوں نے نذر الحفیظ صاحب کو اپنا شریک کار بھی بنا لیا تھا، شریک کار ہونے کے بعد اگر تحمّل کی غیر معمولی صلاحیت نہ ہو تو اکثر بدمزگی ہو جاتی ہے چنانچہ یہ مرحلہ ان میں بھی کبھی کبھی پیش آتا تھا۔ مگر دونوں ایک دوسرے کا شکوہ کسی غیر سے کبھی نہ کرتے، اور اپنے اپنے کام میں لگے رہتے۔

اسحٰق صاحبؒ شعراء کا کلام بھی خوب پڑھتے تھے، اور کبھی کبھی الاصلاح میں نغمہ سرائی بھی فرماتے وہ الاصلاح

میں اکثر جگر کی غزل

یہ مصرع کاش نقش ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے

وہی میخوار ہے جو اس طرح میخوار ہو جائے
کہ شیشہ توڑ دے اور بے پئے سرشار ہو جائے

ایک ایسی شان پیدا کر کہ باطل تھرتھرا اٹھے
نظر تلوار بن جائے نفس جھنکار بن جائے

پڑھتے۔ اور کبھی اقبال کے یہ اشعار پڑھتے

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

اپنے اسی ذوق کی بنا پر ایک مرتبہ جب جگر مرادآبادی لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور اسحٰق صاحب طلبہ کی انجمن "الاصلاح" کے ناظم تھے، مہتمم صاحب[1] سے اجازت لے کر ان کو بلا لائے۔ جگر صاحب شیخ التفسیر مولانا محمد اویس صاحب ندوی مرحوم کے بہت معتقد تھے، دارالعلوم سے ان کو گہرا لگاؤ اور تعلق تھا انھوں نے دعوت قبول فرمالی اور دارالعلوم کے مہمان خانہ میں اوپر کے درجات کے مخصوص طلبہ خود مہتمم صاحب، مولانا اویس صاحبؒ اور سید صدیق حسن صاحب آئی سی ایس اور ان کے بعض رفقا، کی موجودگی میں جگر صاحب تشریف لائے اور نہ صرف یہ، کہ اپنی غزلیں سنائیں بلکہ دارالعلوم کو ایک رقم بھی بطور عطیہ پیش کیا، جگر صاحب نے جو غزلیں پڑھیں ان میں سے ایک مجھے برابر یاد رہی میں نے اسے لکھ بھی لیا تھا۔ اس غزل کا پہلا

---

[1] اس وقت قائم مقام مہتمم مولانا ابوالعرفان صاحب مدظلہٗ تھے۔

شعر تھا

صد آرزوئے خوشگوار سرگراں لئے ہوئے
پھرا کرے گی زندگی کہاں کہاں لئے ہوئے

اس وقت کون کہہ سکتا تھا اور کس کو خبر تھی کہ ایک دن یہی شعر اسحٰق صاحبؒ کی داستان زندگی بن جائے گا عمر کے آخری تین سالوں میں اسحٰق صاحبؒ حضرت مولانا علی میاں صاحب کی تحریک پیام انسانیت کا کام جس آن بان کے ساتھ کر رہے تھے اور ملک کے طول و عرض میں شہر شہر اخلاص جس شوق و وارفتگی کے ساتھ چھان رہے تھے اور جگہ جگہ ہندو مسلم مخلوط اجتماعات کی انجمنیں سجا رہے تھے اور میدان تیار کر کے اپنے مرشد کو آمادۂ سفر کر رہے تھے اور جس درد و لگن کے ساتھ اس کام کو اوڑھ لیا یہ انھیں کا حق تھا اور ان کی لگن و تڑپ کی تصویر شاید جگر کے ان دو شعروں سے بڑھ کر کسی اور طرح نہیں کھینچی جا سکتی۔ شعر پھر پڑھ لیجئے اور تصور میں لکھنؤ، الہ آباد، پرتاب گڈھ، مرادآباد، پنجاب، ہریانہ، اندور، بھوپال، مدراس، میسور، بنگلور، ناگپور وغیرہ کے سفروں اور شاندار جلسوں کو لاتے رہئے ؎

صد آرزوئے خوشگوار سرگراں لئے ہوئے
پھرا کرے گی زندگی کہاں کہاں لئے ہوئے

اسحٰق صاحبؒ کو لطیفے بھی سوجھتے تھے ایک دن ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اسحٰق صاحبؒ اپنی مشکلات و حالات بیان کرنے لگے۔ صورت یہ تھی کہ اسحٰق صاحبؒ تو ہم لوگوں کے مسلک پر تھے اور والد صاحب اور گرد و پیش کا پورا ماحول احمد رضا خاں صاحب کے مسلک کا، یہ اسحاق صاحبؒ کے لئے بڑا مسئلہ تھا والد صاحب کے حقوق اور عقیدہ کا اختلاف جب کہ والد صاحب متشدد بھی تھے بڑا مسئلہ تھا۔

کہنے لگے قریب کی ایک بڑی بی نے ایکدن مجھے فاتحہ دینے کیلئے کہا، مگر تا کیا نہ کرتا میں فاتحہ دینے کے لئے کھڑا ہوا اور چند الفاظ زبان سے کہہ کر منہ پر ہاتھ پھیر دیا، بڑی بی بول اٹھیں، بھیا اتنی جلدی! میں نے کہا اماں بتاؤ خط پہلے پہنچتا ہے کہ ٹیلیگرام۔ بڑی بی بولیں نہیں بھیا ٹیلیگرام۔ پھر میں نے پوچھا کہ خط میں زیادہ عبارت ہوتی ہے کہ ٹیلیگرام میں، بولیں خط میں۔ میں نے کہا بڑی اماں میں نے یہ فاتحہ ٹیلیگرام والا کیا ہے تا کہ جلد پہنچے۔ بڑی بی خوش ہو گئیں بولیں بہت اچھا بھیا۔ یہ اسحٰق صاحبؒ کی ذہانت کی بات تھی کہ بر وقت سوجھی اور ماشاء اللہ ان کو اسی طرح بر وقت سوجھتی تھی ہم لوگوں کی زندگی کے وہ دن بڑے اچھے

متاثر ہے، شیخ پھر بھی شیخ ہوتا ہے اپنے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ اولاد کا سا معاملہ کرتا ہے، حضرت مولانا نے بڑی تسکین دی، ہم سب لوگوں نے اسحاق صاحبؒ کا استقبال کیا وہ یہاں کچھ دن رہے اور ذہن میں اعتدال پیدا ہوگیا مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد سال بھر یا اس سے زائد گزرا ہوگا کہ پھر وہ اپنے خاص حالات کی بنا پر احمد نگر چلے گئے وہاں اور پونا میں بڑی اچھی فضا بنائی حضرت مولانا کا ادھر کا سفر ہوا تو اسحٰق صاحبؒ نے خواص کا بڑا اچھا پروگرام بنایا اس سے حضرت مولانا کو محسوس ہوا کہ اسحٰق صاحب نے اچھا خاصہ میدان بنالیا ہے اور ان میں قوت کار اور صلاحیت بہت اچھی ہے اس اثناء میں وہ لائبریری سائنس بھی کرچکے تھے لہٰذا حضرت مولانا نے ان کو لکھنؤ آنے کو کہا، وہ آئے مگر چھٹی لے کر تھوڑے دنوں کے لئے آتے چلے جاتے، کوئی مستقل فیصلہ نہ کر پاتے، حضرت مولانا کا منشا بھی سامنے ہوتا اور اپنی الجھنیں بھی آخری بار جب آئے تو کچھ ہی دنوں بعد حضرت مولانا کا حجاز مقدس کا سفر درپیش تھا۔ حضرت کا منشا تھا کہ اسحٰق صاحب یہیں رہیں مگر اسحاق صاحب جیسے اب بھی تم خیرا کا شکار تھے، حضرت مولانا جس دن سفر پر روانہ ہورہے تھے ٹرین چھوٹتے چھوٹتے فرمایا اسحٰق صاحب اب یہیں رہنے کا فیصلہ کرلیجئے۔ اسحٰق صاحبؒ نے ہاں تو کہا مگر پریشان — وہ ہم سے ہر اعتبار سے بڑے تھے، مگر نہ جانے کیوں ہم سے محبت بھی کرتے تھے اور اعتماد بھی ہم دونوں مغرب بعد جاکے ایک ہوٹل میں بیٹھے انہوں نے اپنی الجھن بیان کرنی شروع کی اب ان کا یہ حال تھا کہ میں جو کچھ کہتا وہ اس طرح سنتے اور ہاں ہاں کہتے جیسے کوئی بڑا ان کو نصیحت کررہا ہو میں نے عرض کیا کہ آپ یکسو ہوکر اپنے کو حضرت مولانا کے حوالہ کردیجئے سب الجھنیں دور ہوجائیں گی اتنے میں وہ بولے ہاں بھائی اب کی تو چلتے چلتے حضرت نے فرمایا کہ تم یہیں رہو۔ میں نے یہی بات پکڑلی اور کہا اسحٰق صاحب اس کے بعد آپ کا اب یہاں سے چلا جانا کسی طرح سے درست نہیں اب تو آپ رہ جائیے۔ پھر مولانا محمد الحسنیؒ سے بات ہوئی مولانا مرحوم نے بھی یہی بات کہی کہ اسحٰق صاحب چچا جان کے فرما دینے کے بعد آپ کا جانا کسی طرح صحیح نہیں اب تو آپ ندوہ ہی میں رہنے کا فیصلہ کرلیجئے! غرض یہ کہ اسحٰق صاحبؒ نے ندوہ میں رہنے کا فیصلہ کرلیا اور دن بہ دن ان کی غیر مستقل مزاجی، مستقل مزاجی میں تبدیل ہوتی گئی اور انہوں نے اپنے آپ کو کلیۃً اپنے مرشد کے حوالہ کردیا اور ایسا کیا کہ پھر مر کر بھی نہ دور ہوئے اور وصیت کردی کہ مجھے میرے حضرت کے وطن ہی میں دفن کیا جائے۔ جگر کے الفاظ میں

جان دے ہی دی جگرؔ نے آج پائے یار پر   عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

اس خود سپردگی کے بعد اسحاق صاحبؒ نے کتنی ترقی کی، کتنے مفید کام انجام دیئے اور کس تیزی سے ترقی کر رہے تھے اگر زندگی وفا کرتی تو چند برسوں میں وہ ہندوستان کی کتنی عظیم شخصیت بن جاتے ان سب باتوں کی تفصیل آپ اس نمبر کے دوسرے مضامین میں پڑھیں گے اس لئے ان کا ذکر نہیں کرتا۔ اب میں اسحٰق صاحبؒ کی چند خصوصیات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں

اسحٰق صاحبؒ میں جرأت و بے باکی ایسی تھی کہ شاید و باید وہ اپنے اساتذہ، اکابر علماء و مشائخ کو چھوڑ کر باقی کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے کیسی ہی مجلس ہو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی، انجنیروں کی، ڈاکٹروں یا وکیلوں اور وزیروں کی اسحٰق صاحبؒ کہیں جھینپتے اور دبتے نہیں تھے، بات بڑی اونچائی سے کرتے تھے، جو شخص ان سے اچھی طرح واقف نہ ہو وہ تو اس کو استکبار و تعلی پر محمول کرے اور جو واقف ہو جسارت رندانہ اور خود شناسی سے تعبیر کرے دوست ہنسے اور دشمن کو جلن ہو۔

زبانیں وہ کئی جانتے تھے جس کا ذکر آپ کسی مضمون میں تفصیل سے پڑھیں گے یہ سب چیزیں مل کر ان کی جرأت کو بڑھاتی تھیں اسحٰق صاحبؒ چونکہ لگن اور دھن کے ساتھ کام کرنے کے عادی تھے اس لئے کاہلی سے ان کو بڑی نفرت تھی میں ان کو بیکار بہت کم دیکھا تھا کچھ نہ کچھ کرتے ضرور رہتے تھے، سفر میں ٹرین پہ ہوں کہ بس پر اپنے آزو بازو کے لوگوں سے تعارف ضرور حاصل کرتے پھر اپنے خاص انداز میں ان کو متأثر کرتے مسلم ہو کہ غیر مسلم ہر ایک کو حُسنِ کردار اور پیام انسانیت کا سبق پڑھاتے اور اس کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ان کا یہ کام ہر جگہ جاری رہتا۔

اسحاق صاحبؒ کا اور میرا ساتھ برسوں کا تھا اور میرے ایک طرح کے محسن بھی تھے اس کے باوجود معاصرت بڑا حجاب ہوتی ہے، میرے دل میں اسحاق صاحبؒ کی صلاحیتوں کی قدر تھی مگر کوئی غیر معمولی اثر نہ تھا لیکن ادھر دو سال سے وہ اس طرح سے آگے بڑھ رہے تھے اور دھیرے دھیرے دل میں سمائے جا رہے تھے کہ نہ کہئے اور یہ بات میں نے اس وقت محسوس کی جب انہوں نے خود کو اپنے مرشد کے حوالہ اس طرح کر دیا کہ

جہاں کر دیا گرم گرما گئے وہ
جہاں کر دیا نرم نرما گئے وہ

اسحٰق صاحبؒ پیام انسانیت کے دورے پر تھے اور میں پاکستان چلا گیا دو مہینہ وہاں رہنا ہوا، چار پانچ مہینہ کچھ ایسا اتفاق رہا کہ میں ندوہ میں ہوتا تو وہ دورہ پر ہوتے اور وہ ندوہ میں ہوتے تو میں

باہر ہوتا، ہم لوگوں کی پانچ چھ مہینے تک ملاقات نہ ہو سکی، چھ ماہ بعد جب اسحٰق صاحبؒ سے ملاقات ہوئی تو وہ دُبلے نظر آئے ایسے کہ مجھے فکر ہوئی اور میں نے خاص طور سے محمد میاںؒ سے کہا کہ ان کی صحت دیکھ کر تشویش ہوتی ہے، محمد میاںؒ سے مرحوم کو بڑا تعلّق تھا اپنا درد دل انھیں سے کہتے تھے محمد میاںؒ کے انتقال کا ان پر بڑا اثر تھا۔ فرمایا کاش! ان کی جگہ میں ہوتا۔ آخر ہوا وہی کہ ان کے پیچھے پیچھے خود بھی چلے اور یہ سچ کر دکھایا

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

کسے خبر تھی کہ کیا ہونے والا ہے محمد میاںؒ کی جدائی بجائے خود رنج و الم کا ایک پہاڑ تھی پھر اسحاق صاحبؒ نے بھی داغ مفارقت دیا تو دل کی ایسی کیفیت ہوئی کہ کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کسی دوست کی جدائی پر بھی ایسا غم ہوتا ہے تذکروں میں پڑھتا تھا تو مبالغہ معلوم ہوتا تھا مگر محمد میاںؒ اور اسحٰق صاحبؒ کی موت نے بہت سے شاعرانہ تخیلات کو حقیقت بنا دیا۔

اسحٰق صاحبؒ کا غم جدائی اور محمد میاںؒ کے ایک ہی مہینے کے بعد نہ پوچھئے کہ کیا گزری

یہ عالم ہے اب خشک آنکھوں کا اپنی
کہ طوفاں ہے برپا روانی نہیں ہے

ہردم رواں پیہم دواں
مولانا اسحاق جلیس ندوی

منصور نعمانی ندوی

افسوس کہ ۱۱ر جولائی ۱۹۷۹ء ۵ بجے شام کو ندوہ کے نقیب تعمیر حیات کے مدیر جلیل، پیام انسانیت کے سرگرم کارکن، ندوہ کے ایک نامور سپوت، سنجیدہ صحافت کے علمبردار مولانا محمد اسحٰق جلیس ندوی نے پیام اجل کو لبیک کہا۔

راقم الحروف ندوہ پہونچا تو مولانا اسحاق جلیس صاحب مرحوم درجات فضیلت کے منتہی طلبہ میں تھے اور انجمن الاصلاح "کے غالباً صدر بھی تھے، طلبہ پر ان کی تحریری و تقریری صلاحیت کی بڑی دھاک بیٹھی تھی میں بہت جونیر تھا لیکن بھوپال کی نسبت اور مشترک صفت" خاینت "، نے بہت جلد تکلفات کے پردے اٹھادیئے وہ تعلیم مکمل کر کے مجلس تحقیقات ونشریات ندوہ کے معاون سکریٹری ہوگئے، میرا ان سے برابر ربط وضبط رہا، وہ مفید مشوروں سے نوازتے رہتے اور علمی رہبری بھی کرتے اور لکھنے کی ترغیب بھی دیتے، تین چار سال مجلس سے وابستہ رہنے کے بعد چند وجوہ سے ان کو اپنے وطن احمد نگر جانا پڑا، میں بھی ندوہ سے فراغت پاکر بھوپال میں تھا کہ معلوم ہوا اسحاق صاحب پونہ میں ایک ہفتہ وار پرچہ "ملت ٹائمز" کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، اس خبر سے خوشی ہوئی، میں نے ایک خط ان کو مبارکباد کا لکھا تو انہوں نے جواب میں پابندی سے پرچہ میرے نام روانہ کرنا شروع کردیا، یہ پرچہ ان کی صحافت کا ابتدائی زینہ تھا لیکن بایں ہمہ پاکیزہ نگاری اور سنجیدہ صحافت کا مکمل آئینہ تھا، اس پرچہ میں وہ ملکی و ملی مسائل پر بہت جرأت وبیباکی سے اظہار خیال کرتے انہوں نے بہت جلد صحافی برادری کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، اخبارات ورسائل میں" ملت ٹائمز "، کے فکر انگیز مقالے بار پانے لگے، ایک نومولود پرچے کے لئے یہ چیز بڑے امتیاز کی ہوا کرتی ہے کہ اس کے ساتھ اخبارات اعتنا کریں ورنہ کتنے ہی پرچے ایسے نکلتے ہیں جو صحافی برادری کی سیرچشمی کی نذر ہوکر عدم کی راہ لیتے ہیں، مگر یہ اردو کی بدقسمتی تھی کہ اردو نوازوں کی سرد مہری کا یہ پرچہ بھی شکار ہوا اور ایک سال سے زیادہ اس کی عمر بھی نہ ہوسکی،

اس پرچہ کے بند ہونے کا زخم سہہ کر اسحاق صاحب نے اپنے لیئے تدریس کے میدان کا انتخاب کیا اور ان کا تقرر بحیثیت استاد پونہ کے ایک اسکول میں ہوگیا۔ تدریسی خدمات کے ساتھ یہاں ان کو لائبریری سائنس سے دلچسپی ہوئی اور اس کا ڈپلوما بھی حاصل کر لیا۔ مطالعہ و کتب بینی کا شوق ان کو ندوہ ہی سے تھا، یہاں انہوں نے خالی اوقات میں انگریزی کی طرف توجہ کی اور اس میں خاصا عبور بھی حاصل کر لیا،

مولانا علی میاں مجلس کے زمانہ کی ان کی انتھک محنت اور بے لوث خدمت سے بخوبی آگاہ تھے، ندوہ کے کتب خانہ کی تنظیم جدید کا پلان بنایا گیا تو مولانا کی نظر انتخاب اسحاق خاں صاحب پر پڑی۔ مولانا کے ایماء پر وہ پونہ سے عارضی طور پر ندوہ آگئے اور شب و روز کی محنت و جانکاہی سے کتب خانہ ندوہ کا نقشہ بدل دیا، اور کتب خانہ کو نئے طرز و اسٹائل پر لے آئے، ان کی محنتِ شاقہ سے مولانا متاثر ہوئے اور ان کے ادبی و علمی ذوق کو دیکھتے ہوئے "تعمیر حیات" کی زمام ان کے ہاتھ میں دے دی، اسحاق صاحب نے اس پرچہ کی ذمہ داری سنبھالتے ہی اس کے قالب میں نئی جان ڈال دی اور صوری و معنوی حیثیت سے اس کو اتنا مرصع و بامعنی کر دیا کہ اس کا شمار بہت جلد ہندوستان کے مقبول سنجیدہ پرچوں میں ہونے لگا، اس کے مضامین میں خاصا تنوع کیا اور اس پرچہ کے لئے جدید وسائل فراہم کرائے جس سے آفسیٹ کی خوبصورت طباعت پر یہ شائع ہونے لگا اور اس کی اشاعت بھی کافی ہونے لگی، طلبہ کے مضامین کا اس میں خاصا اضافہ کیا، طلبہ کی حوصلہ افزائی بھی جس سے طلبہ میں تحریر کا شوق ہوا اور بہت جلد طلبہ کی ایک ٹیم تیار ہوگئی۔

ندوہ کے جشن کے موقع پر تعمیر حیات کے صفحات کو ندوہ کے اغراض و مقاصد اور اس کے پیغام کے لئے وقف کر دیا تھا، انہوں نے ندوہ کی وکالت اس زور شور سے کی کہ ہر حلقہ اور مکتبِ فکر نے اس جشن کے ساتھ تعاون کیا اور اس جشن کو شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔ اس جشن کو کامیابی سے ہمکنار کرنے والوں میں ان کا نام بھی بزرگوں کے دوش بدوش لیا جائے گا،

جشن ندوہ کے سلسلہ کا ان کا ایک اور شاہکار کتب خانہ کی علمی و تاریخی نمائش تھی، اس نمائش کو ترتیب دینے میں انہوں نے شب و روز ایک کر دیئے تھے، اس کو اس خوبی و مہارت سے ترتیب دیا کہ علماء ہند کے کارنامے بیک نظر سامنے آجاتے ہیں، انہوں نے صدیوں کی علمی مساعی کو چارٹوں کے ذریعہ نمایاں کیا، عربی و اردو زبان میں یہ چارٹ تیار کرا کے کتب خانہ میں آویزاں کر دیا، جب اس نمائش کا افتتاح کیا گیا تو ہر شخص اس نمائش

سے بہت متاثر تھا، انہوں نے ایک گوشہ ندوی مصنفین کے لئے بھی خاص کیا تھا اور ان کی کتابیں تلاش بسیار سے جمع کی تھیں۔ اس سے ندوی مصنفین کی علمی خدمات سامنے آجاتی ہیں، اس وقت بھی کتب خانہ میں یہ چیزیں اسی حالت میں موجود ہیں جو برابر ان کی یاد دلاتی رہیں گی، اسی موقع پر ان کے ذمہ "تاریخ ندوہ" لکھنے کا کام بھی سپرد ہوا تھا، اس کام کو وہ بہت محنت و توجہ سے کر رہے تھے اور غالباً اس کو مکمل بھی کر چکے تھے، ایک موقع پر مجھ سے تاریخ ندوہ کا ذکر کرنے لگے تو میں نے کہا، "یہ موضوع بہت نازک ہے اگر آپ نے صحافی کے قلم سے تاریخ لکھی تو اس میں جھول رہ جائیگا اور اگر آپ مؤرخ کے قلم سے لکھتے ہیں تو کیا آپ اس موضوع سے انصاف کر سکیں گے"، اس پر انہوں نے بہت تیکھے انداز میں جواب دیا تھا کہ" زبانی جمع خرچ لوگ خوب کرنا جانتے ہیں کام خود کرتے نہیں دوسرے کام کریں تو اول وہلہ ہی سے رخنے ڈالنا شروع کر دیتے ہیں، ہماری کوشش یہ ہے کہ یہ تاریخ غیر جانبدارانہ ہو انشاء اللہ اس پر کسی کو انگشت نمائی کا موقع نہ ملیگا" افسوس یہ تاریخ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی، اگر یہ شائع ہو جائے تو ان کی یہ کاوش منظر عام پر آئے۔

اسی طرح حلقہ پیام انسانیت کا وجود ہوا، تو اس کے کنوینر اسحاق جلیس صاحب بنائے گئے، اس کے اغراض و مقاصد پر انہوں نے زورِ قلم صرف کیا، اس تحریک کو ان کی کوششوں سے پورے ہندوستان میں بھرپور تعاون ملا، اس تحریک کی توسیع و اشاعت کے لئے انہوں نے مولانا علی میاں کے ساتھ ہندوستان بھر کا دورہ کیا، مختلف صوبوں میں اس تحریک کے وفود کا شاندار استقبال ہوا اور اس کے جلسے ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں اتنے مفید و کارآمد ہوئے کہ لوگوں کا بیان ہے کہ تحریکِ خلافت کی یاد تازہ ہو گئی، ان دوروں کی رپورٹ وہ تعمیر حیات میں برابر شائع کرتے تھے، انہوں نے تعمیر حیات میں مولانا علی میاں صاحب کی ایک ایک تقریر کو ریکارڈ کرایا، اس سے قبل بھی مولانا کی تقاریر اس پرچہ کی زینت بنا کرتی تھیں لیکن جس اہتمام والتزام کے ساتھ انہوں نے ان تقاریر کو جمع کیا اس سے مولانا کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت و وارفتگی کا پتہ چلتا ہے، اس ریکارڈ سے مولانا کی تقاریر کے کئی مجموعے بآسانی شائع ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کی بقا و حفاظت کا سہرا اسحاق جلیس صاحب ہی کے سر رہے گا۔

وہ طلبہ میں پاکیزہ صحافت کے ذوق کو عام کرنے کے لئے ندوہ میں جرنلزم کا شعبہ قائم کرنے کے لئے کوشاں تھے، اگرچہ باقاعدہ اس کا قیام عمل میں نہیں آسکا لیکن چند طلبہ کو وہ بطور خاص اس کی تربیت دے

رہے تھے، وہ اچھے جرنلسٹ تھے، حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر تھی، وہ مرض کی نشان دہی بھی کرتے، اور اس کا علاج بھی بتاتے، جلسوں، کانفرنسوں اور سیمناروں کی روداد لکھنے پر ان کو بلا کی قدرت حاصل تھی، اس کا انداز اتنا دلچسپ، سرور آگیں، دلکش اور معلومات آفریں ہوتا کہ وہ قاری کو اس ماحول میں پہونچا دیتے، پاکستان میں جو ایشیائی کانفرنس ہوئی تھی اس کی روداد انہوں نے بہت خوب انداز میں لکھی، بھوپال میں آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس ہوئی تو اس کی روداد بھی انہوں نے لکھی، اسی طرح پیام انسانیت کے دورہ کے سلسلہ میں مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کا جو دورہ علاقہ مالوہ (بشمول بھوپال) ہوا تھا اس کی روداد میں تعمیر حیات کا ایک ضخیم نمبر نکالا، اس میں مالوہ کی تاریخ، اس کا ماضی اور حال، اولیاء کرام، قابل ذکر اشخاص، بھوپال کی تاریخ، علماء بھوپال کے شاندار کارنامے، نوابانِ بھوپال کی علمی، ادبی اور سیاسی فتوحات پر فل اسکیپ کے ۵۰ صفحات لکھے اور مولانا کی ولولہ انگیز تقریروں کے اقتباسات بھی دیئے، جس سے یہ ایک تاریخی دستاویز ہوگئی، آیندہ مالوہ کی تاریخ پر یہ روداد ایک مستند ماخذ بن جائے گی اس لئے اس کو الگ کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے تو یہ ان کی خدمات کے اعتراف کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔

وہ بھوپال کئی مرتبہ آئے، ۱۹۷۰ء میں تاج المساجد کی تعمیر جدید کے افتتاح کے موقعہ پر مولانا علی میاں صاحب کے ہمراہ آئے اور تین دن قیام رہا، وہ مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی کے ہمالیائی عزم اور مساجد کے تاج کے جدید نقشہ سے بہت متاثر تھے، میں نے اس تاثر کو دیکھتے ہوئے تاج المساجد پر ایک مضمون کی فرمائش کر دی، انہوں نے میری فرمائش پر چند گھنٹوں میں "عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ دیا، میں اس سے ان کی زود نویسی اور اخاذ طبیعت کا قائل ہوگیا، ان کا یہ یادگار مضمون نشان منزل تاج المساجد نمبر میں میں نے محفوظ کر دیا ہے۔

۱۹۷۵ء میں مولانا ہی کے ہمراہ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے اجلاس ہفتم کے موقع پر بھوپال آئے تو ندوہ کے اجلاس کے سلسلہ کا پہلا خواص کا جلسہ محمد گڑھ ہاؤس میں ہوا، اسحاق جلیس صاحب نے ندوہ کے اغراض و مقاصد اور اجلاس کی ضرورت پر ایک تقریر کی، اس کے بعد مولانا علی میاں اور خاں صاحب نے تقریر کی، اس میں اجلاس کے لئے چندہ کی اپیل کی گئی، اس جلسہ میں آٹھ ہزار کا پہلا چندہ ہوا، اس اجلاس کے سلسلہ کی دلچسپ روداد انہوں نے تعمیر حیات کے صفحات میں لکھی ہے۔

وہ مولانا علی میاں کے دعوتی فکر سے بڑے متاثر تھے اور خود بھی اس کے بڑے حامل تھے اور اس فکر کو عام کرنے کی پیہم کوشش کرتے رہتے تھے وہ علی میاں سے بیعت وارادت کا تعلق بھی رکھتے تھے اور انہوں نے اپنی مرضی کو حضرت کی مرضی وایما، کے تابع کر دیا تھا، مولانا بھی ان سے خاص تعلق رکھتے۔ سفر وحضر میں ان کو ساتھ رکھتے رمضان کا پورا مہینہ وہ رائے بریلی میں گزارتے، دو تین سال سے رمضان المبارک میں وہ ایک تربیتی کیمپ قائم کرتے، طلبہ کی ایک بڑی جماعت ان کے ساتھ مولانا کی خدمت میں جاتی اور مولانا کی مجالس سے استفادہ کرتی، راقم السطور سے جب ملاقات ہوتی اصرار کرتے کہ رمضان کا کچھ حصہ میں رائے بریلی میں گزاروں، ان کے مسلسل اصرار پر دو سال قبل رمضان میں تین دن مولانا کی مجالس میں شرکت کرنے کی سعادت میں نے حاصل کی تھی، ان کی نا وقت وفات مولانا کے لئے بڑے سوہان روح کا باعث ہوگی، واقعہ یہ ہے کہ ان جیسا معتمد اور مولانا کی فکر کا ایسا حامل، ندوہ کے لئے اپنی زندگی کو قربان کر دینے والا دور دور نظر نہیں آتا،

مرحوم کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا ان کے والد صاحب بسلسلہ معاش احمد نگر آئے اور یہیں بودو باش اختیار کر لی۔ ۵۹ء میں راقم رمضان المبارک میں احمد نگر گیا تو انہوں نے اپنے والد مولانا عبد الستار صاحب مرحوم سے ملایا تھا، وہ صاحب علم اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، انہوں نے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لئے ایک بڑا کتب خانہ بھی جمع کر لیا تھا، گفتگو بہت دلچسپ، مرصع اور مدلل کرتے تھے، لب ولہجہ زیادہ تر پختون ہو جاتا، مہاراشٹر میں طویل قیام کے باوجود یہاں کے اثرات ان پر کم تھے، فیاضی وسیر چشمی کے اوصاف گرانمایہ سے یہ متصف تھے، اسحاق صاحب نے بھی ان خصوصیات کو اپنے والد سے ورثہ میں پایا تھا، میں جب تک احمد نگر میں رہا اسحاق خاں صاحب سحر وافطار پر مدعو کرتے رہے، ان کے اخلاق کریمانہ سے طبیعت بڑی متاثر ہوئی تھی اور آج تک اس کا نقش دل پر ہے ۹۷ء میں عم محترم مولانا عمران خاں صاحب کی رفاقت میں دار العلوم احمد نگر کے جلسہ سیرت پاک میں دوبارہ احمد نگر جانے کا اتفاق ہوا، اس وقت اسحاق صاحب پونا میں تھے، عجلت میں ان کے والد سے بھی ملاقات نہ کر سکا تھا جس کی کسک آج بھی محسوس کرتا ہوں، یہ واقعہ کتنا دلخراش ہے کہ اسی سال مارچ کے مہینہ میں ان کے والد کا انتقال ہوا اور اس حادثہ کے چار ماہ بعد ہی اسحاق صاحب بھی اپنے پیدا کرنے والے کے پاس چلے گئے،

وہ اپنی عمر کی صرف ۴۴ بہاریں دیکھ سکے مگر کام کو انہوں نے زندگی کا مقصد بنا لیا تھا وہ مصاف حیات میں ٹھہرنے کے قائل نہ تھے، وہ اقبال کے " جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی "، کا مجسم پیکر تھے،

ان کی مثال اس غریب الدیار کی سی تھی جس کی کوئی منزل نہ ہو مگر چلتے رہنا اس کا کام ہو، وہ چلتے رہے تا آنکہ ان کی منزل سامنے آگئی اور وہ اس منزل کو بھی بخوشی و رضا پار کر گئے،

ان کی طبیعت میں جرأت حق، خلوص نیت، عالی ظرفی، عزم و حوصلہ ثبات و استقامت کے جوہر نمایاں تھے زندگی کے تقاضوں پر مثبت و ایجابی انداز سے وہ غور و فکر کرتے، مایوسی و قنوطیت کا ان پر سایہ بھی نہ پڑا تھا، عزم و ہمت کے ساتھ ناساعد حالات سے نبرد آزمائی، صحت مند شعور اور دینی غیرت و حمیت کے جذبات کے ساتھ دین و دنیا کی خدمت ان کا شعار تھا، وطن کی بے لوث محبت اور انسان دوستی ان کا خمیر تھا، اور زندگی بھر وہ اپنی تحریروں سے یہی پیام عام کرتے رہے۔

اپنے کسی عزیز قریب، ہمدم دیرینہ اور تعلق رکھنے والوں کے انتقال سے دل و دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ اور چہار سو تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے اور گوش عبرت کو یہ پیام سنائی دیتا ہے ؎

نسیم جاگو، کمر کو باندھو، اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

سراپا ہمدرد

ملک ایک نئی قیادت، نئی تحریک اور نئے نظام کا بے چینی سے منتظر ہے، ایسی تحریک اور قیادت جو اس ملک کے عوام کے زخموں پر مرہم کا کام کرے، جو سراپا ہمدرد و غم گسار ہو، جو جھوٹی عزت، سستی شہرت اور منتقمانہ جذبات سے پاک و بے نیاز ہو۔ جس تحریک کا ایک ایک فرد، تشدد، انارکی اور انتشار و بدامنی سے نفرت کرے اور امن پسندی، شفقت و بھائی چارگی اور بے غرضی و خلوص کا پیکر ہو۔ بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح، بگڑے ہوئے انسانوں اور غیر تربیت یافتہ، تشدد پسند مجمع کے ذریعہ نہیں کی جا سکتی۔ بگاڑ دور کرنے کے لئے پیمبرانہ کردار و عمل اور خدا کے مقبول بندوں کی سی صفات و خصوصیات لازمی ہے۔ ایسے افراد چاہے تعداد میں مٹھی بھر ہوں مگر وہی ایسا دیرپا اور خوشگوار انقلاب لا سکتے ہیں جس کے سائے میں انسانیت کا تھکا ماندہ، مضمحل و مضطرب اور پریشان و ہراساں قافلہ اطمینان و سکون کی سانس لے سکے۔

(مولانا اسحق جلیس ندوی مرحوم)

مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم
ذاتی تعلقات کی روشنی میں

محمد فاروق قاضی بھٹکلی ندوی

سنہ ۶۳ء کے ابتدائی ایام میں جب اس ناچیز نے عالم اسلام کی ایک مایہ ناز علمی درسگاہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں بسلسلۂ تعلیم و تربیت پہلی مرتبہ قدم رکھا تو یہاں اپنے قدیم مشفق ومحسن اساتذہ کے علاوہ جن لوگوں سے شناسائی اور تعارف کا موقع حاصل ہوا ان میں سے ایک مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم بھی تھے جو اس وقت مجلس تحقیقات ونشریات (جس کو قائم ہوئے کوئی زیادہ مدت نہیں گذری تھی) کے نگراں اور ذمہ دار تھے۔ مرحوم سے پہلی بار مل کر اور ان کی بے تکلف گفتگو سنکر جو خالص اردو اور زیادہ تر بمبئی اور جنوبی ہند کے لہجے میں ہوتی بڑی مسرت ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ ان سے ایک انسیت اور ذہنی یکسانیت محسوس ہوئی۔ مرحوم کو چونکہ ندوہ سے فراغت حاصل کئے کوئی زیادہ مدت بھی نہیں ہوئی تھی یعنی جدید اصطلاح میں زیادہ سینیئر بھی نہیں تھے کہ ان سے ملنے میں تقدس اور احترام کا ایک حجاب حائل ہو۔ نیز خالص ندوی آفاقی ذہنیت اور جنوبی ہند کی بہت ساری خصوصیتوں کی حامل ایک بے تکلف اور مزاج شناس شخص تھے۔ لہذا ان سے پہلی ہی ملاقات میں ہر شخص یہ محسوس کرتا گویا وہ اپنے ایک بے تکلف بھائی یا دوست سے مل رہا ہے اور جس سے بلا کسی قید و بند کے اپنا حال بیان کر رہا ہے اور ہنسی مذاق کر رہا ہے۔

مرحوم سے پہلی ملاقات کے دوران یہ محسوس ہوا کہ آپ ندوی فکر کے بڑے حامی اور اپنے ندوی اساتذہ کے بڑے مداح اور قدرشناس اور ساتھ ہی ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی سے بہت متاثر اور ان سے بہت قریب ہیں۔ علامہ شبلی نعمانیؒ، سید سلیمان ندویؒ اور دیگر ندوی اکابر علماء کی تصنیف و تحریر کے ہر وقت کلمہ گو اور مدح سرا ہیں۔ جو بھی طالب علم یا ان کا اپنا رفیق درس ملتا تو سب سے پہلے مرحوم اس کی باتوں کو پرکھتے اور ذہانت کا اندازہ لگاتے اور پھر فوراً موقع و محل کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی دلچسپ مگر علمی گفتگو سے متاثر کر کے اسے ندویت کے وسیع دائرہ میں یقین کی حد تک شامل

کرنے کی کوشش کرتے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہو جاتے۔ جب انھیں اس میں کامیابی ہو جاتی تو پھر نیک و مفید مشوروں کے ذریعہ طالب علم کو جدید مفید انگریزی، اردو، عربی کتابوں کے مطالعہ کا شوق دلاتے اور انھیں زمانہ کی ذہنی مرعوبیت کے خود ساختہ خول سے نکال کر ایمان و یقین کی وسیع فضا ــــ اور خود اعتمادی اور ذہنی تفوق کے اونچے میدان میں لے آتے۔ دارالعلوم میں بعض وہ طلباء جو مغربی تہذیب کی تیز و تند آندھیوں سے اور جدید صحافت و ادب کے پُرفریب اور دیدہ زیب فتنوں سے متاثر ہو جاتے اور اسلام اور علوم نبویہ کے بارے میں ان کی دلچسپی کم ہو جاتی اور اپنے اسلاف کی علمی کاوشوں کے بارہ میں کسی قدر تحقیر اور تنقیص کا جذبہ پیدا ہو جاتا اور غیروں کی ہر چیز کی طرف قدر کی نگاہ سے دیکھنا اور ان سے مرعوب ہونا ان کا ذوق ہوتا ایسے طلباء کو مولانا اسحاق خاں مرحوم اور مولانا محمد میاں مرحوم جیسے وسیع النظر اور بلند خیال اور زمانہ کے رمز شناس اور نوجوانوں کی نفسیات سے واقف اور ان کی صلاحیتوں کے قدر شناس حضرات کی بروقت ذہنی و فکری رہنمائی اور ہمت افزائی نے اس بڑی ہلاکت اور خرابی میں مبتلا ہونے سے اکثر بچا لیتی اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کی جستجو اور اپنے اوپر مکمل اعتماد آگے بڑھنے کی راہیں کھول دیتے۔

مولانا مرحوم سے پہلی ملاقات کے بعد پھر تعلقات کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا اور بارہا ان کے ندوہ میں قیام کے دوران مجلس تحقیقات و نشریات اسلام جانے اور وہاں پر موجود جدید موضوعات پر عربی و اردو کتابوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ پھر جلد ہی وہ غالباً ایک دو سال کے مختصر قیام کے بعد اپنے وطن احمد نگر چلے گئے اور وہاں انہوں نے ندوی نصاب کے طرز پر ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی اور اس کی ذمہ داری کا بار کچھ مدت تک سنبھالتے رہے اور وہاں کی دینی و ملی تحریکوں میں پیش پیش رہے۔ پھر اس کے بعد ان کا پونا میں قیام رہا اور وہاں کے کسی کالج میں بحیثیت لکچرر ان کا تقرر رہا۔ اس دوران میں انہوں نے وہاں سے ایک پرچہ "ندائے ملت" کے طرز پر "ملت ٹائمز" کے نام سے نکالا جو برابر دارالعلوم میں طلباء کی یونین میں آتا اور ہم طلباء اس وقت اس کو بڑے شوق سے پڑھتے اور ان کے فکر انگیز مضامین سے بہت متاثر ہوتے اور ہمیں تعجب ہوتا کہ یہ شخص تنہا اپنی ہمت کے بل بوتے پر جنوبی ہند سے ایسا پرچہ نکال رہا ہے اور وہاں کے مسلمانوں کی فکری قیادت کا خلا پُر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ پرچہ تھوڑی مدت تک جاری رہا پھر بعض وجوہات کی بنا پر بند ہو گیا۔ اس پرچے سے ہمیں اندازہ ہوا کہ مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم میں اعلیٰ

صحافتی صلاحیتیں موجود ہیں نیز ان کی ہمت اور فکر کی بلندی بہت ہی غیر محدود ہے اور یہ آگے چل کر ملت کے حق میں اپنی زبان و قلم سے بہت مفید کام انجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے چند سال اپنے وطن احمد نگر اور پونا و بمبئی کی دینی و علمی سرگرمیوں میں گذارے اس دوران کبھی کبھی وہ حضرت مولانا کی ملاقات اور ندوہ کے اساتذہ و احباب سے ملنے کے لئے لکھنؤ ضرور تشریف لاتے اور ہر دفعہ قدیم و جدید طلباء سے بے تکلف مل کر اور سب کو متاثر کر کے واپس چلے جاتے،

اس ناچیز نے دار العلوم سے فراغت حاصل کرنے بعد ۱۹۷۲ء میں ایک سال کے لیے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی کی خدمت میں رہنے کا فیصلہ کیا اور سفر و حضر میں حضرت کے ساتھ بغرض استفادہ کچھ مدت گذارنے کی سعادت حاصل کی۔ اس دوران میں مولانا مدظلہ کے ہمراہ ۲-۳ مرتبہ بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ اور وہاں مولانا اسحٰق جلیس صاحب سے ملاقات اور گفتگو کا موقع ملتا رہا۔ اسی سفر میں ایک مرتبہ حضرت مولانا کو پونا آنے کی دعوت دی اور وہاں حضرت کی تقریر اور استفادہ کا ایک منظم پروگرام بنایا۔ چنانچہ بمبئی ہی سے بذریعۂ کار پونہ جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے علمی و تبلیغی حلقے میں مولانا کی تقریریں ہوئیں اور پونہ کے مسلمان بہت ہی مستفید ہوئے۔ وہاں کے پروگرام سے یہ اندازہ ہوا کہ پونا جیسے شہر میں جو کہ اس وقت شیو سینا اور جن سنگھی ذہنیت رکھنے والے غالی مرہٹی ہندوؤں کا ایک ترقی یافتہ شہر ہے اور جہاں جدید تعلیم یافتہ لوگ بہت ہیں۔ مولانا اسحاق مرحوم نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور مرنجان مرنج طبیعت سے کیسا اچھا اثر قائم کیا ہے، اور کیسی مفید خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اور اس وقت وہاں جو فرقہ پرستانہ زہریلی فضا غالی ہندو جماعتوں کے اثر سے پیدا ہوئی ہے اس کی اصلاح حتی الامکان کیسے مدبرانہ اور ہوشمندانہ اقدامات سے پیام انسانیت اور اخوت و محبت کے نعروں سے انجام دے رہے ہیں۔ یہی چیزیں آگے چل کر ان کی ترقی اور ملت کی وسیع تر میدان میں مفید خدمت انجام دینے کی پیشین گوئی کر رہی تھیں جن کو حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی کی فراست اور قیافہ شناس آنکھوں نے پہچان لیا اور اس قیمتی گوہر کی قدر دانی اور اسکی چمک میں مزید اضافہ کرنے کے لیئے اپنے ندوے واپسی کے فوراً بعد ہی انھیں اپنے یہاں بلانے اور ان سے مختلف کام لینے کا فیصلہ فرمایا۔

حضرت مولانا مدظلہ العالی خوب جانتے تھے کہ ندوۃ العلماء عالم اسلام کا ایک فعال تعلیمی و تربیتی ادارہ

ہے اور موجودہ دور میں مسلمانوں کی فکری و دینی قیادت کا سرچشمہ اور معدن ہے اس کی افادیت کا دائرہ غیر محدود ہے۔ یہ ادارہ اپنے بہترین اور صحیح ترین مقاصد میں اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ انھیں عملی جامہ پہنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم ہوں اور اس کے لئے باصلاحیت اور مخلص افراد کیا شمال، کیا جنوب اور کیا عرب و کیا عجم، غرض جہاں کہیں سے بھی میسر آجائیں انھیں ضرور حاصل کیا جانا عین حقیقت بینی اور ملت شناسی ہے۔ چنانچہ اس کے لئے وہ اپنے ادارہ میں تعلیم و تدریس اور دیگر علمی و تصنیفی خدمات کے لئے ندوی فارغین ہی کی قید نہیں لگائی ہے بلکہ غیر ندویوں کی بھی ایک معتد بہ تعداد کو اپنی صلاحیتوں اور علمی خصوصیتوں کے بل بوتے پر دین کی خدمت مخلصانہ طور پر انجام دینے میں برابر کا شریک ٹھہرایا ہے، لہذا حضرت مولانا مدظلہ العالی جنوب سے اسی ادارہ کے ایک قابل اور لائق ترین فرزند مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم کو ندوہ میں بلاکر "تعمیر حیات" جیسے معیاری دینی پرچہ اور ندوۃ العلماء کے آرگن کی ادارت سونپنے کتب خانہ، دارالعلوم کی ترتیب نو کی ذمہ داری اور اجلاس دارالعلوم میں تعلیمی نمائش کی آرائش کا کام اور پیام انسانیت جیسے نازک ترین اور اہم ترین کام انجام دینے کا بوجھ ان پر ڈالنے میں کوئی چیز مانع نہیں بن سکی بلکہ وہ "وضع الشیئ فی محلہٖ" کے مصداق بن گئے۔ چنانچہ مولانا اسحاق مرحوم نے ان تمام ذمہ داریوں کو حضرت مولانا کی حسب توقع بہت ہی خوش اسلوبی اور فرض شناسی کے ساتھ انجام دیا اور زندگی کی آخری سانس تک ندوہ ہی کی فکر اور حضرت مولانا ہی کے تعلق اور احسان مندی کا ذکر اور یاد الٰہی میں محو ہو کر بہت ہی صبر و ثبات کے ساتھ سفر آخرت فرمایا۔ موت کے وقت زبان پر کلمۂ شہادت اور بکثرت درود اور چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔ گویا وہ اقبال کے اس شعر کی عکاسی کر رہے تھے ؎

نشانِ مرد مومن با تو گویم   چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

جس وقت حضرت مولانا مدظلہ العالی نے انھیں ندوہ طلب کیا تھا اس وقت وہ اپنے ذاتی حالات کے پیش نظر کچھ ذہنی پریشانیوں میں مبتلا تھے اور ندوہ آنے میں تذبذب فرما رہے تھے۔ رائے بریلی میں ناچیز سے ملاقات کے دوران اپنے اس تذبذب کا ذکر کیا تو اس پر انھیں اطمینان دلانے کی کوشش کی گئی اور حضرت کے مشورے پر عمل کرنا مفید بتایا گیا، الحمد للہ مرحوم نے مکمل شرح صدر کے ساتھ توکل علی اللہ کرتے ہوئے اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق غالباً ۱۹۷۳ء میں ندوہ تشریف لائے اور مفوضہ ذمہ داریوں کو انجام دینا شروع

کیا۔ اس عرصہ میں ناچیز کا دمشق جانا ہوا اور پھر دوبارہ ملاقات ۷۵ء میں ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ شہرۂ آفاق تعلیمی جشن ہی میں ہوسکی اور مولانا مرحوم کی ترتیب کردہ تعلیمی نمائش اور بعض جلسوں میں ان کے ترجموں کو سننے کا موقع میسر آیا جس سے بڑی خوشی ہوئی۔ ۸۱ء میں ناچیز کو بھی حضرت مولانا مدظلہ العالی کی ہدایت اور تعمیل حکم میں مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء آکر رہنے کا اتفاق ہوا تو مولانا مرحوم سے بھی قدیم تعلق اور بھٹکلی برادری سے ان کی محبت اور انسیت کے نتیجہ میں ہمیشہ قریب سے ملنے اور مشورہ لینے کا اتفاق ہوا۔ اور الحمد للہ انہوں نے ہماری ہمت افزائی کی اور دارالعلوم میں آمد کو سراہا اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔ آمین

تعلیمی وثقافتی کانفرنسوں اور سیرت کے جلسوں میں شرکت کرنے کی نیت سے مرحوم بارہا بیرون ندوہ چلے جاتے اور آخر میں تو پیام انسانیت کے سلسلے میں مقررہ مقامات پر جاکر پہلے ہی سے پروگرام مرتب کرنا اور زمین ہموار کرنا ان کے لئے بے حد ضروری ہوگیا تھا۔ لہذا اس سلسلے میں مرحوم نے کئی مرتبہ، تامل ناڈ، کیرالا، کرناٹک، آندھرا پردیش، مدھیہ پردیش اور پنجاب وغیرہ کے مقامات کا دورہ کیا ہے اور اپنی تقریروں سے وہاں کی ہندو مسلم آبادی کو متاثر کرکے اور علمی ودینی حلقوں کو مستفید فرماکر واپس لوٹے ہیں اور ندوہ کے دعوتی مشن کو بہترین طریقہ پر انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ آمین

تم ماہ شبِ چار دہم تھے مرے گھر میں

زاہد حسین ندوی۔ استاذ معہد دار العلوم ندوۃ العلماء

کہتے ہیں "وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے" فطرت جہاں خرمنِ ہوش و خرد کو مصائب و آلام کی بجلیوں سے دوچار کرتی ہے وہیں صبر و ضبط اور حلم و استقلال کی شبنم افشانیوں سے شاداب و بحال بھی کردیتی ہے، جو ماضی پر پردہ ڈال کر مستقبل کی تگ و دو اور ہمہمی میں گم کردینے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتا ہے، اور یہی فطرت کا وہ اصول ہے جس کو اپنانا تقاضائے بشریت بھی ہے اور شیوۂ مرداں بھی۔

زمانہ قدیم سے اب تک اس عالمِ آب و گل میں جانے کتنی ہی ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے ہر گوشۂ حیات میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے اور زندگی کے اجڑے ہوئے گلشن کو اپنے خونِ دل و جگر سے سینچ سینچ کر لالہ زار بنا دیا، کتنے ہی مسیحا آئے جن کے اعجاز نے جاں بلب انسانیت میں زندگی کی نئی روح پھونک دی، مگر جب وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کر چکے، اور وقتِ رحلت آگیا، تو دنیا کی کوئی طاقت ایک لمحہ کے لئے بھی نہ روک سکی اور انسانوں کا سوگوار قافلہ فطرت کے نظام کیساتھ بدستور چلتا رہا، ٹھوکریں لگتی رہیں، لوگ سنبھلتے رہے، برق گرتی رہی، نشیمن بنتے رہے، فرعونیت سر اٹھاتی رہی اور ضربِ کلیمی اپنا اثر دکھاتی رہی لیکن اس محویت و رمیدگی میں تحت الشعور کے پردہ سے ایک آہ اٹھتی رہی، دل کی پہنائیوں میں کہیں ٹیس محسوس ہوتی رہی، یادوں کی پروائی دل کے زخموں کو ہرا کرتی رہی، قافلہ گذر جاتا ہے مگر غبارِ راہ فضا کی بلندیوں سے گذرے ہوئے لمحات کی غمازی کرتی ہے، سورج ڈوب جاتا ہے لیکن افق کی سرخی دیر تک اسکے قہر و جلال کی گواہی دیتی ہے، لوگ مرجاتے ہیں لیکن ان کے کارناموں کی صدائے بازگشت ذہن کے پردوں سے ٹکرا کر رگ و پے میں حرارت و اضطراب کی لہر دوڑا دیتی ہے —— اور یہ وہ احساسات ہیں جہاں ارادے ناکام اور فطرت مجبور ہوجاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ مرکر بھی زندہ و جاوید اور یادگارِ زمانہ بن جاتے ہیں۔

انھیں ہستیوں میں سے ایک ہستی مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم کی بھی تھی جنکی موت کے تازہ حادثہ نے انھیں بھی ایک یادگار بنا کر رکھ دیا، آپ دین کے نڈر سپاہی اور میدان صحافت و خطابت کے بہترین شہسوار تھے، آپکی جرأت و بیباکی، اخلاص و مروت اور ذکاوت و ذہانت نے آپکے قلم کو تلوار کی صفت عطا کردی

تھی، آپ کی تحریروں میں صلابت و پختگی، کیفیت و سرور انگڑائیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آپ ادیب محض نہیں تھے لیکن نوک قلم کی تیزی، ابلتی ہوئی مقصدیت اور بے باکانہ طرز تحریر دلوں پر ضرب لگاتی ہوئی اور میدان فکر و عمل کی طرف للکارتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، آپ کی تحریر حقائق زندگی، مقصد حیات، فکر و نظر کی بلندی اور عزائم و ولولہ کی وارفتگی سے پُر ہے جس میں زیست کے نور و سرور بھی ہیں اور حرارت و توانائی بھی، آپ قلم کو زندگی کے تمام شعبوں کا حقیقی ترجمان اور دینی و معاشرتی سدھار کا آلۂ کار نیز صحافت کو قوم و ملت کا مفید سرمایہ دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ موجودہ صحافت کی بے ضمیری اور محدود مفاد پرستی پر نکیر کرتے ہوئے تعمیر حیات ۱۰ مارچ ۱۹۷۶ء کے اداریہ میں لکھتے ہیں:

"بدقسمتی سے مشرق، خاص طور سے ملت اسلامیہ اور دیندار طبقے میں ہنوز صحافت کی اہمیت اور دائرۂ اثر کا صحیح شعور نہیں، انہیں اس کا اندازہ نہیں کہ اخبار نویس وہ معلم ہے جس کا مدرسہ پورا ملک ہوتا ہے جس کے تلامذہ میں دہقان و مزدور سے لے کر وزیر اور صدر مملکت تک، تمام چھوٹے بڑے شامل ہوتے ہیں یہ وہ مبلغ ہے جس کی دعوت گھر گھر، دوکان دوکان اور دفتر دفتر گونجتی ہے، ایک ایسے دور میں جسے صحافت کی جہاں گیری کا دور کہہ سکتے ہیں دینی، علمی، ادبی اور اصلاحی پرچوں کیطرف سے قوم کی بے اعتنائی کس درجہ افسوسناک اور کتنے بھیانک خطرات کی علامت ہے۔ وہ رسائل و اخبارات جنہوں نے بے اصولے پن کی کوکھ سے جنم لیا اور جلب منفعت کو اپنا مقصد بنایا ہے۔ وسائل کی فراوانی، ظاہری نمائش اور دلکشی رکھنے کی وجہ سے نئی نسل اس کی طرف پروانہ وار لپکتی ہے۔"

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ صحافت وقتی اغراض یا ناعاقبت اندیشی کی بنیاد پر جب چاہتی ہے عوام کے جذبات کو کھلونا بنا کر ہلاکت و تباہی کے اسباب اور اغیار کو ہنسنے کے مواقع فراہم کرتی ہے، اس سلسلے میں اگر مولانا کے معیار صحافت اور نقطۂ نظر کو اپنایا جائے تو موجودہ صحافت ایک نیا اور مفید موڑ لے سکتی ہے۔ مولانا بیک وقت دینیات کے علاوہ حالات حاضرہ کے مختلف موضوعات پر بولنے اور لکھنے کی بہترین صلاحیت رکھتے تھے، مولانا اپنی لطافت شعور اور ذکاوت فہم کی بنا پر مختلف فنون کے مزاج اور اس کی روح سے واقف تھے، موضوع کی گہرائیوں تک پہنچ جانا اور اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر لینا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا، کسی بھی موضوع پر برجستہ تقریر کر لینے میں آپ کو قدرت و ملکہ حاصل تھا،

ساتھ ہی آپ ایسے مزاج شناس اور نباض تھے کہ جس سے بات کرتے یا جس محفل میں خطاب کرتے اس کے مزاج اور ماحول کو ملحوظ رکھ کر مثالوں اور دلیلوں سے مطابقت پیدا کرتے ہوئے اپنی بات افکار واذہان سے اس قدر ہم آہنگ کردیتے کہ آسانی سے لوگوں کے دلوں میں اترتی چلی جاتیں، ان کی تقریر دلپذیر میں بلا کی جاذبیت وکشش اور حرارت وشگفتگی تھی، آواز کی متانت وگھن گرج، طرز ادا کا زیر وبم اور چہرہ کا اتار چڑھاؤ سامعین کو اپنی طرف کھینچتا چلا جاتا اور ایسی محویت کا عالم طاری ہوتا کہ تقریر کا طلسم اس کے اختتام پر ہی ٹوٹتا، لمبی تقریر ہو جانے کے باوجود یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی ابھی شروع ہوئی تھی، وہ خطابت کے مخصوص اور مؤثر فن سے واقف تھے جس میں دلوں کو فتح کر لینے اور ذہنوں کو مسخر کر لینے کی طاقت تھی جس کا اظہار ندوۃ العلماء میں سنہ ۱۹۷۳ء "اردو اڈیٹرس کانفرنس" کے مندوبین کو ندوہ کی طرف سے دیئے گئے عصرانہ میں ہوا تھا، انھوں نے کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے جس مؤثر پیرایہ میں صحافت کا مقام اور اس کی قیمت واہمیت پر روشنی ڈالی تھی وہ صحافیوں اور دیگر اہل قلم کے لئے سنگ میل اور مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کا اعتراف اکثر صحافیوں نے اسی وقت کیا۔

آپ نے پاکستان کے حالیہ اسلامی کانفرنس میں "البعث الاسلامی" کے اڈیٹر مولانا سید محمد الحسنی ندوی مرحوم کے ساتھ شرکت کی اور اپنی شعلہ بیانی کا جوہر دکھاتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات واحساسات اور دکھ درد کی ایسی شاندار ترجمانی کی کہ ارباب محفل کو خصوصی طور پر متوجہ ہونا پڑا۔

اگر ایک طرف مادر علمی ندوۃ العلماء نے انھیں علمی قوت وتوانائی فکر کی جودت وصلابت نیز قلمی وخطابی اعجاز بخشا تھا۔ تو دوسری طرف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مخلصانہ اور بصیرت افروز تربیت نے ان کے صدف ذہن وقلوب کو گوہر آب دار کی صفت عطا کردی تھی، وہ " فیضان نظر " اور " مکتب کی کرامت " دونوں ہی نعمتوں سے بہرہ ور تھے، یہی وجہ ہے کہ " آداب فرزندی " کا پاس ان میں ہمیشہ رہا اور وہ جہاں کہیں رہے مادر علمی کی خدمت اور اس کے اعلیٰ مقاصد ونظریات کی تبلیغ کو اپنا فرض سمجھتے رہے۔ ان کی انھیں گراں قدر صلاحیتوں اور مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے " حلقۂ پیام انسانیت " (جس کا باقاعدہ قیام سنہ ۱۹۷۴ء میں الہ آباد میں ہوا تھا) کی ذمہ داری ان کے سپرد کی جس کو مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم آخری وقت تک بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، اور ہندوستان کے مختلف صوبوں کا دورہ کرکے عوام کو اس تحریک کی افادیت سے روشناس کرتے رہے نیز مختلف مذاہب وادیان کے ماننے والوں کو انسانیت کی ایک ڈگر پر لانے کی جدوجہد کی جہاں فرقہ واریت تنگ نظری اور رنگ وخون کے امتیازات سے بڑے اخوت وہمدردی، اخلاق ومحبت اور باہمی ربط وتعلق کی

فضا میں چین و راحت، صلح و آشتی، اور امن وسکون کی سانس لی جاسکتی ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں مالوہ، راجستھان اور کرناٹک وغیرہ کا دورہ کیا اور ہر جگہ کامیابی ان کے قدم چومتی رہی۔ وہ ہندوستانی عوام میں اخوت و بھائی چارگی اور عام انسانی فضا قائم کرنے کے بیحد متمنّی اور کوشاں تھے جس کا اظہار ان کی تحریروں سے بھی ہوتا ہے وہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۸ء کے "تعمیر حیات" کے اداریہ میں فرقہ واریت اور ظلم و تشدد پر آنسو بہاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اخلاق و مروت، اہنسا و رواداری، عدم تشدد اور امن پسندی، حب الوطنی اور خدمت خلق کی اعلیٰ روایات جن کے جدوجہد آزادی کے دوران گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس پارٹی نے عوام کا دل جیت لیا تھا اور انگریزوں کو شکست دی تھی وہ اعلیٰ روایات طاق نسیاں بن کر رہ گئیں، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور صلح و آشتی کی موجودہ فضا کو برقرار رکھنے اور مزید مستحکم و پائدار بنانے کی فکر و کوشش برابر جاری رہنا انتہائی ضروری ہے اس سلسلہ میں مسلمانوں کو خاص طور پر ہوشمندی، سنجیدگی اور رواداری کا ثبوت دینا ہوگا، انھیں اپنے صفوں میں ایسے طالع آزما لیڈروں کی حوصلہ آزمائی نہیں کرنی چاہئے جو اپنی بے سروپا جوشیلی تقریروں کے ذریعہ فضا کو مسموم، مخالفین کو متحد اور ملت کو منتشر کرکے اپنے محدود مفادات حاصل کرتے ہیں "

مولانا میں حالات حاضرہ سے باخبری فکر و تدبر اور فہم و شعور بدرجۂ اتم موجود تھیں آپ جھوٹی نعرہ بازی اور مذہب کے نام پر دحشت و بربریت کو ہوا دینے والے عناصر (جو ظلم و تشدد کے بازار کو گرم کرکے انسانی خون کی چھینٹوں سے اپنی ہوس کی آگ بجھاتے ہیں) کے زبردست مخالف تھے، اور اس سلسلہ میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ۱ر اگست ۱۹۷۸ء کے تعمیر حیات کے اداریہ میں لکھتے ہیں:

"آج کی دنیا جو جمہوریت کو نسل انسانی کے لئے ایک قیمتی تحفہ کہتی ہے اور انسان کے بنیادی حقوق، اس کی جان و مال عزت و آبرو اور مذہب و تہذیب کی حفاظت اور ضمیر کی آزادی کو اپنے دستور میں اولین مقام دیتی ہے اس نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر انسانی برادری کی فلاح و بہبود اور اسے ایک مرکز پر جمع کرنے کا دعویٰ کرکے بے شمار انجمنوں کی تشکیل اور اقوام متحدہ جیسی بین الاقوامی تنظیم بھی قائم کرلی لیکن ان سب کے باوجود انسان سے سچی ہمدردی اس کی غم خواری اور چارہ سازی

مظلوم کی دادرسی اور ظالم کی سرکوبی اور انصاف و اخلاق کی عام فضا پیدا کرنے میں یہ تمام کوششیں ناکام اور یہ تمام دعوی بے معنی معلوم ہوتے ہیں "

آپ جن جذبات واحساسات کے تحت لکھتے ہیں اس میں دکھے دل کی صدا اور ضمیر صادق کی پکار نظر آتی ہے آپ کی زندگی ؎

غم زمانہ غم دل غم حیات لئے
اٹھا ہوں مقصد تعمیر کائنات لئے

کا حقیقی مصداق تھی، آپ آخر وقت تک صدق وصفا، امانت و خودداری اور محبت و اخلاص کی جوت جلاتے رہے۔

مولانا سادہ لوح، شیریں کلام اور رقیق القلب تھے آپ کو شعر و ادب سے خاصا شغف و انس تھا، خصوصی مجلسوں میں اکثر شعر و شاعری کا دور چلا کرتا، رات کی مجلسوں میں جب بھی شریک ہوتا تو مجھ سے کسی غزل کی فرمائش کرتے اور آخر میں خود بھی سناتے آپ خوش الحان اور اچھے مترنم بھی تھے جگر کی وہ غزلیں جو آپ نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان سے سنی تھیں بالکل جگر ہی کے لب و لہجہ میں سناتے اور پرکیف سماں پیدا کر دیتے، ساتھ ہی کلام اقبال اور ان کی دعوتی و پیامی نظموں سے اتنے متأثر تھے کہ ان کو گنگناتے ہوئے ان پر رقت طاری ہو جاتی اور وہ وفور جذبات سے مغلوب ہو کر لوگوں میں غیرت و حمیت اسلامی کی روح پھونک دینا چاہتے شاید یہ ان کے اندرونی کیفیات اور حرارت ایمانی سے تپتے ہوئے دل کا اثر تھا جس نے انھیں سیماب صفت بنا دیا تھا وہ بیکار بیٹھنا گوارا نہیں کرتے اور اسے مومن کی شان کے خلاف سمجھتے اور وہ ہمیشہ چاق وچوبند اور متحرک نظر آتے اور کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے شاید اس سے ان کے ضمیر کو سکون اور جذبۂ دل کو قرار محسوس ہوتا، وہ خود بھی سیمابی کیفیات کے حامل تھے اور دوسروں کو بھی سیماب صفت ہونے کی تلقین کرتے۔

وہ اپنی فعالیت اور کارکردگی میں "دلِ دردمند، ذہن ارجمند اور زبان ہوشمند" (جو ندوۃ العلماء کے خمیر میں ہے) کے سچے آئینہ دار تھے اور اس امر کی شہادت ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی ترتیب نو اور جشن تعلیمی میں علمی نمائش کے لوحات زبان حال سے اب بھی دے رہے ہیں جس کو مختلف ممالک کے ہزاروں لوگوں نے دیکھا اور داد و تحسین کے والہانہ کلمات نوک زبان تک آ گئے۔

مولانا اپنی عاجزی وانکساری، ظرافت و بذلہ سنجی کی وجہ سے ہر دل میں جگہ رکھتے تھے۔ عام مجلسوں میں

اپنی حاضر دماغی، برجستہ گوئی اور لطائف بیانی کی وجہ سے مرکز نگاہ اور روحِ محفل بن جاتے، آپ طلباء سے بھی دوستانہ ماحول میں بات کرتے اور فرقِ مراتب کو زیادہ اہمیت نہ دیتے، آپ طلباء ندوہ کی انجمن کی صدارت کے لئے آتے تو لڑکوں میں نیا جوش اور انبساط کی لہر دوڑ جاتی اور جلسہ کے اختتام تک لڑکے خاطر جمعی سے بیٹھے رہتے اس کی اصل وجہ ان کا وہ صدارتی تبصرہ اور دلچسپ خطاب ہوتا جو وہ اختتام پر پیش کرتے۔

ان کی زندگی کا سب سے قابلِ ذکر اور اہم پہلو نماز کے سلسلہ میں ہے جس کی پابندی اور اہتمام وہ غلو کی حد تک کرتے اور اس کو زندگی اور تمام اعمال صالحہ نیز صفائی قلب و خشیتِ الٰہی کا محرک اصلی تصور کرتے وہ اذان ہوتے ہی تمام مشغولیات سے دست بردار ہو کر مسجد کی طرف چل دیتے اور ہمیشہ صفِ اوّل میں نظر آتے چنانچہ عوام سے بھی وہ اسی جذبہ اور کیفیت کی تلقین کرتے ہوئے ۵ ؍ جولائی ۱۹۷۷ء کے تعمیر حیات میں لکھتے ہیں:

"ہمیں اپنا جائزہ بھی لینا ضروری ہے کہ کہیں ہمارا ذکر، ہماری نمازیں، ہماری عبادت، ہمارا دینی شعائر پر بے عمل روح، بے کیف اور بے جان تو نہیں ہو گیا ہے، ہماری وہ خشوع و خضوع والی نماز جو فلاح کی ضمانت تھی اور فحشاء اور منکر کے لئے ڈھال بن جایا کرتی تھی جس میں مالک کائنات کو دیکھ لیتے تھے یا کم از کم اس یقین و تصور کے ساتھ اس کو ادا کرتے تھے کہ مالک کائنات ہمیں دیکھ رہا ہے، وہ نماز جس کی لذت ہمیں ایسا محو کر دیتی تھی کہ ہمیں اپنے جسم کے زخم اور ان کی تکلیف و درد کا احساس نہ رہتا تھا، ہماری وہ نمازیں جو نہ صرف ہمارے جسم کو روحانی مسرت بخشتی تھی بلکہ غیر بھی جسے دیکھ کر متاثر ہوتے تھے، اور اسلام قبول کر لیتے تھے"

اس تحریر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی کا تعلق کس میکدے سے تھا نیز قول و فعل میں کس قدر یکسانیت اور ہم آہنگی تھی، وہ اس شعر کی معنویت کے بڑے قائل تھے اور اکثر اسے پڑھا کرتے تھے ؏

زباں و دل میں باہم ارتباط ہو ایسا
کہ جو زباں کہے دل کو اعتبار آئے

مولانا نماز عصر ادا کرکے اپنے محبوب حقیقی کے دربار سے نکلے ہی تھے کہ ان کے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد شروع ہوا اور کچھ ہی دیر میں اتنی شدت اختیار کر لی کہ انھیں اسپتال پہونچایا گیا جہاں سے وہ دوبارہ واپس نہ آسکے ؏

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اور مادرِ ندوہ کی گود ایک جواں سال لاڈلے سے خالی ہوگئی، عروسِ صحافت کا سیندور اجڑ گیا اور دلوں کا مسیحا خود اپنے درد سے جاں بر نہ ہو سکا، افسوس کہ مشیت نے انھیں ندوہ اور اہلِ ندوہ سے بہت جلد جدا کر دیا قدرت نے انکے ذمہ کا کام بہت جلد ان سے لے لیا اور گردشِ شام وسحر سے نکال کر حیاتِ جاوداں کی آغوش میں پہونچا دیا سوگواروں اور غم زدوں کی آج بھی ایک دنیا رہ گئی ہے جن کا مداوائے غم " فصبرٌ جمیل " کے سوا اور کچھ نہیں لیکن ان کی یاد دلوں میں آج بھی لالۂ سحر کی طرح تازہ ہے، ان کا شگفتہ اور مسکراتا ہوا چہرہ جواں کے آئینۂ دل کا غماز تھا، وہ لمبا قد سڈول جسم اور کشادہ پیشانی جوان کی عبقریت کی چغلی کھاتی ہوئی محسوس ہوتی، وہ چوڑا سینہ، پروقار اور تیز چال جوان کے مجاہدانہ شان اور بے باکانہ فطرت کی گواہ تھی، وہ ان کا صاف وشفاف لباس اور خوب صورت چشمہ جوان کے ذوقِ لطیف اور نظافت طبع کا آئینہ دار تھا، کتب خانہ سے ان کی رہائش گاہ تک کی وہ راہداری جس سے وہ بارہا آیا جایا کرتے، مسجد سے ان کے مکان تک کی وہ رہ گذر جس سے وہ پانچوں وقت اپنے مالک حقیقی کے دربار میں حاضری دینے جاتے، کتب خانے میں نشست گاہ کی وہ کرسی جس پر بیٹھ کر وہ اپنے کاموں میں مگن رہتے آج بھی جب ان پر نگاہ اٹھتی ہے، تو دل کو ایک دھچکا سا لگتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے یہ خام خیال دل میں آتا ہے کاش کہ مولانا ایک بار پھر اس راہداری پر نظر آجاتے کاشکہ اس کرسی پر ان کی ایک جھلک پھر دکھائی دیتی، کتنی سنسان اور بے کیف ہیں وہ راہیں جسے ان کے قدموں نے رونق وزندگی بخش دی تھی، کتنی ویران اور اجڑی اجڑی ہے وہ کرسی جو کبھی اپنی آغوش میں ایک انجمن کو سمیٹے رہتی تھی ؏

ویران ہیں میکدے خم وساغر اداس ہے

آہ! وہ لمحہ جب دلوں کو فتح کرنیوالا اور محفلوں پر چھا جانے والا مردِ آہن اسپتال میں موت وزیست کی کشمکش کا شکار بنا ہوا تھا، کتنی صبر آزما تھی وہ گھڑی جبکہ ایک متحرک اور سیماب صفت انسان کو علالت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دیا تھا کہ ہلنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

شاید یہ خدا کی طرف سے آزمائش کی وہی بھٹی تھی جس میں وہ اپنے نیک اور مومن بندے کو ڈال کر اسے گناہوں کے میل کچیل سے پاک اور منزہ کر دیتا ہے۔ ساتھ ہی اپنے بندے کے اس امتحان میں صبر وضبط اور کامیابی پر ملاء اعلیٰ کے سامنے فخر کرتے ہوئے " إني أعلم مالا تعلمون " کا قول یاد دلاتا ہے۔

بہرکیف جب میں نے ظاہری آنکھوں سے ان کو اس حالت میں دیکھا تو طبیعت لرز اٹھی اور

آبگینۂ دل چھلک گیا، میں نے ان کے قریب جاکر نبض پر ہاتھ رکھا تو انھوں نے آنکھیں کھول دیں، ان کی زبان پر کلمۂ استغفار مچل گیا اور آنکھیں نم ہونے لگیں، اس جذبہ کے تحت کہ اب کون ہے جو ان کے عزائم کو عملی روپ دے گا؟ اب کون ہے جو انسانیت کے زخم دل پر مرہم رکھے گا؟ اب کون ہے جو ان کے ذمہ کے فرائض ادا کرے گا؟ قوم وملت کا احساس، دین و مذہب کی فلاح کا خیال اور اپنے بچوں کے فرائض پرورش و پرداخت کی فکر، یہی وہ عناصر تھے جس نے ان کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔

سچ ہے کہ مجاہد اپنے لئے نہیں، قوم وملت کے لئے جیتا ہے اور دین و مذہب کیلئے مرتا ہے اس کے خون کا ایک ایک قطرہ ملک وملت کا اثاثہ اور دین و مذہب کا سرمایہ ہوتا ہے، میں نے انھیں لرزتے ہونٹوں سے تسلی دینے کی کوشش کی اور ان کے چہرے پر اداس تبسم کی ایک دھوپ سی پھیل گئی، دھوپ کی وہی ہلکی سی چادر جو شبنم کے کتنے ہی آنسوؤں کو اپنی آغوش میں چھپا لیتی ہے اور پھر ان کی آنکھیں بند ہو گئیں ——— ہمیشہ کے لئے بند !!!

ع   نہ جانے آہ کہ ان آنسوؤں پہ کیا گذری
جو دل سے آنکھ تک آئے مژہ تک آنہ سکے

اور وہ اسی مقام پر لے جاکر دفن کر دیئے گئے جہاں ایک ہی میدان صحافت کے مجاہد اور ایک ہی منزل کے مسافر مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کو ٹھیک ایک ماہ پہلے سپرد خاک کیا جاچکا تھا، کتنا اشتراک و قرب تھا دونوں کی موت وزیست میں، عمر بھی ایک، عزائم بھی ایک، زندگی کے مقاصد بھی ایک، موت کا بہانہ بھی ایک، جولان گاہ بھی ایک، مدفن بھی ایک ——— ع

جا ملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

ہر لمحہ تیری یاد کا، تاباں، درخشاں، جاوداں

علاء الدین ندوی

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے لکھا ہے کہ "خاکہ نگاری کا بڑا وصف اور اولیں شرط میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنادے۔ بڑے کو کتنا ہی بڑا دکھلائے آسان ہوگا، بہ نسبت اس کے کہ چھوٹے کو بڑا دکھایا جائے فن اور فنکار کی معراج ہوگی"۔

مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم بھی ایک اسلامی فن کار تھے، ان کے اندر معمولی کو غیر معمولی بنادینے کی بڑی صلاحیت موجود تھی، خدانے ان میں بیک وقت متعدد خصوصیات و کمالات بھی جمع کردئے تھے، وہ ایک عالم دین، داعی و مبلغ، تحریک "پیام انسانیت" کے سرگرم و فعال منتظم، مدرس و لکچرار، لائبریری سائنس سے واقف، ممتاز صحافی، شستہ و شائستہ تحریر کے مالک، عربی، اردو، انگریزی، ہندی، مراٹھی زبانوں پر قادر، خوش گفتار و خوش اخلاق، بھاری بھرکم اور پرکشش و پرعظمت شخصیت کے مالک تھے۔

مولانا کے اخلاق، کردار، گفتار، رفتار اور ان کی قابلیت و صلاحیت کو پرکھنے کے لیے مولانا کی عام مجلسوں، طلباء کے ساتھ ان کا برتاؤ اور "جنرل سائنس" کے موضوع پر ان کی تقریروں کا تذکرہ ضروری ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کے بارے میں سنا ہے کہ وہ خارجی اوقات میں طلباء کو عام معلومات کے موضوع پہ درس دیتے تھے، اور انھیں ان کو زمانہ کی رفتار و ترقی سے باخبر رکھنے کی بڑی فکر رہتی تھی، طلباء بھی بڑے ذوق شوق سے شریک ہوتے اور ان کے سب گردیدہ ہو گئے تھے، چونکہ خود مولانا رنگارنگ طبیعت کے مالک، اعلیٰ ظرف و باصلاحیت اور جہاندیدہ و متبحر عالم، متکلم و مورخ تھے، ان کا درس بھی رنگینیوں، دلچسپیوں اور معلومات کا مجموعہ ہوتا، اس لئے سارے طلباء سمٹ کر ان کے درس میں یکجا ہو جاتے، اور دوسرے اساتذہ کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی اُنسیت و محبوبیت کا اظہار کرتے، مولانا اسحاق جلیس مرحوم کی مجلسوں اور کلاسوں میں

بھی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ یہی رنگ نظر آتا، ان کی تقریروں اور باتوں میں بڑی دلچسپیاں پنہاں ہوتیں، زبان کا اُتار چڑھاؤ، خطابت کی امتیازی خصوصیتیں، زبان و بیان کی شگفتگی و روانی، طرز القا، اشعار و لطائف اور معلومات و دلچسپی سے بھرپور ہونے کی وجہ سے وہ صحیح معنوں میں "مسحورکن مقرر" بن جاتے اور سامعین کے لئے ان کی گفتگو کے دوران دوسری طرف متوجہ ہونا مشکل ہو جاتا۔

مولانا اپنے بعض نمایاں کمالات اور منفرد اوصاف کی وجہ سے "ندویت" کا رمز بن گئے تھے، بلکہ اگر یوں کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ "اسحاق جلیس ندوی" اپنی فکر و نظر کی انفرادیت "ندویت" سے عشق اور تحریک ندوۃ العلماء سے اپنی گہری وابستگی و عقیدت بلکہ اس کے لئے اپنی جان کی بھی بازی لگا دینے کی وجہ سے خود ایک "مکتبہ فکر" اور "ادارہ" بن گئے تھے۔

مولانا عموماً ایک لفظ "ندویت" بہت استعمال کرتے تھے کہ "ندویت شئی لطیف کا نام ہے"، یہ شئی لطیف (ان کے نزدیک) اپنے اندر بہت وسیع معنی رکھتا تھا، مثلاً یہ کہ ایک ندوی جہاں اعلیٰ ظرف، وسیع مطالعہ اور آفاقی ذہن رکھتا ہوگا وہیں وہ عقل سلیم کے جوہر سے بھی آشنا ہوگا، جہاں وہ فروعی، جزوی اور فقہی وغیر بنیادی اختلافات سے بالاتر بڑا روشن ضمیر و بابصیرت ہوگا وہیں وہ ایک بہترین داعی، مصلح، خادم دین اور انسانیت کا سچا ہمدرد بھی ہوگا، اعتدال، توازن اور جامعیت کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ دے گا، وہ فراست ایمانی سے بھرپور اور ایمانی بصیرت سے مالا مال ہوگا، اس "شئی لطیف" کی امتیازی خصوصیت خود ان کے اندر بڑی حد تک مضمر تھی، چنانچہ کتب خانہ ندوۃ العلماء کی حسن تنظیم و ترتیب، جشن ندوۃ العلماء میں علمی نمائش و آرائش، "تعمیر حیات" کی ترقی میں ان کی سلیقگی، اور انسانیت کی مسیحائی کے لئے "پیام انسانیت" کی پیغامبری میں انہوں نے جس محنت، لگن اور ذوق و جذبہ کا ثبوت دیا وہ اس کی ایک بڑی مثال ہے۔

مولانا میں فکری طور سے ادبی ذوق و جمال کارفرما تھا، اگر وہ اپنے آپ کو صرف ادب و قلم کے لئے وقف کر دیتے تو شاید صف اول کے ادیبوں میں جگہ پاتے لیکن انہوں نے شہرت و نام آوری سے دور ادب کو صرف مقصد (دعوت واصلاح) کے لئے ذریعہ و زینہ بنایا پھر بھی ان کی تحریروں میں ایک خاص طرح کی ندرت و لطافت پیدا ہو گئی ہے، ان میں دبستان شبلی کی جھلک بھی ہے اور تحریک اسلامی کی امنگیں

بھی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (مدظلہ العالی) کی باطنی سوز و تپش کا عکس بھی ہے اور کامیاب ادیبوں کی سلاست و روانی کا مظہر بھی، بلکہ کبھی کبھی تو ان کی تحریروں و تقریروں میں رومانیت کی سی کشش، تیز بہاؤ جیسی روانی، نازک پھولوں کی شگفتگی اور کمسن جمال کی سی شادابی و دلکشی جلوہ گر ہوتی ہے، جن میں طوفانوں کا زور اور فلسفیوں کا سا علمی استدلال بھی پوشیدہ ہوتا ہے، چنانچہ "تعمیر حیات" میں انکے اداریوں نے بارہا لوگوں کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر ان میں نئی قوت و حرارت اور نئے عزائم و ارادے پیدا کر دیئے۔

مولانا کے اداریہ "مدعی سست، گواہ چست"، کو تو ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کہ شاید ابوالکلام آزادؒ کے "الہلال" اور مولانا محمد علی جوہرؔ کے "ہمدرد" کے ولولہ انگیز و انقلاب آفریں اداریے کے بعد (عصر حاضر میں) کسی صحافی کے ایڈیٹوریل کو ایسی شہرت حاصل نہ ہوئی ہوگی۔ اس اداریے کو لکھ کر مولانا نے نہ صرف یہ کہ ندوی اہل قلم کی جرأت و بیباکی کی ترجمانی اور مومنانہ بصیرت کا ثبوت دیا بلکہ موجودہ صحافیوں کے لئے "سنگ میل" کی حیثیت سے ایک عمدہ مثال چھوڑ گئے، یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ طبقہ نے اس پر آفریں کی صدائیں بلند کیں۔

۱۹۷۵ء میں مولانا نے (مولانا سید الرحمٰن صاحب (مدظلہ العالی) ایڈیٹر "البعث الاسلامی"، کے ہمراہ) عالم عربی کا بھی دورہ کیا اور بہت قریب سے عربوں کی مذہبی، سماجی اور سیاسی صورت حال کا معاینہ کیا، وہ عربوں کی (موجودہ) بے راہ روی اور عیش پسندی سے سخت نالاں تھے، لیکن چونکہ فطرۃً وہ رجائیت پسند واقع ہوئے تھے اس لئے ان سے مستقبل قریب میں اچھی توقعات وابستہ رکھتے تھے، اس سفر میں وہ حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔

مولانا ہر کام میں بہت جلدی کرتے تھے، کسی بھی ذمہ داری کو اپنے سر ڈال لینے کے بعد اس کو ٹالنے کے عادی نہ تھے، بلکہ جلد سے جلد اس کو نبٹا دینا چاہتے تھے، حتیٰ کہ کھانے پینے، پڑھنے لکھنے، بات کرنے، نماز کے لئے جانے، کسی سے ملنے، بلکہ اپنے خدا سے بھی ملنے میں انہوں نے جلدی ہی کی۔

مولانا ندوہ سے فراغت کے بعد علمی ہی کاموں سے وابستہ رہے، آخری مرتبہ ۱۹۷۳ء میں وہ پونا کالج چھوڑ کر ندوہ آگئے تھے۔ شاید ندوہ سے باہر جہاں بھی رہے ہوں گے مادر علمی سے دوری کی وجہ سے

ایک خلش و بے چینی محسوس کرتے رہے ہوں گے، ان کی ندوۃ العلماء دوبارہ آمد پر "تعمیر حیات" کی ادارت اور کتب خانہ کی خدمت ان کے سپرد کر دی گئی تھی۔

مولانا نے مستقل کوئی وقیع تصنیف نہیں چھوڑی (سوائے تاریخ ندوہ کے) لیکن ان کے اداریے، مضامین، مسلسل ان کے اسفار اور دعوتی سرگرمیاں، انسانی سُدھار کے لئے ان کے کارنامے، طلباء میں انکی ہردلعزیزی، ان کا خاص انداز ولب ولہجہ، ان کا پُررعب تیور، ان کی باوقار وجاذب نظر شخصیت اور تصور میں بسا ان کا سراپا، یہ ساری چیزیں ان کے یادوں کے مزار پر چراغ روشن بن کر عرصہ دراز تک تابانی و درخشانی کرتے رہیں گے، اور اُن کی آخری تصنیفی پیش کش[1] ندوی برادری، دعوتوں، تحریکوں اور جماعتوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک قیمتی سوغات بن کر جاوداں بن جائے گی۔

---

[1] مولانا کی تصنیف "تاریخ ندوہ" کی پہلی جلد کئی سال ہوئے تیار ہو گئی تھی، لیکن کتابت شدہ کاپیوں میں کمی آجانے کی وجہ سے وہ چھپوا نہ سکے آخر انہوں نے اس میں مزید اضافے کئے اور زیادہ دقیع و پُرمغز بنایا، جلد دوم (حضرت) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دام مجدہ کی نگرانی میں تصنیف و ترتیب کے مراحل سے گذر رہی ہے انشاء اللہ دونوں جلد منظر عام پر آئیں گی۔

اسحاق جلیس — میرے محسن میرے دوست

(تعزیتی مکتوب)

(عبدالمجید۔ پونہ)

کل رات گیارہ بجے مجھے ٹیلیفون ملا کہ برادرم اسحاق جلیس صاحب ندوی رحلت فرماگئے، میرے آنسوؤں کی جھڑی کل سے اب تک نہیں تھمی۔ وہ میرے بھائی، دوست اور باپ سب کچھ تھے۔ میری زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں ان کا ہی زیادہ حصہ تھا وہ میرے ہر آڑے اور مشکل وقتوں میں مدد کیا کرتے تھے۔ اور صحیح مشورے دیتے رہے۔ سب سے بڑھ کر ان کا عظیم احسان یہ ہے کہ انہوں نے حضرت اقدس سے رابطہ پیدا کر دیا اور تعلق کا ذریعہ بنے۔ میں کس کس کو یاد کروں اور کس کس کو روؤں۔ عمر میں وہ مجھ سے دو سال چھوٹے تھے لیکن ذہانت اور علم و فہم میں بہت بڑے تھے۔ یہاں پونا میں اس صدمہ جانکاہ کو جو سنتا حیرت میں پڑ جاتا اور بڑی دیر تک یقین نہیں کرتا۔ ہم سے زیادہ صدمہ اور رنج تو حضرت اقدس کو ہوا ہوگا، وہ ندوہ اور ملت کے لئے پیدا کئے گئے تھے ندوہ کو جو نقصان ہوا وہ کم نہیں لیکن ساتھ ہی ملت کا بھی کچھ کم نقصان نہیں ہوا۔ تحریک پیام انسانیت کے تو وہ سرگرم کارکن تھے اور اس کو انہوں نے اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا لیا تھا وہ صحیح معنوں میں حضرت اقدس کی فکر و فلسفہ کو پوری طرح پی گئے تھے اور اسی کی اشاعت و پرچار کو اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین بنا لیا تھا، ایسے وقت جب کہ ملک میں طوائف الملوکی اور وحشت و بربریت کا دور دورہ ہے، انہیں پیام انسانیت کی تحریک کے لئے کچھ دن اور زندہ رہنا چاہیئے تھا۔ حضرت اقدس کے تو وہ دست راست تھے اور ملک و ملت کو بھی ان کی ضرورت تھی ؎

کیا ہوتا جو نہ مرتے کوئی دن اور

میرا تو پندرہ سالہ دوستی اور محبت کا رشتہ ختم ہوا اور ان کے بعد جینے سے شرم آنے لگی۔

کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

میں جو دائم المرض ہوں اکثر ان سے کہا کرتا تھا کہ بہت جلد سفر کر دوں گا لیکن وہ مجھ سے پہلے ہی نکل گئے اور بہت دور اور بہت آگے نکل گئے۔ جو حضرت اقدس کے قدموں میں جان نچھاور کردے اس کے لئے تو عیش ہی عیش ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ میں اپنی کم ہمتی کے باعث سوچتا ہی رہا لیکن انہوں نے منزل کو جا لیا ؂

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا

عزیز گرامی محمد میاں کے غم اور صدمے سے ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ چرخ نیلی فام نے ایک اور غم کا پہاڑ توڑ دیا۔ میرا جلیس اور میرے بھائی ہر کام میں عجلت اور جلدی کرتے تھے۔ کھانے میں جلدی، چلنے میں جلدی، بولنے میں جلدی، تقریروں میں جلدی، زندگی کے ہر معاملے میں جلدی یہاں تک کہ انہوں نے موت میں بھی جلدی کی ؂

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے اسؔد
کیا دیوانے نے موت پائی ہے

بیاد مولانا اسحاق جلیسؔ ندوی مرحوم

مجیب بستوی

دار فانی سے سوئے دار البقا چلنا پڑا
زندگی کو موت کی آغوش میں پلنا پڑا
اٹھ گئے دنیا سے مولانا جلیسؔ اسحاق آج
ہم کو ان کے غم میں اپنے ہاتھ کو ملنا پڑا

دل سے ان کی موت کا غم دور ہوگا کس طرح
کس طرح ان کو بھلایا جائے گا پروردگار
کس طرح بادِ خزاں گلشن سے نکلے گی مرے
کس طرح آئے گی گلشن میں مرے روٹھی بہار

اسحٰق جلیس ندوی رح

انیس توحیدی

عندلیب وقت کوئی جیسے رخصت ہو گیا / گلشن بستی ہے ویراں، نوحہ خواں بادِ صبا
محفل عیش و طرب میں بچھ گئی ماتم کی صف / چھا گئی کالی گھٹا رنج و الم کی ہر طرف
رو رہی ہے چشم نرگس یاد میں تیری جلیسؔ / کیا بتاؤں کس قدر مغموم ہے قلب انیسؔ
پھول ہیں صحن چمن کے گویا کملائے ہوئے / حزن سے ہیں سارے چہرے آج مرجھائے ہوئے
صرف ندوہ ہی نہیں سارا جہاں ہے سوگوار / سب کے دل ہیں ٹکڑے ٹکڑے سب کی آنکھیں اشکبار
آفتاب افق ندوہ نازش قوم و وطن / تیرے دم سے صحن گیتی میں تھی ضوءِ علم و فن
ہو تو کیسے ہو دل مضطر کو اب صبر و قرار / آہ اے رشک مسیحا آہ اے جان بہار
دین کے حق میں سپر، اسلام کی تلوار تھے / لشکر ملت کے تم گویا سپہ سالار تھے
جب کبھی تیرا قلم اٹھتا تھا باطل کے خلاف / مثل سیف تند کر دیتا تھا حق کی راہ صاف
کس قدر تیری ضرورت آج تھی اسلام کو / کتنی امیدیں تھیں تجھ سے ملت و اقوام کو
اب کہاں پائیں گے ہم تجھ جیسا معمار حیات / کون دکھلائے گا گمراہوں کو اب راہ نجات
آدمیت کا سبق اب دیگا کون انسان کو / کس سے رعنائی ملے گی فکر اور اذہان کو
سرد دل کو کون سوز عشق سے گرمائے گا / کون ہم کو سرفروشی کا ہنر سکھلائے گا
تھی یہی مرضی خدا کی، کر نہ شکوہ لے زباں / ہے مجال دم زدن اسکی مشیت میں کہاں

التجائے عرض رحمت کر کہ اے شاہِ ازل
پھر عطا کر دہر کو ان کا کوئی نعم البدل

تأثرات

مولانا اسحٰق جلیس ندوی مرحوم کی تعزیت میں آنے والے خطوط کے اقتباسات

مولانا اسحٰق جلیس ندوی نے کم عمری کے باوجود اپنی ذہانت، صلاحیت، خدمات اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے تعلق کی وجہ سے بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ وہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے سکریٹری رہے۔ پونا و احمد نگر میں بہت سی سماجی و اصلاحی تنظیموں اور سرگرمیوں کے روح رواں رہے ندوہ کے کتب خانہ کی تجدید کی، تعمیر حیات کی ادارت سنبھالی اور اڈیٹرس کانفرنس کے ممبر رہے، تحریک پیام انسانیت میں سرگرم حصہ لیا اس سلسلہ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا سفر کیا، پاکستان اور حجاز کا بھی سفر کیا اور برصغیر میں مسلمانوں کے ہر حلقہ اور ہر مکتب فکر کے لوگوں سے ذاتی تعلقات قائم کئے، اسی وجہ سے ان کے انتقال پر جو تعزیتی خطوط آئے، ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ان تمام خطوط کو شامل اشاعت کرنا ممکن نہیں، یہاں چند منتخب خطوط کے اقتباسات کسی خاص ترتیب کا لحاظ کئے بغیر دئیے جا رہے ہیں، باقی ماندہ خطوط میں بہت سے مرحوم کے ساتھ خلوص، یا ان کے بارہ میں صحیح تجزیہ یا اس طرح اور اسباب کے بنا پر قابل اشاعت ہوں گے۔ ہم ایسے تمام مکتوب نگار سے معذرت خواہ ہیں۔ (مرتب)

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کا مکتوب مولانا محمد رابع حسنی ندوی کے نام :۔

"ان کی وفات کا سانحہ ان کے خاندان کے لئے ہی نہیں بلکہ ندوہ کے لئے بہت بڑا سانحہ ہے وہ بڑی اچھی صلاحیت رکھتے تھے علمی بھی اور عملی بھی جو کام انکے سپرد کیا جاتا خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے، مختلف میدانوں میں ان کا تجربہ کیا گیا اور ہر جگہ کامیاب رہے۔"

مولانا اسحٰق جلیس ندوی سے احمد نگر میں ملاقات ہوئی، شیریں گفتار اور صاف کردار

فاضل تھے، ان سے قدرتی طور پر اک لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔

(مولانا) محمد طیب
دارالعلوم دیوبند

اسحٰق جلیس سلمہ، کی وفات کی جانکاہ خبر آج اخبارات میں پڑھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دل کو بڑا صدمہ پہنچا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور دوسرے پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ دعوت کا وہ تراشہ بھیج رہا ہوں جس میں اسحٰق جلیس مرحوم کی خبرِ وفات شائع ہوئی ہے۔ براہ کرم مرحوم کے خاندان کے لوگوں کو بھی میرا پیغام تعزیت پہنچا دیں۔

(مولانا) محمد یوسف۔ دہلی

مولانا محمد اسحٰق جلیس ندوی کی جدائی کی خبر اچانک ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی گذشتہ پاکستان تشریف آوری کے موقع پر پہلی مرتبہ ان کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے ساتھ دو طویل نشستیں رہیں۔ اللہ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ دل و دماغ کی نعمتوں سے مالامال تھے۔ ایک ابھرتے ہوئے مجاہد مسلمانوں کے لئے سرمایہ۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ ان جیسے مجاہدوں کے ہوتے ہوئے انشاء اللہ مسلمان بھنور سے نکل کر پھر اپنا کھویا ہوا مقام جلد حاصل کر لیں گے۔

عبدالغفور احمد۔ کراچی

ابھی حسنی مرحوم کی وفات حسرت آیات کا غم تازہ ہی ہے کہ اسحٰق جلیس داغِ مفارقت دے گئے۔ جلیس مرحوم آپ کے لئے محبوب ترین عزیز سے کم نہ تھے۔ آپ نے ان کی ذات سے کیا کیا امیدیں باندھ رکھی تھیں، وہ ندوہ کے لئے ایک سرمایہ تھے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ

آج الجمعیۃ مورخہ ۱۸ جولائی ملا تو اس سے مولانا اسحٰق جلیس کے انتقال پر ملال

کی خبر معلوم کر کے سخت صدمہ اور ملال ہوا۔ . . . . وہ بڑے لائق و فائق، نہایت مستعد، صاحب فہم و تدبر اور مخلص انسان تھے، آپ پر دل و جان سے فدا اور زندگی کے آخری لمحہ تک آپ کی خدمت میں رہنے کی قسم کھائے ہوئے تھے۔

(مولانا) سعید احمد اکبر آبادی

اچانک یہاں کے اخبارات "جنگ" اور "جسارت" (کراچی) دونوں میں جناب محترم اسحٰق جلیس صاحب کی وفات کی خبر پڑھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
ان کا علم، تہذیب اور حسن اخلاق یہ سب متاثر کرنے والی چیزیں تھیں۔ ان کی وفات کی خبر ایک اخبار میں پڑھی اور طبیعت پر شدید اثر ہوا۔ میں دوسرے اخبار میں جس میں قدرے تفصیل تھی نہ پڑھ سکا۔ اس کا اثر کئی دن رہا۔

حامد میاں فرنگی محلی

لاہور

" میں مرحوم سے ملا تو نہیں مگر ان کے قلم سے خوب ملاقات ہے ان کی تحریروں کو دیکھ کر اور پڑھ کر ہماری امیدیں جوان رہتی تھیں۔"

سید سلمان ندوی۔ ڈربن جنوبی افریقہ

" محمد میاں اگر آپ کے دایاں بازو تھے تو مولوی اسحاق جلیس بایاں بازو۔ قریبی زمانہ میں ان دونوں کا انتقال حقیقتاً آپ کے لئے سخت رنج اور صدمہ کا باعث ہے۔"

جناب حافظ کا صاحب سفیر ہند۔ جدہ

" یہ ندوہ ہی کے لئے نہیں بلکہ حضرت والا اور تحریک پیام انسانیت کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔"

شہاب ندوی۔ بنگلور

" ندوہ پر جو مصیبت اتری ہے اس پر دلی رنج والم کے ساتھ یہ دعا کر رہا ہوں کہ اللہ ندوہ کو اہل اور مناسب افراد عطا فرمائے۔"

محمود القیسیہ۔ ابوظبی

" ماپروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چون وچرا در قضائے ما

بس اللہ تعالیٰ اہل ملت پر رحم فرمائے ۔"

غلام محمد ۔ کراچی

" دین کا نام لینے اور اس کے لئے خلوص سے کام کرنے والے افراد کی یوں ہی کمی ہے اس حال میں ان دونوں اصحاب علم وقلم کا عین جوانی کے عالم میں اٹھ جانا بہت بڑا سانحہ ہے ۔

جلال الدین عمری

ادارہ تصنیف جماعت اسلامی ہند ۔ علی گڑھ

" . . . . ندوہ کے مسلک اور مقاصد کی اشاعت کے لئے بھی ایک نقصان عظیم کا باعث ہوں گے ۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ کو ان کی جدائی پر صبر عطا فرمائیں اور آپ کے کاموں کے لئے ان کا کوئی نعم البدل بھی ۔"

مولانا سعید انصاری ۔ نئی دہلی

" جادۂ اعتدال پر قائم رہنا ایک بڑی بات ہے بالخصوص میدانِ صحافت میں اس کا نباہنا ایک کٹھن مرحلہ ہوا کرتا ہے لیکن حق یہ ہے کہ مولانا مرحوم کا قلم کبھی اعتدال کی راہ سے نہیں ہٹتا ۔"

سید حسنین پاشا ۔ صدر انجمن فلاح ملت ۔ بہار

" . . . . ان کی ہفت زبانی تحریر و تقریر میں سوز دروں ، برادران وطن کے لئے اسلام کا پیغام پہنچانے میں انتہائی موثر انداز ، اس ملک میں موجودہ حالات کی ہولناکی میں انتہائی کارآمد انسان ۔"

مولانا افتخار فریدی ۔ مراد آباد

" خاندان ندوہ کے اس لائق سپوت وصحافی کی ناگہانی موت ملت کا عظیم نقصان ہے ۔"

محمد عبدالقادر ۔ حیدرآباد

"مرحوم نے تحریک پیام انسانیت کو اپنے افکار سے جلا عطا فرمائی، اس سے ہزارہا بندگان خدا خیر و فلاح کی طرف بڑھے اور دین کی حقیقت پہچاننے اور عمل کرنے کے لئے خود کو قابل بنا سکے۔"

محمد عاقل خاں۔ ملی امدادی سوسائٹی۔ بہرائچ

مولانا کے انتقال سے دلی صدمہ پہنچا، جنازہ میں بھی شریک رہا۔ اس حادثہ سے دل پر بہت اثر ہے۔"

مولانا محمد احمد پھول پوری

"تعمیر حیات میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ کئی دینی تحریکوں میں ان کا کردار مثالی رہا۔"

محی الدین منیری۔ بمبئی

"میں آجکل اس تصور میں اکثر کھویا رہتا ہوں کہ اول تو اس ملت میں افراد ہی کی کمی ہے اور اگر کوئی شخص خلوص نیت سے کام کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو پیام اجل آجاتا ہے۔"

محمد عزیز حسن مراد آباد

"یہ دونوں حادثے ملت اسلامیہ ہند کے لئے تو ایسے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان کی تلافی کیسے ہوگی؟ ان کی جدائی کا غم تو پوری ملت کا غم ہے۔

مولانا محمد سراج الحسن

امیر جماعت اسلامی حلقہ کرناٹک

"واللہ! ان دونوں سپاہیوں کی ضرورت تھی، ایک کی عرب کو ایک کی عجم کو۔

محمد شفیع شہاب۔ بھٹکل

"آپ کے لئے اور ندوہ کے لئے یہ دونوں حادثے ایسے ہیں جن کا درد برسوں محسوس کیا جائے گا۔"

محمد عباس ندوی۔ گیا

"مرحوم نے دنیائے صحافت میں بہت جلد اپنا مخصوص اور اہم مقام بنالیا تھا اور

اس دور پر جس دیانتداری سے واقعات پر تبصرہ فرماتے تھے موصوف ہی کا کمال تھا۔"

محمد حبیب اللہ قادری

ماہنامہ "کانتی" دہلی

"ہماری قوم کا ہر فرد اس غم میں برابر کا شریک ہے اُن کے علاوہ بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہے۔"

حمید اللہ چشتی

صدر تبت مسلم رفیوجی ولیفر ایسوسی ایشن

سری نگر۔ کشمیر

"مولانا اسحٰق جلیس ندوی کے انتقال سے دلی صدمہ ہوا۔ اللہ ان کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر کی توفیق۔

ڈاکٹر احمد تو تونجی

"ایک مخلص اور بے تکلف دوست جاتا رہا گرم دم جستجو تھے، جس کام کو لیتے بس اس پر لگ جاتے، جرأت و بے باکی کی وجہ سے مجھے بے حد عزیز تھے . . . . مرحوم نے بھٹو کے سلسلہ میں جو نمبر نکالا وہ ان کی صلاحیت خلوص اور لگن کا آئینہ دار ہے۔"

ڈاکٹر سید انور علی بھٹکل

"تعمیر حیات کی ادارت کی خدمات قبول کرتے ہی اس کی قسمت چمکا دی اور اس پرچہ کے ذریعہ عالم اسلامی بالخصوص مسلمانانِ ہند کو پیش آنے والے مسائل کا نیک نیتی کے ساتھ تجزیہ کیا، اور انکے لئے جینے کی راہ متعین کی اور جناب عالی نے پیام انسانیت کے نام سے جو تحریک شروع کی تھی اسکو آگے بڑھانے میں پورا تعاون کیا۔"

مولانا عبد الرؤف رحمانی۔ جھنڈا نگر نیپال

تاریخ وفات حسرت آیات

"آہ ادیب علم نافع مولانا السیّد محمد الحسنی الندوی مدیر البعث الاسلامی"
۹ ۷ ۹ ۱ ء

آہ مدیر تعمیر حیات
۹ ۹ ۳ ۱ ھ

"اُف احترام بزم مولانا عبد السلام القدوائی الندوی
۹ ۹ ۳ ۱ ھ

اِنَّ اللّٰہَ رَبٌّ قَوِیٌّ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ
۹ ۷ ۹ ۱ ء

مرسلہ
جناب حکیم احمد حسن غفرلہٗ
۸ جنوری ۱۹۸۰ء